کلیاتِ پریم چند

6

مُرتبہ

مدن گوپال

قومی کونسل برائے فروغِ اُردو زبان، نئی دہلی

کلیاتِ پریم چند

6

نرملا ، غبن

مرتبہ

مدن گوپال

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل (حکومتِ ہند)

ویسٹ بلاک ۱، آر۔ کے۔ پورم نئی دہلی

پیش لفظ

اردو زبان و ادب میں پریم چند کو خاص مقبولیت حاصل ہے۔ عرصۂ دراز سے ان کی تصانیف مختلف سطحوں کے تعلیمی نصابوں میں شامل رہی ہیں۔ ایک عرصے سے ضرورت محسوس کی جارہی تھی کہ پریم چند کی تمام تصانیف کے مستند اڈیشن یکجا صورت میں منظرعام پر آئیں۔ بالآخر قومی اردو کونسل نے پریم چند کی تمام تحریروں کو "کلیاتِ پریم چند" کے عنوان سے مختلف جلدوں میں ایک مکمل سِٹ کی صورت میں شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ کلیات 22 جلدوں پر مشتمل ہوگا جس میں پریم چند کے ناول، افسانے، ڈرامے، خطوط، تراجم، مضامین اور اداریے بہ اعتبارِ اصناف یکجا کیے جائیں گے۔جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

ناول : جلد 1سے 8 تک ، افسانے : جلد 9 سے جلد 14 تک، ڈرامے :
جلد15 و جلد 16 ، خطوط : جلد17، متفرقات : جلد 18 سے جلد 20 تک،
تراجم : جلد 21 و جلد 22 تک

"کلیاتِ پریم چند" میں متون کے استناد کا خاص خیال رکھا جا رہا ہے۔ مواد کی فراہمی کے لیے مختلف شہروں کے کتب خانوں سے استفادہ کیا گیا ہے اور پریم چند سے متعلق شخصیتوں سے بھی ذاتی طور پر ملاقات کرکے مدد لی گئی ہے۔ اس سلسلے میں پریم چند کے پسرزادے پروفیسر آلوک رائے نے بہت سی مفید معلومات بہم پہنچائیں۔

"کلیاتِ پریم چند" کی ترتیب میں یہ التزام رکھا گیا ہے کہ ہر صنف کی تحریریں زمانی ترتیب کے ساتھ شاملِ اشاعت ہوں اور ہر تحریر کے آخر میں اول سنِ اشاعت، جس میں شائع ہوئی ہو، اس رسالہ کا نام اور مقامِ اشاعت بھی درج ہو۔ اس سے مطالعہ پریم چند کے نئے امکانات پیدا ہوں گے۔ ہماری کوشش ہے کہ "کلیاتِ پریم چند" میں شامل تمام تحریروں کا مستند متن قارئین تک پہنچے۔

"کلیاتِ پریم چند" کی شکل میں یہ منصوبہ نقشِ اولیں ہے ہماری پوری کوشش کے باوجود جہاں تہاں کوئی کوتاہی راہ پاسکتی ہے۔ مستقبل میں پریم چند کی نودریافت تحریروں کا

خیر مقدم کیا جائے گا اور نئی اشاعت میں ان کا لحاظ رکھا جائے گا۔ کلیات سے متعلق قارئین
کے مفید مشوروں کا بھی خیر مقدم کیا جائے گا۔

اردو کے اہم اور بنیادی کلاسیکی ادبی سرمایے کو شائع کرنے کا منصوبہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی ترجیحات میں شامل ہے۔ ان ادبی متون کو انتخاب کرنے اور انھیں شائع کرنے کا فیصلہ قومی کونسل کی ادبی پینل کی کمیٹی کے ذریعے لیا گیا ہے۔ اس کمیٹی کے چیئرمین پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی اور ارکان پروفیسر شمیم حنفی، جناب محمد یوسف ٹینگ، جناب بلراج پوری، پروفیسر نیر مسعود، جناب احمد سعید ملیح آبادی اور کونسل کے نائب چیئرمین جناب راج بہادر گوڑ کے ہم ممنون ہیں کہ انھوں نے اس پروجکٹ سے متعلق تمام بنیادی امور پر غور کرکے اس منصوبے کو تکمیل تک پہنچانے میں ہماری معاونت فرمائی۔ ''کلیاتِ پریم چند'' کے مرتب مدن گوپال اور ریسرچ اسسٹنٹ ڈاکٹر رحیل صدیقی بھی ہمارے شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے پریم چند کی تحریروں کو یکجا کرنے اور انھیں ترتیب دینے میں بنیادی رول ادا کیا۔

ہمیں امید ہے کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی دیگر مطبوعات کی طرح ''کلیاتِ پریم چند'' کی بھی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ
ڈائرکٹر
قومی کونسل برائے فروغ اردوزبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومتِ ہند،
نئی دہلی

فہرست

دیباچہ

منشی پریم چند نے کایا کلپ (اردو میں پردۂ مجاز) کے مسودے کو ستمبر1925 میں مکمل کیا۔ مدیر رام رکھ سہگل نے پریم چند سے کہا کہ مستورات کی دلچسپی کے افسانے ان کے ہندی ماہنامہ 'چاند' کو دیا کریں اور ایک ناول بھی لکھیں ماہنامہ چاند، سرسوتی اور مادھوری جیسے رسالوں کے مقابلے کا تھا۔ اور اُس کا دائرہ وسیع تھا۔ اس کے خصوصی نمبروں نے ادبی حلقوں میں ہلچل مچا دی تھی اس ماہنامہ کے مارواڑی انک، راجپوتانہ انک اور پھانسی انک (جس کا تعلق بھگت سنگھ سے تھا) بہت مقبول ہوئے۔ پھانسی انک تو اتنا مقبول ہوا کہ اسے برٹش سرکار نے ضبط بھی کیا۔ ماہنامہ چاند عورتوں میں خاص طور سے مقبول تھا اِس کا ایک مہلا اندولن انک بھی نکلا تھا۔

پریم چند ابتدائی دور سے ہی عورتوں کے مسائل پر خاص دھیان دیتے تھے۔ تیرہ سال کی عمر میں رشتے کے ماموں کے رومانس کو لے کر انھوں نے ایک ڈرامائی کہانی لکھی تھی۔ قیامِ گورکھپور کے دوران وہ اپنی جوان سوتیلی ماں اور ہمسایے میں ایک اہیرن ودھوا کے ہنسی مزاق کا لطف اُٹھاتے۔ پریم چند نے شیو رانی دیوی کو بتلایا کہ اپنی چھوٹی عمر میں اُنھیں ان باتوں کا پتہ تھا جو اس عمر کے بچوں کے لیے مضر ہوتی ہیں۔ (یاد رہے کہ پریم چند کے والد نے بڑھاپے میں ایک نوجوان لڑکی سے شادی کی تھی اور جلد ہی دنیا سے رخصت ہوگئے تھے۔

نرملا ماہنامہ چاند میں نومبر1925 سے لے کر نومبر1926 تک مسلسل قسط وار شائع ہوا۔ یہ ناول بہت مقبول ہوا۔ جنوری1927 میں چاند پریس نے اسے کتاب کی شکل میں

شائع کیا۔ پریم چند نے خود اس کا ترجمہ اردو میں کیا اور گیلانی الیکٹرک پریس لاہور سے 1929 میں شائع کرایا۔

'نرملا' کی مقبولیت کو دیکھ کر رام رکھ سہگل نے پریم چند کو ایک اور ناول لکھنے پر مجبور کیا اور پریم نے اپنے پرانے ناول 'ہم خرما و ثواب' کو نئے سرے سے پیش کیا۔ اور عنوان دیا 'پرتگیا'۔ یہ جنوری 1927 سے لے کر نومبر 1927 تک چاند میں شائع ہوا۔ اس کا اردو ترجمہ 'بیوہ' کے عنوان سے پریم چند نے خود شائع کیا تھا آگے چل کر اسے مکتبہ جامعہ نئی دہلی نے شائع کیا۔ 'بیوہ' کو کلیات پریم چند کے پہلے شمارہ میں شامل کیا گیا ہے۔ اُسی شمارے میں پریم چند کے دوسرے ناول کشنا کا ذکر بھی کیا گیا تھا۔ منشی جی نے اپنے عزیز شاگرد جناردن پرساد جھا دِوج کو بتلایا تھا کہ کشنا کی تھیم (مستورات کی زیورات میں دلچسپی) کو لے کر آگے چل کر غبن کی تصنیف کی گئی۔

'غبن' 1931 میں شائع ہوا۔ اس کی تخلیق پریم چند کے قیامِ لکھنؤ کے دوران ہوئی یہ ناول سرسوتی پریس سے شائع ہوا اس کا اردو ترجمہ پریم چند نے خود کیا اور لاجپت رائے اینڈ سنس لاہور سے شائع کرایا۔

تھیم کے لحاظ سے نرملا اور غبن کا تعلق پریم چند کی ادبی خدمات کے ابتدائی دور سے ہے۔یہ ناول گوشۂ عافیت، چوگان ہستی کے مقابلے کا نہیں ہے پھر بھی اس کی اپنی اہمیت ہے۔ دونوں (نرملا اور غبن) کا انگریزی ترجمہ شائع ہوچکا ہے۔

مدن گوپال

(۱)

یوں تو بابو اُودے بھان لال کے گھر میں بیسیوں آدمی تھے۔ کوئی ماموں زاد بھائی تھا کوئی پھوپھی زاد۔ کوئی بھانجا تھا کوئی بھتیجا۔ لیکن یہاں ہم کو ان سے کوئی مطلب نہیں۔ وہ اچھے وکیل تھے ان پر لکشمی مہربان تھی۔ پس غریب کنبہ والوں کی مدد کرنا ان کا فرض تھا۔ ہمارا مطلب تو صرف ان کی دونوں لڑکیوں سے ہے جن میں بڑی کا نام نرملا اور چھوٹی کا کرشنا تھا۔ ابھی کل تک دونوں ساتھ ساتھ گڑیاں کھیلتی تھیں۔ نرملا کا پندرہواں سال تھا۔ اور کرشنا کا دسواں۔ پھر بھی ان کے مزاج میں کوئی خاص فرق نہ تھا۔ دونوں شوخ لہو و لعب کی دلدادہ اور سیر وتماشا کی شیدائی تھیں۔ دونوں گڑیوں کا دھوم دھام سے بیاہ رچاتی تھیں اور کام سے ہمیشہ جی چُرایا کرتی تھیں۔ ماں پکارا کرتی مگر دونوں کوٹھے پر چھپی بیٹھی رہتیں کہ نہ جانے کس کام کے لیے بلاتی ہو۔ دونوں اپنے بھائیوں سے لڑتیں، نوکروں کو ڈانٹ بتاتیں اور باجہ کی آواز سنتے ہی دروازہ پر جاکر کھڑی ہوجایا کرتیں۔ مگر آج دفعتاً ایک ایسی بات ہوگئی ہے جس نے بڑی کو بڑی اور چھوٹی کو چھوٹی بنا دیا ہے۔ کرشنا وہی ہے مگر نرملا متین، تنہائی پسند اور حیادار ہوگئی ہے۔ اِدھر مہینوں سے بابو اُودے بھان لال نرملا کے بیاہ کی بات چیت کر رہے تھے۔ آج ان کی محنت ٹھکانے لگی۔ بابو بھال چندر سنہا کے بڑے صاحبزادے بھون موہن سنہا سے نسبت پختہ ہوگئی۔ لڑکے کے والد نے کہہ دیا ہے کہ آپ کے مزاج میں آئے جہیز دیں یا نہ دیں مجھے اس کی پرواہ نہیں۔ البتہ بارات میں جو لوگ جائیں ان کی خاطر تواضع بخوبی ہونی چاہیے کہ میری اور آپ کی بدنامی نہ ہو۔ بابو

اُودے بھان لال تھے تو وکیل مگر دولت جمع کرنا نہ جانتے تھے۔ جہیز دینا اُن کے لیے ایک مشکل مسئلہ تھا۔ اس لیے جب لڑکے کے والد نے کہہ دیا کہ مجھے جہیز کی پرواہ نہیں تو گویا انھیں آنکھیں مل گئیں خوف تھا کہ نہ جانے کس کس کے سامنے ہاتھ پھیلانے پڑے۔ دو تین مہاجنوں سے معاملہ ٹھیک کر رکھا تھا۔ ان کا قیاس تھا کہ بہت کفایت کرنے پر بھی بیس ہزار سے کم خرچ نہ ہوں گے۔ یہ تشفی پاکر وہ خوشی سے جامہ میں پھولے نہ سمائے۔

اسی خبر نے معصوم لڑکی کو مُنہ ڈھانک کر ایک گوشہ میں بٹھا رکھا ہے۔ اس کے دل میں ایک عجیب خوف جاگزیں ہوگیا ہے۔ اس کے روئیں روئیں میں اس نامعلوم خوف کا اثر ہے نہ جانے کیا ہوگا؟ اس کے دل میں وہ امنگیں نہیں ہیں جو بتانِ نوخیز کی آنکھوں میں ترچھی چتون بن کر، ان کے ہونٹوں پر شیریں تبسم ہوکر اور ان کے سارے اعضاء میں مستانہ خودر فتگی کی صورت میں نمایاں ہوتی ہیں۔ نہیں، وہاں تمنائیں نہیں، بلکہ خوف، تفکر اور بزدلانہ توہّم سے شباب ابھی کھلا نہیں ہے۔

کرشنا کچھ کچھ جانتی ہے اور کچھ کچھ نہیں جانتی۔ وہ جانتی ہے کہ بہن کو اچھے اچھے گہنے ملیں گے۔ دروازے پر باجے بجیں گے۔ مہمان آئیں گے۔ ناچ ہوگا۔ یہ جان کر وہ خوش ہے وہ یہ بھی جانتی ہے کہ بہن سب کے گلے مل کر روئے گی۔ یہاں سے رودھو کر چلی جائے گی اور میں اکیلی رہ جاؤں گی۔ یہ جان کر وہ مغموم ہے مگر وہ نہیں جانتی کہ یہ سب کس لیے ہو رہا ہے۔ ماں اور باپ کیوں بہن کو گھر سے نکالنے پر اس قدر تُلے ہوئے ہیں۔ بہن نے تو کسی کو کچھ نہیں کہا۔ کسی سے لڑائی نہیں کی۔ کیا اسی طرح ایک دن مجھے بھی یہ لوگ نکال دیں گے؟ میں بھی اسی طرح کونے میں بیٹھ کر روؤں گی اور کسی کو مجھ پر رحم نہ آئے گا؟ اس خیال سے وہ خائف بھی ہو رہی ہے۔

شام کا وقت تھا۔ نرملا چھت پر جاکر تنہا بیٹھی ہوئی آسمان کی طرف اشتیاق آمیز نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ جی میں آتا تھا کہ اگر پَر ہوتے اُڑجاتی۔ اور اِن تمام جھنجھٹوں سے چھٹکارا پا جاتی۔ اس وقت اکثر دونوں بہنیں کہیں سیر کے لیے جایا کرتی تھیں۔ بگھی خالی نہ ہوتی تو باغیچہ میں ٹہلا کرتیں۔ اس لیے کرشنا اُسے ڈھونڈ رہی تھی۔ کہیں نہ پاکر وہ چھت پر گئی اور اسے دیکھتے ہی ہنس کر بولی۔ ''تم یہاں آکر چھپی بیٹھی ہو، اور میں تمھیں ڈھونڈتی پھرتی ہوں۔ چلو بگھی تیار کرا آئی ہوں۔

نرملا نے بے پروائی سے کہا۔ "تو جا۔ میں نہ جاؤں گی۔"

کرشنا۔ نہیں میری اچھی دیدی۔ آج ضرور چلو۔ دیکھو کیسی ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے۔

نرملا۔ میرا جی نہیں چاہتا۔ تو چلی جا۔

کرشنا کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ کانپتے ہوئے لہجہ میں بولی۔ "آج تم کیوں نہیں چلتیں؟ مجھ سے کیوں نہیں بولتیں؟ کیوں اِدھر اُدھر چُھپی پھرتی ہو؟ میرا جی اکیلے بیٹھے بیٹھے گھبراتا ہے۔ تم نہ چلوگی تو میں بھی نہ جاؤں گی۔ یہیں تمھارے پاس بیٹھی رہوں گی۔

نرملا۔ اور جب میں چلی جاؤں گی تب کیا کرے گی؟ تب کس کے ساتھ کھیلے گی کِس کے ساتھ گھومنے جائے گی؟ بتا!

کرشنا۔ میں بھی تمھارے ساتھ چلوں گی۔ مجھ سے اکیلے یہاں نہ رہا جائے گا۔ نرملا مسکرا کر بولی۔ تجھے اماں نہ جانے دیں گی۔

کرشنا۔ تو میں بھی تمھیں نہ جانے دوں گی۔ تم اماں سے کہہ کیوں نہیں دیتیں کہ میں نہ جاؤں گی؟

نرملا۔ کہہ تو رہی ہوں۔ کوئی سُنتا بھی ہے؟

کرشنا۔ تو کیا یہ تمھارا گھر نہیں ہے؟

نرملا۔ نہیں، میرا گھر ہوتا تو کوئی کیوں زبردستی نکال دیتا؟

کرشنا۔ اسی طرح کسی دن میں بھی نکال دی جاؤں گی؟

نرملا۔ اور نہیں تو کیا تو بیٹھی رہے گی؟ ہم لڑکیاں ہیں ہمارا گھر کہیں نہیں ہوتا۔

کرشنا۔ چندر بھی نکال دیا جائے گا؟

نرملا۔ چندر تو لڑکا ہے اُسے کون نکالے گا؟

کرشنا۔ تو لڑکیاں بڑی خراب ہوتی ہوں گی؟

نرملا۔ خراب نہ ہوتیں تو گھر سے بھگائی کیوں جاتیں؟

کرشنا۔ چندر تو اتنا بدمعاش ہے، اسے کوئی نہیں بھگاتا۔ ہم تم تو کوئی بدمعاشی بھی نہیں کرتیں۔

یکایک چندر دھم دھم کرتا ہوا چھت پر آ پہنچا اور نرملا کو دیکھ کر بولا۔ "اچھا آپ یہاں بیٹھی ہیں۔ اوہو! آج تو باجے بجیں گے۔ دیدی دلہن بنیں گی، پالکی پر چڑھیں گی،

اوہو! اوہو!!"

چندر کا پورا نام چندر بھان سنہا تھا۔ نرملا سے تین سال چھوٹا اور کرشنا سے دو سال بڑا تھا۔

نرملا۔ چندر! تم چڑھاؤگے تو ابھی جاکر اماں سے کہہ دوں گی۔

چندر۔ تو چڑھتی کیوں ہو؟ تم بھی باجے سُننا۔ اوہو! ہو! اب تم دلہن بنوگی کیوں کشنی! تو باجے سُنے گی نہ؟ ایسے باجے تم نے کبھی نہ سُنے ہوں گے۔

کرشنا۔ کیا بینڈ سے بھی اچھے ہوں گے؟

چندر۔ ہاں ہاں۔ بینڈ سے بھی اچھے۔ ہزار گنا اچھے۔ لاکھ گنا اچھے۔ تم جانو کیا۔ ایک بینڈ سن لیا تو سمجھنے لگیں کہ اس سے اچھے باجے ہی نہیں ہوتے! باجا بجانے والے سرخ سرخ وردیاں اور سیاہ سیاہ ٹوپیاں پہنے ہوں گے۔ ایسے خوبصورت معلوم ہوں گے کہ تم سے کیا کہوں۔ آتشبازی بھی ہوگی۔ ہوائیاں آسمان پر اُڑ جائیں گی۔ اور وہاں تاروں میں لگیں گی تو لال، پیلے، ہرے، نیلے تارے ٹوٹ ٹوٹ کر گریں گے۔ بڑا مزا آئے گا۔

کرشنا۔ اور کیا کیا ہوگا چندر؟ بتادے میرے بھیا!

چندر۔ میرے ساتھ گھومنے چل تو راستے میں ساری باتیں بتا دوں۔ ایسے ایسے تماشے ہوں گے کہ دیکھ کر تیری آنکھیں کھل جائیں گی۔ ہوا میں اُڑتی ہوئی پریاں ہوں گی۔ سچ مچ کی پریاں!

کرشنا۔ اچھا چلو۔ لیکن نہ بتاؤگے تو ماروں گی۔

چندر بھان اور کرشنا چلے گئے مگر نرملا تنہا بیٹھی رہ گئی۔ کرشنا کے چلے جانے پر اس وقت اُسے بہت رنج ہوا۔ کرشنا جسے وہ جان سے بھی زیادہ پیار کرتی تھی۔ آج اتنی بے مروّت ہوگئی۔ تنہا چھوڑ کر چلی گئی۔ بات کچھ نہ تھی۔ مگر دُکھی دل دُکھتی ہوئی آنکھ ہے۔ جس میں ہوا سے بھی درد ہوتا ہے۔ نرملا بڑی دیر تک بیٹھی روتی رہی۔ بھائی، بہن، ماں باپ سبھی اسی طرح مجھے بھول جائیں گے۔ سب کی آنکھیں پھر جائیں گی۔ پھر شاید انھیں دیکھنے کو بھی ترس جاؤں۔

باغ میں پھول کھلے ہوئے تھے۔ بھینی بھینی خوشبو آرہی تھی۔ چیت کی سرد خوشگوار

ہوا چل رہی تھی۔ آسمان پر تارے چھٹکے ہوئے تھے۔ نرملا اِنھیں دُکھ بھرے خیالات میں پڑے پڑے سوگئی۔ اور آنکھ لگتے ہی اس کا خیال عالمِ خواب میں گشت کرنے لگا۔ کیا دیکھتی ہے کہ سامنے ایک دریا موجیں مار رہا ہے۔ اور وہ اسی کے کنارے کنارہ پر کشتی کا انتظار کر رہی ہے شام کا وقت ہے۔ تاریکی کسی خوفناک جانور کی طرح بڑھتی چلی آرہی ہے۔ وہ سخت تفکر میں مبتلا ہے کہ کس طرح اس پار جاکر گھر پہنچوں گی۔ رو رہی ہے کہ کہیں رات نہ ہوجائے ورنہ میں اکیلی یہاں کیسے رہوں گی۔ دفعتاً اسے ایک عمدہ کشتی گھاٹ کی طرف آتی ہوئی نظر آتی ہے۔ وہ خوشی سے اُچھل پڑتی ہے اور جوں ہی کشتی گھاٹ پر آتی ہے وہ اس پر چڑھنے کے لیے بڑھتی ہے۔ لیکن جوں ہی کشتی کے تختہ پر قدم رکھنا چاہتی ہے ملاّح بول اُٹھتا ہے کہ تیرے لیے یہاں جگہ نہیں ہے۔ وہ ملاح سے منّت کرتی ہے۔ اس کے پیروں پڑتی ہے۔ روتی ہے۔ لیکن وہ برابر یہی کہتا جاتا ہے کہ تیرے لیے یہاں جگہ نہیں ہے۔ ایک لمحہ میں کشتی کھل جاتی ہے۔ وہ زار و قطار رونے لگتی ہے۔ دریا کے سنسان کنارہ پر تمام رات کیسے رہے گی۔ یہ سوچ کر وہ دریا میں کود کر اس کشتی کو پکڑنا چاہتی ہے کہ اتنے میں کہیں سے آواز آتی ہے۔ "ٹھہرو ٹھہرو۔ ندی گہری ہے۔ ڈوب جاؤگی وہ کشتی تمھارے لیے نہیں ہے میں آتا ہوں۔ میری کشتی پر بیٹھو۔ میں اس پار پہنچا دوں گا۔" وہ خوف زدہ ہوکر اِدھر اُدھر دیکھتی ہے کہ یہ آواز کہاں سے آئی۔ ذرا دیر بعد ایک چھوٹی سی ڈونگی آتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ اس میں نہ پال ہے اور نہ پتوار اور نہ مستول۔ پینڈا پھٹا ہوا۔ تختے ٹوٹے ہوئے اور کشتی میں پانی بھرا ہوا! ایک شخص اس میں سے پانی باہر پھینک رہا ہے وہ اس سے کہتی ہے یہ تو ٹوٹی ہوئی ہے۔ کیسے پار لگے گی؟ ملاّح کہتا ہے تمھارے لیے یہی بھیجی گئی ہے آکر بیٹھ جاؤ۔ وہ ایک لمحہ سوچتی ہے کہ اس میں بیٹھوں یا نہ بیٹھوں۔ بالآخر وہ بیٹھنے کا تہیہ کرلیتی ہے۔ یہاں تنہا پڑی رہنے سے کشتی میں بیٹھ جانا پھر بھی اچھا ہے۔ کسی خوفناک جانور کا لقمہ ہونے سے تو یہی بہتر ہے کہ ندی میں ڈوب جاؤں کون جانے کشتی پار لگ ہی جائے۔ یہ سوچ کر وہ جان کو مٹھی میں لیے ہوئے کشتی میں بیٹھ جاتی ہے۔ کچھ دیر تک تک کشتی ڈگمگاتی ہوئی چلتی ہے مگر لمحہ بہ لمحہ اس میں پانی بھرتا جاتا ہے۔ وہ بھی ملاّح کے ساتھ دونوں ہاتھوں سے پانی باہر پھینکنے لگتی ہے یہاں تک کہ اس کے بازو شل ہوجاتے ہیں۔ آخر کشتی چکّر کھانے لگتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اب ڈوبی اور تب ڈوبی۔ اس وقت

وہ کسی نادیدہ سہارے کے لیے اپنے دونوں ہاتھ پھیلاتی ہے۔ کشتی نیچے سے کھسک جاتی ہے اور اس کے پیر اُکھڑ جاتے ہیں! وہ زور سے چلّائی اور چلّاتے ہی اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ دیکھا تو ماں سامنے کھڑی ہوئی اس کا شانہ پکڑ کر اسے ہلا رہی تھی۔

(۲)

بابو اُودے بھان لال کا مکان بازار میں واقع ہے۔ برآمدہ میں سونار کے ہتھوڑے اور کمرہ میں درزی کی سوئیاں چل رہی ہیں۔ سامنے نیم کے درخت کے نیچے بڑھئی چارپائیاں بنا رہے ہیں۔ کھپریل کے تلے حلوائی کے لیے بھٹہ کھودا گیا ہے۔ مہمانوں کے لیے علاحدہ ایک مکان میں انتظام کیا گیا ہے۔ یہ بندوبست کیا جا رہا ہے کہ ایک مہمان کے لیے ایک ایک چارپائی، ایک ایک کرسی اور ایک ایک میز ہو۔ ہر تین مہمانوں کے لیے ایک ایک کہار مقرر کرنے کی تجویز ہو رہی ہے۔ ابھی بارات کے آنے میں ایک ماہ کا وقفہ ہے۔ مگر تیاریاں ابھی سے ہو رہی ہیں۔ براتیوں کی ایسی خاطر کی جائے کہ کسی کو زبان ہلانے کی ضرورت نہ ہو لوگ بھی یاد کریں کہ کسی کے یہاں بارات میں گئے تھے۔ ایک پورا مکان برتنوں سے بھرا ہوا ہے۔ چائے کے سیٹ ہیں۔ ناشتہ کی طشتریاں، تھال، لوٹے اور گلاس۔ جو لوگ روزانہ چارپائیوں پر پڑے حقّہ پیتے رہتے تھے۔ وہ بڑی مستعدی سے کام کر رہے ہیں اپنی کارپردازی ثابت کرنے کا ایسا عمدہ موقعہ انھیں پھر بہت روز بعد ملے گا۔ جہاں ایک آدمی کو جانا ہوتا ہے۔ پانچ دوڑتے ہیں۔ کام کم ہوتا ہے شور و غل زیادہ۔ ذرا ذرا سی بات پر گھنٹوں حجت ہوتی ہے اور بالآخر وکیل صاحب کو آکر تصفیہ کرنا پڑتا ہے، ایک کہتا ہے یہ گھی خراب ہے۔ دوسرا کہتا ہے اس سے اچھا بازار میں مل جائے تو ٹانگ کی راہ نکل جاؤں۔ تیسرا کہتا ہے اس میں تو بدبو آتی ہے۔ چوتھا کہتا ہے کہ تمھاری ناک ہی سڑ گئی ہے۔ تم کیا جانو کہ گھی کسے کہتے ہیں۔ جب سے یہاں آئے ہو گھی ملنے لگا ہے۔ ورنہ گھی کے درشن بھی نہ ہوتے تھے۔ اس پر تکرار بڑھ جاتی ہے اور وکیل صاحب کو نپٹارا کرنا پڑتا ہے۔

رات کے نو بجے تھے اُودے بھان لال اندر بیٹھے ہوئے مصارف کا تخمینہ لگا رہے تھے وہ عموماً ہر روز تخمینہ لگاتے تھے مگر روز ہی اس میں کچھ نہ کچھ ترمیم یا اضافہ کرنا پڑتا تھا۔ سامنے کلیانی چیں بجبیں کھڑی تھی۔ بابو صاحب نے بڑی دیر کے بعد سر اُٹھایا اور بولے دس ہزار سے کم نہیں ہوتا شاید اور بڑھ جائے۔

کلیانی۔ دس دن میں پانچ ہزار سے دس ہزار ہوئے۔ ایک مہینے میں تو شاید ایک لاکھ کی نوبت آجائے۔

اُودے بھان۔ کیا کروں۔ جگ ہنسائی بھی تو اچھی نہیں لگتی۔ کوئی شکایت ہوئی تو لوگ کہیں گے کہ نام بڑے اور درشن تھوڑے۔ پھر جب وہ مجھ سے جہیز کے نام ایک پائی نہیں لیتے تو میرا بھی یہ فرض ہے کہ مہمانوں کی خاطر مدارات میں کوئی بات اُٹھا نہ رکھوں۔

کلیانی۔ جب سے برھما جی نے دنیا کو بنایا۔ تب سے آج تک کوئی براتیوں کو خوش نہیں کرسکا۔ انھیں عیب نکالنے اور بُرائی کرنے کا کوئی نہ کوئی موقعہ مل ہی جاتا ہے۔ جسے اپنے گھر سوکھی روٹیاں بھی نصیب نہیں وہ بھی بارات میں جاکر تاناشاہ بن جاتا ہے۔ تیل خوشبودار نہیں، صابن ٹکے سیر کا جانے کہاں سے بٹور لائے۔ کہار بات نہیں سنتے۔ لالٹینیں دھواں دیتی ہیں، کرسیوں میں کھٹمل ہیں۔ چارپائیاں ڈھیلی ہیں۔ جنواسہ کی جگہ ہوادار نہیں۔ ایسی ایسی ہزاروں شکایتیں ہوتی رہتی ہیں۔ انھیں آپ کہاں تک روکیے گا۔ اگر یہ موقعہ نہ ملا تو اور کئی عیب نکال لیے جائیں گے۔ بھئی، یہ تیل تو رنڈیوں کے لگانے کے لائق ہے ہمیں تو سادہ تیل چاہیے۔ جناب یہ صابن نہیں بھیجا ہے اپنی امارت کی شان دکھائی ہے۔ گویا ہم نے صابن دیکھا ہی نہیں۔ یہ کہار نہیں، جم دوت (ملک الموت) ہیں جب دیکھیے سر پر سوار۔ لالٹینیں ایسی بھیجی ہیں کہ آنکھیں جھپکنے لگتی ہیں۔ اگر دس پانچ روز اس روشنی میں بیٹھنا پڑے تو آنکھیں پھوٹ جائیں جنواسہ کیا ہے ابھاگے کا بھاگ ہے۔ جس میں چاروں طرف سے جھونکے آتے رہتے ہیں۔ میں تو پھر یہی کہوں گی کہ براتیوں کے نخرے کا خیال ہی چھوڑ دو۔

اُودے بھان۔ تو آخر تم مجھے کیا کرنے کو کہتی ہو؟

کلیانی۔ کہہ تو رہی ہوں کہ پختہ ارادہ کرلو کہ پانچ ہزار سے زیادہ نہ خرچ کریں گے۔ گھر میں تو ٹکا ہے نہیں۔ قرض ہی کا بھروسہ ٹھہرا تو پھر اتنا قرض کیوں لو کہ زندگی میں ادا نہ ہو۔ آخر میرے اور بچے بھی ہیں ان کے لیے بھی تو کچھ چاہیے۔

اُودے بھان۔ تو کیا آج میں مرا جاتا ہوں؟

کلیانی۔ جینے مرنے کا حال کوئی نہیں جانتا۔

اُودے بھان۔ تو تم بیٹھی یہی منایا کرتی ہو؟

کلیانی۔ اس میں بگڑنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ مرنا ایک دن سبھی کو ہے۔ کوئی یہاں امر ہوکر تھوڑا ہی آیا ہے۔ آنکھیں بند کرلینے سے تو ہونے والی بات نہ ٹلے گی۔ روز آنکھوں سے دیکھتی ہوں کہ باپ مرجاتا ہے اور اس کے بچّے گلی گلی ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں۔ آدمی ایسا کام ہی کیوں کرے؟

اُودے بھان نے جھلا کر کہا۔ ''تو اب سمجھ لوں کہ میرے مرنے کے دن قریب آگئے۔ یہ تمھاری پیشین گوئی ہے۔ سہاگ سے عورتوں کو اکتاتے نہیں سُنا تھا۔ آج یہ نئی بات معلوم ہوئی۔ رنڈاپے (بیوگی) میں بھی کوئی سُکھ ہوگا ضرور!

کلیانی۔ تم سے دنیا کی بھی کوئی بات کہی جاتی ہے تو زہر اُگلنے لگتے ہو۔ اسی لیے نہ کہ جانتے ہو اِس کا کہیں ٹھکانہ نہیں ہے۔ میری ہی روٹیوں پر پڑی ہوئی ہے۔ یا اور کچھ؟ جہاں کوئی بات کہی کہ بس سر ہوگئے۔ گویا میں گھر کی لونڈی ہوں۔ میرا صرف روٹی کپڑے کا ناطہ ہے۔ جتنا ہی میں دبتی ہوں تم اور بھی دباتے ہو۔ مفت خورے مال اُڑائیں کوئی مُنہ نہ کھولے۔ شراب کباب میں روپے اڑیں۔ کوئی زبان نہ ہلائے یہ سارے کانٹے میرے بچوں ہی کے لیے تو بوئے جارہے ہیں۔

اُودے بھان۔ تو میں کیا تمھارا غلام ہوں؟

کلیانی۔ تو کیا میں تمھاری لونڈی ہوں؟

اُودے بھان۔ ایسے مرد اور ہوں گے جو عورتوں کے اشاروں پر ناچتے ہیں۔

کلیانی۔ تو ایسی عورتیں بھی اور ہوں گی جو مردوں کی جوتیاں سہا کرتی ہیں۔

اُودے بھان۔ میں کما کر لاتا ہوں جیسے چاہوں ویسے خرچ کرسکتا ہوں کسی کو بولنے کا اختیار نہیں ہے۔

کلیانی۔ تو آپ اپنا گھر سنبھالیے۔ ایسے گھر کو میرا دور ہی سے سلام ہے۔ جہاں میری کوئی پوچھ نہیں۔ گھر پر جتنا تمھارا اختیار ہے اتنا ہی میرا بھی ہے۔ اس سے جَو بھر بھی کم نہیں۔ اگر تم اپنے من کے راجا ہو تو میں بھی اپنے من کی رانی ہوں۔ تمھارا گھر تمھیں مبارک رہے۔ میرے لیے پیٹ کی روٹیوں کی کمی نہیں ہے۔ تمھارے بچّے

ہیں مارو یا جلاؤ نہ آنکھوں سے دیکھوں گی نہ درد ہوگا۔ آنکھ پھوٹی پیر (درد) گئی۔
اودے بھان۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ تم نہ سنبھالوگی تو میرا گھر ہی نہ سنبھلے گا؟ میں تنہا ایسے ایسے دس گھر سنبھال سکتا ہوں۔
کلیانی۔ کون! اگر آج کے تیسویں دن مٹی میں نہ مل جائے تو کہنا کوئی کہتی تھی۔
یہ کہتے کہتے کلیانی کا چہرہ تمتما اُٹھا۔ وہ جھمک کر اُٹھی۔ اور کمرہ سے دروازہ کی طرف چلی۔ وکیل صاحب مقدمات میں تو خوب "ہندی چندی" نکالتے تھے مگر عورتوں کے مزاج سے انھیں کچھ تھوڑی ہی سی واقفیت تھی۔ یہی ایک ایسا علم ہے جس سے آدمی مُسِن ہونے پر بھی نابلد رہ جاتا ہے۔ اگر اب بھی وہ نرم پڑجاتے اور کلیانی کا ہاتھ پکڑ کر بٹھا لیتے تو شاید وہ رُک جاتی۔ لیکن آپ سے یہ تو نہ ہوسکا۔ اُلٹا چلتے چلاتے ایک اور چرکا دیا۔ بولے۔ 'میکے کا گھمنڈ ہوگا۔"
کلیانی نے دروازے پر ٹھہر کر شوہر کی طرف سُرخ سُرخ آنکھوں سے دیکھا۔ اور بپھر کر بولی۔"میکے والے میری تقدیر کے ساتھی نہیں ہیں۔ اور نہ میں اتنی کمینی ہوں، کہ ان کی روٹیوں پر جا پڑوں۔"
اُودے بھان۔ تب کہاں جا رہی ہو؟
کلیانی۔ تم یہ پوچھنے والے کون ہوتے ہو۔ ایشور کی دنیا میں بے شمار بدکاروں کے لیے جگہ ہے تو پھر کیا میرے ہی لیے جگہ نہیں ہے؟
یہ کہہ کر کلیانی کمرہ کے باہر نکل گئی۔ صحن میں جاکر اس نے ایک بار آسمان کی طرف دیکھا۔ گویا ستاروں کو گواہ کر رہی ہے کہ میں اس گھر سے کتنی بے دردی سے نکالی جارہی ہوں۔ رات کے گیارہ بج گئے تھے۔ گھر میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ دونوں لڑکوں کی چارپائی اسی کے کمرہ میں رہتی تھی۔ وہ اپنے کمرہ میں آئی۔ دیکھا چندر بھان سوایا ہوا ہے۔ سب سے چھوٹا سورج بھان چارپائی سے اُٹھ بیٹھا ہے۔ ماں کو دیکھتے ہی بولا۔"تم تہاں (کہاں) دئی (گئی) تھیں اماں؟"
کلیانی دور ہی کھڑی ہوئی بولی۔"کہیں تو نہیں بیٹا، تمھارے باپو کے پاس گئی تھی۔"
سورج۔ تم تلی دئیں۔ مجھے اکیلے ڈر لدتا۔ تم تیوں تلی دئی تیں۔ بتا۔"
یہ کہہ کر بچّہ نے گود میں جانے کے لیے دونوں ہاتھ پھیلا دیے۔ کلیانی اب ضبط نہ

کر سکی۔ مہر مادری کی امرت دھارا سے اس کا جلتا ہوا دل سرد ہوگیا۔ دل کا نازک پودا جو غصہ کی آنچ سے مرجھا گیا تھا، پھر شاداب ہوگیا۔ آنکھیں نم ہوگئیں۔ اس نے بچہ کو گود میں اُٹھا لیا اور سینہ سے لگا کر بولی۔

"تم نے مجھے پکار کیوں نہ لیا بیٹا!"

سورج۔ پکاتا تو تا۔ تم چھنتی ہی نہ تیں۔ بتاؤ ابتو تبی نہ داؤ ی؟

کلیانی۔ نہیں بھیا۔ اب کبھی نہ جاؤں گی۔

یہ کہہ کر کلیانی سورج بھان کو لے کر چارپائی پر لیٹی۔ ماں کے سینہ سے لپٹتے ہی بچہ بے کھٹکے ہوکر سوگیا۔ کلیانی کے دل میں وسوسے ہونے لگے۔ شوہر کی باتیں یاد آتیں تو جی میں آتا کہ گھر کو یک دم چھوڑکر چلی جاؤں۔ مگر بچوں کا منہ دیکھتی تو پیار سے دل پر رقت طاری ہوجاتی۔ بچوں کو کس پر چھوڑکر جاؤں؟ میرے اِن لالوں کو کون پالے گا؟ یہ کس کے ہوکر رہیں گے؟ کون بڑے سویرے انھیں دودھ اور حلوا کھلائے گا؟ کون ان کی نیند سوئے گا۔ ان کی نیند جاگے گا؟ بے چارے کوڑی کے تین ہوجائیں گے۔ نہیں پیارے بچو! میں تمھیں چھوڑ کر نہ جاؤں گی۔ تمھارے لیے سب کچھ سہہ لوں گی۔ بے عزتی، ذلت، جلی کٹی، کھوٹی کھری، دھمکی جھڑکی یہ سب تمھارے لیے سہوں گی۔

کلیانی تو بچہ کو لے کر لیٹی۔ مگر بابو صاحب کو نیند نہ آئی۔ انھیں چوٹ کرنے والی باتیں بڑی مشکل سے بھولتی تھیں۔ اُف! یہ مزاج! گویا میں ہی ان کی بیوی ہوں، بات مُنہ سے نکالنی مشکل ہے۔ اب میں ان کا غلام ہوکر رہوں۔ گھر میں تنہا یہ رہیں۔ اور باقی جتنے یگانے بیگانے ہیں وہ سب نکال دیے جائیں۔ جلا کرتی ہیں۔ مناتی ہیں، کہ یہ کسی طرح مَرے تو میں اکیلی آرام سے رہوں۔ دل کی بات مُنہ سے نکل ہی آتی ہے۔ خواہ کوئی کتنا ہی چُھپائے۔ کئی روز سے دیکھ رہا ہوں۔ ایسی جلی کٹی سُنایا کرتی ہیں کہ...... بس میکے کا گھمنڈ ہوگا۔ لیکن وہاں کوئی بات بھی نہ پوچھے گا۔ ابھی سب آؤبھگت کرتے ہیں جب جاکر سر پڑجائیں گی تو آٹا دال کا بھاؤ معلوم ہوجائے گا۔ روتی ہوئی آئیں گی۔ واہ رے گھمنڈ۔ سوچتی ہیں کہ میں ہی یہ گرہستی چلاتی ہوں۔ ابھی چار دن کو کہیں چلا جاؤں تو معلوم ہو۔ تب دیکھوں کیا کرتی ہیں۔ بس چار ہی دن میں تو معلوم ہوجائے گا۔ ساری شیخی کرکری ہوجائے گی۔ ایک بار تو ان کا گھمنڈ توڑ ہی دوں۔ ذرا بیوگی کا بھی مزہ چکھا دوں۔ نہ جانے ان کی

ہمت کیسے پڑتی ہے کہ مجھے اس طرح کوسنے لگتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ محبت انھیں چھو نہیں گئی۔ یا سمجھتی ہیں کہ یہ گھر سے اتنا لپٹا ہوا ہے کہ اسے چاہے جتنا کوسوں، ٹلنے کا نام نہ لے گا۔ یہی بات ہے مگر یہاں دنیا سے لپٹنے والے نہیں ہیں۔ جہنم میں جائے وہ گھر جہاں ایسے آدمیوں سے پالا پڑے۔ گھر ہے یا نرک، آدمی باہر سے تھکا ماندہ آتا ہے تو گھر میں اسے آرام ملتا ہے۔ یہاں آرام کے عوض کوسنا سننا پڑتا ہے۔ میری موت کے لیے برت کیے جاتے ہیں۔ یہ ہے پچیس سال کی ازدواجی زندگی کا نتیجہ! بس چل ہی دوں۔ جب دیکھ لوں گا کہ ان کا سارا گھمنڈ مٹی میں مل گیا۔ اور مزاج ٹھنڈا ہوگیا تو لوٹ آؤں گا چار پانچ روز کافی ہوں گے لو تم بھی کیا یاد کروگی کہ کسی سے کام پڑا تھا۔

یہی سوچتے ہوئے بابوصاحب اُٹھے۔ ریشمی چادر گلے میں ڈالی۔ کچھ روپے لیے۔ اپنا کارڈ نکال کر دوسرے کرتے کی جیب میں رکھا۔ چھڑی اُٹھائی اور چپکے سے باہر نکلے۔ سب نوکر نیند میں مست تھے۔ کتا آہٹ پاکر چونک پڑا اور ان کے ساتھ ہو لیا۔

مگر یہ کون جانتا تھا کہ یہ ساری باتیں کارکنانِ قضا و قدر کے ہاتھوں ہو رہی ہیں۔ زندگی کے سٹیج کے بے درد منتظمین کسی نامعلوم مخفی مقام پر بیٹھے ہوئے اپنی ناقابلِ فہم بے دردی کا تماشہ دکھا رہے ہیں۔ یہ کون جانتا تھا کہ نقل اصل ہونے جارہی ہے۔ تماشہ سچائی کی صورت اختیار کرنے والا ہے؟

شبِ دیجور نے چاند کو شکست دے کر اپنا عملدرآمد قائم کر رکھا تھا۔ اس کی شیطانی فوج قدرت پر اپنا رُعب جمائے ہوئے تھی۔ روحانی جذبات مُنہ چُھپائے پڑے تھے۔ اور نفسانی جذبات غرور و نخوت سے اکڑتے پھرتے تھے۔ جنگلوں میں درندے شکار کی تلاش میں گھوم رہے تھے۔ اور شہروں میں بدمعاش لوگ کوچہ بکوچہ منڈلاتے پھرتے تھے۔

بابو اُودے بھان لال تیزی سے گنگا کی طرف چلے جا رہے تھے۔ انھوں نے اپنا کرتہ گھاٹ پر رکھ کر پانچ روز کے لیے مرزا پور چلے جانے کا ارادہ کرلیا تھا۔ ان کے کپڑے دیکھ کر لوگوں کو ان کے ڈوب جانے کا یقین ہوجائے گا۔ کارڈ کرتے کی جیب میں تھا۔ پتہ لگنے میں کوئی دقت نہ ہوسکتی تھی۔ آنِ واحد میں سارے شہر میں خبر مشہور ہوجائے گی۔ آٹھ بجتے بجتے تو سارا شہر میرے دروازہ پر جمع ہوجائے گا۔ تب دیکھوں کہ دیوی جی کیا کرتی ہیں؟

یہی سوچتے ہوئے بابو صاحب گلیوں میں چلے جارہے تھے۔ دفعتاً انھیں اپنے پیچھے کسی دوسرے آدمی کے آنے کی آہٹ ملی سمجھے کوئی ہوگا۔ آگے بڑھے لیکن جس گلی سے وہ مڑتے اسی طرف وہ آدمی بھی مڑتا تھا۔ اس وقت بابو صاحب کو اندیشہ ہوا کہ یہ آدمی میرا ہی پیچھا کر رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوا کہ اس کی نیت صاف نہیں ہے۔ انھوں نے فوراً جیبی لالٹین نکالی اور اس کی روشنی میں اس آدمی کو دیکھا۔ ایک طاقتور شخص کندھے پر لٹھ رکھے چلا آتا تھا۔ بابو صاحب اسے دیکھتے ہی چونک پڑے یہ شہر کا مشہور بدمعاش تھا۔ تین سال قبل اس پر ڈاکہ کا مقدمہ چلا تھا۔ اودے بھان نے اس مقدمہ میں سرکار کی طرف سے پیروی کی تھی اور اس بدمعاش کو تین برس کی سزا دلائی تھی۔ جبھی سے وہ ان کے خون کا پیاسا ہو رہا تھا۔ کل ہی وہ چھوٹ کر آیا تھا آج اتفاقاً بابو صاحب تنہا رات کو دِکھائی دیے تو اس نے سوچا کہ ان سے بدلہ لینے کا یہ اچھا موقعہ ہے۔ ایسا موقعہ شاید ہی پھر کبھی ملے۔ فوراً ہی پیچھے ہولیا۔ اور حملہ کرنے کی گھات ہی میں تھا کہ بابو صاحب نے لالٹین جلائی۔ بدمعاش ٹھٹک کر بولا۔ "کیوں بابو جی، پہچانتے ہو نہ؟ میں ہوں متئی۔"

بابو صاحب نے ڈانٹ کر کہا۔ "تم میرے پیچھے پیچھے کیوں آرہے ہو؟"

متئی۔ کیوں، کیوں۔ کسی کو راہ چلنے کی مناہی (ممانعت) ہے؟ یہ گلی تمھارے باپ کی ہے؟

بابو صاحب جوانی میں کشتی لڑتے تھے۔ اب بھی ہٹے کٹے آدمی تھی۔ دل کے بھی کچے نہ تھے۔ چھڑی سنبھال کر بولے۔ "ابھی شاید جی نہیں بھرا۔ اب سات سال کو جاؤگے۔"

متئی۔ میں سات سال کو جاؤں یا چودہ سال کو۔ مگر تمھیں جیتا نہ چھوڑوں گا ہاں اگر تم میرے پیروں پر گر کر قسم کھاؤ کہ اب کسی کو سزا نہ کراؤں گا تو چھوڑ دوں بولو منظور ہے؟

اُودے بھان۔ تیری شامت تو نہیں آئی ہے؟

متئی۔ شامت میری نہیں آئی۔ تمھاری آئی ہے۔ بولو کھاتے ہو قسم۔ ایک۔

اُودے بھان۔ تم ہٹتے ہو کہ میں پولیس کو بلاؤں؟

متئی۔ دو!

اُودے بھان۔ (گرج کر) ہٹ بدمعاش سامنے سے!

متئی۔ تین!

مُنہ سے تین کی آواز نکلتے ہی بابو صاحب کے سر پر لٹھ کا ایسا تُلا ہوا ہاتھ پڑا کہ وہ بے ہوش ہوکر زمین پر گر پڑے۔ مُنہ سے صرف اتنا ہی نکلا۔ "ہائے مار ڈالا۔" متئی نے پاس جاکر دیکھا تو سر پھٹ گیا تھا۔ اور خون کی دھار بہہ رہی تھی۔ نبض کا کہیں پتا نہ تھا۔ سمجھ گیا کہ کام تمام ہوگیا۔ اس نے کلائی سے سونے کی گھڑی کھول لی۔ کرتے سے سونے کے بٹن نکال لیے۔ انگلی سے انگوٹھی اتاری اور اپنی راہ چلا گیا گویا کچھ ہوا ہی نہیں البتہ اتنا رحم کیا کہ لاش کو راستہ سے کھینچ کر ایک طرف ڈال دیا۔ ہائے بے چارے گھر سے کیا سوچ کر چلے تھے اور کیا ہوگیا۔ زندگی! تجھ سے زیادہ ناپائیدار بھی دنیا میں کوئی چیز ہے؟ کیا وہ اس چراغ کی طرح نہیں ہے جو ہوا کے ایک جھونکے سے بجھ جاتا ہے؟ پانی کے اس بلبلے کو دیکھتے ہو۔ مگر اسے ٹوٹنے پر بھی کچھ دیر لگتی ہے۔ زندگی میں اتنی بھی پائیداری نہیں۔ سانس کا بھروسہ ہی کیا؟ اور اسی بھروسہ پر ہم اپنی آرزوؤں کا کتنا عالی شان محل بناتے ہیں۔ یہ نہیں جانتے کہ اندر جانے والی سانس باہر آئے گی یا نہیں مگر سوچتے اتنی دور کی ہیں کہ گویا ہمیں فنا نہیں۔

(۳)

بیوہ کی فریاد اور یتیموں کی گریۂ وزاری سُناکر ہم ناظرین کا دل نہ دُکھائیں گے۔ جس پر پڑتی ہے وہ روتا ہے، چلاتا ہے، پچھاڑیں کھاتا ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں۔ ہاں اگر آپ چاہیں تو کلیانی کے اس سخت روحانی قلق کا اندازہ کرسکتے ہیں جو اس کو اس خیال سے ہو رہا تھا کہ میں ہی اپنے دل و جان کے مالک کی قاتلہ ہوں! وہ کلمے جو غصہ کے جوش میں اس کی بے لگام زبان سے نکلے تھے اب اس کے دل کو تیر بن کر چھلنی کیے دیتے تھے۔ اگر شوہر نے اس کی گود میں کراہ کراہ کر جان دی ہوتی تو اسے تسکین ہوتی کہ میں نے ان کے متعلق اپنا فرض ادا کردیا۔ غمزدہ دلوں کو اس سے زیادہ تسکین اور کسی بات سے نہیں ہوتی۔ اسے یہ خیال کر کے کتنا اطمینان ہوتا کہ میرے مالک مجھ سے خوش ہوکر گئے۔ آخر وقت تک ان کے دل میں میری محبت برقرار رہی۔ کلیانی کو یہ اطمینان نصیب نہ تھا۔ وہ سوچتی کہ ہائے میرے پچیس سال کی ریاضت ضائع ہوگئی۔ میں آخر وقت اپنے مالک کی محبت سے محروم رہی۔ اگر میں نے انھیں ایسے سخت الفاظ نہ کہے ہوتے تو وہ رات کو گھر سے باہر ہرگز نہ جاتے۔ نہ جانے ان کے دل میں کیا کیا خیال پیدا ہوئے ہوں۔ ان کے خیالات

کا اندازہ اور اپنے گناہ میں اضافہ کر کے و آٹھوں پہر کڑھتی رہتی تھی۔ جن بچّوں پر وہ جان دیتی تھی اب ان کی صورت سے چڑھتی تھی۔ انھیں کے سبب مجھے اپنے مالک سے جھگڑا مول لینا پڑا۔ یہی میرے دشمن ہیں۔ جہاں آٹھوں پہر کچہری سی لگی رہتی تھی۔ وہاں اب خاک اُڑتی تھی۔ وہ میلا ہی اب اُٹھ گیا تھا۔ جب کھلانے والا ہی نہ رہا تو کھانے والے وہاں کیسے پڑے رہتے۔ رفتہ رفتہ ایک ماہ کے اندر سبھی بھانجے بھتیجے رخصت ہوگئے۔ جن کو دعویٰ تھا کہ ہم پسینہ کی جگہ لہو بہانے والوں میں ہیں۔ وہ ایسا سرپٹ بھاگے کہ پیچھے پھر کر بھی نہ دیکھا۔ دنیا ہی دوسری ہوگئی۔ جن بچّوں کو دیکھ کر پیار کرنے کو جی چاہتا تھا۔ ان چہروں پر اب مکھیاں بھنبھناتی تھیں۔ نہ جانے وہ رونق کہاں چلی گئی تھی۔

رنج گھٹا تو نرملا کے بیاہ کا مسئلہ درپیش ہوا۔ کچھ لوگوں نے رائے دی کہ شادی امسال ملتوی کی جائے۔ لیکن کلیانی نے کہا۔ اتنی تیاریوں کے بعد شادی ملتوی کردینے سے سب کیا دھرا خاک میں مل جائے گا۔ اور دوسرے سال پھر یہی تیاریاں کرنی پڑیں گی۔ جن کی کوئی امید نہ تھی۔ بیاہ کردینا ہی بہتر ہے۔ براتیوں کی مہمانداری کا بندوبست ہوچکا ہے۔ توقف سے نقصان ہی نقصان ہے۔ پس بابو بھال چندر کو اس حادثہ کی خبر کے ساتھ ہی یہ پیغام بھی بھیج دیا گیا۔ کلیانی نے اپنے خط میں لکھا:

اس بے کس پر رحم کیجیے۔ اور ڈوبتی ہوئی ناؤ کو پار لگایئے۔ سوامی جی کے دل میں بڑے بڑے حوصلے تھے۔ مگر ایشور کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اب میری لاج آپ کے ہاتھ ہے۔ لڑکی آپ کی ہوچکی ہے۔ میں آپ لوگوں کی خاطرداری کرنے میں اپنی خوش قسمتی سمجھتی ہوں۔ لیکن اگر اس میں کچھ کمی ہو، یا کوئی غلطی سرزد ہو تو میری حالت کا خیال کرکے معاف کیجیے گا۔ مجھے یقین ہے کہ آپ خود مجھ بے کس کی بدنامی نہ ہونے دیں گے۔ ۔وغیرہ وغیرہ۔

کلیانی نے یہ خط ڈاک سے نہ بھیجا۔ بلکہ پروہت جی سے کہا۔ آپ کو تکلیف تو ہوگی مگر آپ خود جاکر یہ خط دیجیے گا اور میری جانب سے نہایت عاجزی کے ساتھ کہیے گا کہ جتنے کم لوگ آئیں اتنا ہی اچھا۔ یہاں کوئی انتظام کرنے والا نہیں ہے۔ پروہت موٹے رام یہ پیغام لے کر تیسرے روز لکھنؤ جا پہنچے۔

شام کا وقت تھا۔ بابو بھال چندر دیوان خانہ کے سامنے آرام کرسی پر لیٹے ہوئے حقہ

پی رہے تھے۔ بہت ہی موٹے اور بلند قامت شخص تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سیاہ دیو ہے۔ یا کوئی حبشی افریقہ سے پکڑ کر آیا ہے۔ سر سے پیر تک ایک ہی رنگ تھا۔ چہرہ اتنا سیاہ تھا کہ معلوم نہ ہوتا تھا ماتھے کی انتہا کہاں ہے اور سر کی ابتدا کہاں بس کوئلے کی ایک زندہ مورت تھی۔ آپ کو گرمی بہت ستاتی تھی۔ دو آدمی کھڑے پنکھا جھل رہے تھے۔ اس پر بھی پسینہ کا تار بندھا ہوا تھا۔ آپ محکمہ آبکاری کے کسی بڑے عہدہ پر تھے اور پانچ سو مشاہرہ ملتا تھا۔ ٹھیکہ داروں سے خوب رشوت بھی لیتے تھے۔ ٹھیکہ دار شراب کے نام پر پانی فروخت کریں۔ چوبیں گھنٹے دکان کھلی رکھیں۔ آپ کو صرف خوش رکھنا کافی تھا۔ سارا قانون آپ کی خوشی تھی۔ اتنی بھیانک شکل تھی کہ چاندنی رات میں انھیں دیکھ کر دفعتاً لوگ چونک پڑتے تھے۔ صرف بچے اور عورتیں نہیں، مرد تک ڈر جاتے تھے۔ چاندنی رات اس لیے کہی گئی کہ اندھیری رات میں تو انھیں کوئی دیکھ ہی نہ سکتا تھا۔ سیاہی تاریکی میں جذب ہوجاتی تھی۔ صرف آنکھوں کا رنگ سُرخ تھا جیسے پکّا مسلمان پانچ بار نماز پڑھتا ہے اسی طرح آپ پانچ بار شراب پیتے تھے۔ مفت کی شراب تو قاضی کو بھی حلال ہے پھر آپ تو شراب پر افسر ہی تھے۔ جتنی چاہیں پئیں، کوئی ہاتھ پکڑنے والا نہ تھا۔ جب پیاس لگتی شراب پی لیتے۔ جیسے کچھ رنگوں میں باہمی رفاقت ہے اسی طرح کچھ رنگوں میں باہمی مخالفت۔ سُرخی کے مل جانے سے سیاہی اور بھی خوفناک ہوجاتی ہے۔

بابوصاحب نے پنڈت جی کو دیکھتے ہی کرسی سے اُٹھ کر کہا۔"اخاہ۔ آپ ہیں۔ آیئے آیئے زہے نصیب! کوئی ہے؟ کہاں چلے گئے سب کے سب۔ جھگڑو۔ گوردین۔ چھکوڑی۔ بھوانی۔ رام غلام۔ کوئی ہے۔ کیا سب کے سب مر گئے؟ درجن بھر آدمی ہیں مگر وقت پر ایک کی بھی صورت نظر نہیں آتی۔ نہ جانے سب کہاں غائب ہوجاتے ہیں۔ چلو رام غلام آپ کے واسطے کرسی لاؤ۔

بابوصاحب نے یہ پانچوں نام کئی بار دُہرائے۔ لیکن یہ نہ ہوا کہ پنکھا جھلنے والے دونوں آدمیوں میں سے کسی کو کرسی لانے کے لیے بھیج دیتے۔ تین چار منٹ کے بعد ایک کانا آدمی کھانستا ہوا آکر بولا۔ سرکار، اے تنکاکی نوکری ہمار کیں نا ہوئی۔ کہاں تلک اُدھار باڑی لے لے کھائی۔ مانگت مانگت تھیتھر ہوئی گئیں۔

بھال چندر۔ مت بکو۔ جاکر کرسی لاؤ۔ جب کوئی کام کرنے کو کہا گیا تو رونے لگتا ہے۔ کہیے

پنڈت جی۔ وہاں سب خیریت تو ہے؟

موٹے رام۔ کیا خیریت، کہوں بابوجی۔ اب خیریت کہاں؟ سارا گھر مٹی میں مل گیا۔

اتنے میں کہار نے ایک ٹوٹا ہوا چیڑ کا صندوق لاکر رکھ دیا۔ اور بولا۔ "کرسی میج ہمار اُٹھائے ناہیں اُٹھت ہے۔"

پنڈت جی شرماتے ہوئے ڈرتے ہوئے اس پر بیٹھے کہ مبادا کہیں ٹوٹ جائے۔ اور کلیانی کا خط بابوصاحب کے ہاتھ میں رکھ دیا۔

بھال چندر۔ اب اور کیسے مٹی میں ملے گا۔ اس سے بڑی اور کون مصیبت پڑے گی؟ بابو اُودے بھان لال سے میری پُرانی دوستی تھی۔ آدمی نہیں ہیرا تھا۔ کیا دل تھا، کیا ہمت تھی۔ (آنکھیں پونچھ کر) میرا تو جیسے داہنا ہاتھ ہی کٹ گیا۔ یقین کیجیے کہ جب سے یہ خبر سُنی ہے آنکھوں میں اندھیرا سا چھا گیا ہے۔ کھانے بیٹھتا ہوں تو لقمہ مُنہ میں نہیں جاتا۔ ان کی صورت آنکھوں کے سامنے کھڑی رہتی ہے۔ مُنہ جوٹھا کر کے اُٹھ آتا ہوں۔ کسی کام میں دل نہیں لگتا۔ بھائی کے مرنے کا رنج بھی اس سے کم ہی ہوتا آدمی نہیں ہیرا تھا۔

موٹے رام۔ سرکار۔ اب نگر میں ویسا کوئی رئیس ہی نہیں رہا۔

بھال چندر۔ میں خوب جانتا ہوں پنڈت جی۔ آپ مجھ سے کیا کہتے ہیں۔ ایسا آدمی لاکھ دو لاکھ میں ایک ہوتا ہے۔ جتنا میں ان کو جانتا تھا دوسرا نہیں جان سکتا۔ دو ہی تین بار کی ملاقات میں ان کا معتقد ہوگیا۔ اور مرتے دم تک رہوں گا۔ آپ سدھن صاحب سے کہہ دیجیے گا کہ مجھے دلی رنج ہے۔

موٹے رام۔ آپ سے ایسی ہی امید تھی۔ آپ جیسے بھلے آدمیوں کا ملنا مشکل ہے۔ ورنہ آج کل کون بغیر جہیز کے لڑکے کا بیاہ کرتا ہے۔

بھال چندر۔ جہیز کی گفتگو لیسے راست باز لوگوں سے نہیں کی جاتی اُن سے تو رشتہ ہوجانا ہی لاکھ روپے کے برابر ہے۔ میں اسی کو اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں۔ آہ دل کتنا فیاض تھا۔ روپے کو تو انھوں نے کچھ سمجھا ہی نہیں۔ اس کی تنکے کے برابر بھی پرواہ نہیں کی۔ بُرا رواج ہے بے حد بُرا۔ میرا بس چلے تو جہیز لینے والوں اور دینے والوں ہی کو گولی ماردوں۔ ہاں صاحب صاف گولی مار دوں۔ پھر چاہے پھانسی ہی

کیوں نہ ہوجائے پوچھو، آپ لڑکے کی شادی کرتے ہیں کہ اُسے بیچتے ہیں۔ اگر آپ کو لڑکے کی شادی میں دل کھول کر خرچ کرنے کا ارمان ہے تو شوق سے خرچ کیجیے۔ لیکن جو کچھ کیجیے۔ وہ اپنے بل بوتہ پر۔ یہ کیا کہ لڑکی کے باپ کا گلا کاٹیے۔ کمینہ پن ہے بے حد کمینہ پن۔ میرا بس چلے تو ان پاجیوں کو گولی ماردوں!

موٹے رام۔ دھنیہ ہو سرکار! بھگوان نے آپ کو بڑی بدھی دی ہے۔ یہ دھرم کی برکت ہے۔ مالکن کی خواہش ہے کہ بیاہ کا مہورت وہی رہے۔ اور تو انھوں نے ساری باتیں خط میں لکھ ہی دی ہیں بس اب آپ ہی ہاتھ لگائیں تو ہمارا بیڑا پار ہوسکتا ہے۔ اس طرح تو بارات میں جتنے لوگ جائیں گے ان کی خاطر ہم کریں گے ہی، مگر حالت اب بہت بدل گئی ہے سرکار، کوئی کرنے دھرنے والا نہیں ہے۔ بس ایسی بات کیجیے کہ وکیل صاحب کے نام پر بٹہ نہ لگے۔

بھال چندر ایک منٹ تک آنکھیں بند کیے بیٹھے رہے۔ پھر ایک لمبی سانس کھینچ کر بولے۔''ایشور کو منظور ہی نہ تھا کہ وہ لکشمی میرے گھر آتی۔ ورنہ کیوں یہ مصیبت نازل ہوتی؟ سارے منصوبے خاک میں مل گئے۔ خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا کہ وہ مبارک وقت قریب آرہا ہے۔ مگر کیا معلوم تھا کہ ایشور کے دربار میں کچھ اور ہی سازش ہو رہی ہے۔ مرنے والے کی یاد ہی رُلانے کے لیے کافی ہے اُسے دیکھ کر تو زخم اور بھی ہرا ہوجائے گا۔ اس حالت میں نہ جانے کیا کر بیٹھوں۔ اس وصف سمجھیے یا عیب کہ جس سے ایک بار میری دوستی ہوگئی۔ پھر اس کی یاد دل سے نہیں بھولتی۔ ابھی تو خیر اتنا ہی ہے کہ ان کی صورت آنکھوں میں گھومتی رہتی ہے۔ مگر وہ لڑکی گھر میں آگئی تو اس وقت میرا زندہ رہنا مشکل ہوجائے گا۔ سچ مانیے روتے روتے میری آنکھیں پھوٹ جائیں گی۔ جانتا ہوں کہ رونا دھونا فضول ہے جو مرگیا وہ لوٹ کر نہیں آسکتا۔ صبر کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے۔ مگر دل سے مجبور ہوں۔ اس اناتھ لڑکی کو دیکھ کر میرا کلیجہ پھٹ جائے گا۔

موٹے رام۔ ایسا نہ کہیے سرکار! وکیل صاحب نہیں ہیں تو کیا۔ آپ تو ہیں اب آپ ہی اس کے باپ کی طرح ہیں۔ وہ اب وکیل صاحب کی لڑکی نہیں آپ کی لڑکی ہے۔ آپ کے دل کی بات کو تو کوئی نہیں جانتا۔ لوگ سمجھیں گے کہ وکیل صاحب کے مرجانے کی وجہ سے آپ اپنے وعدہ سے پھرگئے۔ اس میں آپ کی بدنامی ہے۔ دل

کو ڈھارس دیجیے۔ اور ہنسی خوشی سے لڑکی کو بیاہ لائیے۔ ہاتھی مرے بھی تو نو لاکھ کا۔ لاکھ مصیبت پڑی ہے مگر مالکن صاحبہ آپ لوگوں کا آدرستکار کرنے میں کوئی بات اُٹھا نہ رکھیں گی۔

بابو صاحب سمجھ گئے کہ پنڈت موٹے رام صرف پوتھی ہی کے پنڈت نہیں، بلکہ بات بیوہار میں بھی ہوشیار ہیں۔ بولے۔ "پنڈت جی۔ حلفیہ کہتا ہوں کہ مجھے اس لڑکی سے جتنی محبت ہے اتنی اپنی لڑکی سے بھی نہیں ہے۔ لیکن جب ایشور کو منظور ہی نہیں ہے تو میرا کیا بس ہے؟ یہ مَوت ایک طرح کی بدشگونی کی خبر ہے۔ جو ایشور کی جانب سے ہم کو ملی ہے۔ یہ کسی آنے والی مصیبت کی غیبی آواز ہے۔ ایشور صاف الفاظ میں کہہ رہا ہے کہ یہ شادی مبارک نہ ہوگی۔ ایسی حالت میں آپ ہی سوچیے کہ یہ رشتہ کہاں تک مناسب ہے۔ آپ تو وِدوان آدمی ہیں، سوچیے۔ جس کی شروعات ہی بدشگونی سے ہو اس کا اخیر بھلا مبارک ہوسکتا ہے؟ نہیں، جان بوجھ کر مکھی نہیں نگلی جاسکتی۔ سدھن صاحبہ سے سمجھا کر کہہ دیجیے گا کہ میں ان کا حکم ماننے کو تیار ہوں مگر اس کا نتیجہ اچھا نہ ہوگا۔ خودغرض بن کر اپنے دلی دوست کی اولاد کے ساتھ یہ بے انصافی نہیں کرسکتا۔

اس منطق نے پنڈت جی کو لاجواب کردیا۔ مدعی نے وہ تیر سر کیا تھا جس کی کوئی کاٹ ان کے پاس نہ تھی۔ دشمن نے انھیں کے ہتھیار سے ان پر وار کیا تھا اور وہ اس کا دفعیہ نہ کرسکتے تھے۔ وہ ابھی کوئی جواب سوچ ہی رہے تھے کہ بابو صاحب نے پھر نوکروں کو پکارنا شروع کیا۔ ارے تم سب پھر غائب ہوگئے۔ جھگڑو، چھکوڑی، بھوانی گردین، رام غلام۔ ایک بھی نہیں بولتا۔ سب کے سب مر گئے۔ پنڈت جی کے واسطے پانی وانی کی بھی کچھ فکر ہے۔ نہ جانے ان سبھوں کو کوئی کہاں تک سمجھائے۔ عقل چھو تک نہیں گئی۔ دیکھ رہے ہیں کہ ایک بھلا آدمی دور سے تھکا ماندہ چلا آرہا ہے۔ مگر کسی کو ذرا بھی پرواہ نہیں۔ لاؤ پانی وانی رکھو۔ پنڈت جی آپ کے لیے شربت تیار کراؤں، یا پھلا ہاری مٹھائی منگوا دوں۔

موٹے رام جی مٹھائیوں کے متعلق قیود کی پرواہ نہ کرتے تھے۔ ان کا اصول تھا، کہ گھی سے سبھی چیزیں پاک ہوجاتی ہیں۔ رس گلے اور بیسنی لڈو انھیں بہت پسند تھے۔ مگر شربت سے انھیں رغبت نہ تھی۔ پانی سے پیٹ بھرنا ان کے اصول کے خلاف تھا۔ تامّل سے بولے۔ "شربت پینے کی تو میری عادت نہیں مٹھائی کھالوں گا۔"

بھال چندر۔ پھلاہاری نا؟
موٹے رام۔ اس کا مجھے کوئی خیال نہیں۔
بھال چندر ہے تو یہی بات۔ ہے چھوت چھات سب ڈھکوسلا۔ میں خود اس کا قائل نہیں۔ ارے ابھی تک کوئی نہیں آیا۔ چھکوڑی۔ بھوانی۔ گردین۔ رام غلام۔ کوئی تو بولے۔
اب کے بھی وہی بوڑھا کہار کھانستا ہوا آکر کھڑا ہوگیا۔ اور بولا۔"سرکار! مور طلب دے دین جائے۔ ایسی نوکری موسے نہ ہوئی۔ کہاں تو (تک) دَوری؟ دوَرت دوَرت گوڑ پیڑے لگت ہیں۔
بھال چندر۔ کام کچھ کرو نہ کرو۔ مگر طلب پہلے چاہیے۔ دن بھر پڑے پڑے کھانسا کرو۔ طلب تو تمھاری چڑھ رہی ہے۔ جاکر بازار سے ایک آنہ کی کوئی تازہ مٹھائی لا۔ دوڑتا ہوا جا!
کہار کو یہ حکم دے کر بابو صاحب گھر میں گئے۔ اور بیوی سے بولے۔ وہاں سے ایک پنڈت جی آئے ہیں۔ یہ خط لائے ہیں۔ ذرا پڑھو تو۔
بیوی صاحبہ کا نام رنگیلی بائی تھا۔ گورے رنگ کی خوش دل عورت تھی۔ حسن و شباب اس سے رخصت ہورہے تھے۔ مگر کسی محبت کرنے والے دوست کی طرح مچل مچل کر تیں سال تک جس کے گلے کا ہار رہی۔ اس کو چھوڑتے نہ بنتا تھا۔
رنگیلی بائی بیٹھی پان لگا رہی تھیں۔ بولیں کہ کہہ دیا نہ کہ ہمیں وہاں بیاہ کرنا منظور نہیں۔
بھال چندر۔ ہاں کہہ تو دیا۔ مگر شرم کے مارے منہ سے لفظ نہ نکلتا تھا جھوٹ موٹ کا حیلہ کرنا پڑا۔
رنگیلی۔ صاف بات کہنے میں شرم کیا؟ ہماری مرضی ہے نہیں کرتے۔ کسی کا کچھ لیا تو نہیں ہے؟ جب دوسری جگہ دس ہزار نقد مل رہے ہیں تو وہاں کیوں نہ کروں؟ ان کی لڑکی کوئی سونے کی تھوڑا ہی ہے۔ وکیل صاحب جیتے ہوتے تو شرماتے شرماتے بھی پندرہ بیس ہزار دے نکلتے۔ اب وہاں کیا دھرا ہے؟
بھال چندر۔ ایک مرتبہ قول دے کر پھرجانا اچھی بات نہیں۔ کوئی منہ پر کچھ نہ کہے مگر بدنامی ہوئے بغیر نہیں رہتی۔ پھر بھی تمھاری ضد سے مجبور ہوں۔

رنگیلی بائی نے پان کھاکر خطوط کھولا اور پڑھنے لگی۔ ہندی کی مہارت بابو صاحب کو تو بالکل نہ تھی اور اگرچہ رنگیلی بھی شاید ہی کوئی کتاب پڑھتی ہو مگر خط وغیرہ پڑھ لیتی تھی۔ پہلی سطر پڑھ کر اس کی آنکھیں آبگوں ہوگئیں۔ اور خط کے خاتمہ پر تو اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ایک ایک لفظ میں رقت تھی۔ ایک ایک حرف سے بے کسی ٹپک رہی تھی۔ رنگیلی بائی کا کڑاپن پتھر کا نہیں لاکھ کا تھا۔ جو ایک ہی آنچ میں پگھل جاتی ہے۔ کلیانی کی رقت آمیز تحریر نے اس کے خودغرض دل کو پگھلا دیا۔ بھرائی ہوئی آواز سے بولی۔"ابھی برہمن بیٹھا ہے۔ نہ؟"

بھال چندر بیوی صاحب کے، آنسوؤں کو دیکھ دیکھ کر خشک ہوئے جاتے تھے۔ اپنے اوپر جھلا رہے تھے کہ ناحق میں نے یہ خط اس کو دکھایا۔ اس کی ضرورت ہی کیا تھی؟ ایسی غلطی ان سے کبھی نہ ہوئی تھی۔ مشتبہ لہجہ میں بولے۔ "شاید بیٹھا ہو۔ میں نے تو جانے کو کہہ دیا تھا۔"

رنگیلی نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ پنڈت موٹے رام جی بگلے کی طرح دھیان لگائے بازار کے راستہ کی طرف تاک رہے تھے۔ شوق سے مضطرب ہوکر کبھی یہ پہلو بدلتے کبھی وہ پہلو "ایک آنہ کی مٹھائی" نے امید کی کمر تو پہلے ہی توڑ دی تھی۔ اس میں بھی یہ تاخیر تو قیامت ہی تھی۔ انھیں بیٹھا دیکھ کر رنگیلی بول اُٹھی "ہَے ہَے ابھی ہے۔ جاکر کہہ دو کہ ہم بیاہ کریں گے، ضرور کریں گے۔ بے چاری بڑی مصیبت میں ہے۔"

بھال چندر۔ تم کبھی کبھی بچّوں کی سی باتیں کرنے لگتی ہو۔ ابھی اس سے کہہ آیا ہوں کہ مجھے بیاہ کرنا منظور نہیں۔ جس کے لیے مجھے ایک لمبی چوڑی تمہید باندھنی پڑی اب جاکر یہ بات کہوں گا۔ تو وہ اپنے دل میں کیا کہے گا ذرا سوچو تو۔ اور یہ شادی بیاہ کا معاملہ ہے۔ لڑکوں کا کھیل نہیں ہے کہ ابھی ایک بات طے کی اور ابھی پلٹ گئے۔ بھلے آدمی کی بات نہ ہوئی۔ دل لگی ہوئی۔

رنگیلی۔ اچھا۔ تم اپنے مُنہ سے نہ کہو اس برہمن کو میرے پاس بھیج دو۔ میں اس طرح سمجھا دوں گی کہ تمھاری بات بھی رہ جائے اور میری بھی۔ اس میں تمھیں تو کوئی اعتراض نہیں ہے؟

بھال چندر۔ تم اپنے سوا ساری دنیا کو نادان سمجھتی ہو۔ تم کہو یا میں کہوں۔ بات ایک ہی

ہے۔ جو بات طے ہوگئی وہ ہوگئی۔ اب میں اسے پھر نہیں اُٹھانا چاہتا۔ تم ہی تو بار بار کہتی تھیں کہ میں وہاں نہ کروں گی۔ تمھارے ہی سبب مجھے اپنی بات پلٹنی پڑی اب تم پھر رنگ بدلتی ہو۔ یہ تو میری چھاتی پر مونگ دلنا ہے۔ آخر تمھیں کچھ تو میری عزت بے عزتی کا خیال ہونا چاہیے۔

رنگیلی۔ تو مجھے کیا معلوم تھا کہ بیوہ کی حالت اتنی بُری ہوگئی ہے۔ تمھیں نے تو کہا تھا کہ اس نے اپنے شوہر کی ساری دولت چُھپا رکھی ہے۔ اور اپنی غریبی کا ڈھونگ رچ کر کام نکالنا چاہتی ہے۔ ایک چھٹی ہوئی عورت ہے۔ تم نے جو کہا اسے میں نے مان لیا بھلائی کر کے بُرائی کرنے میں تو شرم و غیرت ہے۔ بُرائی کر کے بھلائی کرنے میں کوئی شرم و غیرت نہیں۔ اگر تم ہاں کر کے آئے ہوتے اور میں نہیں کرنے کو کہتی، تو تمھارا ہچکچانا مناسب ہوتا۔ نہیں کرنے بعد ہاں کرنے میں تو اور اپنی بڑائی ہے۔

بھال چندر۔ تمھیں بڑائی معلوم ہوتی ہو، مگر مجھے تو کمینہ پن ہی معلوم ہوتا ہے۔ پھر تم نے یہ کیسے مان لیا کہ میں نے وکیل صاحب کی بیوہ کے بارے میں جو بات کہی تھی وہ جھوٹی تھی۔ کیا یہ خط پڑھ کر؟ تم جیسے خود سیدھی سادھی ہو ویسا ہی دوسروں کو بھی سمجھتی ہو۔

رنگیلی۔ اِس خط میں بناوٹ نہیں معلوم ہوتی۔ بناوٹ کی بات دل میں بیٹھتی نہیں اس میں بناوٹ کی بو ضرور رہتی ہے۔

بھال چندر۔ بناوٹ کی بات تو دل میں ایسی کھپتی ہے کہ سچ بات اس کے سامنے بالکل پھیکی معلوم ہوتی ہے۔ یہ قصہ کہانی لکھنے والے جن کی کتابیں پڑھ پڑھ کر تم گھنٹوں روتی ہو کیا سچ باتیں لکھی ہوتی ہیں؟ سراسر جھوٹ کا طومار باندھتے ہیں۔ یہ بھی ایک ہنر ہے۔

رنگیلی۔ کیوں جی، تم مجھ سے بھی اُڑتے ہو؟ دائی سے پیٹ چھپاتے ہو؟ میں تمھاری باتیں مان لیتی ہوں تو تم سمجھتے ہو کہ اس کو چکمہ دیا۔ مگر میں تمھاری ایک ایک رگ پہچانتی ہوں۔ تم اپنا عیب میرے سر منڈھ کر خود بے داغ بنا چاہتے ہو؟ بولو! کچھ جھوٹ کہتی ہوں؟ جب وکیل صاحب زندہ تھے تو تم نے سوچا تھا کہ قرار کی

ضرورت ہی کیا ہے وہ خود ہی جتنا مناسب سمجھیں گے دے دیں گے۔ بلکہ بلا قرار کے اور زیادہ ملنے کی امید ہوگی۔ اب جو وکیل صاحب کا سورگباش ہوگیا تو طرح طرح کے حیلے حوالے کرنے لگے۔ یہ شرافت نہیں کمینہ پن ہے۔ اس کا الزام بھی تمھارے ہی سر ہے۔ میں اب شادی بیاہ کے قریب نہ جاؤں گی۔ تمھاری جیسی مرضی ہو کرنا۔ ڈھونگی آدمیوں سے مجھے چڑھ ہے۔ جو بات کرو صفائی سے کرو۔ بُرا ہو یا بھلا۔ "ہاتھی کے دانت کھانے کے اور دکھانے کے اور" والی مثل پر چلنا تمھارے لیے بھلا نہیں معلوم ہوتا۔ بولو اب بھی وہاں شادی کرتے ہو یا نہیں؟

بھال چندر۔ جب میں بے ایمان، دغاباز اور جھوٹا ٹھہرا تو مجھ سے پوچھنا ہی کیا؟ مگر خوب پہچانتی ہو آدمیوں کو۔ کیا کہنا ہے، تمھاری اس سوجھ بوجھ کے بلہاری!

رنگیلی۔ ہو بڑے حیادار۔ اب بھی نہیں شرماتے۔ ایمان سے کہو، میں نے بات تاڑ لی کہ نہیں؟

بھال چندر۔ اجی جاؤ، وہ دوسری عورتیں ہوتی ہیں جو مردوں کو پہچانتی ہیں۔ اب تک میں بھی یہی سمجھتا تھا کہ عورتوں کی نگاہ بہت باریک ہوتی ہے مگر آج وہ خیال جاتا رہا۔ اور مہاتماؤں نے عورتوں کے بارے میں جو اہم باتیں کہی ہیں ان کو ماننا پڑا۔

رنگیلی۔ ذرا آئینہ میں صورت تو دیکھ آؤ۔ تمھیں میری قسم ہے۔ ذرا دیکھ لو، کتنا جھینپے ہوئے ہو۔

بھال چندر۔ سچ کہنا۔ کتنا جھینپا ہوا ہوں؟

رنگیلی۔ اتنا ہی۔ جتنا کوئی بھلامانس چور چوری کھل جانے پر جھینپتا ہے۔

بھال چندر۔ خیر میں جھینپا سہی۔ مگر شادی وہاں نہ ہوگی۔

رنگیلی۔ میری بلا سے! جہاں چاہے کرو۔ کیوں، بھون سے ایک بار کیوں نہیں پوچھ لیتے؟

بھال چندر۔ اچھی بات ہے اسی پر فیصلہ رہا۔

رنگیلی۔ ذرا بھی اشارہ نہ کرنا۔

بھال چندر۔ اجی میں اس کی طرف دیکھوں گا بھی نہیں۔

اتفاقاً ٹھیک اسی وقت بھون موہن بھی آپہنچا۔ ایسے شکیل، سڈول مضبوط نوجوان کالج میں کم نظر آتے ہیں۔ بالکل ماں کے مشابہ تھا۔ وہی گورا صاف رنگ۔ وہی نازک گلاب

کے پنکھڑی جیسے ہونٹ، وہی چوڑا ماتھا، وہی بڑی بڑی آنکھیں، البتہ قد باپ کا سا تھا اونچا کوٹ، بریچز، ٹائی بوٹ، ہیٹ اس کے بدن پر بہت بھلے لگتے تھے۔ ہاتھ میں ایک ہاکی سٹک تھی۔ رفتار میں شباب کا غرور تھا۔ آنکھوں میں خود[illegible] کی جھلک۔ رنگیلی نے کہا۔ آج تم نے بڑی دیر کی۔ یہ دیکھو، تمھاری سسرال سے ایک خط [illegible] ہے تمھاری ساس کا لکھا ہوا۔ صاف صاف بتلا دو۔ ابھی وقت ہے کہ تمھیں [illegible] بیاہ کرنا [illegible] یا نہیں۔

بھون۔ کرنا تو چاہیے اماں۔ مگر میں کروں گا نہیں

رنگیلی۔ کیوں؟

بھون۔ کہیں ایسی شادی کروایئے کہ خوب روپے ملیں۔ اور نہ [illegible] کم سے کم [illegible] لاکھ تو ملیں۔ وہاں اب کیا رکھا ہے؟ وکیل صاحب تو اب ر[illegible] ہیں، [illegible] پاس کیا ہوگا؟

رنگیلی۔ تمھیں ایسی باتیں منہ سے نکالتے شرم نہیں آتی؟

بھون۔ اس میں شرم کی کون سی بات ہے؟ روپے کیسے کاٹتے ہیں؟ [illegible] پے تو لاکھ جنم میں بھی میں جمع نہ کرپاؤں گا۔ اس سال پاس بھی ہوگیا تو کم [illegible] سال تک تو روپے کی صورت نہ دکھائی پڑے گی۔ پھر سو دو سو روپے ماہوار [illegible] ہوں گا۔ پانچ چھ سو تک پہنچتے پہنچتے عمر کا تین چوتھائی حصہ ختم ہوجائے گا۔ و[illegible] جمع کرنے کی نوبت ہی نہ آئے گی۔ دنیا کا کچھ لطف نہ حاصل کرسکوں گا۔ [illegible] لڑکی سے شادی ہوجاتی تو چین سے گزرتی۔ میں زیادہ نہیں چاہتا، بس ایک لاکھ نقد ہو یا کوئی ایسی جائیداد والی بیوہ ملے جس کی ایک ہی لڑکی ہو!

رنگیلی۔ چاہے عورت کیسی ہی ملے؟

بھون۔ روپیہ سارے عیبوں کو چھپا دے گا۔ مجھے دو گالیاں بھی سنائے تو چوں نہ کروں۔ دودھار گائے کی لات کسے بُری معلوم ہوتی ہے؟

بابو صاحب نے تعریف کے لہجہ میں کہا۔ ہمیں ان لوگوں سے ہمدردی [illegible] رنج ہے کہ ایشور نے انھیں مصیبت میں ڈالا۔ لیکن عقل سے کام لے کر ہی کو[illegible] طے کرنی چاہیے۔ ہم کتنے ہی پھٹے حالوں سے جائیں پھر بھی اچھی خاصی بارات ہوجا[illegible] کھانے تک کا ٹھکانا نہیں۔ سوائے اس کے کہ لوگ ہنسیں اور کوئی نتیجہ نہ ہوگا۔

رنگیلی۔ تم باپ بیٹے دونوں ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہو۔ دونوں اس غریب لڑکی کے گلے پر چھری چلانا چاہتے ہو۔

بھون۔ جو غریب ہے اسے غریبوں ہی کے یہاں رشتہ مندی کرنا چاہیے اپنی حیثیت سے بڑھ کر......

رنگیلی۔ چپ بھی رہ۔ آیا ہے وہاں سے حیثیت لے کر۔ تم کہاں کے ایسے دھنا سیٹھ ہو؟ کوئی آدمی دروازہ پر آجائے تو ایک لوٹا پانی کو ترس جائے۔ بڑی حیثیت والے بنے ہیں۔

یہ کہہ کر رنگیلی وہاں سے اُٹھ کر رسوئی ٹھیک کرنے چلی گئی۔ بھون موہن مسکراتا ہوا اپنے کمرہ میں چلا گیا۔ اور بابو صاحب اپنی مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے باہر آئے کہ موٹے رام کو آخری فیصلہ سُنا دیں۔ مگر ان کا کہیں پتہ نہ تھا۔

موٹے رام جی کچھ دیر تک تو کہار کا انتظار کرتے رہے۔ جب اس کے آنے میں بہت دیر ہوئی تو ان سے بیٹھا نہ گیا۔ سوچا یہاں بیٹھے بیٹھے کام نہ چلے گا۔ کچھ تدبیر کرنی چاہیے۔ تقدیر کے بھروسے یہاں اڑے بیٹھے رہے تو بھوکوں مرجائیں گے یہاں تمھاری دال نہیں گلنے کی! چپکے سے چھڑی اُٹھائی اور جدھر وہ کہار گیا تھا اسی طرف چلے۔ بازار ذرا ہی دور تھا۔ ایک لمحہ میں جا پہنچے۔ دیکھا تو بڈھا کہا ایک حلوائی کی دکان پر بیٹھا چلم پی رہا ہے۔ اسے دیکھتے ہی آپ نے بڑی بے تکلفی سے کہا۔ "ابھی کچھ تیار نہیں ہے کیا مہرا؟ سرکار وہاں بیٹھے بگڑ رہے ہیں کہ جاکر سوگیا یا کہیں تاڑی پینے لگا۔ میں نے کہا کہ سرکار یہ بات نہیں، بڈھا آدمی ہے آتے ہی آتے تو آئے گا۔ عجیب آدمی ہیں، نہ جانے ان کے یہاں کیسے نوکر کا نباہ ہوتا ہے۔

کہار۔ مجھے چھوڑ کر آج تک تو دوسرا ٹکا نہیں اور نہ ٹکے گا۔ سال بھر سے طلب نہیں ملی۔ کسی کی طلب نہیں دیتے۔ جہاں کسی نے طلب مانگی اور لگے ڈانٹنے۔ بے چارہ نوکری چھوڑ کر بھاگ جاتا ہے۔ وہ دونوں آدمی جو پنکھا جھل رہے تھے۔ سرکاری نوکر ہیں۔ سرکار سے دو آدمی ملے ہیں۔ اسی لیے پڑے ہوئے ہیں۔ میں بھی سوچتا ہوں کہ جیسا تیرا تانا بانا ویسی میری بھرنی۔ دس سال کٹ گئے ہیں۔ سال دو سال اور اسی طرح کٹ جائیں گے۔

موٹے رام۔ تو تم اکیلے ہی ہو؟ نام تو کئی کہاروں کا لیتے ہیں۔

کہار۔ وہ سب ان دو تین مہینوں کے اندر آئے اور چھوڑ چھوڑ کر چلے گئے۔ یہ اپنا رعب جمانے کو ابھی تک ان کا نام جپا کرتے ہیں۔ کہیں نوکری دلایئے گا؟ چلوں؟

موٹے رام۔ اجی بہت نوکری ہیں۔ کہار تو آج کل ڈھونڈے نہیں ملتے۔ تم تو پرانے آدمی ہو۔ تمھارے لیے نوکری کی کون کمی ہے۔ ہے وہاں کوئی تازہ چیز؟ مجھ سے کہنے لگے کھچڑی بنایئے گا یا باٹی لگایئے گا۔ میں نے کہہ دیا۔ سرکار۔ وہ بڈھا آدمی ہے۔ رات کو اُسے میرا کھانا پکانے میں تکلیف ہوگی۔ میں کچھ بازار میں کھا لوں گا۔ اس کی آپ فکر نہ کریں۔ بولے اچھی بات ہے۔ کہار آپ کو دوکان پر ملے گا۔ بولو ساہ جی۔ کچھ تر مال ہے؟ لڈو تو تازہ معلوم ہوتے ہیں، تول دو ایک سیر بھر۔ آجاؤں وہیں پر نہ؟

یہ کہہ کر موٹے رام جی حلوائی کی دوکان پر جا بیٹھے اور لگے تر مال چکھنے خوب چھک کر کھایا۔ ڈھائی تین سیر چٹ کرگئے۔ کھاتے جاتے تھے اور حلوائی کی تعریف کرتے جاتے تھے۔ ساہ جی تمھاری دکان کا جیسا نام سُنا تھا ویسا ہی مال بھی پایا۔ بنارس والے ایسے رس گلے نہیں بناتے۔ قلاقند اچھی بناتے ہیں۔ پر تمھاری ان سے بُری نہیں۔ مال ڈالنے سے اچھی چیز نہیں بن جاتی۔ ہنر چاہیے۔

حلوائی۔ کچھ اور لیجیے مہاراج! تھوڑی سی ربڑی میری طرف سے لے لیجیے۔

موٹے رام۔ بھوک تو نہیں ہے۔ لیکن دے دو پاؤ بھر!

حلوائی۔ پاؤ بھر کا کیا کیجیے گا۔ چیز اچھی ہے۔ آدھ سیر تو لیجیے۔

خوب شکم سیر ہونے کے بعد پنڈت جی نے تھوڑی دیر بازار کی سیر کی۔ اور نو بجتے بجتے مکان پر پہنچے۔ یہاں سنّاٹا چھایا ہوا تھا۔ ایک لالٹین جل رہی تھی، آپ نے بستر جمایا اور سوگئے۔

صبح اپنی عادت کے مطابق کوئی آٹھ بجے اُٹھے۔ دیکھا کہ بابو صاحب ٹہل رہے ہیں۔ انھیں جگا ہوا دیکھ کر وہ پالاگن کرکے بولے۔ مہاراج، آپ رات کو کہاں چلے گئے۔ میں بڑی رات تک آپ کی راہ دیکھتا رہا۔ کھانے کا سب سامان بڑی دیر تک رکھا رہا۔ جب آپ نہ آئے تو رکھوا دیا گیا۔ آپ نے کچھ بھوجن کیا تھا یا نہیں؟

موٹے رام۔ حلوائی کی دکان سے کچھ کھا آیا تھا۔

بھال چندر۔ اجی پوری مٹھائی میں وہ مزہ کہاں جو بائی اور دال میں ہے۔ دس بارہ آنے خرچ ہوئے ہوں گے اور پھر بھی پیٹ نہ بھرا ہوگا۔ آپ میرے مہمان ہیں۔ جتنے پیسے لگے ہوں لے لیجیے گا۔

موٹے رام۔ آپ ہی کے حلوائی کی دکان پر کھا آیا تھا۔ وہ جو نکڑ پر بیٹھا ہے۔

بھال چندر۔ کتنے پیسے دینے پڑے؟

موٹے رام۔ آپ کے حساب میں لکھوا دیئے ہیں۔

بھال چندر۔ جتنی مٹھائی لی ہو مجھے بتا دیجیے۔ ورنہ بعد کو بے ایمانی کرنے لگے گا۔ ایک ہی ٹھگ ہے۔

موٹے رام۔ کوئی ڈھائی سیر مٹھائی تھی اور آدھ سیر ربڑی۔

بابوصاحب نے تعجب آمیز نگاہوں سے پنڈت جی کو دیکھا۔ گویا کوئی انوکھی بات سُنی ہو۔ تین سیر تو یہاں کبھی مہینہ بھر کا ٹوٹل بھی نہ ہوتا تھا۔ اور یہ حضرت ایک ہی بار کوئی چار روپے کا مال اُڑا گئے۔ اگر ایک آدھ روز اور رہ گئے تو دیوالہ ہی نکل جائے گا پیٹ ہے یا شیطان کی قبر۔ تین سیر۔ کچھ ٹھکانا ہے۔ پریشانی کی حالت میں دوڑے ہوئے اندر گئے۔ اور رنگیلی سے بولے۔ "کچھ سنتی ہو۔ یہ حضرت کل تین سیر مٹھائی اڑا گئے۔ تین سیر پکّی تول!"

رنگیلی بائی نے متحیر ہوکر کہا۔ "اجی نہیں۔ تین سیر بھلا کیا کھائے گا آدمی ہے یا بیل؟"

بھال چندر۔ تین سیر تو وہ اپنے مُنہ سے کہہ رہا ہے۔ چار سیر سے کم نہ کھایا ہوگا۔ پکّی تول!

رنگیلی۔ پیٹ میں سنیچر ہے کیا؟

بھال چندر۔ آج اور رہ گیا تو چھ سیر پر ہاتھ صاف کرے گا۔

رنگیلی۔ تو آج رہے کیوں؟ خط کا جواب جو دینا ہو دے کر رخصت کرو۔ اگر رہے تو صاف کہہ دینا کہ ہمارے یہاں مٹھائی مفت نہیں آتی۔ کھچڑی بنانا ہو تو بنائیں ورنہ اپنی راہ لیں۔ جنھیں ایسے پیٹوؤں کو کھلانے سے مکتی (نجات) ملتی ہو وہ کھلائیں ہمیں ایسی مکتی

نہیں چاہیے۔

مگر پنڈت جی رخصت ہونے کو تیار بیٹھے تھے۔ اس لیے بابو صاحب کو کسی چالاکی سے کام لینے کی ضرورت نہ پڑی۔ پوچھا۔ "کیا تیاری کردی مہاراج!"

موٹے رام۔ ہاں سرکار! اب چلوں گا۔ نو بجے کی گاڑی ملے گی نہ؟

بھال چندر۔ بھلا آج تو اور رہیے۔

یہ کہتے کہتے بابو صاحب کو خوف ہوا کہ کہیں یہ مہاراج سچ مچ نہ رہ جائیں۔ اس لیے اس جملہ کو یوں پورا کیا۔ "ہاں۔ وہاں لوگ آپ کا انتظار کر رہے ہوں گے۔"

موٹے رام۔ ایک دو دن کی تو کوئی بات نہ تھی۔ اور ارادہ بھی یہی تھا کہ گومتی میں اشنان کروں گا۔ مگر بُرا نہ مانیے. تو کہوں۔ آپ لوگوں میں برہمنوں کی کچھ بھی بھگتی نہیں ہے۔ ہمارے ججمان ہیں جو ہمارا منہ جوہتے رہتے ہیں کہ پنڈت جی کوئی آگیا (حکم) دیں تو اس کا پالن (تعمیل) کریں۔ ہم ان کے دروازہ پر پہنچ جاتے ہیں تو وہ اپنا دھنیہ بھاگ مانتے ہیں۔ اور سارا گھر مع چھوٹے بڑوں کے ہماری خاطر کرنے میں لگ جاتا ہے۔ جہاں اپنا آدر نہیں ایک چھن (لمحہ) بھی ہمیں ٹھہرنا ناگوار ہے جہاں برہمن کا آدر نہیں وہاں کلیان نہیں ہوسکتا۔

بھال چندر۔ مہاراج! ہم سے تو ایسا اَپرادھ (قصور) نہیں ہوا۔

موٹے رام۔ اَپرادھ نہیں ہوا! اور اَپرادھ کسے کہتے ہیں؟ ابھی آپ ہی نے گھر جاکر کہا کہ یہ حضرت تین سیر مٹھائی چٹ کر گئے۔ پکّی تول! آپ نے ابھی کھانے والے دیکھے کہاں؟ ایک بار کھلایئے تو آنکھیں کُھل جائیں۔ ایسے ایسے مہاں (بڑے) پُرش پڑے ہوئے ہیں جو پنسیری بھر مٹھائی کھا جائیں۔ اور ڈکار تک نہ لیں۔ ایک مٹھائی کھانے کے لیے ہماری خوشامد کی جاتی ہے۔ روپے دیے جاتے ہیں۔ ہم فقیر نہیں جو آپ کے دروازہ پر پڑے رہیں۔ آپ کا نام سُن کر آئے تھے۔ یہ نہ جانتے تھے کہ یہاں بھوجن کے بھی لالے پڑیں گے۔ جایئے۔ بھگوان آپ کا بھلا کریں۔

بابو صاحب اس قدر نادم ہوئے کہ منہ سے بات نہ نکلی۔ زندگی میں انھیں کبھی ایسی لعنت ملامت نہ کی گئی تھی۔ بہت باتیں بنائیں۔ "آپ کا ذکر نہ تھا۔ ایک دوسرے ہی شخص کی بات تھی۔" لیکن پنڈت جی کا غصہ فرو نہ ہوا۔ وہ سب کچھ برداشت کرسکتے تھے مگر اپنے

پیٹ کی مذمت نہیں۔ عورتوں کو صورت کی مذمت جتنی بری لگتی ہے اس سے کہیں زیادہ بُری مردوں کو اپنے پیٹ کی مذمت معلوم ہوتی ہے۔ بابو صاحب مناتے تو تھے مگر یہ کھٹکا بھی لگا ہوا تھا کہ یہ ٹھہر نہ جائیں۔ اُن کے بخل کا پردہ فاش ہوگیا تھا۔ اب اس میں کچھ شک نہ تھا۔ اس پردہ کو ڈھانکنا ضروری تھا۔ اپنے بخل کی پردہ داری کے لیے کوئی بات انھوں نے اُٹھا نہ رکھی تھی۔ مگر شدنی ہوکر رہی۔ پچھتا رہے تھے کہ کہاں سے گھر میں اس کی بات کہنے گیا اور کہا بھی تو بلند آواز میں۔ یہ کم بخت بھی کان لگائے سُنتا رہا۔ مگر اب پچھتانے سے کیا ہوسکتا تھا۔ نہ جانے آج کس منحوس کی شکل دیکھی تھی کہ یہ مصیبت پڑی۔ اگر اس وقت یہاں سے خفا ہوکر چلا گیا تو وہاں جاکر بدنام کرے گا۔ اور میرا سارا پردہ فاش ہوجائے گا۔ اب تو اس کا منہ بند کردینا ہی پڑے گا۔

یہ سوچتے ہوئے گھر میں جاکر رنگیلی بائی سے بولے۔ "اس دشٹ نے ہماری تمھاری باتیں سُن لیں۔ روٹھ کر چلا جارہا ہے۔

رنگیلی۔ جب تم جانتے تھے کہ دروازہ پر کھڑا ہے تو آہستہ کیوں نہ بولے؟

بھال چندر۔ مصیبت آتی ہے تو اکیلے نہیں آتی۔ میں یہ کیا جانتا تھا، کہ وہ دروازہ پر کان لگائے کھڑا ہے۔

رنگیلی۔ نہ جانے کس کا مُنہ دیکھا تھا؟

بھال چندر۔ وہی دشٹ سامنے لیٹے ہوا تھا۔ جانتا تو ادھر دیکھتا ہی نہ۔ اب تو کچھ دے دلا کر راضی کرنا پڑے گا۔

رنگیلی۔ اونہہ۔ جانے بھی دو۔ جب تمھیں وہاں شادی ہی نہیں کرنی تو کیا پرواہ ہے۔ جو چاہے سمجھے جو چاہے کہے۔

بھال چندر۔ یوں نہ جان بچے گی۔ لاؤ دس روپے رخصتانہ کے بہانے دے دوں۔ ایشور پھر اس منحوس کی صورت نہ دکھائے۔ رنگیلی نے بہت پچھتاتے ہوئے دس روپے نکال۔ اور بابو صاحب نے لے جاکر پنڈت کے قدموں پر رکھ دیئے۔ پنڈت جی نے دل میں کہا۔ "دھت تیرے مکھی چوس کی! ایسا رگڑا کہ یاد ہی کروگے۔ تم سمجھتے ہوگے کہ دس روپے دے کر اسے اُلّو بنا لوں گا۔ اس پھیر میں نہ رہنا۔ یہاں تمھاری نس نس پہچانتے ہیں۔" روپے جیب میں رکھ لیے۔ اور آشیرواد (دعا) دے کر اپنی راہ لی۔

کلیانی کے لیے اب ایک مشکل پیدا ہوگئی تھی۔ شوہر کی وفات کے بعد اسے اپنی بُری حالت کا یہ پہلا اور تلخ تجربہ ہوا۔ غریب بیوہ کے لیے اس سے بڑھ کر اور کون سی مصیبت ہوسکتی ہے کہ جوان لڑکی سر پر موجود ہو؟ لڑکے برہنہ پا پڑھنے جاسکتے ہیں۔ چوکا برتن بھی اپنے ہاتھ سے کیا جاسکتا ہے۔ جھونپڑے میں دن گزارے جاسکتے ہیں مگر جوان لڑکی گھر میں نہیں بٹھائی جاسکتی۔ کلیانی کو بھال چندر پر ایسا غصہ آتا تھا کہ میں خود جاکر اس کے منہ کالکھ لگاؤں۔ اس کے سر کے بال نوچ ڈالوں۔ کہوں۔ "تو اپنی بات سے پھر گیا، تو اپنے باپ کا بیٹا نہیں۔" پنڈت موٹے رام نے ان کی قلعی اچھی طرح کھول دی تھی۔

وہ غصہ میں بھری بیٹھی تھی کہ کرشنا کھیلتی ہوئی آئی۔ اور بولی۔ "کے دن میں بارات آئے گی اماں؟ پنڈت جی تو آگئے۔"

کلیانی۔ بارات کا سپنا دیکھ رہی ہے کیا؟

کرشنا۔ وہی چندر تو کہہ رہا ہے کہ دو تین دن میں بارات آئے گی کیا نہیں آئے گی؟

کلیانی۔ ایک بار تو کہہ دیا۔ سر کیوں کھاتی ہے؟

کرشنا۔ سب کے گھر تو بارات آرہی ہے ہمارے یہاں کیوں نہیں آتی؟

کلیانی۔ تیرے یہاں جو بارات لانے والا تھا اس کے گھر میں آگ لگ گئی۔

کرشنا۔ سچ اماں؟ تب تو سارا گھر جل گیا ہوگا۔ کہاں رہتے ہوں گے؟ بہن کہاں جاکر رہے گی؟

کلیانی۔ اری پگلی۔ تو تو بات ہی نہیں سمجھتی۔ آگ نہیں لگی۔ وہ ہمارے یہاں بیاہ نہ کرے گا۔

کرشنا۔ یہ کیوں اماں؟ پہلے تو وہاں ٹھیک ہوگیا تھا نہ؟

کلیانی۔ بہت سے روپے مانگتا ہے۔ میرے پاس اسے دینے کو روپے نہیں ہیں۔

کرشنا۔ کیا وہ بڑے لالچی ہیں اماں؟

کلیانی۔ لالچی نہیں تو اور کیا ہے؟ پورا قصائی، بے درد، دغاباز!

کرشنا۔ تب تو اماں بہت اچھا ہوا کہ اس کے گھر بہن کا بیاہ نہیں ہوا۔ بہن ان کے ساتھ

کیسے رہتی؟ یہ تو خوش ہونے کی بات ہے اماں، تم رنج کیوں کرتی ہو۔

کلیانی نے لڑکی کو محبت بھری نگاہوں سے دیکھا۔ اس کا کہنا کتنا سچ ہے۔ بھولے بھالے لفظوں میں سوال کا کتنا دل میں اثر کرنے والا جواب ہے۔ سچ مچ یہ تو خوش ہونے کی بات ہے کہ ایسے بُرے لوگوں سے ناطہ نہیں ہوا۔ اس میں رنج کی تو کوئی بات نہیں۔ ایسے بُرے آدمیوں میں بے چاری نرملا کی نہ جانے کیا دُردشا ہوتی؟ اپنے بھاگ کو روتی۔ ذرا سا گھی دال میں زیادہ پڑجاتا تو سارے گھر میں شور مچ جاتا۔ ذرا کھانا زیادہ پک جاتا تو ساس دنیا سر پر اُٹھا لیتی۔ لڑکا بھی ایسا ہی لالچی ہے، بڑی اچھی بات ہوئی ورنہ بے چاری کو تمام عمر رونا پڑتا۔ کلیانی یہاں سے اُٹھی تو اس کا دل ہلکا ہوگیا تھا۔

مگر شادی تو کرنی ہی تھی اور ممکن ہو تو اسی سال، ورنہ دوسرے سال تو پھر نئے سرے سے تیاریاں کرنی پڑیں گی۔ اب تو اچھے گھر کی ضرورت نہ تھی۔ اچھے بَر کی ضرورت نہ تھی۔ بدنصیب کو اچھا گھر اور بَر کہاں ملتا ہے اب تو کسی طرح سر کا بوجھ اُتارنا تھا۔ کسی طرح لڑکی کو پار لگانا تھا۔ اسے کنوئیں میں دھکیلنا تھا۔ وہ خوب صورت ہے، خوش خو ہے، ہوشیار ہے، معزز ہے تو ہوا کرے۔ جہیز نہیں تو اس کے جُملہ اوصاف عیوب ہیں۔ اور جہیز ہے تو جُملہ عیوب اوصاف ہیں۔ انسان کی کوئی قدر نہیں صرف جہیز کی قدر ہے۔ قسمت کا کتنا دل ہلا دینے والا کھیل ہے!

کلیانی کا کچھ کم قصور نہ تھا۔ بیکس اور بیوہ ہونا ہی اسے الزام سے بَری نہیں کرسکتا۔ اس کو اپنے لڑکے، اپنی لڑکیوں سے کہیں زیادہ عزیز تھے۔ لڑکے ہل کے بیل ہیں۔ بھوسہ کھلی پر پہلا حق ان کا ہے۔ پھر ان کے کھانے سے جو بچ رہے وہ گایوں کا! مکان تھا کچھ نقد تھا، کئی ہزار کے گہنے تھے۔ مگر اسے ابھی دو لڑکوں کی پرورش کرنی تھی۔ انھیں پڑھانا لکھانا تھا۔ ایک لڑکی اور بھی چار پانچ سال میں بیاہ کے لائق ہوجائے گی۔ اس لیے وہ کوئی بڑی رقم جہیز میں نہ دے سکتی تھی۔ آخر لڑکوں کو بھی تو کچھ چاہیے۔ وہ کیا سمجھیں گے کہ ہمارا بھی کوئی باپ تھا۔

پنڈت موٹے رام کو لکھنؤ سے لوٹے پندرہ روز گزر چکے تھے۔ لوٹنے کے بعد وہ دوسرے ہی روز سے لڑکے کے کھوج میں نکلے تھے۔ انھوں نے عہد کر لیا تھا کہ میں ان لکھنؤ والوں کو دکھا دوں گا کہ دنیا میں تمھیں اکیلے نہیں ہو۔ بلکہ تمھارے جیسے بہت پڑے

ہوئے ہیں۔ کلیانی روز دن گنا کرتی تھی۔ آج اس نے ان کو خط لکھنے کا تہیہ کر لیا تھا وہ قلم دوات لے کر بیٹھی ہی تھی کہ پنڈت موٹے رام نے قدم رنجہ فرمایا۔

کلیانی۔ آیئے پنڈت جی۔ میں تو آپ کو خط لکھنے جا رہی تھی۔ کب لوٹے؟

موٹے رام۔ لوٹا تو بڑے سویرے ہی تھا۔ مگر اسی وقت ایک سیٹھ کے یہاں سے بلاوا آگیا۔ کئی روز سے تر مال نہ ملا تھا۔ میں نے کہا کہ لگے ہاتھ اس کام کو بھی نپٹاتا چلوں۔ ابھی وہیں سے چلا آرہا ہوں۔ کوئی پانچسو برہموں کا بھوجن تھا۔

کلیانی۔ کچھ کام بھی ٹھیک ہوا یا راستہ ہی ناپنا پڑا۔

موٹے رام۔ کام کیوں نہ ٹھیک ہوتا۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے۔ پانچ جگہ بات چیت کر آیا ہوں۔ پانچوں کی نقل لایا ہوں۔ ان میں سے جسے آپ چاہیں پسند کرلیں۔ یہ دیکھیے۔ اس لڑکے کا باپ ڈاک کے محکمہ میں سو روپیہ ماہوار کا ملازم ہے۔ لڑکا ابھی کالج میں پڑھ رہا ہے۔ مگر نوکری ہی کا بھروسہ ہے۔ گھر میں کوئی جائیداد نہیں۔ لڑکا ہونہار معلوم ہوتا ہے۔ خاندان بھی اچھا ہے۔ دو ہزار میں بات طے ہوجائے گی۔ مانگتے تو وہ تین ہزار۔

کلیانی۔ لڑکے کے اور بھی بھائی ہیں؟

موٹے رام۔ نہیں۔ مگر تین بہنیں ہیں۔ اور تینوں کنواری۔ ماں زندہ ہیں۔ اچھا اب دوسری نقل لیجیے۔ یہ لڑکا ریل کے محکمہ میں پچاس روپے ماہوار پاتا ہے۔ ماں باپ نہیں ہیں۔ نہایت خوبصورت، بہت اچھے سبھاؤ والا خوب مضبوط بدن کا کسرتی جوان ہے۔ مگر خاندان اچھا نہیں۔ کوئی کہتا ہے ماں نائن تھی۔ کوئی کہتا ہے ٹھکرائن تھی۔ باپ کسی ریاست میں مختار تھے۔ گھر پر کچھ زمینداری ہے۔ مگر اس پر کئی ہزار کا قرضہ ہے۔ یہاں کچھ لینا دینا نہ پڑے گا۔ عمر کوئی بیس سال ہوگی۔

کلیانی۔ خاندان میں داغ نہ ہوتا تو منظور کرلیتی۔ دیکھ کر تو مکھی نہیں نگلی جاتی۔

موٹے رام۔ تیسری نقل دیکھیے۔ ایک زمیندار کا لڑکا ہے۔ کوئی ایک ہزار سالانہ منافع ہے۔ کچھ کھیتی باڑی بھی ہوتی ہے۔ لڑکا پڑھا لکھا تو تھوڑا ہی ہے، مگر کچہری عدالت کے کام میں ہوشیار ہے۔ دوسرا بیاہ ہوگا۔ پہلی عورت کو مرے دو سال ہوئے۔ اس سے کوئی اولاد نہیں ہے۔ لیکن رہن سہن (طرز معاشرت) موٹا ہے۔ پیسنا کوٹنا گھر ہی

میں ہوتا ہے۔

کلیانی۔ کچھ جہیز بھی مانگتے ہیں؟

موٹے رام۔ اس کی کچھ نہ پوچھیے۔ چار ہزار سُناتے ہیں۔ اچھا یہ چوتھی نقل دیکھیے۔ لڑکا وکیل ہے۔ عمر کوئی پینتیس سال ہوگی۔ تین چار سو کی آمدنی ہے پہلی عورت مر چکی ہے اس سے تین لڑکے بھی ہیں۔ اپنا گھر بنوایا ہے۔ کچھ جائیداد بھی خریدی ہے۔ یہاں بھی لینے دینے کا جھگڑا نہیں ہے۔

کلیانی۔ خاندان کیسا ہے؟

موٹے رام۔ بہت ہی اچھا۔ پرانے رئیس ہیں۔ اچھا، یہ پانچویں نقل دیکھیے۔ باپ کا چھاپہ خانہ ہے۔ لڑکا پڑھا تو بی، اے تک ہے۔ مگر اسی چھاپہ خانے میں کام کرتا ہے۔ عمر اٹھارہ سال ہوگی۔ گھر میں چھاپہ خانہ کے سوائے کوئی جائداد نہیں ہے۔ مگر کسی کا قرضہ سر پر نہیں، خاندان نہ بہت اچھا ہے نہ بُرا۔ لڑکا بہت خوبصورت اور اچھے چال چلن کا ہے مگر ایک ہزار سے کم پر معاملہ طے نہ ہوگا۔ مانگتے تو وہ تین ہزار ہیں۔ اب بتایئے آپ کو کون سا بَر پسند ہے؟

کلیانی۔ آپ کو سب میں کون پسند ہے؟

موٹے رام۔ مجھے تو دو بَر پسند ہیں۔ ایک وہ جو ریلوے میں ہے اور دوسرا یہ جو چھاپہ خانہ میں کام کرتا ہے۔

کلیانی۔ مگر پہلے کے خاندان میں تو آپ عیب بتلاتے ہیں۔

موٹے رام۔ ہاں یہ بات تو ہے۔ تو پھر چھاپہ خانہ والے ہی کو رہنے دیجیے۔

کلیانی۔ یہاں ایک ہزار دینے کو کہاں سے آئے گا؟ ایک ہزار تو آپ کا اندازہ ہے۔ شاید اور بھی منہ پھیلائے۔ آپ تو گھر کی حالت دیکھ ہی رہے ہیں۔ کھانا ملتا جائے یہی غنیمت ہے۔ روپے کہاں سے آئیں گے؟ زمیندار صاحب چار ہزار سُناتے ہیں ڈاک بابو بھی دوہزار کا سوال کرتے ہیں۔ ان کو جانے دیجیے۔ بس وکیل صاحب ہی بچ رہتے ہیں۔ ۳۵ سال کی عمر بھی ایسی زیادہ نہیں انھیں کو کیوں نہ رکھیے؟

موٹے رام۔ آپ خوب سوچ بچار لیں۔ میں تو آپ کی مرضی کا تابعدار ہوں۔ جہاں کہیے گا وہاں ٹیکہ کر آؤں گا۔ مگر ہزار ڈیڑھ ہزار کا منہ نہ دیکھیے۔ چھاپہ خانہ والا لڑکا ہیرا

ہے۔ اس کے ساتھ لڑکی کی زندگی سپھل ہوجائے گی۔ جیسے یہ روپ اور گن کی پوری ہے ویسا ہی لڑکا بھی سندر اور سوشیل ہے۔

کلیانی۔ پسند تو مجھے بھی یہی ہے مہاراج! مگر روپے کس کے گھر سے لاؤں؟ کون دینے والا ہے؟ ہے کوئی ایسا دانی؟ کھانے والے تو کھاپی کر چل دیے۔ اب کسی کی صورت بھی نہیں دکھائی دیتی۔ بلکہ اور مجھے بُرا مانتے ہیں کہ ہم نے نکال دیا۔ جو بات اپنے بس کے باہر ہے اس کے لیے ہاتھ ہی کیوں پھیلاؤں؟ اولاد کس کو پیاری نہیں ہوتی؟ کون اُسے سکھی نہیں دیکھنا چاہتا؟ پر جب اپنا کوئی بس بھی ہو۔ آپ ایشور کا نام لے کر وکیل صاحب کو ٹیکہ کر آیئے۔ عمر کچھ زیادہ ہے مگر مرنا جینا ایشور کے ہاتھ ہے۔ پینتیس سال کا آدمی بڈھا نہیں کہلاتا۔ اگر لڑکی کے نصیب میں سکھ بھوگنا بدا ہے تو جہاں جائے گی سکھی رہے گی۔ اور دُکھ بھوگنا ہے تو جہاں جائے گی دُکھ ہی جھیلے گی۔ ہماری نرملا کو بچّوں سے محبت ہے ان کے بچّوں کو اپنا سمجھے گی۔ آپ اچھی ساعت دیکھ کر ٹیکہ کر آئیں۔

(۵)

نرملا کا بیاہ ہوگیا سسرال آگئی۔ وکیل صاحب کا نام تھا منشی طوطا رام سانولے رنگ کے موٹے آدمی تھے۔ عمر تو ابھی چالیس سے زیادہ نہ تھی۔ مگر وکالت کی سخت محنت نے سر کے بال سفید کردیے تھے۔ ورزش کرنے کی انھیں فرصت نہ تھی۔ یہاں تک کہ کبھی کہیں گھومنے بھی نہ جاتے تھے۔ اس لیے پیٹ بڑھ گیا تھا۔ بدن کے فربہ ہونے پر بھی آئے دن کوئی نہ کوئی شکایت بنی رہتی۔ بدہضمی اور بواسیر سے تو ان کی مستقل رفاقت تھی۔ پس بہت پھونک پھونک کر قدم رکھتے تھے۔ ان کے تین لڑکے تھے۔ بڑا منسا رام سولہ سال کا تھا۔ منجھلا جیا رام بارہ سال کا اور چھوٹا سیا رام سات سال کا۔ تینوں انگریزی پڑھتے تھے۔ گھر میں وکیل صاحب کی بیوہ بہن کے سوا کوئی عورت نہ تھی۔ وہی گھر کی مالکہ تھی۔ اس کا نام رکمنی اور اس کی عمر پچاس سال سے زائد تھی۔ سسرال میں کوئی نہ تھا۔ مستقل طور پر یہیں رہتی تھی۔

طوطا رام علم ازدواج سے خوب واقف تھے۔ نرملا کو خوش کرنے کے لیے ان میں جو قدرتی کمی تھی۔ اسے وہ تحفہ جات سے پوری کرنا چاہتے تھے۔ اگرچہ نہایت کفایت شعار

آدمی تھے۔ مگر نرملا کے لیے کوئی نہ کوئی تحفہ روز لایا کرتے۔ موقع پر روپیہ کی پرواہ نہ کرتے تھے۔ خود کبھی ناشتہ نہ کرتے تھے، لڑکوں کے لیے تھوڑا تھوڑا دودھ آتا تھا مگر نرملا کے لیے میوے، مربّے، مٹھائیاں، کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ وہ اپنی زندگی میں کبھی سیر تماشہ کے لیے نہ گئے تھے۔ مگر تعطیل میں نرملا کو سینما، سرکس، تھیٹر دکھلانے لے جاتے۔ اپنے بیش قیمت وقت کا تھوڑا سا حصہ اس کے ساتھ بیٹھ کر گراموفون بجانے میں گزارتے۔

لیکن نرملا کو نہ جانے کیوں طوطا رام کے پاس بیٹھنے اور ان سے ہنسنے بولنے میں تامّل ہوتا تھا۔ اس کا شاید یہ سبب تھا کہ اب تک اسی قسم کا ایک شخص اس کا باپ تھا جس کے سامنے وہ سر جھکا کر اور بدن چھپا کر نکلتی تھی۔ اب اسی عمر کا ایک شخص اس کا شوہر تھا۔ وہ اسے محبت کی چیز نہیں عزت کی چیز سمجھتی تھی۔ ان سے بھاگتی پھرتی۔ ان کو دیکھتے ہی اس کی خوشی کافور ہوجاتی تھی۔

وکیل صاحب کو ان کے علم ازدواج نے سکھلایا تھا کہ نوجوان عورت سے خوب محبت بھری باتیں کرنی چاہئیں۔ اس کے سامنے دل نکال کر رکھ دینا چاہیے۔ یہی اس کا تسخیر کا خاص منتر ہے۔ پس وکیل صاحب اپنے اظہار محبت میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھتے تھے۔ مگر نرملا کو ان باتوں سے نفرت ہوتی تھی۔ وہی باتیں جنھیں کسی نوجوان کے منہ سے سن کر اس کا دل نشۂ محبت سے سرشار ہوجاتا، جب وکیل صاحب کے منہ سے نکلتی تھیں تو اس کے دل میں تیر سی جاکر لگتی تھیں۔ ان میں مزہ نہ تھا۔ لطف نہ تھا۔ نشہ نہ تھا۔ دل نہ تھا بلکہ تصنع تھا۔ فریب تھا اور روکھا پھیکا لفظی تلازمہ، اسے عطر و روغن بُرے نہ لگتے تھے۔ سیر تماشے بُرے نہ لگتے۔ بناؤ سنگار کرنا بھی بُرا نہ لگتا البتہ اسے بُرا لگتا تھا صرف طوطا رام کے پاس بیٹھنا! وہ اپنا حسن و شباب انھیں نہ دکھانا چاہتی تھی۔ کیونکہ دیکھنے والی آنکھیں نہ تھیں۔ وہ انھیں ان نعمتوں سے لطف اندوز ہونے کے قابل ہی نہ سمجھتی تھی۔ غنچہ نسیم ہی کے مس سے شگفتہ ہوتا ہے۔ دونوں میں یکساں تازگی ہے۔ نرملا کے لیے وہ نسیم سحری کہاں تھی؟

پہلا مہینہ گزرتے ہی طوطا رام نے نرملا کو اپنا خزانچی بنا لیا۔ کچہری سے آکر دن بھر کی کمائی اسے دے دیتے۔ ان کا خیال تھا کہ نرملا ان روپوں کو دیکھ کر خوشی سے پھولی نہ سمائے گی۔ نرملا بڑے شوق سے اس عہدہ کا کام انجام دیتی۔ ایک ایک پیسہ کا حساب لکھتی

اگر کبھی روپے کم ملتے تو پوچھتی کہ آج کم کیوں ہیں؟ امورخانہ داری کے متعلق ان سے خوب باتیں کرتی۔ انھیں باتوں کے لائق وہ ان کو سمجھتی تھی۔ کوئی تفنن آمیز کلمہ ان کی زبان سے نکل جاتا تو اس کا چہرہ اُداس ہوجاتا تھا۔

نرملا جب گہنے کپڑوں سے اپنا سنگار کرکے آئینہ کے سامنے کھڑی ہوتی، اور اس میں اپنے حُسن روح افزا کا عکس دیکھتی تو اس کا دل حسرت بھری امنگ سے بیقرار ہوجاتا تھا۔ اس وقت اس کے سینہ میں آگ سی جل اُٹھتی تھی۔ جی میں آتا کہ اس گھر کو آگ لگا دوں۔ ماں پر غصّہ آتا۔ باپ پر غصّہ آتا۔ اپنی قسمت پر غصّہ آتا۔ اور سب سے زیادہ غصّہ آتا بے چارے بے قصور طوطا رام پر! وہ ہمیشہ اسی کوفت میں مبتلا رہتی۔ بانکا سوار بوڑھے لدّو ٹٹو پر سوار ہونا کب پسند کرے گا؟ خواہ اسے پیدل ہی کیوں نہ چلنا پڑے۔ نرملا کی حالت اسی بانکے سوار کی سی تھی۔ وہ اس پر سوار ہوکر اُڑنا چاہتی تھی اس کی مسرت خیز برق رفتاری کا لطف اُٹھانا چاہتی تھی۔ اسے ٹٹو کے ہنہنانے اور کنوتیاں کھڑی کرنے سے کیا امید ہوتی؟ ممکن تھا کہ بچّوں کے ساتھ ہنس کھیل کر وہ ذرا دیر کے لیے اپنی حالت کو بھول جاتی۔ دل کچھ ہرا ہوجاتا۔ مگر رکمنی دیوی بچّوں کو اس کے پاس پھٹکنے بھی نہ دیتی تھیں۔ گویا وہ کوئی ڈائن ہے۔ جو انھیں کھاجائے گی۔ رکمنی کا مزاج ساری دنیا سے نرالا تھا۔ یہ پتہ لگانا مشکل تھا کہ وہ کس بات سے خوش ہوتی تھیں، اور کس بات سے ناراض۔ ایک بار جس بات سے خوش ہوجاتی تھیں دوسری بار اسی بات سے ناراض ہوتی تھیں۔ اگر نرملا اپنے کمرہ میں بیٹھی رہتی تو کہتیں کہ نہ جانے کہاں کی منحوس ہے۔ اگر وہ کوٹھے پر جاتی یا مہریوں سے باتیں کرتی تو سینہ کوبی کرنے لگتیں۔ لاج ہے نہ شرم۔ نگوڑی نے حیا بھون کھائی ہے۔ اب کیا؟ کچھ دنوں میں بازار بازار ناچے گی۔ جب سے وکیل صاحب نے نرملا کے ہاتھ میں روپے پیسے دینے شروع کیے، رُکمنی اس کی نکتہ چینی پر آمادہ ہوگئی تھیں۔ اسے معلوم ہوتا تھا کہ اب قیامت ہونے میں بہت تھوڑی سی کسر رہ گئی ہے۔ لڑکوں کو باربار پیسہ کی ضرورت پڑتی۔ جب تک خود مالک تھی۔ انھیں بہلا دیا کرتی تھی۔ اب ان کو سیدھے نرملا کے پاس بھیج دیتی۔ نرملا کو لڑکوں کا چٹوراپن اچھا نہ لگتا تھا۔ کبھی کبھی پیسے دینے سے انکار کردیتی۔ رکمنی کو اپنے لفظی تیر سر کرنے کا موقعہ مل جاتا۔ اب تو مالکن ہوئی ہیں۔ لڑکے کاہے کو جئیں گے۔ بِلا ماں کے بچّوں کو کون پوچھے؟ روپوں کی مٹھائیاں

کھاجاتے تھے اب دھیلے دھیلے کو ترستے ہیں۔ نرملا اگر چڑھ کر کسی دن بلا پوچھے پیسے دے دیتی تو دیوی جی اس کی اور ہی طرح نکتہ چینی کرتیں۔ انھیں کیا لڑکے مریں، یا جئیں ان کی بلا سے! ماں کے بغیر کون سمجھائے کہ بیٹا بہت مٹھائی مت کھاؤ۔ آئی گئی تو میرے سر جائے گی۔ انھیں کیا؟ یہیں تک ہوتا تو شاید نرملا ضبط کرجاتی۔ مگر دیوی جی خفیہ پولیس کے سپاہی کی طرح نرملا کا پیچھا کرتی رہتی تھیں۔ اگر وہ کوٹھے پر کھڑی ہے تو ضرور کسی پر نظر دوڑا رہی ہوگی۔ مہری سے بات کرتی ہے تو ضرور ان کی بُرائی کرتی ہوگی۔ بازار سے کچھ منگواتی ہے تو ضرور کوئی شوق کی چیز ہوگی۔ وہ برابر اس کے خطوط کو پڑھنے کی کوشش کیا کرتیں۔ چُھپ چُھپ کر اس کی باتیں سُنا کرتیں۔ نرملا ان کی دو دھار والی تلوار سے کانپتی رہتی۔ یہاں تک کہ ایک روز اس نے شوہر سے کہا۔ آپ ذرا جی جی کو سمجھا دیں کیوں میرے پیچھے پڑی رہتی ہیں؟

طوطا رام نے تیز لہجے میں کہا۔ کیا تمھیں کچھ کہا ہے؟

"روز ہی کہتی ہیں۔ بات منہ سے نکلنی مشکل ہے۔ اگر انھیں اس بات کی جلن ہو کہ یہ مالکہ کیوں بنی ہوئی ہے۔ تو آپ ان ہی کو روپے پیسے دیجیے مجھے نہ چاہیے۔ وہی مالکہ بنی رہیں۔ میں تو صرف اتنا چاہتی ہوں کہ مجھے طعنے نہ دیا کریں۔"

یہ کہتے کہتے نرملا کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ طوطا رام کو اپنی محبت ظاہر کرنے کا یہ نہایت اچھا موقعہ ملا۔ بولے۔ "میں آج ہی ان کی خبر لوں گا۔ صاف کہہ دوں گا کہ اگر منہ بند کرکے رہنا ہے تو رہو ورنہ اپنی راہ لو۔ اس گھر کی مالکہ وہ نہیں ہیں تم ہو۔ وہ محض تمھیں مدد دینے کے لیے ہیں۔ اگر مدد کرنے کی بجائے تمھیں دق کرتی ہیں تو ان کے یہاں رہنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ وِدھوا ہیں، اناتھ ہیں، پاؤ بھر آٹا کھائیں گی اور پڑی رہیں گی۔ جب اور نوکر چاکر کھا رہے ہیں تو یہ تو اپنی بہن ہی ہیں لڑکوں کی دیکھ بھال کے لیے ایک عورت کی ضرورت بھی تھی۔ رکھ لیا۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ تمھارے اوپر حکومت کریں۔

نرملا نے پھر کہا۔ "لڑکوں کو سکھا دیتی ہیں کہ جاکر ماں سے پیسے مانگو۔ کبھی کچھ کبھی کچھ، لڑکے آکر میری جان کھاتے ہیں۔ گھڑی بھر لیٹنا مشکل ہوجاتا ہے۔ ڈانٹتی ہوں تو وہ آنکھیں لال پیلی کرکے دوڑتی ہیں۔ مجھے سمجھتی ہیں کہ یہ لڑکوں کو دیکھ نہیں سکتی۔ ایشور

جانتا ہے کہ میں بچّوں کو کتنا چاہتی ہوں۔ آخر میرے ہی بچّے تو ہیں، مجھے ان سے کیوں جلن ہونے لگی۔"

طوطا رام غصّہ سے کانپ اُٹھے۔ بولے۔"تمھیں جو لڑکا دِق کرے اسے پیٹ دیا کرو۔ میں بھی دیکھتا ہوں کہ لڑکے شریر ہوگئے ہیں۔ منسا رام کو تو میں بورڈنگ ہاؤس میں بھیج دوں گا۔ باقی دونوں کو آج ہی ٹھیک کیے دیتا ہوں۔"

اس وقت طوطا رام کچہری جارہے تھے۔ ڈانٹ ڈپٹ کرنے کا موقعہ نہ تھا۔ لیکن کچہری سے واپس آتے ہی انھوں نے گھر میں جاکر رکمنی سے کہا۔ "کیوں بہن، تمھیں اس گھر میں رہنا ہے یا نہیں؟ اگر رہنا ہے تو سیدھی طرح رہو، یہ کیا کہ دوسروں کا رہنا مشکل کردو۔"

رُکمنی سمجھ گئی کہ بہو نے اپنا وار کیا۔ مگر وہ دبنے والی عورت نہ تھی۔ ایک تو عمر میں بڑی۔ اس پر اس گھر کی خدمت میں زندگی گزار دی تھی۔ کس کی مجال تھی کہ انھیں بے دخل کردے؟ انھیں بھائی کی اس کم ظرفی پر تعجب ہوا۔ بولی۔ "تو کیا لونڈی بناکر رکھوگے؟ لونڈی بن کر رہنا ہے تو اس گھر کی لونڈی نہ بنوں گی۔ اگر تمھاری یہ مرضی ہو کہ گھر میں کوئی آگ لگا دے اور میں کھڑی دیکھا کروں، کسی کو بے راہ چلتے دیکھوں تو چپ سادھ لوں۔ جو جس کے دل میں آئے کرے اور میں مٹی کو مورت بنی بیٹھی رہوں تو یہ سب مجھ سے نہ ہوگا۔ یہ ہوا کیا جو تم آج اتنا آپے سے باہر ہو رہے ہو۔ نکل گئی ساری عقلمندی۔ کل کی چھوکری چوٹی پکڑ کر نچانے لگی۔ کچھ پوچھنا نہ گچھنا۔ بس اس نے تار کھینچا اور تم کاٹھ کے سپاہی کی طرح تلوار سونت کر کھڑے ہوگئے۔

طوطا رام۔ سنتا تو ہوں کہ تم ہمیشہ عیب نکالتی رہتی ہو۔ بات بات پر طعنے دیتی ہو۔ اگر کچھ سیکھ دینی ہو تو اسے پیار سے ملائم لفظوں میں دینی چاہیے طعنے سے نصیحت ملنے کی بجائے اُلٹا جی جلنے لگتا ہے۔

رُکمنی۔ تو تمھاری یہی مرضی ہے کہ کسی بات میں نہ بولوں۔ یہی سہی۔ لیکن پھر یہ نہ کہنا کہ تم تو گھر میں بیٹھی تھیں۔ کیوں نہیں صلاح دی؟ جب میری باتیں زہر معلوم ہوتی ہیں۔ تو مجھے کیا کتے نے کاٹا ہے کہ بولوں؟ مثل ہے۔ "ناٹوں کھیتی۔ بہوریوں گھر۔" میں بھی دیکھوں، بہوریا کیسے گھر چلاتی ہے؟"

اتنے میں سیارام اور جیارام اسکول سے آگئے۔ آتے ہی دونوں بوا کے پاس جاکر کھانا مانگنے لگے۔ رکمنی نے کہا۔ "جاکر اپنی نئی ماں سے کیوں نہیں مانگتے؟ مجھے بولنے کا حکم نہیں ہے۔"

طوطا رام۔ اگر تم لوگوں نے اُس مکان میں قدم رکھا تو ٹانگ توڑدوں گا۔ بدمعاشی پر کمر باندھی ہے۔

جیارام ذرا شوخ تھا۔ بولا۔"ان کو تو آپ کچھ نہیں کہتے ہمیں کو دھمکاتے ہیں۔ کبھی پیسے نہیں دیتیں۔"

سیارام نے اس کی تائید کی۔ "کہتی ہیں کہ مجھے دق کروگے تو کان کاٹ لوں گی۔ کہتی ہیں کہ نہیں جیا؟"

نرملا اپنے کمرہ سے بولی۔ "میں نے کب کہا کہ تمھارے کان کاٹ لوں گی۔ ابھی سے جھوٹ بولنے لگے؟"

اِتنا سُننا تھا کہ طوطارام نے سیارام کے دونوں کان پکڑکر اس کو اُٹھا لیا لڑکا زور کی چیخ مارکر رو پڑا۔

رُکمنی نے دوڑ کر بچّے کو منشی جی کے ہاتھ سے چھڑا لیا اور بولیں۔" بس رہنے بھی دو۔ کیا بچّہ کو مار ہی ڈالو گے؟ ہائے ہائے کان لال ہوگیا۔ سچ کہا ہے نئی بیوی پاکر آدمی اندھا ہوجاتا ہے۔ ابھی سے یہ حال ہے تو آگے اس گھر کے بھگوان ہی مالک ہیں۔"

نرملا اپنی فتح پر دل ہی دل میں خوش ہورہی تھی۔ لیکن جب منشی جی نے بچّہ کا کان پکڑکر اُٹھا لیا تو اس سے ضبط نہ ہوسکا۔ چھڑانے کو دوڑی مگر رُکمنی پہلے ہی پہنچ گئی تھی۔ بولی "پہلے آگ لگا دی اب بجھانے دوڑی ہو۔ جب اپنے لڑکے ہوں گے تب آنکھیں کھلیں گی پرایا درد کیا جانو؟"

نرملا۔ کھڑے تو ہیں۔ پوچھ لو نہ کہ میں نے کیا آگ لگا دی۔ میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ مجھے پیسوں کے لیے بار بار دق کرتے ہیں۔ اس کے سوا جو میرے مُنہ سے کچھ اور نکلا ہو تو میری آنکھیں پھوٹ جائیں۔

طوطارام۔ میں خود ان لونڈوں کی شرارت دیکھا کرتا ہوں۔ اندھا تھوڑا ہی ہوں۔ تینوں ضدی اور شریر ہوگئے ہیں۔ بڑے میاں کو تو میں آج ہی ہوسٹل بھیجتا ہوں۔

رُکمنی۔ اب تک تو تمھیں ان کی کوئی شرارت نہ سوجھتی تھی۔ آج آنکھیں کیوں اتنی تیز ہوگئیں؟

طوطا رام۔ تم ہی نے ان کو اتنا بے شوخ کر رکھا ہے۔

رُکمنی۔ تو میں ہی بِس کی گانٹھ ہوں۔ میرے ہی کارن تمھارا گھر چوپٹ ہو رہا ہے۔ لو میں جاتی ہوں۔ تمھارے لڑکے ہیں، مارو چاہے کاٹو۔ میں کچھ نہ بولوں گی۔

یہ کہہ کر رُکمنی وہاں سے چلی گئی۔ نرملا بچہّ کو روتا دیکھ کر بے تاب ہوگئی۔ اس نے اس کو سینہ سے لگا لیا۔ اور گود میں لیے ہوئے اپنے کمرہ میں لاکر اسے چمکارنے لگی لیکن بچہّ اور بھی سِسک سِسک کر رونے لگا۔ اس کا معصوم دل اس پیار میں وہ ماتا نہ پاتا تھا جس سے ایشور نے اس کو محروم کردیا تھا۔ یہ پیار تھا، صرف رحم تھا۔ یہ وہ چیز تھی جس پر اس کا کوئی حق نہ تھا۔ جو صرف خیرات کی صورت میں اسے دی جا رہی تھی۔ باپ نے پہلے بھی دو ایک بار مارا تھا۔ جب اس کی ماں زندہ تھی۔ لیکن تب اس کی ماں اسے سینہ سے لگا کر روتی نہ تھی۔ وہ ناخوش ہوکر اس سے بولنا ترک کر دیتی۔ یہاں تک کہ وہ خود ذرا ہی دیر بعد سب کچھ بھول کر پھر ماں کے پاس دوڑا جاتا تھا۔ شرارت کے لیے سزا پانا تو اس کی سمجھ میں آتا تھا۔ لیکن مار کھانے پر چمکارا جانا اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا ماں کے پیار میں سختی ہوتی تھی۔ مگر نرمی ملی ہوئی۔ اس پیار میں رحم تھا۔ مگر وہ سختی نہ تھی، جو یگانت کا خفیہ پیغام ہے۔ تندرست عضو کی پرواہ کون کرتا ہے لیکن وہی عضو جب درد سے پھٹنے لگتا ہے تو اسے ٹھیس اور دھکے سے بچانے کی تدبیر کی جاتی ہے۔ نرملا کا رحم آمیز رونا بچہّ کو اس کے بے کس ہونے کی خبر دے رہا تھا۔ وہ بڑی دیر نرملا کی گود میں بیٹھا روتا رہا۔ اور روتے روتے سوگیا۔ نرملا نے اسے چارپائی پر سُلانا چاہا تو بچہّ سوتے سوتے ہوئے اپنے دونوں نازک ہاتھ اس کی گردن میں ڈال دیے۔ اور اس سے ایسا لپٹ گیا گویا نیچے کوئی گڈھا ہو۔ اس کے چہرے پر خوف و اندیشہ کے نشانات ظاہر ہوگئے۔ نرملا نے پھر بچہّ کو گود میں اُٹھا لیا۔ چارپائی پر نہ سُلاسکی۔ اس وقت بچہّ کو گودی میں لیے ہوئے اس وہ اطمینان قلبی ہورہا تھا جو ابھی تک کبھی نہ ہوا تھا۔ اول مرتبہ اس کو اس دلی قدر کا احساس ہوا۔ جس کے بغیر آنکھیں نہیں کُھلتیں۔ اپنے فرض کا راستہ نہیں سُجھائی دیتا۔ یہ راستہ اب دکھائی دینے لگا۔

(۲)

اس دن اپنی گہری محبت کا زبردست ثبوت دینے کے بعد منشی طوطارام کو امید ہوئی تھی کہ نرملا کے دل پر میرا سکہ جم گیا۔ لیکن اس کی یہ امید ذرا بھی پوری نہ ہوئی۔ بلکہ پہلے تو وہ کبھی کبھی ہنس کر بولا بھی کرتی تھی۔ اب بچّوں ہی کی پرورش اور پرداخت میں مصروف رہنے لگی۔ جب گھر میں جاتے تو بچّوں کو اس کے پاس بیٹھا پاتے۔ کبھی دیکھتے کہ انھیں کھلا رہی ہے، کبھی کپڑے پہنا رہی ہے۔ کبھی کوئی کھیل کھیل رہی ہے اور کبھی کوئی کہانی سُنا رہی ہے۔ نرملا کا آرزومند دل اب محبت سے مایوس ہوکر اسی سہارے کو غنیمت سمجھنے لگا۔ بچّوں کے ساتھ ہنسنے بولنے میں اس کی خیالی ماممتا کو آسودگی ہوتی تھی۔ شوہر کے ساتھ ہنستے بولتے اسے جو تامّل، جو نفرت اور جو ناپسندیگی ہوتی تھی۔ یہاں تک کہ وہ اُٹھ کر بھاگ جانا چاہتی تھی۔ اس کی بجائے یہاں بچّوں کی سچّی سادہ محبت سے دل مسرور ہوجاتا تھا۔ پہلے منسارام اس کے پاس جاتے ہوئے جھجکتا تھا مگر اب وہ بھی کبھی کبھی جا بیٹھتا۔ یہ نرملا کا ہم سن تھا لیکن باطنی ترقی میں پانچ سال چھوٹا۔ ہاکی اور فٹ بال اس کی دنیا، اس کے تخیّل کا وسیع میدان اور اس کی تمناؤں کا ہرا بھرا باغ تھا۔ اکہرے بدن کا چھریرا۔ شکیل، ہنس مکھ اور حیادار لڑکا تھا۔ جس کا گھر سے صرف کھانے کا تعلق تھا باقی تمام دن نہ جانے کہاں گھومتا رہتا۔ نرملا اس کی زبان سے کھیل کی باتیں سُن کر ذرا دیر کے لیے اپنے تفکرات بھول جاتی، اور چاہتی کہ ایک بار پھر وہی دن آجائے جب وہ گڑیاں کھیلتی اور ان کا بیاہ رچایا کرتی تھی۔ اور جس کے ابھی بہت تھوڑے دن گزرے تھے۔

منشی طوطا رام دیگر تنہائی پسند انسانوں کی طرح نفس پرست انسان تھے۔ کچھ روز تو وہ نرملا کو سیر تماشے دکھاتے رہے۔ لیکن جب دیکھا کہ ان باتوں کا کچھ نتیجہ نہیں ہوتا، تو انھوں نے گوشۂ تنہائی اختیار کیا۔ دن بھر کی سخت دماغی محنت کے بعد ان کا دل تفریح کے لیے بے قرار ہوجاتا۔ لیکن جب اپنے تفریح خیز باغ میں داخل ہوتے اور اس کے پھولوں کو مُرجھایا، پودوں کو سوکھا اور کیاریوں میں خاک اُڑتی دیکھتے تو ان کے دل میں آتا، کہ کیوں نہ اس باغ کو اجاڑ دوں۔ نرملا ان سے کیوں مخاطب نہیں ہوتی؟ اس کا بھید ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ علم ازدواج کی ساری حکمتوں کو آزما چکے۔ مگر ان کی مقصد برآری نہ ہوئی۔ اب کیا کرنا چاہیے۔ یہ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔

ایک روز وہ اسی تردد میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ان کے ہم سبق دوست منشی نین سکھ رام آکر بیٹھ گئے اور سلام کلام کے بعد مسکرا کر بولے۔ ”آج کل تو خوب گہری چھنتی ہوگی۔ نئی بیوی کو ہم آغوش کرکے جوانی کا مزہ آجاتا ہوگا؟ بڑے خوش نصیب ہو بھئی۔ روٹھی ہوئی جوانی کو منانے کی اس سے بہتر کوئی تدبیر نہیں کہ نیا بیاہ ہوجائے۔ یہاں تو زندگی وبال ہو رہی ہے۔ بیوی صاحبہ اس بری طرح لپٹی ہیں کہ پیچھا ہی نہیں چھوڑتیں۔ میں تو دوسری شادی کی فکر میں ہوں۔ کہیں ڈال ہو تو ٹھیک ٹھاک کردو۔ دستوری میں ایک روز تمھیں اس کے ہاتھ کے بنے ہوئے پان کھلا دیں گے۔

طوطارام نے متانت سے کہا۔ ”کہیں ایسی حماقت نہ کر بیٹھنا۔ ورنہ پچھتاؤ گے۔ لونڈیاں کچھ لونڈوں ہی سے خوش رہتی ہیں۔ ہم تم اب اس کام کے نہیں رہے۔ سچ کہتا ہوں کہ میں تو شادی کرکے پچھتا رہا ہوں۔ بُری بلا گلے پڑی۔ سوچا تھا کہ دو چار سال اور زندگی کا لطف اُٹھا لوں۔ مگر اُلٹی آنتیں گلے پڑیں۔

نین سکھ۔ تم کیا باتیں کرتے ہو؟ لونڈیوں کو قابو میں لانا کیا مشکل ہے؟ ذرا سیر تماشا دکھا دو۔ اس کے رنگ روپ کی تعریف کردو۔ بس رنگ جم گیا۔

طوطا رام۔ یہ سب کر دھر کے ہار گیا۔

نین سکھ۔ اچھا۔ کچھ عطر روغن، پھول پتے، چاٹ واٹ کا بھی مزہ چکھایا؟

طوطا رام۔ اجی۔ یہ سب کرچکا۔ علم ازدواج کے سارے منتروں کو آزما چکا۔ سب جھوٹ ہیں۔

نین سکھ۔ اچھا تو اب میری ایک صلاح مانو۔ ذرا اپنی صورت بنوا لو۔ آج کل یہاں ایک بجلی کے ڈاکٹر آئے ہوئے ہیں۔ جو پیری کے سارے نشانات مٹا دیتے ہیں۔ کیا مجال کہ چہرہ پر ایک شکن یا سر کا ایک بال سفید رہ جائے۔ نہ جانے ایسا کیا جادو کر دیتے ہیں کہ آدمی کا کایا کلپ ہوجاتا ہے۔

طوطا رام۔ فیس کیا لیتے ہیں۔

نین سکھ۔ فیس تو سُنا زیادہ لیتے ہیں۔ شاید پانچسو روپے۔

طوطا رام۔ اجی کوئی جعلساز ہوگا۔ بے وقوفوں کو لوٹ رہا ہوگا۔ کوئی روغن لگا کر دوچار روز کے لیے ذرا چہرہ چکنا کردیتا ہوگا۔ اشتہاری ڈاکٹروں پر تو میرا اعتقاد ہی نہیں۔ دس

پانچ کی بات ہوتی تو کہتا۔ ذرا دل لگی ہی سہی۔ پانچسو تو بڑی رقم ہے۔

نین سکھ۔ تمھارے لیے پانچ سو کون بڑی بات ہے ایک ماہ کی آمدنی ہے۔ میرے پاس تو بھئی اگر پانچ سو ہوتے تو میں سب سے پہلا کام یہی کرتا۔ شباب کے ایک گھنٹہ کی قیمت پانچسو سے کہیں زیادہ ہے۔

طوطا رام۔ اجی کوئی سستا نسخہ بتاؤ۔ کوئی فقیری جڑی بوٹی ہو کہ بلا ہڑ پھٹکری کے رنگ چوکھا ہوجائے۔ بجلی اور ریڈیم بڑے آدمیوں کے لیے رہنے دو یہ انھیں کو مبارک ہوں۔

نین سکھ۔ تو پھر رنگیلے پن کا سوانگ بھرو۔ یہ ڈھیلا ڈھالا کوٹ پھینکو۔ تن زیب کی چست اچکن ہو، چوڑی دار پاجامہ، گلے میں طلائی زنجیر، سر پر جے پوری صافہ، آنکھوں میں سُرمہ اور بالوں میں حنا کا تیل پڑا ہوا۔ پیٹ کا پچکنا بھی ضروری ہے۔ دوہرا کمربند باندھو ذرا تکلیف تو ہوگی۔ مگر اچکن سج اُٹھے گی۔ خضاب میں لادوں گا۔ سو پچاس غزلیں یاد کرلو۔ اور موقعہ موقعہ سے اشعار پڑھو۔ باتوں میں چاشنی بھری ہو۔ ایسا معلوم ہو کہ تمھیں دین دنیا کی کچھ فکر نہیں ہے۔ بس جو کچھ ہے معشوق ہی ہے۔ جواں مردی اور ہمّت کے ساتھ کام کرنے کا موقعہ ڈھونڈتے رہو۔ رات کو جھوٹ موٹ شور کرو کہ چور چور! اور تلوار لے کر اکیلے پل پڑو۔ ہاں ذرا موقعہ دیکھ لینا۔ ایسا نہ ہو کہ سچ مچ کوئی چور آجائے اور تم اس کے پیچھے دوڑو۔ ورنہ ساری قلعی کھل جائے گی۔ اور تم مفت میں احمق بنوگے۔ اس وقت تو جوانمردی اسی میں ہے کہ دم روکے پڑے رہو۔ تاکہ وہ سمجھے کہ تمھیں خبر ہی نہیں ہوئی۔ لیکن جوں ہی چور بھاگ کھڑا ہو تم بھی اچھل کر باہر نکلو اور تلوار لے کر "کہاں کہاں" کہتے دوڑو۔ زیادہ نہیں، ایک ہی ماہ میری باتوں کو آزما دیکھو۔ اگر وہ تمھارا دم نہ بھرنے لگے تو جو جرمانہ کہو دوں۔

طوطا رام نے اس وقت تو یہ باتیں مذاق میں اڑا دیں جیسا کہ ایک ہوشیار آدمی کو کرنا چاہیے تھا۔ لیکن ان میں سے کچھ باتیں ان کے دل نشیں ہوگئیں۔ ان کے مؤثر ہونے میں کوئی شبہہ نہ تھا۔ آہستہ آہستہ رنگ بدلنے لگے کہ لوگ جان نہ سکیں۔ پہلے بالوں سے ابتدا ہوئی۔ پھر سرمہ کی باری آئی۔ یہاں تک کہ ایک دو ماہ میں ان کی کایا پلٹ ہی ہوگئی۔

غزلیں یاد کرنے کی تجویز مضحکہ خیز تھی۔ مگر جواں مردی کی ڈینگ مارنے میں کوئی ہرج نہ تھا۔

اس روز سے روزانہ اپنی بہادری کا کوئی نہ کوئی تذکرہ ضرور چھیڑ دیتے۔ نرملا کو شک ہونے لگا کہ کہیں ان کو دیوانگی کا عارضہ تو نہیں ہورہا ہے۔ جو شخص مونگ کی دال اور موٹے آٹے کے دو پھلکے کھاکر بھی نمک سلیمانی کا محتاج ہو اس کے چھبیلے پن پر دیوانگی کا شبہہ ہو تو تعجب ہی کیا ہے۔ نرملا پر اس دیوانگی کا اور تو کیا رنگ جمتا۔ ہاں اس کو ان پر رحم آنے لگا۔ غصہ اور نفرت کا احساس جاتا رہا۔ غصہ اور نفرت کے لیے وہ شخص ہے جو اپنے ہوش میں ہو۔ پاگل تو رحم ہی کا مستحق ہے۔ وہ بات بات میں ان کی چٹکیاں لیتی۔ ان کا مضحکہ اڑاتی۔ جیسے لوگ پاگلوں کے ساتھ کیا کرتے ہیں ہاں اس امر کا خیال رکھتی تھی کہ یہ سمجھ نہ جائیں۔ وہ سوچتی کہ بے چارہ اپنے گناہ کا کفارہ ادا کر رہا ہے۔ یہ سارا سوانگ تو صرف اسی لیے ہے کہ میں اپنا غم بھول جاؤں۔ آخر اب بھاگ تو بدل سکتا نہیں۔ اس بے چارے کو کیوں جلاؤں؟

ایک روز رات کے نو بجے طوطارام چھیلا بنے ہوئے سیر کرکے لوٹے اور نرملا سے بولے۔ آج تین چوروں سے مقابلہ ہوگیا۔ میں ذرا شیوپور کی طرف چلا گیا تھا۔ اندھیرا تھا ہی۔ جوں ہی ریل کی سڑک کے پاس پہنچا کہ تین آدمی تلواریں لیے ہوئے نہ جانے کدھر سے نکل پڑے۔ یقین مانو تینوں سیاہ دیو تھے! میں بالکل تنہا۔ ہاتھ میں صرف ایک چھڑی تھی۔ ادھر تینوں تلوار باندھے ہوئے، ہوش اڑ گئے۔ سمجھ گیا کہ زندگی کا یہیں تک ساتھ تھا۔ مگر میں نے بھی سوچا کہ مرتا ہی ہوں تو بہادروں کی موت کیوں نہ مروں؟

اتنے میں ایک شخص نے للکار کر کہا۔ "رکھ دے تیرے پاس جو کچھ ہو اور چپکے سے چلا جا۔"

میں چھڑی سنبھال کر کھڑا ہوگیا اور بولا۔ میرے پاس تو صرف یہ چھڑی ہے اور اس کی قیمت ایک آدمی کا سر ہے۔

میرے منہ سے اتنا نکلنا تھا کہ تینوں تلوار کھینچ کر مجھ پر جھپٹ پڑے۔ اور میں ان کے واروں کو چھڑی پر روکنے لگا۔ تینوں جھلا جھلا کر وار کرتے تھے۔ کھٹاکے کی آواز ہوتی تھی اور میں بجلی کی طرح لپک کر ان کے واروں کو کاٹ دیتا تھا۔کوئی دس منٹ تک تینوں

نے خوب تلوار کے جوہر دکھائے مگر میرا ذرا بھی بال بیکا نہ ہوا۔ مجبوری یہی تھی کہ میرے ہاتھ میں تلوار نہ تھی۔ اگر کہیں تلوار ہوتی تو ایک کو بھی جیتا نہ چھوڑتا۔ خیر کہاں تک بیان کروں۔ اس وقت میرے ہاتھوں کی صفائی دیکھنے کے قابل تھی۔ مجھے خود حیرت ہورہی تھی کہ یہ تیزی مجھ میں کہاں سے آگئی۔ جب تینوں نے دیکھا کہ یہاں دال نہیں گلنے کی۔ تو تلوار نیام میں رکھ لی۔ اور میری پیٹھ ٹھونک کر بولے۔ جوان تم سا بہادر آج تک نہیں دیکھا۔ ہم تینوں سَو پر بھاری ہیں۔ گاؤں کے گاؤں ڈھول بجاکر لوٹتے ہیں۔ مگر آج تم نے ہم کو نیچا دکھا دیا۔ ہم تمھارا لوہا مان گئے۔ یہ کہہ کر تینوں پھر نظروں سے اوجھل ہوگئے۔

نرملا نے متانت سے مسکراکر کہا۔"اس چھڑی پر تلواروں کے بہت سے نشان ہوں گے؟"

منشی جی اس سوال کے لیے تیار نہ تھے۔ مگر کوئی جواب دینا ضروری تھا۔ بولے۔"میں واروں کو برابر خالی دیتا تھا۔ دوچار چوٹیں چھڑی پر پڑی تھیں تو اُچٹتی ہوئی جن سے کوئی نشان نہ پڑ سکتا تھا۔

ابھی ان کے منہ سے پوری بات نہ نکلی تھی کہ یکایک رکمنی دیوی بدحواس دوڑتی ہوئی آئیں اور ہانپتی ہوئی بولیں۔"طوطا، طوطا ہے کہ نہیں؟ میرے کمرہ میں ایک سانپ نکل آیا ہے۔ میری چارپائی کے نیچے بیٹھا ہوا ہے۔ میں اُٹھ کر بھاگی۔ موا کوئی دوگز کا ہوگا۔ پھن نکالے پھنکار رہا ہے۔ ذرا چلو تو۔ ڈنڈا لیتے چلنا۔

طوطا رام کے چہرے کا رنگ فق ہوگیا۔ منہ پر ہوائیاں اُڑنے لگی۔ مگر دلی جذبات کو چھپا کر بولے۔

"سانپ وہاں کہاں؟ تمھیں دھوکا ہوا ہوگا۔ کوئی رسّی پڑی ہوگی۔"

رُکمنی۔ ارے میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، ذرا چل کر دیکھ نہ لو، ہے ہے مرد ہوکر ڈرتے ہو!

منشی جی گھر میں سے تو نکلے مگر برآمدہ میں جاکر پھر ٹھٹک گئے۔ ان کے قدم ہی نہ اُٹھتے تھے۔ کلیجہ دھک دھک کر رہا تھا۔ سانپ بڑا غصہ ور جانور ہے۔ کہیں کاٹ لے تو مفت جان سے ہاتھ دھونا پڑے۔ بولے۔ "ڈرتا نہیں ہوں۔ سانپ ہی تو ہے شیر تو نہیں

مگر سانپ پر لاٹھی نہیں کارگر ہوتی۔ جاکر کسی کو بھیجوں، کسی کے گھر سے بھالا لائے۔"

یہ کہہ کر منشی جی لپکے ہوئے باہر چلے گئے۔ منسا رام بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ منشی جی تو باہر گئے۔ اور ادھر وہ کھانا چھوڑکر اپنی ہاکی سٹک ہاتھ میں لیے ہوئے کمرہ میں گھس ہی تو گیا اور فوراً چارپائی کھینچ لی سانپ مست تھا۔ بھاگنے کی بجائے پھن نکال کر کھڑا ہوگیا۔ منسارام نے جھٹ پٹ چارپائی کی چادر اُٹھا کر سانپ کے اوپر پھینک دی۔ اور متواتر تین چار ڈنڈے زور زور سے لگائے۔ سانپ چادر کے اندر ہی تڑپ کر رہ گیا۔ تب وہ اس کو ڈنڈے پر اُٹھائے ہوئے باہر چلا۔ منشی جی کئی آدمیوں کو ساتھ لیے چلے آرہے تھے۔ منسارام کو سانپ لٹکائے دیکھا تو دفعتاً ان کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔ مگر پھر سنبھل گئے اور بولے۔ "میں تو آہی رہا تھا۔ تم نے کیوں جلدی کی؟ دے دو کوئی پھینک دے گا۔"

یہ کہہ کر وہ بڑی بہادری کے ساتھ رکمنی کے کمرہ کے دروازہ پر جاکر کھڑے ہوگئے اور کمرہ کو خوب دیکھ بھال کر مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے نرملا کے پاس آکر بولے۔ "میں جب تک جاؤں جاؤں۔ منسا رام نے مار ڈالا۔ بے سمجھ لڑکا۔ ڈنڈا لے کر دوڑ پڑا کتنے ہی سانپ مارے ہیں۔ سانپ کو کھلا کھلا کر مارتا ہوں کتنے ہی کو تو مٹھی میں پکڑ کر مسل دیا ہے۔"

رکمنی نے کہا۔ "جاؤ بھی۔ دیکھ لی تمھاری مردانگی۔"

منشی جی خجل ہوکر بولے۔"اچھا جاؤ۔ میں ڈرپوک ہی سہی۔ تم سے کچھ انعام تو نہیں مانگ رہا ہوں۔ جاکر مہراج سے کہو کھانا نکالے۔"

منشی جی تو کھانا کھانے گئے اور نرملا دروازہ کی چوکھٹ پر کھڑی سوچ رہی تھی۔ بھگوان۔ کیا انھیں سچ مچ کوئی عارضہ ہو رہا ہے؟ کیا میری حالت کو اور بھی ابتر بنانا چاہتے ہو؟ میں ان کی خدمت کرسکتی ہوں، عزت کرسکتی ہوں۔ اپنی جان ان کے قدموں پر نثار کرسکتی ہوں۔ مگر وہ نہیں کرسکتی جو میرے کیے نہیں ہوسکتا۔ عمر کا فرق مٹانا میرے بس کی بات نہیں، آخر یہ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟ سمجھ گئی۔ آہ! یہ بات پہلے ہی نہیں سمجھی تھی ورنہ ان کو کیوں اتنی تکلیف اُٹھانی پڑتی۔ اتنے سوانگ بھرنے پڑتے؟

(۷)

اس روز سے نرملا کا رنگ ڈھنگ بدلنے لگا۔ اس نے اپنے کو فرض پر قربان کر دینے

کا تہیہ کرلیا۔ اب تک مایوسی کے غم میں اس نے فرض پر دھیان ہی نہ دیا تھا۔ اس کے دل میں بے قراری کی آگ سی جلتی رہتی تھی۔ جس کی ناقابل برداشت تلخی نے اسے بدحواس سا کر رکھا تھا۔ اب اس تکلیف میں کچھ کمی معلوم ہونے لگی۔ اسے احساس ہوا، کہ میرے لیے زندگی میں کوئی خوشی نہیں۔ اس کا خواب دیکھ کر کیوں زندگی کو خراب کروں؟ دنیا میں سب لوگ سکھ کے سیج پر نہیں سوتے۔ میں بھی اُن ہی بدنصیبوں میں سے ایک ہوں۔ مجھے بھی ایشور نے دُکھوں کا بوجھ ڈھونے کے لیے چنا ہے وہ بوجھ سر سے اتر نہیں سکتا۔ اسے پھینکنا بھی چاہوں تو نہیں پھینک سکتی۔ اس بڑے بوجھ سے خواہ آنکھوں میں اندھیرا ہوجائے۔ خواہ گردن ٹوٹنے لگے۔ خواہ قدم اُٹھانا دوبھر ہوجائے۔ مگر وہ بوجھ تو ڈھونا ہی پڑے گا۔ عمر بھر کا قیدی کہاں تک روئے گا۔ اور روئے بھی تو کون دیکھتا؟ کسے اس پر رحم آتا ہے؟ رونے سے کام میں ہرج ہونے کے سبب اُسے اور زیادہ تکلیفیں سہنی پڑتی ہیں۔

دوسرے روز وکیل صاحب کچہری سے آئے تو دیکھا کہ نرملا خندہ پیشانی کی مورت بن کر کمرہ کے دروازہ پر کھڑی ہے۔ یہ خوش کن جلوہ دیکھ کر ان کی آنکھیں آسودہ ہوگئیں۔ آج بہت دنوں کے بعد انھیں یہ کنول کھلا ہوا نظر آیا۔ کمرہ میں ایک بڑا آئینہ دیوار سے لٹکا ہوا تھا۔ جس پر ایک پردہ پڑا رہتا تھا۔ آج وہ پردہ بھی اُٹھا ہوا تھا۔ وکیل صاحب نے کمرہ میں قدم رکھا تو آئینہ پر نگاہ پڑی۔ اپنی صورت صاف صاف نظر آئی ان کے دل پر چوٹ سی لگی۔ دن بھر کی محنت سے چہرہ کی رونق معدوم ہوگئی تھی۔ انواع و اقسام کے مقویات کھانے پر بھی گالوں کی جھریاں صاف نظر آرہی تھیں۔ پیٹ کسا ہوا ہونے پر بھی کسی منہ زور گھوڑے کی طرح باہر نکلا ہوا تھا۔ اسی آئینہ کے سامنے مگر دوسری طرف تاکتی ہوئی نرملا بھی کھڑی تھی۔ دونوں صورتوں میں کتنی تفاوت تھی۔ ایک جواہرات سے مزیّن عالی شان محل تھا۔ تو دوسرا ٹوٹا پھوٹا کھنڈر! وہ اس آئینہ کی طرف زیادہ نہ دیکھ سکے۔ اپنی یہ بُری حالت ان کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ وہ آئینہ کے سامنے سے ہٹ گئے۔ انھیں اپنی ہی صورت سے نفرت ہونے لگی۔ تو پھر اس خوبصورت نازنین کا ان سے متنفر ہونا کوئی تعجب آمیز بات نہ تھی۔ انھیں نرملا کی طرف دیکھنے کی بھی جرأت نہ ہوئی۔ اس کا یہ حُسن بے مثال ان کے دل کا درد بن گیا۔

نرملا نے کہا۔ "آج اتنی دیر کہاں لگائی؟ دن بھر راہ دیکھتے دیکھتے آنکھیں پھوٹ جاتی ہیں۔"

طوطا رام نے کھڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ "مقدموں کے مارے دم مارنے کی فرصت نہیں ملتی۔ ابھی ایک مقدمہ اور تھا مگر میں درد سر کا بہانہ کرکے بھاگ کھڑا ہوا۔"

نرملا۔ تو کیوں اتنے مقدمے لیتے ہو؟ کام اتنا ہی کرنا چاہیے جتنا آرام سے ہوسکے۔ جان دے کر تھوڑا ہی کام کیا جاتا ہے۔ بہت مقدمے نہ لیا کرو۔ مجھے روپیوں کا لالچ نہیں ہے تم آرام سے رہوگے تو بہت روپے ملیں گے۔

طوطا رام۔ بھئی آتی ہوئی لکشمی بھی تو نہیں ٹھکرائی جاتی۔

نرملا۔ لکشمی اگر گوشت اور خون کی بھینٹ لے کر آتی ہے تو اس کا نہ آنا ہی بہتر ہے۔ میں روپیہ کی بھوکی نہیں ہوں۔

اسی وقت منسارام بھی سکول سے لوٹا۔ دھوپ میں چلنے کی وجہ سے چہرہ پر پسینہ کے قطرے نمودار تھے۔ گورے مکھڑے پر خون کی سرخی چھا رہی تھی۔ آنکھوں سے شعاعیں سی نکلتی معلوم ہوتی تھیں۔ دروازہ پر کھڑا ہوکر بولا۔ "اماں جی، لائیے، کچھ کھانے کو نکالیے۔ ذرا کھیلنے جانا ہے۔"

نرملا جاکر گلاس میں پانی لائی۔ اور پھر اس نے ایک طشتری میں کچھ میوے رکھ کر منسارام کو دیے۔ منسارام کھا پی کر چلنے لگا تو نرملا نے پوچھا۔ "کب تک آؤگے؟"

منسارام۔ کہہ نہیں سکتا۔ گوروں کے ساتھ ہاکی کھیلنا ہے۔ پارک یہاں سے بہت دور ہے۔

نرملا۔ بھئی جلد آنا، کھانا ٹھنڈا ہوجائے گا تو کہو گے بھوک نہیں ہے۔

منسارام نے نرملا کی طرف مؤدبانہ محبت سے دیکھ کر کہا۔ "مجھے دیر ہوجائے تو سمجھ لیجیے گا کہ وہیں کھا رہا ہوں۔ میرے لیے بیٹھنے کی ضرورت نہیں۔"

وہ چلا گیا تو نرملا بولی۔ "پہلے تو گھر میں آتے ہی نہ تھے۔ مجھ سے بولتے شرماتے تھے۔ کسی چیز کی ضرورت ہوتی تو باہر ہی سے منگوا بھیجتے۔ جب سے میں نے بُلا کر کہا۔ تب سے اب آنے لگے ہیں۔"

طوطا رام نے کچھ چڑھ کر کہا۔ "یہ تمھارے پاس کھانے پینے کی چیزیں مانگنے کیوں

آتا ہے؟ بہن سے کیوں نہیں مانگتا؟"

نرملا نے یہ بات اپنی تعریف کیے جانے کے لالچ سے کہی تھی۔ وہ یہ دکھانا چاہتی تھی کہ میں تمھارے لڑکوں سے کتنی محبت کرتی ہوں۔ اس میں ذرا بھی تصنع نہ تھا۔ بلکہ اس کو واقعی لڑکوں سے محبت تھی۔ اس کے طرز و انداز میں اب تک طفلانہ انداز ہی کا غلبہ تھا۔ اس میں وہی آرزو مندی، وہی امیدواری، وہی شوخی، وہی تفریح پسندی موجود تھی اور بچّوں کے ساتھ اس کے طفلانہ جذبات آشکارا ہوتے رہتے تھے۔ سوتیلے پن کی ڈاہ ابھی تک اس کے دل میں پیدا نہ ہوئی تھی۔ مگر شوہر کے خوش ہونے کے بجائے ان کے ناک بھوں چڑھانے کا مطلب نہ سمجھ کر بولی۔"میں کیا جانوں کہ ان سے کیوں نہیں مانگتے؟ میرے پاس آتے ہیں تو دتکار نہیں دیتی۔ اگر ایسا کروں تو یہی ہوگا کہ یہ تو لڑکوں کو دیکھ کر جلتی ہے۔

منشی جی نے اس کا جواب نہ دیا۔ مگر آج انھوں نے مؤکلوں سے باتیں نہیں کیں، سیدھے منسارام کے پاس گئے اور اس کا امتحان لینے لگے۔ یہ زندگی میں پہلا ہی موقعہ تھا کہ انھوں نے منسارام اور کسی لڑکے کی تعلیمی ترقی کے بارے میں اتنی دلچپسی ظاہر کی ہو۔ انھیں اپنے کام سے سر اُٹھانے کی مہلت ہی نہ ملتی تھی۔ انھیں ان مضامین کو پڑھے ہوئے تقریباً چالیس سال ہوگئے تھے۔ اس وقت سے ان کی طرف آنکھ بھی نہ اُٹھائی تھی وہ قانونی کتب کے سوا اور کچھ پڑھتے ہی نہ تھے۔ اس کا انھیں وقت ہی نہ ملتا تھا۔ مگر آج انھیں مضامین میں وہ منسارام کا امتحان لینے لگے۔ منسارام ذہین تھا اور ساتھ ہی محنتی بھی کھیل میں وہ بی ٹیم کا کپتان ہونے پر بھی اپنے درجہ میں اوّل رہتا تھا۔ جس سبق کو ایک بار پڑھ لیتا وہ اس کے دل پر نقش کالحجر ہوجاتا تھا۔ منشی جی کو عجلت میں ایسے باریک سوال سوجھے ہی نہیں۔ جن کے جوابات دینے میں ایک ہوشیار لڑکے کو بھی کچھ سوچنا پڑتا۔ اور معمولی سوالات کو منسارام نے چٹکیوں میں اڑا دیا۔ کوئی سپاہی اپنے دشمن پر وار خالی جاتے دیکھ کر جیسے جھلا کر اور بھی تیزی سے وار کرتا ہے اسی طرح منسارام کے جوابات کو سُن سُن کر وکیل صاحب بھی جھلاتے تھے۔ وہ کوئی ایسا سوال کرنا چاہتے تھے جس کا جواب منسارام نہ دے سے۔ دیکھنا چاہتے تھے کہ اس کا کمزور پہلو کہاں ہے۔ یہ دیکھ کر اب انھیں اطمینان نہ ہوتا تھا کہ یہ کیا کرتا ہے۔ وہ یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ یہ کیا نہیں کرتا۔ کوئی مشاق ممتحن

منسارام کی کمزوریوں کو آسانی سے دکھا سکتا مگر وکیل صاحب اپنی نصف صدی کی بھولی ہوئی تعلیم کی بنا پر اتنے کامیاب کیسے ہوتے؟ آخر میں جب ان کو اپنا غصہ اُتارنے کے لیے کوئی بہانہ نہ ملا تو بولے۔ میں دیکھتا ہوں کہ تم تمام دن اِدھر اُدھر مٹرگشت کیا کرتے ہو۔ میں تمھارے چال چلن کو تمھاری عقل سے زیادہ سمجھتا ہوں۔ اور تمھارا اس طرح آوارہ پھرنا مجھے گوارا نہیں ہوسکتا۔

منسارام نے بے خوفی سے کہا۔ ”میں شام کو ایک گھنٹہ کے لیے جانے کے سوا دن بھر کہیں نہیں جاتا۔ آپ اماں یا بوا جی سے پوچھ لیجیے۔ مجھے خود اس طرح گھومنا پسند نہیں۔ ہاں کھیلنے کے لیے ہیڈماسٹر صاحب اصرار کرکے بلاتے ہیں تو مجبوراً جانا ہی پڑتا ہے۔ اگر آپ کو میرا کھیلنے جانا پسند نہیں ہے تو کل سے نہ جاؤں گا۔

منشی جی نے دیکھا کہ باتیں دوسرے ہی رُخ پر جا رہی ہیں۔ تو تیز لہجے میں بولے۔ ”مجھے اس بات کا اطمینان کیوں کر ہو کہ تم کھیلنے کے سوا اور کہیں نہیں گھومنے جاتے؟ میں برابر شکایتیں سنتا ہوں۔“

منسارام نے تیز ہوکر کہا۔ ”کن صاحب نے آپ سے یہ شکایت کی ہے۔ ذرا میں بھی تو سُنو۔“

وکیل۔ کوئی ہو۔ اس سے تمھیں کوئی مطلب نہیں۔ تمھیں اتنا اعتبار ہونا چاہیے کہ میں جھوٹا الزام نہیں لگاتا۔

منسا رام۔ اگر میرے سامنے کوئی آکر کہہ دے کہ میں نے اس کو کہیں گھومتے دیکھا ہے تو منہ نہ دکھاؤں۔

وکیل۔ کسی کو ایسی کیا غرض پڑی ہے کہ تمھارے منہ پر تمھاری شکایت کرے اور تم سے بیر مول لے؟ تم اپنے دوچار ساتھیوں کو لے کر اس کے گھر کا کھپریل پھوڑتے پھرو۔ مجھ سے اس قسم کی شکایت ایک آدمی نے نہیں۔ کئی آدمیوں نے کی ہے اور کوئی وجہ نہیں ہے کہ میں اپنے دوستوں کی باتوں کا اعتبار نہ کروں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اسکول ہی میں رہا کرو۔

منسا رام نے اداس ہوکر کہا۔ مجھے وہاں رہنے میں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ جب سے کہیے چلا جاؤں۔

وکیل۔ تم اداس کیوں ہوگئے؟ کیا وہاں رہنا اچھا نہیں لگتا؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہاں جانے سے تمھاری نانی مری جارہی ہے۔ آخر بات کیا ہے؟ وہاں تمھیں کیا تکلیف ہوگی؟

منسارام بورڈنگ ہاؤس میں رہنے کا شائق نہ تھا۔ لیکن جب منشی جی نے یہی بات کہہ دی اور اس کا سبب دریافت کیا تو وہ اپنی شرم مٹانے کے لیے خوش ہوکر بولا۔ اُداس کیوں ہوں؟ میرے لیے جیسے گھر ویسے بورڈنگ ہاؤس۔ تکلیف بھی کوئی نہیں۔ اور اگر ہو بھی تو اسے برداشت کرسکتا ہوں۔ میں کل سے چلا جاؤں گا۔ ہاں اگر جگہ نہ خالی ہوئی تو مجبوری ہے۔ منشی جی وکیل تھے۔ سمجھ گئے کہ یہ لڑکا کوئی ایسا حیلہ تلاش کررہا ہے کہ مجھے وہاں جانا بھی نہ پڑے اور کوئی الزام بھی سر نہ آئے۔ بولے۔ سب لڑکوں کے لیے جگہ ہے۔ تمھارے ہی لیے جگہ نہ ہوگی؟

منسا رام۔ کتنوں ہی لڑکوں کو جگہ نہیں ملی۔ اور وہ باہر کرایہ کے مکانات میں پڑے ہوئے ہیں۔ ابھی بورڈنگ ہاؤس سے ایک لڑکے کا نام خارج ہوگیا تھا۔ تو اس جگہ کے لیے پچاس درخواستیں آئی تھیں۔

وکیل صاحب نے زیادہ بحث کرنا مناسب نہ سمجھا۔ منسارام کو کل تیار رہنے کا حکم دے کر آپ نے بگھی تیار کرائی اور سیر کرنے چلے گئے۔ ادھر کچھ دنوں سے وہ شام کو عموماً سیر کے لیے چلے جایا کرتے تھے۔ کسی تجربہ کار شخص نے بتلایا تھا کہ زندگی بڑھانے کا اس سے بڑھ کر کوئی نسخہ نہیں ہے۔ ان کے جانے کے بعد منسارام آکر رکمنی سے بولا۔

"بواجی۔ بابوجی نے مجھ سے اسکول ہی میں رہنے کو کہا ہے۔"

رکمنی نے متعجب ہوکر پوچھا۔"کیوں؟"

منسارام۔ میں کا جانوں؟ کہنے لگے کہ تم یہاں آواروں کی طرح اِدھر اُدھر گھوما کرتے ہو۔

رُکمنی۔ پھر تو نے کہا کہ میں کہیں نہیں جایا کرتا؟

منسا رام۔ کہا کیوں نہیں، مگر جب وہ مانیں بھی!

رُکمنی۔ تمھاری اماں جی کی کرپا ہوگی۔

منسارام۔ نہیں بواجی! مجھے ان پر شک نہیں ہے۔ وہ بے چاری تو کبھی بھول کر بھی کچھ نہیں کہتیں۔ کوئی چیز مانگنے جاتا ہوں تو فوراً اُٹھ کر دے دیتی ہیں۔

رُکمنی۔ تو یہ تریا چرتر کیا جانے؟ انھیں کی لگائی آگ ہے دیکھ میں جاکر پوچھتی ہوں۔

رکمنی جھلائی ہوئی نرملا کے پاس پہنچی۔ اسے آڑے ہاتھوں لینے کا، کانٹوں میں گھسیٹنے کا، طعنوں سے چھیدنے کا، رُلانے کا وہ کوئی اچھا موقعہ ہاتھ سے نہ جانے دیتی تھی نرملا ان کی عزت کرتی تھی۔ ان سے دبتی تھی۔ ان کی باتوں کا جواب تک نہ دیتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ یہ مجھے نصیحت کی باتیں کہے۔ جہاں میں بھولوں وہاں سدھارے۔ سب کاموں کی دیکھ بھال کرتی رہے۔ مگر رکمنی اس سے کھنچی ہی رہتی تھی۔

نرملا پلنگ سے اُٹھ کر بولی۔ "آیئے جی جی! بیٹھیے!"

رکمنی نے کھڑے کھڑے کہا۔"میں پوچھتی ہوں۔ کیا تم سب کو گھر سے نکال کر اکیلی ہی رہنا چاہتی ہو؟

نرملا نے سہمی آواز میں کہا۔ "کیا ہوا جی جی۔ میں نے کسی سے کچھ نہیں کہا۔

رکمنی۔ منسارام کو گھر سے نکالے دیتی ہو اور کہتی ہو کہ میں نے کسی سے کچھ نہیں کہا۔ کیا تم نے اتنا بھی نہیں دیکھا جاتا؟

نرملا۔ جی جی تمھارے پیروں پڑکر کہتی ہوں کہ مجھے کچھ بھی نہیں معلوم۔ میری آنکھیں پھوٹ جائیں اگر میں نے اس کے بارے میں زبان تک کھولی ہو۔

رکمنی۔ کیوں بے فائدہ قسمیں کھاتی ہو؟ اب تک طوطارام کبھی لڑکے سے نہیں بولتے تھے۔ ایک ہفتے کے لیے منسارام نانہال چلا گیا تھا تو اتنا گھبرائے کہ خود جاکر ہمراہ لائے اب اسی منسارام کو وہ گھر سے نکال کر اسکول میں رکھے دیتے ہیں۔ اگر لڑکے کا بال بھی بیکا ہوا، تم جانوگی۔ وہ کبھی باہر نہیں رہا۔ اُسے نہ کھانے کی سدھ رہتی ہے نہ پہننے کی۔ جہاں بیٹھا وہیں سوجاتا ہے۔ کہنے کو جوان ہوگیا مگر مزاج لڑکوں سا ہے۔ اسکول میں تو اس کو مَرن ہوجائے گی۔ وہاں کسے فکر ہے کہ اس نے کھایا یا نہیں۔ کہاں کپڑے اُتارے کہاں سو رہا ہے۔ جب گھر میں کوئی پوچھنے والا نہیں تو باہر کون پوچھے گا؟ میں نے تمھیں جتا دیا۔ آگے تم جانو اور تمھارا کام جانے۔

یہ کہہ کر رکمنی وہاں سے چلی گئی۔

وکیل صاحب سیر کرکے لوٹے تو نرملا نے فوراً یہ گفتگو چھیڑ دی۔ منسارام سے وہ آج کل تھوڑی دیر انگریزی پڑھتی تھی۔ اس کے چلے جانے پر پھر اس کے پڑھنے کا ہرج نہ

ہوگا؟ دوسرا کون پڑھائے گا؟ وکیل صاحب کو اب تک یہ بات نہ معلوم تھی۔ نرملا نے سوچا تھا کہ جب کچھ انگریزی کی مہارت ہوجائے گی۔ تو ایک روز انگریزی میں باتیں کر کے وکیل صاحب کو متحیّر کردوں گی۔ کچھ تھوڑی سی واقفیت تو اس کو اپنے بھائیوں سے ہوگئی تھی۔ اب وہ باقاعدہ پڑھ رہی تھی۔ وکیل صاحب کے سینے پر سانپ لوٹ گیا۔ تیوریاں چڑھاکر بولے۔ "کب سے پڑھا رہا ہے تمھیں؟ مجھ سے تم نے پہلے کبھی نہیں کہا؟

نرملا نے ان کی ایسی شکل صرف ایک بار دیکھی تھی۔ جب انھوں نے سیارام کو مارتے مارتے بیدم کردیا تھا۔ وہی شکل زیادہ خوفناک ہوکر آج اس کو پھر دکھائی دی۔ وہ سہمی ہوئی بولی۔ "ان کے پڑھنے میں تو اس سے کوئی ہرج نہیں ہوتا۔ میں اسی وقت پڑھتی ہوں۔ جب انھیں فرصت رہتی ہے۔ پوچھ لیتی ہوں کہ تمھارا ہرج ہوتا ہو تو جاؤ۔ اکثر جب وہ کھیلنے جانے لگتے ہیں تو دس منٹ کے لیے روک لیتی ہوں۔ میں خود چاہتی ہوں کہ ان کا ہرج نہ ہو۔"

بات کچھ نہ تھی مگر وکیل صاحب مضمحل ہوکر پلنگ پر گر پڑے اور پیشانی پر ہاتھ رکھ کر گہرے سوچ میں ڈوب گئے۔ انھوں نے جتنا سمجھا تھا بات اس سے کہیں بڑھ گئی تھی۔ انھیں اپنے اوپر غصّہ آیا کہ میں نے پہلے ہی کیوں نہ لڑکے کو باہر رکھنے کا بندوبست کیا۔ آج کل جو یہ مہارانی اتنی خوش دکھائی دیتی ہیں اس کا بھید اب سمجھ میں آیا۔ پہلے کبھی کمرہ اس قدر آراستہ نہ رہتا تھا۔ بناؤ سنگار بھی نہ کرتی تھیں۔ مگر اب دیکھتا ہوں کہ کایا پلٹ سی ہوگئی ہے۔ دل میں آیا کہ اسی وقت چل کر منسارام کو نکال دوں۔ مگر عقلِ سلیم نے سمجھایا، کہ اس موقعہ پر غصّہ کی ضرورت نہیں، کہیں اس نے بھانپ لیا تو غضب ہی ہوجائے گا۔ ہاں ذرا اس کے جذبات باطنی کو ٹٹولنا چاہیے۔ بولے۔ یہ تو میں جانتا ہوں کہ تمھیں دو چار منٹ پڑھانے میں اس کا کوئی ہرج نہیں ہوتا۔ لیکن آوارہ لڑکا ہے۔ اپنا کام نہ کرنے کا اُسے ایک بہانہ تو مل جاتا ہے۔ کل اگر فیل ہوگیا تو صاف کہہ دے گا کہ میں تو دن بھر پڑھاتا رہتا تھا۔ میں تمھارے لیے مس نوکر رکھ دوں گا۔ کچھ زیادہ خرچ نہ ہوگا۔ تم نے مجھ سے پہلے کچھ کہا ہی نہیں۔ یہ بھلا تمھیں کیا پڑھاتا ہوگا۔ دوچار لفظ بتاکر بھاگ جاتا ہوگا۔ اس طرح تو تمھیں کچھ بھی نہ آئے گا۔"

نرملا نے فوراً اس کی تردید کی۔ "نہیں یہ بات تو نہیں، وہ مجھے دل لگاکر پڑھاتے ہیں

اور ان کا طرز بھی کچھ ایسا ہے کہ پڑھنے میں جی لگتا ہے۔ آپ ایک دن ذرا ان کا سمجھانا دیکھیے۔ میں تو سمجھتی ہوں کہ مس اس طرح نہ پڑھائے گی۔"

منشی جی اپنے اس ہوشیاری بھرے سوال پر مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے بولے۔"دن میں ایک ہی بار پڑھاتا ہے یا کئی بار؟"

نرملا اب بھی ان کے سوالوں کا مطلب نہ سمجھی۔ بولی۔"پہلے تو شام ہی کو پڑھا دیتے تھے۔ اب کئی دنوں سے ایک بار آکر لکھنا بھی دیکھ لیتے ہیں۔ وہ تو کہتے ہیں کہ میں اپنے کلاس میں سب سے اچھا ہوں۔ ابھی امتحان میں انھیں کو اوّل درجہ ملا تھا۔ پھر آپ کیسے سمجھتے ہیں کہ ان کا پڑھنے میں جی نہیں لگتا؟ میں اس لیے اور بھی کہتی ہوں کہ جی جی سمجھیں گی کہ اسی نے یہ آگ لگائی ہے مجھے مفت میں طعنے سننے پڑیں گے۔ ابھی ذرا ہی دیر ہوئی۔ دھمکا کر گئی ہیں۔"

منشی جی نے دل میں کہا۔ خوب سمجھتا ہوں۔ کل کی چھوکری ہو کر مجھے اُڑانے چلی ہے۔ بہن کا سہارا لے کر اپنا مطلب پورا کرنا چاہتی ہے۔ بولے۔ "میں نہیں سمجھتا کہ بورڈنگ کا نام سُن کر کیوں لونڈے کی نانی مرتی ہے۔ اور لڑکے خوش ہوتے ہیں کہ اب اپنے دوستوں میں رہیں گے۔ یہ اُلٹا رو رہا ہے۔ ابھی کچھ دن پہلے تک یہ دل لگا کر پڑھتا تھا۔ یہ اسی محنت کا نتیجہ ہے کہ اپنے درجہ میں سب سے اچھا ہے۔ لیکن ادھر کچھ دنوں سے اسے سیر سپاٹے کا چسکا پڑ چلا ہے اگر ابھی سے روک تھام نہ کی گئی تو پیچھے کچھ کرتے دھرتے نہ بن پڑے گا۔ تمھارے لیے میں ایک مس رکھ دوں گا۔

دوسرے روز منشی علی الصباح کپڑے پہن کر باہر نکلے۔ دیوان خانہ میں کئی مؤکل بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں ایک راجا صاحب بھی تھے۔ جن سے منشی جی کو کئی ہزار روپے سالانہ محنتانہ ملتا تھا۔ مگر منشی جی انھیں وہیں بیٹھا چھوڑ کر اور دس منٹ میں آنے کا وعدہ کرکے بگھی پر بیٹھ کر اسکول کے ہیڈ ماسٹر کے یہاں جا پہنچے۔ ہیڈماسٹر صاحب نہایت شریف آدمی تھے۔ انھوں نے وکیل صاحب کی بہت تعظیم و تکریم کی۔ مگر ان کے یہاں ایک لڑکے کے لیے بھی جگہ خالی نہ تھی۔ سبھی کمرے بھرے ہوئے تھے۔ انسپکٹر صاحب کی سخت تاکید تھی کی مفصلات کے لڑکوں کو جگہ دینے کے بعد ہی شہروں کے لڑکوں کو داخل کیا جائے۔ اس لیے اگر کوئی جگہ خالی بھی ہوئی تو بھی منسارام کو نہ مل سکے گی۔ کیونکہ کئی

باہر ہی کے لڑکوں کو درخواستیں رکھی ہوئی تھیں۔ منشی جی وکیل تھی۔ رات دن ایسے لوگوں سے سابقہ رہتا تھا جو طمع میں آکر مشکل کو آسان اور ناممکن کو بھی ممکن بنا سکتے ہیں سمجھے کہ شاید کچھ دے دلا کر کام نکل جائے۔ دفتر کے کلارک سے بات چیت کرنی چاہیے۔ مگر اس نے ہنس کر کہا۔ منشی جی یہ کچہری نہیں اسکول ہے۔ ہیڈماسٹر صاحب کے کانوں میں اس کی بھنک بھی پڑگئی تو جامہ سے باہر ہوجائیں گے۔ اور منسارام کو کھڑے کھڑے نکال دیں گے۔ ممکن ہے افسروں سے بھی شکایت کردیں۔ بے چارے منشی جی اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ دس بجتے بجتے جھنجلائے ہوئے گھر لوٹے۔ منسارام اسی وقت گھر سے اسکول جانے کو نکلا۔ منشی جی نے اسے تیز نگاہوں سے دیکھا گویا وہ ان کا دشمن ہے اور گھر میں چلے گئے۔

اس کے بعد دس بارہ روز تک وکیل صاحب کا یہی دستور رہا کہ کبھی صبح، کبھی شام کسی نہ کسی اسکول کے ہیڈ ماسٹر سے ملتے۔ اور منسارام کو بورڈنگ ہاؤس میں داخل کرانے کی کوشش کرتے۔ مگر کسی اسکول میں جگہ نہ تھی۔ سبھی کے یہاں سے صاف جواب مل گیا۔ اب دو ہی تدبیریں تھیں۔ یا تو منسا رام کو علاحدہ کرایہ کے مکان میں رکھ دیا جائے یا کسی دوسرے شہر کے سکول میں داخل کرا دیا جائے۔ یہ دونوں ہی آسان تھیں۔ مفصلات کے اسکول میں جگہیں اکثر خالی رہتی ہیں لیکن اب منشی جی کے دل کو کچھ سکون ہوگیا تھا۔ اس روز سے منسارام کو انھوں نے کبھی گھر میں جاتے نہیں دیکھا۔ یہاں تک کہ اب وہ کھیلنے بھی نہ جاتا تھا اسکول جانے کے قبل اور آنے کے بعد برابر اپنے کمرہ میں بیٹھا رہتا۔ گرمی کا موسم تھا۔ کشادہ میدانوں میں بھی بدن سے پسینہ ٹپکتا تھا۔ لیکن منسارام اپنے کمرہ سے باہر قدم نہ رکھتا اس کی خودداری ہرزہ گردی کے الزام سے بری ہوجانے کے لیے بے قرار ہورہی تھی۔ وہ اپنے عمل سے اس کلنک کو مٹا دینا چاہتا تھا۔

ایک روز منشی جی بیٹھے کھانا کھا رہے تھے کہ منسارام بھی نہاکر کھانا کھانے آیا۔ منشی جی نے اس طرف اسے مہینہ بھر نہ دیکھا تھا۔ آج اس پر نگاہ پڑی تو ہوش اُڑگئے۔ ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ سامنے کھڑا تھا۔ چہرہ پر اب بھی برمھ چریہ کی جلا تھی۔ مگر بدن سوکھ کر کانٹا ہوگیا تھا۔ پوچھا۔ "آج کل تمھاری طبیعت اچھی نہیں ہے کیا؟ اتنے کمزور کیوں ہو؟"

منسا رام نے دھوتی اوڑھ کر کہا۔ "طبیعت تو بالکل اچھی ہے۔"

منشی جی۔ پھر اتنے کمزور کیوں ہو؟
منسارام۔ کمزور تو نہیں ہوں۔ میں اس سے زیادہ موٹا کب تھا؟
منشی جی۔ واہ! آدھا بدن بھی نہیں رہا۔ اور کہتے ہو کہ میں کمزور نہیں ہوں۔ کیوں بہن! یہ ایسا ہی تھا؟

رکمنی صحن میں کھڑی تلسی کو جل چڑھا رہی تھی۔ بولی۔ ”دُبلا کیوں ہوگا۔ اب تو بہت اچھی طرح پالن ہورہا ہے۔ میں تو گنوارنی تھی۔ لڑکوں کو کھلانا پلانا نہیں جانتی تھی مٹھائی کھلا کھلا کر ان کی عادت بگاڑے دیتی تھی۔ اب تو ایک پڑھی لکھی گرہستی کے کاموں میں ہوشیار عورت پان کی طرح پھیر رہی نا؟ دُبلا ہو اس کا دشمن!“

منشی جی۔ بہن! تم بڑا انیائے کرتی ہو۔ تم سے کس نے کہا کہ لڑکوں کو بگاڑ رہی ہو؟ جو کام دوسروں کے کیے نہ ہوسکے، وہ تمھیں خود کرنا چاہیے۔ یہ نہیں کہ گھر سے کوئی سروکار ہی نہ رکھو۔ جو ابھی خود لڑکی ہے وہ لڑکوں کو دیکھ بھال کیا کرے گی۔ یہ تمھارا کام ہے۔

رکمنی۔ جب تک اپنا سمجھتی تھی، کرتی تھی۔ جب تم نے غیر سمجھ لیا۔ تو مجھے کیا پڑی ہے کہ تمھارے گلے لپٹوں؟ پوچھو کتنے دنوں سے دودھ نہیں پیا؟ جاکر کمرہ میں دیکھ آو، کہ ناشتہ کے لیے جو مٹھائی بھیجی گئی تھی وہ پڑی سڑ رہی ہے۔ مالکن سمجھتی ہیں کہ میں نے تو کھانے کو سامنے رکھ دیا۔ کوئی نہ کھائے تو کیا منہ میں ڈال دوں؟ تو بھیا اس طرح وہ لڑکے پلتے ہوں گے جنھوں نے کبھی لاڈ پیار کا سُکھ نہیں دیکھا۔ تمھارے لڑکے برابر پان کی طرح پھیرے جاتے رہے ہیں اب اناتھوں کی طرح رہ کر سُکھی نہیں رہ سکتے۔ میں تو بات صاف کہتی ہوں، بُرا مان کر ہی کوئی میرا کیا کرے گا۔ اس پر سنتی ہوں کہ لڑکے کو اسکول میں رکھنے کا بندوبست کر رہے ہو۔ بے چارے کو گھر میں آنے تک کو مناہی ہے۔ میرے پاس آتے بھی ڈرتا ہے اور پھر میرے پاس رکھا ہی کیا رہتا ہے جو جاکر کھلاؤں گی۔

اتنے میں منسارام دو پھلکے کھاکر اُٹھ کھڑا ہوا۔ منشی جی نے پوچھا۔ ”کیا تم کھا چکے۔ ابھی بیٹھے ایک منٹ سے زیادہ نہیں ہوا۔ تم نے کھایا کیا؟ دو ہی پھلکے تو لیے تھے۔“

منسا رام نے شرماتے ہوئے کہا۔ ”دال اور ترکاری بھی تو تھی۔ زیادہ کھاجاتا ہوں تو

گلا جلنے لگتا ہے۔ کھٹی ڈکاریں آنے لگتی ہیں۔"
منشی جی کھانا کھاکر اُٹھے تو بہت فکرمند تھے۔ اگر لڑکا یوں ہی لاغر ہوتا گیا تو کوئی مہلک مرض لاحق ہوجائے گا۔ انھیں رکمنی پر اس وقت بہت غصہ آرہا تھا۔ انھیں یہی جلن ہے کہ میں گھر کی مالکہ نہیں ہوں۔ یہ نہیں سمجھتیں کہ مجھے مالکہ بننے کا کیا حق ہے۔ جسے روپیوں کا حساب تک کرنا نہیں آتا وہ گھر کی مالکہ کیسے ہوسکتی ہے۔ بنی تو تھیں سال بھرتک مالکہ۔ ایک پائی کی بھی بچت نہ ہوتی تھی۔اسی آمدنی میں روپ کلا دو ڈھائی سو روپے بچا لیتی تھی۔ ان کے راج میں وہی آمدنی خرچ کو بھی پوری نہ پڑتی تھی۔ کوئی بات نہیں لاڈپیار سے ان لڑکوں کو ستیاناس کردیا۔ اتنے بڑے بڑے لڑکوں کو اس کی کیا ضرورت کہ جب کوئی کھلائے تو کھائیں۔ انھیں تو خود اپنی فکر رکھنی چاہیے۔ منشی جی تمام دن اسی اُدھیڑ بُن میں پڑے رہے۔ دوچار دوستوں سے بھی ذکر کیا۔ لوگوں نے کہا۔ اس کے کھیل کود میں رُکاوٹ نہ ڈالیے۔ ابھی سے اسے قید نہ کیجیے۔ کھلی ہوا میں چال چلن بگڑنے کی اس سے کہیں کم امید ہے جتنی بند کمرہ میں۔ بُری صحبت سے ضرور بچایئے۔ مگر یہ نہیں کہ اسے گھر سے نکلنے ہی نہ دیجیے۔ ایام شباب میں تنہائی میں رہنا چال چلن کے لیے نہایت مُضر ہے۔

منشی جی کو اب اپنی غلطی معلوم ہوئی۔ گھر لوٹ کر منسا رام کے پاس گئے۔ یہ ابھی سکول سے آیا تھا۔ اور بغیر کپڑے اُتارے ایک کتاب سامنے کھول کر سامنے کھڑکی کی طرف دیکھ رہاتھا۔ اس کی نظر ایک بھکارن پر جمی ہوئی تھی۔ جو اپنے بچّہ کو گود میں لیے بھیک مانگ رہی تھی۔ بچّہ ماں کی گود میں بیٹھا ہوا ایسا خوش تھا گویا وہ کسی شاہی تخت پر بیٹھا ہو۔ منسارام اس بچّہ کو دیکھ کر رو پڑا۔ یہ بچّہ کیا مجھ سے زیادہ سُکھی نہیں ہے؟ اس تمام دنیا میں ایسی کون سی چیز ہے جسے وہ اس گود کے بدلہ میں پاکر خوش ہو۔ ایشور بھی ایسی کسی چیز کو نہیں بناسکتا۔ ایشور! ایسے بچّہ کو پیدا ہی کیوں کرتے ہو جسے ماں کی دائمی مفارقت کا دُکھ بھوگنا پڑا ہو؟ آج مجھ سا بدنصیب اس دنیا میں اور کون ہے؟ کسے میرے کھانے پینے کی، مرنے جینے کی سُدھ ہے۔ اگر آج مر بھی جاؤں تو کِس کے دل کو صدمہ پہنچے گا؟ باپ کو اب مجھے رُلانے میں مزا آتا ہے۔ وہ میری صورت سے بیزار ہیں۔ مجھے گھر سے نکال دینے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ آہ۔ ماں! تمھارا پیارا بیٹا آج آوارہ اور بدچلن کہا جا رہا ہے۔ وہی

باپ جن کے ہاتھوں میں تم نے ہم تینوں بھائیوں کے ہاتھ دیے تھے۔ آج مجھے آوارہ اور بدچلن بتا رہا ہے۔ میں اس قابل بھی نہیں کہ اس گھر میں رہ سکوں! یہ سوچتے سوچتے منسارام بے حد رنج سے زار و قطار رونے لگا۔

اسی وقت طوطارام کمرہ میں آکر کھڑے ہوگئے۔ منسارام نے فوراً آنسو پونچھ ڈالے وہ سر جھکا کر کھڑا ہوگیا۔ منشی جی نے شاید یہ پہلی مرتبہ اس کے کمرہ میں قدم رکھا تھا۔ منسارام کا دل دھڑکنے لگا کہ دیکھوں آج کیا آفت آتی ہے۔ منشی جی نے اسے روتے دیکھا تو ایک لمحہ کے لیے ان کی محبت پدری گویا خواب سے چونک پڑی۔ گھبراکر بولے۔ "کیوں، روتے کیوں ہو بیٹا؟ کیا کسی نے کچھ کہا ہے؟"

منسارام نے بڑی مشکل سے اُمنڈتے ہوئے آنسوؤں کو روک کر کہا۔ "جی نہیں، روتا تو نہیں ہوں۔"

منشی جی۔ تمھاری اماں نے تو کچھ نہیں کہا؟

منسارام۔ جی نہیں۔ وہ تو مجھ سے بولتی ہی نہیں۔

منشی جی۔ کیا کروں بیٹا۔ شادی تو اس لیے کی تھی کہ بچّوں کو ماں مل جائے گی۔ مگر وہ امید پوری نہ ہوئی۔ تو کیا بالکل نہیں بولتیں؟

منسارام۔ جی نہیں۔ ادھر مہینوں سے نہیں بولیں۔

منشی جی۔ عجیب مزاج کی عورت ہے۔ معلوم نہیں ہوتا کہ کیا چاہتی ہے؟ میں جانتا کہ اس کا ایسا مزاج ہوگا تو کبھی شادی نہ کرتا۔ روز ایک نہ ایک بات لے کر اُٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ اسی نے مجھ سے کہا تھا کہ یہ دن بھر نہ جانے کہاں غائب رہتا ہے میں اس کے دل کی بات کیا جانتا تھا۔ سمجھا کہ تم بُری صحبت میں پڑکر شاید دن بھر گھوما کرتے ہو۔ کون ایسا باپ ہے جسے اپنے پیارے بیٹے کو آوارہ پھرتے دیکھ کر رنج نہ ہو؟ اسی لیے میں نے تمھیں بورڈنگ ہاؤس میں رکھنے کا ارادہ کیا تھا۔ بس اور کوئی بات نہیں تھی۔ بیٹا میں تمھارا کھیلنا کودنا بند نہیں کرنا چاہتا تھا۔ تمھاری یہ حالت دیکھ کر میرے کلیجے کے ٹکڑے ہوئے جاتے ہیں۔ کل مجھے معلوم ہوا کہ میں مغالطہ میں تھا۔ تم شوق سے کھیلو۔ صبح و شام میدان میں نکل جایا کرو۔ تازہ ہوا سے تمھیں فائدہ ہوگا۔ جس چیز کی ضرورت ہو مجھ سے کہو۔ ان سے کہنے کی ضرورت نہیں۔

سمجھ لو کہ وہ گھر ہی میں نہیں ہے۔ تمھاری ماں چھوڑ کر چلی گئی تو میں تو موجود ہوں۔

لڑکے کا سادہ معصوم دل شفقتِ پدری سے مسرور ہوگیا۔ اسے معلوم ہوا کہ گویا مجسم ایشور کھڑا ہوا ہے۔ مایوسی اور غم سے بے قرار ہو کر اس نے دل میں اپنے باپ کو بے درد اور نہ جانے کیا کیا سمجھ رکھا تھا۔ سوتیلی ماں سے اُسے کوئی گِلہ نہ تھا۔ اب اسے معلوم ہوا کہ میں نے اپنے دیوتا جیسے باپ کے ساتھ کتنی بے انصافی کی ہے۔ محبت کی ایک لہر سی دل میں اُٹھی۔ اور وہ باپ کے قدموں پر سر رکھ کر رونے لگا۔ منشی جی رقت سے بے تاب ہوگئے۔ جس لڑکے کو آنکھوں سے ایک لمحہ دور دیکھ کر ان کا دل بے قرار ہو جاتا تھا، جس کی شرافت، عقل اور نیک شعاری کے اپنے پرائے سبھی تعریف کرتے تھے اس کی جانب سے ان کا دل اتنا سخت کیوں ہوگیا؟ وہ اپنے ہی عزیز لڑکے کو اپنا دشمن سمجھنے لگے۔ اس کو جلاوطن کرنے پر آمادہ ہوگئے۔ نرملا، باپ اور بیٹے کے درمیان میں دیوار کی طرح حائل تھی۔ نرملا کو اپنی طرف کھینچنے کے لیے پیچھے ہٹنا پڑتا تھا۔ اور باپ بیٹے میں تفرقہ پڑتا جاتا تھا۔ انجام کار آج یہ حالت ہوگئی ہے کہ اپنے عزیز بیٹے سے انھیں اتنا فریب کرنا پڑ رہا ہے۔ آج بہت سوچنے کے بعد انھیں ایک ایسی ترکیب سوجھی ہے جس سے انھیں امید ہو رہی ہے کہ وہ نرملا کے بیچ سے نکال کر اپنے دوسرے بازو کو اپنی طرف کرلیں گے انھوں نے وہ ترکیب کرنا شروع بھی کردیا ہے مگر اس سے مقصد برآری ہوگی یا نہیں؟ اسے کون جانتا ہے۔

جس روز سے طوطارام نے نرملا کی بہت منت ساجت کرنے پر بھی منسارام کو بورڈنگ میں بھیجنے کا ارادہ کرلیا تھا اسی روز سے اس نے منسارام سے پڑھنا ترک کردیا تھا۔ یہاں تک کہ اس سے بولتی بھی نہ تھی۔ اسے اپنے شوہر کی اس بدگمانی کا کچھ کچھ پتہ چل گیا تھا۔ اُف! اتنا شکی مزاج۔ ایشور ہی اس گھر میں لاج رکھے۔ ان کے دل میں ایسے ایسے بُرے خیالات بھرے ہوئے ہیں۔ مجھے یہ اتنی گئی گزری سمجھ رہے ہیں۔ یہ باتیں سوچ کر وہ کئی دن روتی رہی۔ پھر اس نے سوچنا شروع کیا کہ انھیں کیوں ایسا شک ہو رہا ہے۔ مجھ میں ایسی کون سی بات ہے جو اُن کی آنکھوں میں کھٹکتی ہے؟ بہت سوچنے پر بھی اسے اپنے میں کوئی ایسی بات نظر نہ آئی۔ تو کیا اس کا منسارام سے پڑھنا، اس کا ہنسنا بولنا ہی ان کے

شک کا سبب ہے؟ تو پھر میں پڑھنا چھوڑ دوں گی۔ بھول کر بھی منسارام سے نہ بولوں گی۔ اس کی صورت نہ دیکھوں گی۔

مگر یہ ریاضت اُسے ناقابلِ عمل معلوم ہوتی تھی۔ منسارام سے ہنسنے بولنے میں اس کا عیش پسند تخیل برافروختہ بھی ہوتا تھا۔ اور مطمئن بھی! اس سے باتیں کرتے ہوئے اسے ایک قسم کا سکھ کا احساس ہوتا تھا جسے وہ الفاظ میں ظاہر نہ کرسکتی تھی۔ نفس پرستی کا اس کے دل میں شائبہ بھی نہ تھا۔ وہ خواب میں بھی منسارام سے ناجائز محبت کرنے کی بات نہ سوچ سکتی تھی۔ ہر شخص کو اپنے ہمجولیوں کے ساتھ ہنسنے بولنے کی ایک قدرتی خواہش ہوتی ہے اس کے پورا کرنے کا یہ ایک نامعلوم ذریعہ تھا۔ اب وہ ناتمام خواہش نرملا کے دل میں چراغ کی طرح جلنے لگی۔ رہ رہ کر اس کا دل کسی نامعلوم درد سے بے چین ہوجاتا۔ کسی نامعلوم گمشدہ چیز کی تلاش میں اِدھراُدھر بھٹکتی رہتی۔ جہاں بیٹھتی وہاں بیٹھی ہی رہ جاتی۔ کسی کام میں دل نہ لگتا تھا۔ ہاں جب منشی جی آجاتے تو وہ اپنے تمام خواہشات کو مایوسی میں جذب کرکے ان سے مسکراکر اِدھراُدھر کی باتیں کرنے لگتی۔

کل جب منشی جی کھانا کھاکر کچہری چلے گئے تو رکمنی نے نرملا کو خوب طعنے دیئے۔ "جانتی تو تھی کہ یہاں بچّوں کو پالنا پڑے گا۔ تو کیوں گھر والوں سے نہیں کہہ دیا کہ وہاں میرا بیاہ نہ کرو۔ وہاں جاتی جہاں مرد کے سوا اور کوئی نہ ہوتا۔ وہی یہ بناؤ سنگار دیکھ کر خوش ہوتا۔ اپنے بھاگ کو سراہتا۔ یہاں یہ بوڑھا آدمی تمھارے رنگ روپ اور نخروں پر کیا ریجھے گا؟ اس نے انھیں بچّوں کی سیوا کرنے کے لیے تم سے بیاہ کیا ہے نہ کہ مزہ اُٹھانے کے لیے۔" اسی طرح وہ بڑی دیر تک زخم پر نمک چھڑکتی رہی مگر نرملا نے زبان تک نہ ہلائی۔ وہ اپنی صفائی پیش تو کرنا چاہتی تھی مگر کر نہ سکتی تھی۔ اگر وہ کہے کہ میں وہی کررہی ہوں۔ جو میرے شوہر کی مرضی ہے تو گھر کا راز افشا ہوتا ہے اگر اپنی غلطی کا اعتراف کرکے اس کی اصلاح کرتی ہے تو اندیشہ ہے کہ اس کا نہ جانے کیا انجام ہو۔ وہ تو بڑی صاف گو تھی۔ سچ کہنے میں اسے تامّل یا خوف نہ ہوتا تھا۔ مگر اس نازک موقعہ پر اس کو خاموش رہ جانا پڑا۔ اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا وہ دیکھتی تھی کہ منسارام بہت بے تعلق اور مغموم رہتا ہے۔ یہ بھی دیکھتی تھی کہ وہ روز بروز نحیف ہوتا جاتا ہے۔ لیکن قول و فعل ہر دو پر مہر لگی ہوئی تھی۔ چور کے گھر میں چوری ہوجانے سے اس کی جو

حالت ہوجاتی ہے وہی حالت اس وقت نرملا کی ہو رہی تھی۔

(۸)

جب کوئی بات ہماری امید کے خلاف ہوتی ہے تبھی افسوس ہوتا ہے۔ منسارام کو نرملا سے کبھی اس بات کی امید نہ تھی کہ وہ اس کی شکایت کرے گی۔ اس لیے اس کو بڑی بے چینی ہو رہی تھی۔ یہ کیوں میری شکایت کرتی ہیں، کیا چاہتی ہیں۔ یہی نا کہ میرے شوہر کی کمائی کھاتا ہے۔ اس کے پڑھانے لکھانے میں روپے خرچ ہوتے ہیں۔ کپڑے پہنتا ہے۔ وہ یہی چاہتی ہوں گی کہ یہ گھر میں نہ رہے۔ میرے نہ رہنے سے ان کے روپے بچ جائیں گے۔ وہ مجھ سے بہت خوش رہتی ہیں۔ میں نے کبھی ان کے مُنہ سے سخت الفاظ نہیں سُنے۔ کیا سب بناوٹ ہے؟ ہوسکتا ہے۔ چڑیا کو جال میں پھنسانے سے پہلے شکاری دانے بکھیرتا ہے۔ آہ! میں نہ جانتا تھا کہ دانے کے نیچے جال ہے۔ یہ مہرمادری صرف میری جلاوطنی کی تمہید ہے۔

اچھا، میرا یہاں رہنا اُنھیں کیوں بُرا لگتا ہے؟ جو اُن کا شوہر ہے کیا وہ میرا باپ نہیں؟ کیا باپ بیٹے کا رشتہ عورت مرد کے رشتے سے کچھ کم مضبوط ہے۔ اگر مجھے ان کے مختارِکل ہونے سے حسد نہیں ہوتی وہ جو چاہیں کریں، میں مُنہ نہیں کھول سکتا۔ تو وہ مجھے محبتِ پدری سے کیوں محروم کرنا چاہتی ہیں؟ وہ اپنی سلطنت میں کیوں انگل بھر زمین بھی نہیں دینا چاہتیں؟ آپ پختہ محل میں رہ کر کیوں مجھے درخت کے سایہ میں بیٹھے نہیں دیکھ سکتیں؟

ہاں وہ سمجھتی ہوں گی کہ یہ بڑا ہوکر میرے شوہر کے سرمایہ کا مالک ہوجائے گا۔ پس اس کو ابھی سے نکال باہر کرنا اچھا ہے۔ ان کو کیسے یقین دلاؤں کہ میری جانب سے ایسا شبہہ نہ کریں۔ انھیں کیونکر بتاؤں کہ منسارام زہر کھاکر جان دے دے گا۔ اس سے قبل کہ وہ ان کا نقصان کرے۔ اُسے خواہ کتنی ہی تکلیفیں برداشت کرنی پڑیں، وہ ان کے دل کا کانٹا نہ بنے گا۔یوں تو والد صاحب نے مجھے پیدا کیا ہے اور اب بھی مجھ پر ان کی شفقت کم نہیں ہے۔ لیکن کیا میں اتنا بھی نہیں جانتا کہ جس دن والد صاحب نے ان سے شادی کی۔ اسی دن انھوں نے ہم کو دل سے باہر نکال دیا۔ اب ہم یتیموں کی طرح یہاں پڑے رہ سکتے ہیں۔ اس مکان میں ہمارا کوئی اختیار نہیں ہے۔ شاید پُورو جنم سے سنسکاروں کی بدولت

یہاں دیگر یتیموں سے ہماری حالت کچھ بہتر ہے۔ مگر ہیں ہم یتیم ہی! ہم اسی دن یتیم ہوئے جس دن اماں جی پرلوک سدھاریں۔ جو کچھ کسر رہ گئی تھی، وہ اس شادی نے پوری کردی۔ میں تو خود پہلے ان سے کوئی خاص تعلق نہ رکھتا تھا اگر ان ہی دنوں باپ سے میری شکایت کی ہوتی تو شاید مجھے اس قدر ملال نہ ہوتا۔ میں تو اس صدمہ کے لیے تیار بیٹھا تھا۔ دنیا میں کیا کہیں میرا ٹھکانا نہیں؟ کیا میں مزدوری بھی نہیں کرسکتا؟ لیکن انھوں نے چوٹ بُرے وقت میں کی۔ درندے بھی آدمی کو غافل پاکر ہی چوٹ کرتے ہیں۔ اس لیے میری آؤبھگت ہوتی تھی۔ کھانا کھانے کے لیے اُٹھنے میں ذرا بھی دیر ہوجاتی تھی تو بلاوے آتے تھے۔ ناشتہ کے لیے علی الصباح تازہ حلوا پکایا جاتا تھا۔ برابر پوچھا جاتا تھا کہ روپیوں کی ضرورت تو نہیں ہے؟ اس لیے یہ ایک سو ساٹھ روپے کی گھڑی منگوائی گئی تھی۔

مگر کیا انھیں کوئی دوسری شکایت نہ سوجھی کہ مجھے آوارہ کہا؟ آخر انھوں نے میری کیا آوارگی دیکھی؟ وہ کہہ سکتی تھیں کہ اس کا جی پڑھنے لکھنے میں نہیں لگتا ایک نہ ایک چیز کے لیے روزانہ روپے مانگتا رہتا ہے۔ یہی ایک بات انھیں کیوں سوجھی؟ شاید اس لیے کہ یہی سب سے سخت حملہ ہے جو وہ مجھ پر کرسکتی ہیں۔ اول بار ہی انھوں نے مجھ پر آگ بھرا تیر سر کردیا جس سے کہیں پناہ نہیں۔ اس لیے نہ کہ یہ باپ کی نظروں میں گرجائے۔ مجھے بورڈنگ ہاؤس میں رکھنے کا تو ایک حیلہ تھا۔ مطلب یہی تھا کہ اس کو دودھ کی مکھی کی طرح نکال دیاجائے۔ دوچار ماہ بعد خرچ بھی دینا بند کردیاجائے۔ پھر یہ خواہ مرے یا جیے۔ اگر میں جانتا کہ یہ ترغیب ان کی جانب سے ہوئی ہے تو کہیں جگہ نہ رہنے پر بھی جگہ نکال لیتا۔ نوکروں کی کوٹھڑیوں میں تو جگہ مل جاتی۔ برآمدہ میں پڑے رہنے کے لیے بہت جگہ مل جاتی!

خیر اب بھی سویرا ہے۔ جب محبت ہی نہیں رہی تو صرف پیٹ بھرنے کے لیے یہاں پڑا رہنا بے حیائی ہے۔ یہ اب میرا گھر نہیں ہے۔ اسی گھر میں پیدا ہوا ہوں۔ یہیں کھیلا ہوں مگر یہ اب میرا نہیں۔ والد صاحب بھی میرے والد نہیں ہیں۔ میں ان کا بیٹا ہوں۔ مگر وہ میرے باپ نہیں ہیں۔ دنیا کے سارے رشتے محبت کے رشتے ہیں۔ جہاں محبت نہیں، وہاں کچھ نہیں، ہائے اماں تم کہاں ہو؟

یہ سوچ کر منسارام رونے لگا۔ جوں جوں مہرمادری کی یاد تازہ ہوتی تھی، اس کے

آنسو امنڈے آتے تھے۔ وہ کئی بار "اماں اماں" پکار اُٹھا۔ گویا وہ کھڑی سُن رہی ہو۔ ماں کے نہ ہونے کے غم کا آج اس کو پہلی بار تجربہ ہوا۔ وہ خوددار تھا۔ ہمتی تھا۔ مگر اب تک نازونعمت سے پرورش پانے کے سبب وہ اس وقت اپنے کو بے یارو مددگار سمجھ رہا تھا۔

رات کے دس بج گئے تھے۔ منشی جی آج کہیں دعوت کھانے گئے ہوئے تھے۔ دو بار مہری منسارام کو کھانے کے لیے بلانے آچکی تھی۔ منسارام نے آخر بار اس سے جھلاکر کہہ دیا تھا۔ "مجھے بھوک نہیں ہے میں کچھ نہ کھاؤں گا۔ بار بار سر پر آکر سوار ہوجاتی ہے۔" اس لیے جب نرملا نے اسے اسی کام پر بھیجنا چاہا۔ تو وہ نہ گئی۔ بولی۔ "بہوجی۔ وہ میرے بلانے سے نہیں آئیں گے۔"

نرملا۔ آئیں گے کیوں نہیں، جاکر کہہ دے کھانا ٹھنڈا ہوا جاتا ہے دو ہی چار لقمے کھالیں۔

مہری۔ میں سب کہہ کر ہار گئی۔ نہیں آتے۔

نرملا۔ تو نے کہا تھا کہ وہ بیٹھی ہوئی ہیں؟

مہری۔ نہیں بہوجی۔ یہ تو میں نے نہیں کہا تھا۔ جھوٹ کیوں بولوں؟

نرملا۔ اچھا تو جاکر یہی کہہ دینا کہ وہ بیٹھی تمھاری راہ دیکھ رہی ہیں تم نہ کھاؤگے تو وہ رسوئی اُٹھاکر سو رہیں گی۔ میری بُھنگی اب کی اور چلی جا (ہنس کر) نہ آئیں تو گود میں اُٹھا لانا۔

بُھنگی ناک بھوں سکیڑتی گئی۔ مگر ایک ہی لمحہ میں آکر بولی۔"ارے بہوجی، وہ تو رو رہے ہیں۔ کسی نہ کچھ کہا ہے کیا؟"

نرملا اس طرح چونک کر اُٹھی اور دوتین قدم آگے چلی گویا کسی ماں نے اپنے بیٹے کے کنوئیں میں گر پڑنے کی خبر پائی ہو۔ پھر وہ ٹھٹک گئی۔ اور بھنگی سے بولی۔ "رو رہے ہیں۔تم نے پوچھا نہیں کیوں رو رہے ہیں؟"

بُھنگی۔ نہیں بہوجی! یہ تو میں نے نہیں پوچھا۔ جھوٹ کیوں بولوں؟

وہ رو رہے ہیں۔ اس پُرسکون شب میں تنہا بیٹھے ہوئے وہ رو رہے ہیں۔ ماں کی یاد آئی ہوگی۔ کیسے جاکر انھیں سمجھاؤں؟ ہائے کیسے سمجھاؤں۔ یہاں تو چھینکتے ہوئے ناک کٹتی ہے۔ ایشور تم گواہ ہو اگر میں نے کبھی انھیں بھول کر بھی کچھ کہا ہو تو میرے آگے آئے۔ میں کیا کروں۔ وہ دل میں سمجھتے ہوں گے کہ اسی نے باپ سے میری شکایت کی

ہو گی۔ کیسے یقین دلاؤں کہ میں نے تمھارے خلاف کبھی ایک لفظ بھی منہ سے نہیں نکالا۔ اگر میں ایسے دیوتا کی سی عادت والے لڑکے کا بُرا چیتوں تو مجھ سے بڑھ کر چڑیل سنسار میں نہ ہو گی۔

نرملا دیکھتی تھی کہ منسارام کی صحت روز بروز گرتی جاتی ہے۔ وہ روز بروز کمزور ہوتا جاتا ہے۔ اس کے چہرے کی رونق دن بدن مدھم پڑتی جاتی ہے۔ اس کا خوشنما بدن خشک ہوتا جاتا ہے۔ اس کا سبب بھی اس سے پوشیدہ نہ تھا۔ مگر وہ اس بارے میں اپنے شوہر سے کچھ کہہ نہ سکتی تھی۔ یہ سب دیکھ دیکھ کر اس کا دل تڑپا کرتا تھا۔ مگر اس کی زبان نہ کھلتی تھی وہ کبھی کبھی دل میں جھنجھلاتی کہ منسارام کیوں ذرا سی بات پر اتنا رنج کرتا ہے۔ کیا ان کے آوارہ کہنے سے وہ آوارہ ہو گیا۔ میری بات ہے۔ ایک ذرا سا شک مجھے تباہ کر سکتا ہے۔ مگر اسے ایسی باتوں کی اتنی کیا پرواہ؟

اس کے دل میں زبردست تحریک ہوئی کہ جاکر انھیں چپ کراؤں اور لاکر کھانا کھلادوں۔ بے چارے رات بھر بھوکے پڑے رہیں گے۔ ہائے میں ہی تو اس فساد کی جڑ ہوں میرے آنے سے پہلے اس گھر میں امن و امان تھا۔ باپ بچّوں پر جان دیتا تھا۔ بچّے باپ کو پیار کرتے تھے میرے آتے ہی سارے جھگڑے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کا نتیجہ کیا ہوگا؟ بھگوان ہی جانیں۔ بھگوان مجھے موت بھی نہیں دیتے۔ بے چارہ اکیلا بھوکا پڑا ہے۔ اُس وقت بھی منہ جوٹھا کرکے اُٹھ گیا تھا۔ اور پھر اس کا کھانا ہی کیا ہے۔ جتنا وہ کھاتا ہے اتنا تو سال دوسال کے بچّے کھاجاتے ہیں۔

نرملا چلی۔ شوہر کی مرضی کے خلاف چلی۔ جو رشتے میں اس کا بیٹا ہوتا تھا۔ اسی کو منانے جاتے اس کا دل کانپ رہا تھا۔ اس نے پہلے رکمنی کے کمرہ کی طرف دیکھا وہ کھانا کھاکر بے خبر سورہی تھی۔ پھر باہر کے کمرے کی طرف گئی۔ وہاں بھی سناٹا تھا۔ منشی جی ابھی نہ آئے تھے، یہ سب دیکھ بھال کر وہ منسارام کے کمرہ کے سامنے جا پہنچی۔ کمرہ کھلا ہوا تھا۔ منسارام ایک کتاب سامنے رکھے میز پر سر جھکائے بیٹھا تھا۔ گویا رنج و تفکر کا زندہ مجسمہ ہو۔ نرملا نے پکارنا چاہا۔ مگر اس کے مُنہ سے آواز نہ نکلی۔

دفعتاً منسارام نے سر اُٹھاکر دروازہ کی طرف دیکھا۔ نرملا کو دیکھ کر وہ اندھیرے میں پہچان نہ سکا۔ چونک کر بولا۔ ''کون؟''

نرملا نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ "میں ہوں۔ کھانا کھانے کیوں نہیں چل رہے ہو؟ کتنی رات گئی؟

منسارام نے مُنہ پھیر کر کہا۔ "مجھے بھوک نہیں ہے۔"

نرملا۔ یہ تو میں تین بار بُھنگی سے سُن چکی ہوں۔

منسارام۔ تو چوتھی بار میرے مُنہ سے سُن لیجیے۔

نرملا۔ شام کو بھی تو کچھ نہیں کھایا تھا۔ بھوک کیوں نہیں لگی؟

منسارام نے طنز کی ہنسی ہنس کر کہا۔ "بہت بھوک لگے گی تو آئے گا کہاں سے؟"

یہ کہہ کر منسارام نے کمرہ کا دروازہ بند کرنا چاہا۔ لیکن نرملا کواڑ کو ہٹاکر کمرہ میں داخل ہوگئی۔ اور منسارام کا ہاتھ پکڑکر بادیدۂ نم عاجزی کے لہجہ میں بولی۔ "میرے کہنے سے چل کر تھوڑا سا کھا لو۔ تم نہ کھاؤگے تو میں بھی جاکر سو رہوں گی۔ دوہی لقمے کھانا۔ کیا مجھے رات بھر بھوکوں مارنا چاہتے ہو؟

منسارام سوچ میں پڑگیا۔ ابھی تک اس نے بھی کھانا نہیں کھایا؟ میرے ہی انتظار میں بیٹھی رہی۔ یہ محبت اور انکسار کی دیوی ہے یا حسد اور نحوست کی دھوکا دینے والی عورت؟ اسے اپنی ماں کی یاد آگئی۔ جب وہ روٹھ کر جاتا تھا تو وہ بھی اسی طرح منانے آیا کرتی تھیں اور جب تک وہ نہ جاتا تھا وہاں سے اُٹھنے کا نام نہ لیتی تھیں۔ وہ اس التجا کو نامنظور نہ کرسکا۔ بولا۔ "میرے لیے آپ کو اتنی تکلیف ہوئی۔ اس کا مجھے افسوس ہے۔ اگر میں جانتا کہ آپ میرے انتظار میں بھوکی بیٹھی ہیں تو کبھی کا کھا آیا ہوتا۔

نرملا نے حقارت کے انداز سے کہا۔ "یہ تم کیسے سمجھ سکتے تھے کہ تم بھوکے رہوگے اور میں کھاکر سو رہوں گی؟ کیا سوتیلی ماں کا ناطہ ہونے ہی سے میں اتنی خودغرض ہوجاؤں گی؟"

دفعتاً باہر کے کمرہ میں منشی جی کے کھانسنے کی آواز آئی۔ ایسا معلوم ہوا کہ وہ منسارام کے کمرہ کی طرف آرہے ہیں۔ نرملا کے چہرہ کا رنگ فق ہوگیا۔ وہ فوراً کمرہ سے نکل گئی۔ اور اندر جانے کا موقعہ نہ پاکر سخت لہجہ میں بولی۔ "میں لونڈی نہیں ہوں کہ اتنی رات تک کسی کے لیے رسوئی خانہ کے دروازہ پر بیٹھی رہوں۔ جسے نہ کھانا ہو وہ پہلے ہی کہہ دیا کرے۔" منشی جی نے نرملا کو وہاں کھڑے دیکھا۔ اندھیرے میں یہ کیا کرنے یہاں آگئی۔

بولے۔ "یہاں کیا کر رہی ہو؟" نرملا نے کرخت آواز میں کہا۔ "کیا کررہی ہوں، اپنے نصیبوں کو رو رہی ہوں۔ بس ساری برائیوں کی جڑ میں ہی ہوں۔ کوئی ادھر روٹھا بیٹھا ہے کوئی اُدھر منہ پُھلائے پڑا ہے۔ کس کس کو مناؤں اور کہاں تک مناؤں۔

منشی جی متعجب ہوکر بولے۔ "بات کیا ہے؟"

نرملا۔ کھانا کھانے نہیں جاتے اور کیا بات ہے۔ دس مرتبہ مہری کو بھیجا آخر آپ دوڑی آئی۔ انھیں تو اتنا کہہ دینا آسان ہے کہ مجھے بھوک نہیں ہے۔ یہاں تو کُل گھر کی لونڈی ہوں۔ ساری دنیا کالکھ لگانے کو تیار ہے۔ کسی کو بھوک نہ ہو مگر کہنے والوں کو یہ کہنے سے کون روکے گا کہ یہ چڑیل کسی کو کھانا نہیں دیتی؟ منشی جی نے منسارام سے کہا۔ "کھانا کیوں نہیں کھالیتے جی، جانتے ہو کیا وقت ہے؟"

منسارام سکتہ میں کھڑا تھا۔ اس کے سامنے ایک کھیل ہورہا تھا۔ جس کا وہ بھید وہ کچھ بھی نہ سمجھ سکتا تھا۔ جن کی آنکھوں میں ایک لمحہ قبل عاجزی کے آنسو بھرے ہوئے تھے۔ ان میں یکایک حسد کی آگ کہاں سے پیدا ہوگئی؟ جن ہونٹوں سے ایک لمحہ قبل امرت کی برشا ہو رہی تھی۔ اُن سے زہر کے قطرے کیوں ٹپکنے لگے۔ اسی سکتہ کی حالت میں بولا۔ "مجھے بھوک نہیں۔" منشی جی نے جھڑک کر کہا۔ "کیوں بھوک نہیں ہے؟ بھوک نہیں تھی تو شام ہی کو کیوں نہ کہلا دیا؟ تمھاری بھوک کے انتظار میں کون تمام رات بیٹھا رہے؟ تم میں پہلے تو یہ عادت نہ تھی۔ روٹھنا کب سے سیکھ لیا؟ جاکر کھا لو۔"

منسارام۔ جی نہیں، مجھے ذرا بھی بھوک نہیں ہے۔

طوطارام نے دانت پیس کر کہا۔"اچھی بات ہے جب بھوک لگے تب کھانا۔" یہ کہتے ہوئے وہ اندر چلے گئے۔ نرملا بھی ان کے پیچھے چلی گئی۔ منشی جی تو لیٹنے چلے گئے۔ اس نے جاکر رسوئی اُٹھا دی اور کلّی کرکے پان کھاکر مسکراتی ہوئی آپہنچی۔ منشی جی نے پوچھا۔ "کھانا کھا لیا نہ؟"

نرملا۔ کیا کرتی؟ کس کے لیے اَن جل چھوڑوں گی؟

منشی جی۔ اُسے نہ جانے کیا ہوگیا ہے، کچھ سمجھ میں ہی نہیں آتا۔ دن بدن گھلتا چلا جاتا ہے۔ دن بھر اسی کمرہ میں پڑا رہتا ہے۔

نرملا کچھ نہ بولی۔ وہ تفکر کے بحر ناپید کنار میں غوطے کھا رہی تھی۔ منسارام نے

میرے تغیر کو دیکھ کر دل میں کیا سمجھا ہوگا؟ کیا اس کے دل میں یہ سوال نہ پیدا ہوا ہوگا۔ کہ باپ کو دیکھتے ہی اس کی تیوریاں کیوں بدل گئیں؟ اس کا سبب بھی کیا اس کی سمجھ میں آگیا ہوگا۔ بے چارہ کھانے آرہا تھا۔ تب تک یہ حضرت نہ جانے کہاں سے پھٹ پڑے۔ اس بھید کو اسے کیوں کر سمجھاؤں سمجھانا ناممکن بھی ہے۔ ہائے بھگوان! میں کس مصیبت میں پھنس گئی؟

سویرے وہ اُٹھ کر گھر کے کام دھندے میں لگی۔ دفعتاً نو بجے بُھنگی نے آکر کہا۔ "منسا بابو تو اپنے کاگد پتر سب یکہ پر لاد رہے ہیں۔"

نرملا نے متحیر ہوکر کہا۔ "یکہ پر لاد رہے ہیں؟ کہاں جاتے ہیں؟"

بُھنگی۔ میں نے پوچھا تو بولے کہ اب سکول ہی میں رہوں گا۔

منسارام علی الصباح اُٹھ کر اپنے اسکول کے ہیڈماسٹر کے پاس گیا تھا۔ اور اپنے رہنے کا بندوبست کر آیا تھا۔ ہیڈماسٹر نے پہلے تو کہا کہ یہاں جگہ نہیں اور تم سے پہلے کے کتنے ہی لڑکوں کی عرضیاں پڑی ہوئی ہیں۔ مگر جب منسا رام نے کہا کہ مجھے جگہ نہ ملے گی تو شاید میرا پڑھنا نہ ہوسکے اور میں امتحان میں شریک نہ ہوسکوں، تو ہیڈماسٹر کو ہار ماننی پڑی۔ منسا رام کے اوّل درجہ میں پاس ہونے کی امید تھی۔ ماسٹروں کو یقین تھا کہ وہ اسکول کی شہرت کو چمکائے گا۔ ہیڈماسٹر صاحب ایسے لڑکے کو کس طرح چھوڑسکتے تھے؟ انھوں نے اپنے دفتر کا کمرہ اس کے لیے خالی کردیا اور منسارام وہاں سے آتے ہی اپنا سامان یکّے پر لادنے لگا۔

منشی جی نے کہا۔"ابھی ایسی کیا عجلت ہے؟ دو چار روز میں چلے جانا۔ میں چاہتا ہوں کہ تمھارے لیے کوئی اچھا باورچی مقرر کردوں۔"

منسارام۔ وہاں کا باورچی بہت عمدہ کھانا پکاتا ہے۔

منشی جی۔ اپنی صحت کا خیال رکھنا ایسا نہ ہو کہ پڑھنے کے پیچھے تندرستی سے ہاتھ دھو بیٹھو۔

منسارام۔ وہاں نو بجے کے بعد کوئی پڑھنے ہی نہیں پاتا ہے اور سب کو قاعدہ کے ساتھ کھیلنا پڑتا ہے۔

منشی جی۔ بستر کیوں چھوڑے دیتے ہو؟ بچھاؤ گے کیا؟

منسارام۔ کمبل لیے جاتا ہوں۔ بستر کی ضرورت نہیں۔

منشی جی۔ کہار جب تک تمھارا سامان رکھ رہا ہے جاکر کچھ کھالو۔ رات بھی تو تم نے کچھ نہیں کھایا تھا۔

منسارام۔ وہیں کھالوں گا۔ باورچی سے کھانا بنانے کو کہہ آیا ہوں۔ یہاں کھانے لگوں گا تو دیر ہوگی۔

گھر میں جیارام اور سیارام بھی بھائی کے ساتھ جانے کو بضد ہو رہے تھے۔ نرملا ان دونوں کو بہلا رہی تھی۔ "بیٹا! وہاں چھوٹے لڑکے نہیں رہتے۔ سب کام اپنے ہی ہاتھ سے کرنا پڑتا......"

یکایک رُکمنی نے آکر کہا۔ "تمھارا پتھر کا کلیجہ ہے۔ مہارانی! لڑکے نے رات بھی کچھ نہیں کھایا۔ اور اس وقت بھی بغیر کھائے پیے چلا جا رہا ہے۔ یہاں تم لڑکوں کو لیے باتیں کر رہی ہو۔ یہ سمجھ لوکہ وہ سکول نہیں جا رہا ہے، بن باس لے رہا ہے۔ لوٹ کر پھر نہ آئے گا۔ وہ ان لڑکوں میں نہیں ہے کھیل میں مار کھا کر بھول جاتے ہیں بات اس کے دل پر پتھر کی لکیر ہوتی ہے۔"

نرملا نے دبی ہوئی آواز میں کہا۔ "کیا کروں جی جی۔ وہ کسی کی سنتے ہی نہیں۔ آپ ذرا جاکر بُلائیں۔ آپ کے بُلانے سے آجائیں گے۔"

رُکمنی۔ آخر ہوا کیا جس پر وہ بھاگا جاتا ہے۔ گھر سے تو اس کا جی کبھی اُچاٹ نہ ہوتا تھا۔ اسے تو اپنے گھر کے سوا اور کہیں اچھا نہ لگتا تھا۔ تمھیں نے اسے کچھ کہا ہوگا، یا اس کی کچھ شکایت کی ہوگی۔ کیوں اپنے لیے کانٹے بورہی ہو؟ رانی! گھر کو مٹی میں ملاکر تم چین سے نہ بیٹھنے پاؤگی۔

نرملا نے رو کر کہا۔ "میں نے انھیں کچھ کہا ہو تو میری زبان کٹ جائے۔ ہاں سوتیلی ہونے کے سبب بدنام تو ہوں۔ آپ کے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ ذرا جاکر انھیں بلا لائیے۔

رُکمنی نے تیز لہجہ میں کہا۔ "تم کیوں نہیں بُلا لاتیں؟ کیا چھوٹی ہوجاؤگی؟ اپنا ہوتا تو کیا اسی طرح بیٹھی رہتیں؟"

نرملا کی حالت اس بلا پَر کے پرندہ کی سی ہورہی تھی، جو سانپ کو اپنی طرف آتے دیکھ کر اُڑنا چاہتا ہے مگر اُڑ نہیں سکتا۔ اُچھلتا ہے اور گر پڑتا ہے۔ پروں کو پھڑپھڑا کر رہ جاتا ہے۔ اس کا دل اندر ہی اندر تڑپ رہا تھا۔ مگر وہ باہر نہ جاسکتی تھی۔

اتنے میں دونوں لڑکے روتے ہوئے اندر آکر بولے۔ ''بھیا جی چلے گئے۔ نرملا بُت بنی کھڑی رہی۔ گویا بے حس ہوگئی ہو۔ چلے گئے۔ گھر میں آئے تک نہیں، مجھ سے ملے تک نہیں چلے گئے! مجھ سے اتنی نفرت! میں ان کی کوئی نہ سہی ان کی بوا تو تھیں۔ ان سے ملنے تو آنا چاہیے تھا۔ میں یہاں تھی نہ! اندر کیسے قدم رکھتے؟ میں دیکھ لیتی نہ! اسی لیے چلے گئے۔

(۹)

منسا رام کے جانے سے گھر سونا ہوگیا۔ دونوں چھوٹے لڑکے اسی سکول میں پڑھتے تھے۔ نرملا ان سے منسارام کا حال پوچھتی، یہ امید تھی کہ تعطیل کے روز وہ آئے گا۔ لیکن جب تعطیل کا دن ختم ہوگیا اور وہ نہ آیا تو نرملا کی طبیعت گھبرانے لگی۔ اس نے اس کے لیے مونگ کے لڈو بنا رکھے تھے۔ سوموار کو صبح بُھنگی کو لڈو دے کر سکول بھیجا۔ نو بجے بُھنگی واپس آئی۔ منسارام نے لڈو جیوں کے تیوں لوٹا دیے تھے۔

نرملا نے پوچھا۔ ''پہلے سے کچھ ہرے ہوئے ہیں، رے؟''

بُھنگی۔ ہرے ورے تو نہیں ہوئے اور سوکھ گئے ہیں۔

نرملا۔ کیا جی اچھا نہیں ہے کیا؟

بُھنگی۔ یہ تو میں نے نہیں پوچھا بہوجی! جھوٹ کیوں بولوں؟ ہاں وہاں کا کہار میرا دیور لگتا ہے۔ وہ کہتا تھا کہ تمھارے بابوجی کی خوراک کچھ نہیں ہے دو پھلکیاں کھاکر اُٹھ جاتے ہیں۔ پھر دن بھر کچھ نہیں کھاتے۔ ہردم پڑھتے ہیں۔

نرملا۔ تو نے پوچھا نہیں کہ لڈو کیوں لوٹائے دیتے ہو؟

بُھنگی۔ یہ تو نہیں پوچھا بہوجی۔ جھوٹ کیوں بولوں؟ انھوں نے کہا کہ اِسے لیتی جا۔ یہاں رکھنے کا کچھ کام نہیں۔ میں لیتی آئی۔

نرملا۔ اور کچھ نہیں کہتے تھے؟ پوچھا نہیں کہ کل کیوں نہیں آئے؟ چھٹی تو تھی۔

بُھنگی۔ بہوجی! جھوٹ کیوں بولوں؟ یہ پوچھنے کی تو مجھے سدھ نہ رہی۔ ہاں یہ کہتے تھے کہ اب تو یہاں کبھی نہ آیا کر، نہ میرے لیے کوئی چیز لانا اور اپنی بہوجی سے کہہ دینا کہ میرے پاس کوئی چٹھی پتر نہ بھیجیں۔ لڑکوں سے بھی میرے پاس کوئی سندیسہ نہ بھیجیں۔ اور ایک بات ایسی کہی بہوجی کہ میرے مُنہ سے نکل نہیں سکتی۔ پھر رونے لگے۔

نرملا۔ کون بات تھی؟ کہہ تو۔

بُھنگی۔ کیا کہوں بہو جی! کہتے تھے کہ میرے جینے کو دھتکار ہے۔ پھر رونے لگے۔

نرملا کے مُنہ سے ایک ٹھنڈی سانس نکل گئی۔ ایسا معلوم ہوا گویا دل بیٹھا جاتا ہے۔ اس کا رواں رواں رونے لگا۔ وہ وہاں بیٹھی نہ رہ سکی۔ جاکر بستر پر مُنہ ڈھانک کر پڑ رہی۔ اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ''وہ بھی جان گئے۔'' یہی آواز اس کے دل میں بار بار گونجنے لگی۔ ''وہ جان گئے۔'' بھگوان! اب کیا ہوگا؟ جس شبہ کی آگ میں وہ جل رہی تھی وہ اب سَو گُنے زور سے دہکنے لگی۔ اسے اپنی کوئی فکر نہ تھی۔ زندگی میں اب آرام کی کیا امید تھی۔ جس کی اسے خواہش ہوتی؟ اس نے اپنے دل کو اس خیال سے سمجھایا تھا کہ یہ میرے اگلے جنم کے پاپوں کا پرائیچت ہے۔ کون شخص ایسا بے حیا ہوگا جو اس حالت میں بہت دن زندہ رہے؟ فرض پر اس نے اپنی زندگی اور اس کی ساری تمنّائیں قربان کردی تھیں۔ دل روتا رہتا تھا۔ مگر ہونٹوں پر ہنسی کا سوانگ بھرنا پڑتا تھا۔ جس کا منہ دیکھنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ اس کے آگے ہنس ہنس کر باتیں کرنی پڑتی تھیں۔ جس بدن کو چھونا اس کو سانپ کے سرد جسم کی طرح معلوم ہوتا تھا۔ اس سے لپٹ کر اس کو جتنی نفرت اور دلی اذیت ہوتی تھی۔ اسے کون جان سکتا ہے؟ اس وقت اس کی یہی خواہش ہوتی تھی، کہ زمین پھٹ جائے اور میں اس میں سما جاؤں۔ لیکن یہ ساری باتیں اپنے ہی تک محدود تھیں اور اپنی فکر کرنا اس نے ترک کردیا تھا۔ لیکن یہ مسئلہ اب بہت زیادہ خوفناک ہوگیا تھا۔ وہ اپنی آنکھوں سے منسارام کی دلی تکلیف کو نہیں دیکھ سکتی تھی۔ منسارام جیسے بیدار مغز اور جری نوجوان پر اس الزام کا جو اثر پڑسکتا تھا۔ اس کے خیال ہی سے اس کی روح لرزجاتی تھی۔ اب خواہ اس پر کتنے ہی شکوک کیوں نہ ہوں، خواہ اسے خودکشی ہی کیوں نہ کرنی پڑے مگر وہ خاموش نہیں بیٹھ سکتی تھی۔ منسارام کی حفاظت کرنے کے لیے وہ بے قرار ہوگئی۔ اس نے تامل اور حیا کی چادر اُتار کر پھینک دینے کا تہیّہ کرلیا۔

وکیل صاحب کھانا کھاکر کچہری جانے کے قبل ایک بار اس سے ضرور مل لیا کرتے تھے۔ ان کے آنے کا وقت ہوگیا تھا۔ آہی رہے ہوں گے۔ یہ سوچ کر نرملا دروازہ پر کھڑی ہوگئی۔ اور ان کا انتظار کرنے لگی۔ لیکن یہ کیا؟ وہ تو باہر چلے جارہے ہیں۔ گاڑی تیار ہو کر آگئی۔ اس کے لیے وہ یہیں سے حکم دیا کرتے تھے۔ تو کیا آج وہ نہ آئیں گے۔ باہر ہی باہر

چلے جائیں گے؟ نہیں، ایسا نہیں ہوسکتا۔ اس نے بھنگی سے جاکر کہا۔ جاکر بابو جی کو بلا لا۔ کہنا ایک ضروری کام ہے سُن لیجیے۔

منشی جی جانے کو تیار ہی تھے۔ یہ پیغام پاکر اندر آئے۔ مگر کمرہ میں نہ آئے۔ دور ہی سے پوچھا۔''کیا بات ہے بھئی، جلد کہہ دو، مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔ ابھی ذرا دیر ہوئی کہ ہیڈماسٹر صاحب کا ایک خط آیا ہے کہ منسارام کو بخار آگیا ہے۔ پس بہتر ہوگا کہ آپ مکان ہی پر اس کا علاج کریں اس لیے اُدھر ہی سے ہوتا ہوا کچہری جاؤں گا۔ تمھیں کوئی خاص بات تو نہیں کہنی ہے؟''

نرملا پر گویا بجلی گر پڑی۔ آنسوؤں کے جوش اور حلق کی آواز میں سخت مقابلہ ہونے لگا۔ دونوں ہی پہلے نکلنے پر تُلے ہوئے تھے۔ دو میں سے کوئی ایک قدم بھی پیچھے نہیں ہٹنا چاہتا تھا۔ آواز کی کمزوری اور آنسوؤں کی طاقت دیکھ کر یہ تصفیہ کرنا مشکل نہ تھا کہ ایک لمحہ یہی مقابلہ جاری رہا۔ تو میدان کس کے ہاتھ رہے گا۔ آخر دونوں ساتھ ساتھ نکلے لیکن باہر آتے ہی طاقت ور نے کمزور کو دبا دیا۔ صرف اتنا منہ سے نکلا۔ ''کوئی خاص بات نہیں تھی۔ آپ تو اُدھر جا ہی رہے ہیں۔''

منشی جی۔ میں نے لڑکوں سے پوچھا تھا تو وہ کہتے تھے کہ کل بیٹھے پڑھ رہے تھے آج نہ جانے کیا ہوگیا؟

نرملا نے جوش سے کانپتے ہوئے کہا۔ "یہ سب آپ ہی کر رہے ہیں۔''

منشی جی نے تیوریاں بدل کر کہا۔''میں کررہا ہوں! میں کیا کررہا ہوں؟''

نرملا۔ اپنے دل سے پوچھیے۔

منشی جی۔ میں نے تو یہی سوچا تھا کہ یہاں اس کا پڑھنے میں جی نہیں لگتا وہاں اور لڑکوں کے ساتھ خواہ مخواہ پڑھے گا۔ یہ کوئی بُری بات نہ تھی۔ اور میں نے کیا کیا؟

نرملا۔ خوب سوچیے! اسی لیے آپ نے ان کو وہاں بھیجا تھا؟ آپ کے دل میں کوئی اور بات نہ تھی؟

منشی جی ذرا ہچکائے۔ اور اپنی کمزوری کو چھپانے کے لیے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بولے۔''اور کیا بات ہوسکتی ہے۔ بھلا تمھیں سوچو۔''

نرملا۔ خیر یہی سہی۔ آپ مہربانی کرکے انھیں آج ہی لیتے آیئے گا۔ وہاں رہنے سے ان کی

بیماری بڑھ جانے کا خوف ہے۔ یہاں جی جی جتنی تیمارداری کر سکتی ہیں دوسرا نہیں کر سکتا۔

ایک لمحہ بعد اس نے سر نیچا کر کے پھر کہا۔ "میرے سبب سے نہ لانا چاہتے ہوں تو میرے گھر مجھے بھیج دیجیے۔ میں وہاں آرام سے رہوں گی۔

منشی جی۔ نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ باہر چلے گئے۔ اور ایک لمحہ بعد گاڑی اسکول کی طرف چل دی۔

دل! تیری کتنی عجیب حالت ہے۔ کتنی پُراسرار، کتنی ناقابلِ فہم! تو کتنی جلد رنگ بدلتا ہے۔ اس فن میں تو ماہر ہے۔ آتشباز کی چرخی کو بھی رنگ بدلتے کچھ دیر لگتی ہے۔ مگر تجھے ایسا کرنے میں اس کا ایک لاکھواں حصہ وقت بھی نہیں۔ جہاں ابھی محبت تھی وہاں پھر شک نے جگہ قائم کر لی!

وہ سوچتے تھے کہ کہیں اس نے بہانہ تو نہیں کیا ہے!

(۱۰)

منسارام دوروز تک گہری فکر میں پڑا رہا۔ اس کو باربار اپنی ماں کی یاد آتی تھی۔ نہ کھانا اچھا معلوم ہوتا اور نہ پڑھنے ہی میں طبیعت لگتی۔ اس کی کایاپلٹ سی ہو گئی۔ دو روز گزر گئے اور بورڈنگ ہاؤس میں رہتے ہوئے بھی اس نے وہ کام نہ کیا جو سکول ماسٹروں نے گھر سے کر لانے کو دیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسے بنچ پر کھڑا رہنا پڑا۔ جو بات کبھی نہ ہوئی تھی وہ آج ہو گئی۔ یہ ناقابلِ برداشت ذلت بھی اسے برداشت کرنی پڑی۔

تیسرے روز وہ انھیں تفکرات میں ڈوبا ہوا اپنے دل کو سمجھا رہا تھا۔ کیا دنیا میں صرف میری ہی ماں مری ہے؟ سوتیلی مائیں تو سبھی اسی قسم کی ہوتی ہیں۔ میرے ساتھ کوئی نئی بات نہیں ہورہی ہے۔ اب مجھے مردوں کی طرح دونی محنت سے اپنا کام کرنا چاہیے۔ جیسے ماں باپ راضی ہوں۔ ویسے راضی رکھنا چاہیے۔ امسال اگر وظیفہ مل گیا تو مجھے گھر سے کچھ لینے کی ضرورت ہی نہ رہے گی۔ کتنے ہی لڑکے اپنے ہی بل پر بڑے بڑے خطابات حاصل کر لیتے ہیں۔ مشکلات پر فتح پانا اور موقعہ دیکھ کر کام کرنا ہی انسانوں کا فرض ہے۔ قسمت کے نام پر روتے اور کوسنے سے کیا ہوتا ہے۔

اتنے میں جیارام آکر کھڑا ہو گیا۔ منسارام نے پوچھا۔ گھر کا کیا حال ہے جیا؟ نئی اماں

تو بہت خوش ہوں گی؟

جیارام۔ ان کے دل کا حال تو میں نہیں جانتا۔ لیکن جب سے تم آئے ہو انھوں نے ایک وقت بھی کھانا نہیں کھایا۔ جب دیکھو تب رویا کرتی ہیں۔ جب بابوجی آتے ہیں، تب البتہ ہنسنے لگتی ہیں۔ تم چلے آئے تو میں نے بھی شام کو اپنی کتابیں ٹھیک کیں۔ یہیں تمھارے ساتھ رہنا چاہتا تھا۔ بھنگی چڑیل نے جاکر اماں جی سے کہہ دیا۔ بابوجی بیٹھے تھے کہ ان کے سامنے ہی اماں جی نے آکر میری کتابیں چھین لیں اور بولیں۔ "تم بھی چلے جاؤگے تو اس گھر میں کون رہے گا؟ اگر میری وجہ سے تم لوگ گھر چھوڑ چھوڑ کر بھاگے جارہے ہو تو میں ہی کہیں چلی جاتی ہوں۔" میں جھلایا ہوا تھا ہی، بگڑ کر بولا۔ "آپ کیوں چلی جائیں گی؟ آپ کا تو گھر ہے آپ آرام سے رہیے۔ غیر تو ہمیں لوگ ہیں۔ ہم نہ رہیں گے، تب تو آپ کو آرام ہی رہے گا۔"

منسارام۔ تم نے خوب کہی۔ بہت ہی اچھا کہا۔ اس پر اور بھی بگڑی ہوں گی۔ اور جاکر بابوجی سے شکایت کی ہوگی۔

جیارام۔ نہیں۔ یہ کچھ نہیں ہوا۔ بے چاری زمین پر بیٹھ کر رونے لگیں۔ مجھے بھی رونا آگیا میں بھی رو پڑا۔ تب انھوں نے آنچل سے میرے آنسو پونچھے۔ اور بولیں۔ "جیا میں ایشور کی ساکھی دے کر کہتی ہوں کہ میں نے تمھارے بھیا کے بارے میں تمھارے بابوجی سے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ میرے بھاگ میں کلنک لکھا ہے۔ وہ بھوگ رہی ہوں۔ پھر اور نہ جانے کیا کیا کہا۔ جو میری سمجھ میں نہیں آیا۔ کچھ بابوجی کی بات تھی۔

منسارام نے بے صبری سے پوچھا۔ "بابوجی کے بارے میں کیا کہا؟ کچھ یاد ہے؟"

جیا رام۔ باتیں تو بھیّا مجھے یاد نہیں آتیں۔ میری یادداشت کون بڑی اچھی ہے۔ مگر ان کی باتوں کا مطلب کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انھیں بابوجی کو خوش رکھنے کے لیے یہ سوانگ بھرنا پڑرہا ہے۔ نہ جانے دھرم اَدھرم کی کیسی باتیں کرتی تھیں۔ جو میں بالکل نہ سمجھ سکا۔ مجھے تو اب اس کا یقین ہوگیا ہے کہ ان کی مرضی تمھیں یہاں بھیجنے کی نہ تھی۔

منسارام۔ تم ان چالوں کا مطلب نہیں سمجھ سکتے، یہ بڑی گہری چالیں ہیں۔

جیارام۔ تمھاری سمجھ میں ہوں گی۔ میری سمجھ میں تو نہیں ہیں۔
منسارام۔ جب تم جیومیٹری نہیں سمجھ سکتے تو ان باتوں کو کیا سمجھوگے۔ اس رات کو جب مجھے کھانے کے لیے بلانے آئی تھیں اور میں ان کے اصرار پر جانے کو تیار بھی ہوگیا تھا۔ اس وقت بابوجی کو دیکھتے ہی انھوں نے جو رنگ بدلا۔ وہ کیا میں کبھی بھول سکتا ہوں۔
جیارام۔ یہی بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔ ابھی کل ہی میں یہاں سے گیا تو تمھارا حال پوچھنے لگیں۔ میں نے کہا۔ وہ تو کہتے تھے کہ اب کبھی اس گھر میں قدم نہ رکھوں گا۔ میں نے کچھ جھوٹ تو کہا نہیں۔ کیونکہ تم نے مجھ سے ایسا کہا ہی تھا۔ اتنا سننا تھا کہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ میں دل میں بہت پچھتایا کہ کہاں سے میں نے یہ بات کہہ دی۔ بار بار یہی کہتی تھیں کہ کیا وہ میرے کارن گھر چھوڑ دیں گے؟ مجھ سے اتنے ناراض ہیں، چلے گئے اور مجھ سے ملے تک نہیں! کھانا تیار تھا۔ کھانے تک نہیں آئے۔ ہائے میں کیا بتاؤں کس مصیبت میں ہوں۔ اتنے میں بابوجی آگئے۔ بس فوراً آنسو پونچھ کر مسکراتی ہوئی ان کے پاس چلی گئیں۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔ آج مجھ سے بڑی منت کی کہ ان کو ساتھ لیتے آنا۔ آج میں تمھیں کھینچ کر لے چلوں گا۔ دو دن میں وہ کتنی دُبلی ہوگئی ہیں۔ تمھیں ان کو دیکھ کر رحم آئے گا۔ تو چلوگے نا؟"
منسارام نے کچھ جواب نہ دیا۔ اس کے پیر کانپ رہے تھے۔ جیارام تو حاضری کی گھنٹی سُن کر بھاگا۔ مگر وہ بنچ پر لیٹ گیا۔ اور اتنی گہری سانس لی۔ گویا بہت دیر سے اس نے سانس نہیں لی تھی۔ اس کی زبان سے دلی درد میں ڈوبے ہوئے یہ الفاظ نکلے۔"ہائے ایشور۔" اس نام کے سوا اُسے اب اپنی زندگی میں کوئی یارو مددگار نہ نظر آتا تھا۔ اس ایک فقرے میں کتنی مایوسی، کتنا درد، کتنی محبت، کتنی عاجزی بھری ہوئی تھی۔ اس کا کون اندازہ کرسکتا ہے۔ اب سارا بھید اس کی سمجھ میں آرہا تھا۔ اور بار بار اس کے درد بھرے دل سے یہ الفاظ نکل رہے تھے۔ "ہائے ایشور! اتنا بڑا کلنک!" کیا زندگی میں اس سے سخت تر مصیبت کا قیاس کیا جاسکتا ہے؟ کیا دنیا میں اس سے زیادہ کمینہ پن کا خیال ہو سکتا ہے؟ آج تک کسی باپ نے اپنے بیٹے پر اتنا بُرا کلنک نہ لگایا ہوگا۔ جس کے چال چلن کی سبھی تعریف کرتے

تھے جو دوسرے لڑکوں کے لیے معیار سمجھا جاتا تھا۔ جس نے کبھی ناپاک ارادوں کو اپنے پاس تک نہیں پھٹکنے دیا تھا۔ اسی پر یہ سنگین الزام! منسارام کو ایسا معلوم ہوا گویا اس کا دل شق ہوا جاتا ہے۔

دوسری گھنٹی بج گئی۔ لڑکے اپنے اپنے کمروں میں گئے۔ مگر منسارام ہتھیلی پر سر رکھے بلا پلک جھپکائے ہوئے زمین کی طرف تاک رہا تھا۔ گویا اس کا سب کچھ پانی میں ڈوب گیا ہو۔ گویا وہ کسی کو منہ نہ دکھلا سکتا ہو۔ سکول میں غیر حاضری ہوجائے گی۔ جرمانہ ہوجائے گا۔ اس کی اسے فکر نہیں۔ جب اس کا سب کچھ لٹ گیا تو اب ان ذرا ذرا سی باتوں کا کیا خوف؟ اتنا بڑا کلنک لگنے پر بھی اگر جیتا رہوں تو میرے جینے پر لعنت ہے۔

اسی رنج و غم کی حالت میں وہ چلا اُٹھا۔ "ماتا جی تم کہاں ہو؟ تمھارا بیٹا جس پر تم جان دیتی تھیں۔ جسے تم اپنی زندگی کا سہارا سمجھتی تھیں، آج سخت مصیبت میں ہے۔ اسی کا باپ اس کے حلق پر چھری پھیر رہا ہے۔ ہائے تم کہاں ہو؟"

منسارام پھر ٹھنڈے دل سے سوچنے لگا۔ مجھ پر یہ شبہہ کیوں ہو رہا ہے؟ اس کا کیا سبب ہے؟ مجھ میں ایسی کون سی بات انھوں نے دیکھی جس سے انھیں یہ شبہہ ہوا؟ وہ میرے باپ ہیں۔ میرے دشمن نہیں ہیں۔ جو خواہ مخواہ مجھ پر الزام عائد کریں۔ ضرور انھوں نے کوئی نہ کوئی بات دیکھی یا سُنی ہے۔ ان کا مجھ پر کتنا پیار تھا۔ میرے بغیر کھانے نہ جاتے تھے وہی میرے دشمن ہوجائیں یہ بات بلا سبب نہیں ہوسکتی۔

اچھا۔ اس شک کی ابتدا کس دن ہوئی؟ مجھے بورڈنگ میں ٹھہرانے کی بات تو پیچھے کی ہے۔ جس دن رات کو وہ میرے کمرہ میں آکر میرا امتحان لینے لگے تھے۔ اسی دن ان کی تیوریاں بدلی ہوئی تھیں۔ اس دن ایسی کون سی بات ہوئی۔ جو انھیں بُری لگی ہو؟ میں نئی اماں سے کچھ کھانے کو مانگنے گیا تھا۔ بابو جی اس وقت وہاں بیٹھے تھے۔ ہاں اب یاد آتا ہے۔ اسی وقت ان کا چہرہ تمتما گیا تھا۔ اسی دن سے نئی اماں نے مجھ سے پڑھنا چھوڑ دیا تھا۔ اگر میں جانتا کہ میرا گھر میں آنا جانا، اماں جی سے کچھ کہنا سُننا اور انھیں پڑھانا لکھانا والد صاحب کو بُرا لگتا ہے۔ تو آج کیوں یہ نوبت آتی؟ اور نئی اماں؟ ان پر کیا بیت رہی ہوگی؟

منسارام نے اب تک نرملا کی طرف توجہ نہیں کی تھی۔ نرملا کا دھیان آتے ہی اس کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ ہائے ان کا سادہ اور محبت بھرا دل یہ صدمہ کیسے برداشت کرسکے

گا میں کتنے دھوکے میں تھا؟ میں ان کی محبت کو فریب سمجھتا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ انھیں والد صاحب کی بدگمانی دور کرنے کے لیے میرے ساتھ اتنا کڑا برتاؤ کرنا پڑتا ہے۔ آہ میں نے ان پر کتنا بڑا ظلم کیا ہے؟ ان کی حالت تو مجھ سے ابتر ہو رہی ہوگی۔ میں تو یہاں چلا آیا۔ مگر وہ کہاں جائیں گی؟ جیا کہتا تھا کہ انھوں نے دور روز سے کھانا نہیں کھایا۔ ہردم رویا کرتی ہیں کیسے جاکر سمجھاؤں؟ وہ مجھ بدنصیب کے لیے کیوں اپنے سر پر مصیبت لے رہی ہیں؟ وہ کیوں باربار میرا حال پوچھتی ہیں؟ کیوں باربار مجھے بلاتی ہیں؟ کیسے کہہ دوں کہ اماں! تم سے مجھے ذرا بھی شکایت نہیں۔ تمھاری طرف سے میرا دل صاف ہے۔ وہ اب بھی بیٹھی رو رہی ہوں گی۔ کتنا بڑا اندھیر ہے؟ بابوجی کو یہ کیا ہوگیا؟ کیا اسی لیے شادی کی تھی؟ ایک لڑکی کو ہلاک کرنے ہی کے لیے اسے اپنے گھر لائے تھے؟ اس نازک پھول کو مسل ڈالنے ہی کے لیے توڑا تھا؟ ان کا اودھار کیسے ہوگا؟ اس بے گناہ کا مُنہ کیسے اُجلا ہوگا؟ انھیں صرف میرے ساتھ محسبتانہ برتاؤ کرنے کے لیے یہ سزا دی جارہی ہے۔ ان کی شرافت کا انھیں یہ صلہ مل رہا ہے۔ میں انھیں اِس اِس طرح بے رحمانہ وار سہتے ہوئے دیکھ کر بیٹھا رہوں گا؟ اپنی عزت بچانے کے لیے نہ سہی، ان کی جان بچانے کے لیے مجھے اپنی زندگی کو قربان کرنا پڑے گا۔ اس کے سوا نجات کا اور کوئی ذریعہ نہیں۔ آہ! دل میں کیسے کیسے ارمان تھے۔ ان سب کو خاک میں ملا دینا ہوگا۔ ایک عصمت کی دیوی پر شبہہ کیا جارہا ہے اور میرے سبب! مجھے اپنی جان دے کر اس کی حفاظت کرنی ہوگی۔ یہی میرا فرض ہے اسی میں سچّی بہادری ہے! ماتا، میں اپنے خون سے اس داغ کو دھو دوں گا۔ اسی میں میرا تمھارا دونوں کا بھلا ہے۔

وہ تمام دن ان ہی خیالات میں محو رہا۔ شام کو اس کے دونوں بھائی آکر گھر چلنے کے لیے اصرار کرنے لگے۔

سیارام۔ چلتے کیوں نہیں؟ میرے بھیا جی چلے چلو نہ۔

منسارام۔ مجھے فرصت نہیں ہے کہ تمھارے کہنے سے چلا چلوں۔

جیارام۔ آخر کل تو اتوار ہی ہے۔

منسارام۔ اتوار کو بھی کام ہے۔

جیارام۔ اچھا، کل آؤگے نا؟

منسارام۔ نہیں کل مجھے ایک میچ میں جانا ہے۔

سیارام۔ اماں جی مونگ کے لڈو بنا رہی ہیں۔ نہ چلوگے تو ایک بھی نہ پاؤگے۔ ہم تم مل کر کھا جائیں گے جیا! انھیں نہ دیں گے۔

جیارام۔ بھیا اگر تم کل نہ گئے تو شاید اماں جی یہیں چلی آئیں۔

منسارام۔ سچ؟ نہیں، ایسا کیا کریں گی، یہاں آئیں تو بڑی پریشانی ہوگی۔ تم کہہ دینا وہ کہیں میچ دیکھنے گئے ہیں۔

جیارام۔ میں جھوٹ کیوں بولنے لگا؟ میں کہہ دوں گا۔ وہ منہ پھلائے بیٹھے تھے۔ دیکھ لینا اُنھیں ساتھ لاتا ہوں کہ نہیں۔

سیارام۔ ہم کہہ دیں گے آج پڑھنے نہیں گئے۔ پڑے سوتے رہے۔

منسارام نے ان دونوں سے کل آنے کا وعدہ کرکے گلا چھڑایا۔ جب دونوں چلے گئے تو پھر سوچ میں پڑ گیا۔ ساری رات اسے کروٹیں بدلتے گزری۔ تعطیل کا دن بھی بیٹھے ہی بیٹھے گزر گیا۔ اسے تمام دن یہی خیال ہوتا رہا کہ اماں جی واقعی نہ چلی آئیں۔ کسی گاڑی کی کھڑکھڑاہٹ سنتا تو اس کا دل دھڑکنے لگتا۔ کہیں آتو نہیں گئیں؟

بورڈنگ ہاؤس میں ایک چھوٹا سا ہسپتال تھا۔ ایک ڈاکٹر صاحب شام کے وقت ایک گھنٹہ کے لیے آجایا کرتے تھے۔ اگر کوئی، لڑکا بیمار ہوتا تو اسے دوا دیتے۔ آج وہ آئے تو منسارام کچھ سوچتا ہوا ان کے پاس جا کھڑا ہوا۔ وہ منسارام کو بخوبی جانتے تھے۔ اسے دیکھ کر تعجب سے بولے۔ ''یہ تمھاری کیا حالت ہے جی؟ تم تو گلے سے جا رہے ہو۔ کہیں بازار کا چسکا تو نہیں پڑ گیا۔ آخر تمھیں ہوا کیا؟ ذرا یہاں تو آؤ۔''

منسارام نے مسکراکر کہا۔ ''مجھے زندگی کا مرض ہے۔ آپ کے پاس اس کی بھی کوئی دوا ہے؟''

ڈاکٹر۔ میں تمھاری تشخیص کرنا چاہتا ہوں۔ تمھاری تو صورت ہی بدل گئی ہے۔ پہچانے بھی نہیں جاتے۔

یہ کہہ کر انھوں نے منسارام کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور سینہ، پیٹھ، آنکھیں، زبان سب باری باری سے دیکھیں۔ تب متوحش ہوکر بولے۔ وکیل صاحب سے میں آج ہی ملو گا۔ تمھیں دق ہو رہا ہے۔ سارے علامات اسی کے ہیں۔

منسارام نے نہایت شوق سے دریافت کیا۔ "بھلا کتنے دنوں میں تصفیہ ہوجائے گا۔ ڈاکٹر صاحب!"

ڈاکٹر۔ کیسی باتیں کرتے ہو جی؟ میں وکیل صاحب سے مل کر تمھیں کسی پہاڑی مقام پر بھیجنے کی صلاح دوں گا۔ ایشور نے چاہا تو تم بہت جلد صحت یاب ہوجاؤ گے۔ بیماری ابھی ابتدائی حالت پر ہے۔

منسارام۔ تب تو ابھی سال دو سال کی دیر معلوم ہوتی ہے۔ میں تو انتظار نہیں کرسکتا۔ سمجھیے۔ مجھے دق وغیرہ کچھ نہیں ہے۔ اور نہ کوئی شکایت ہی ہے۔ آپ بابوجی کو ناحق تردد میں نہ ڈالیے گا۔ اس وقت میرے سر میں درد ہے۔ کوئی دوا دیجیے۔ کوئی دوا ایسی ہو جس سے نیند بھی آجائے۔ مجھے دو راتوں سے نیند نہیں آئی۔

ڈاکٹر صاحب نے زہریلی دواؤں کی الماری کھولی۔ اور ایک شیشی میں تھوڑی سی دوا نکال کر منسارام کو دی۔ منسارام نے پوچھا۔ "یہ تو کوئی زہر ہے۔ بھلا اسے کوئی پی لے تو مرجائے؟"

ڈاکٹر۔ نہیں۔ مر تو نہ جائے۔ لیکن سر ضرور چکرانے لگے۔

منسارام۔ کوئی ایسی دوا بھی اس میں ہے جس کو پیتے ہی جان نکل جائے؟

ڈاکٹر۔ ایسی ایک دو نہیں کتنی ہی دوائیں ہیں۔ یہ جو شیشی دیکھ رہے ہو۔ اس کی ایک بوند بھی پیٹ میں چلی جائے۔ تو جان نہ بچے۔ آناً فاناً موت ہوجائے۔

منسارام۔ کیوں ڈاکٹر صاحب۔ جو لوگ زہر کھالیتے ہیں۔ انھیں بڑی تکلیف ہوتی ہوگی۔

ڈاکٹر۔ سبھی زہروں میں تکلیف نہیں ہوتی۔ بعض تو ایسے ہوتے ہیں کہ پیتے ہی آدمی ٹھنڈا ہوجائے۔ یہ شیشی اسی قسم کی ہے۔ اسے پیتے ہی انسان بے ہوش ہوجاتا ہے۔ اور پھر ہوش نہیں آتا۔

منسارام نے سوچا۔ تب تو جان دینا بہت آسان ہے۔ پھر لوگ کیوں اتنا ڈرتے ہیں؟ یہ شیشی کیسے ملے گی۔ اگر دوا کا نام پوچھ کر شہر کے کسی دوافروش سے لینا چاہوں تو وہ کبھی نہ دے گا۔ اونہہ! اس کے ملنے میں کوئی دقت نہیں، یہ تو معلوم ہوگیا کہ جان نہایت آسانی سے دی جاسکتی ہے۔ منسارام اتنا خوش ہوا گویا کوئی انعام مل گیا ہو۔ اس کے دل پر سے ایک بوجھ سا ہٹ گیا۔ فکر کے بادل جو سر پر منڈلا رہے تھے پھٹ گئے۔ مہینوں کے

بعد آج اس کے دل میں ایک قسم کے جوش کا احساس ہوا۔ کئی لڑکے تھیٹر دیکھنے جا رہے تھے۔ سپرنٹنڈنٹ سے اجازت لے لی تھی۔ منسارام بھی ان کے ساتھ تھیٹر دیکھنے چلا گیا۔ ایسا خوش تھا کہ گویا اس سے زیادہ خوش انسان دنیا میں نہیں ہے۔ تھیٹر میں نقل دیکھ تو وہ ہنستے ہنستے لوٹ گیا۔ باربار تالیاں بجانے اور "ونس مور" کی صدا دینے میں سب سے پہلا نمبر اسی کا تھا۔ گانا سُن کر وہ مست ہوتا جاتا تھا۔ اور "اوہوہو" کہہ کر چلّا اُٹھتا تھا۔ تماشائیوں کی نگاہیں باربار اس کی طرف اُٹھ جاتی تھیں۔ تھیٹر کے ایکٹر بھی اس کی طرف تاکتے تھے۔ اور یہ جاننا چاہتے تھے کہ کون حضرت اتنے شوقین اور ذکی الحس ہیں۔ اس کے دوستوں کو اس کے چلبلے پن پر تعجب ہو رہا تھا۔ وہ نہایت خاموش اور متین لڑکا تھا۔ آج وہ کیوں اتنا ہنسوڑا ہوگیا، کیوں اس کے مذاق پسندی کی انتہا نہیں ہے؟

دو بجے رات کو تھیٹر سے لوٹنے پر بھی اس کی مذاق پسندی کم نہیں ہوئی۔ اس نے ایک لڑکے کی چارپائی اُلٹ دی۔ کئی لڑکوں کے کمرے کے کواڑ باہر سے بند کردیے۔ اور انھیں اندر سے کھٹ کھٹاتے ہوئے سنتا رہا۔ یہاں تک کہ بورڈنگ ہاؤس کے سپرنٹنڈنٹ کی نیند بھی شوروغل سے اُچٹ گئی اور انھوں نے منسارام کی شرارت پر اظہار افسوس کیا۔ کون جانتا ہے کہ اس کے دل میں کتنی زبردست ہلچل ہو رہی ہے؟ بدگمانی کے بے رحمانہ وار نے اس کی حیا اور خودداری کو پامال کر ڈالا ہے۔ اس کو ذلت اور حقارت کا ذرا بھی خوف نہیں رہا۔ یہ تفریح نہیں، اس کے دل کی رقت بھری فریاد ہے۔ جب اور سب لڑکے سوگئے تو وہ بھی پلنگ پر لیٹ گیا۔ مگر اسے نیند نہیں آئی۔ ایک لمحہ بعد وہ اُٹھ بیٹھا۔ اور اپنی ساری کتابیں باندھ کر صندوق میں رکھ دیں۔ جب مرنا ہی ہے تو پڑھ کر کیا ہوگا؟ جس زندگی میں ایسی ایسی پریشانیاں ہیں، ایسی ایسی اذیتیں ہیں اس سے موت کہیں بہتر ہے۔

یہی سوچتے سوچتے سویرا ہوگیا۔ تین رات سے وہ ایک منٹ بھی نہ سویا تھا۔ اس وقت وہ اُٹھا تو اس کے پیر تھرتھرا رہے تھے۔ اور سر چکرا رہا تھا۔ آنکھیں جل رہی تھیں اور سارے اعضاء ڈھیلے ہو رہے تھے۔ دن چڑھتا جاتا تھا۔ اور اس میں اتنی طاقت بھی نہ تھی، کہ منہ ہاتھ دھو ڈالے۔ یکایک اس نے بُھنگی کو رومال میں کچھ لیے ہوئے ایک کہار کے ساتھ آتے دیکھا اس کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ ہائے ایشور! وہ آگئیں۔ اب کیا ہوگا؟ بھنگی تنہا نہیں آئی ہوگی۔ نکی ضرور باہر کھڑی ہوگی۔ کہاں تو اس سے اُٹھا نہ جاتا تھا۔

کہاں بھنگی کو دیکھتے ہی دوڑا اور گھبرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''اماں جی بھی آئی ہیں کیا رے؟'' جب معلوم ہوا کہ اماں جی نہیں آئیں، تب اس کا جی ٹھکانے ہوا۔ بھنگی نے کہا۔ ''بھیا، تم کل آئے نہیں، بہوجی تمھاری راہ دیکھتی رہ گئیں۔ ان سے کیوں روٹھے ہو بھیا۔ وہ تو کہتی ہیں کہ میں نے ان کی کچھ بھی شکایت نہیں کی ہے۔ مجھ سے آج رو کر کہنے لگیں کہ ان کے پاس یہ مٹھائی لیتی جا اور کہنا کہ میرے کارن گھر کیوں چھوڑ دیا ہے؟ کہاں رکھ دوں یہ تھالی؟''

منسارام نے رُکھائی سے کہا۔ ''تھالی اپنے سر پر پٹک لے۔ چڑیل وہاں سے چلی ہے مٹھائی لے کر۔ خبردار جو پھر کبھی ادھر آئی۔ سوغات لے کر چلی ہے! جاکر کہہ دینا کہ تمھارا گھر ہے تم رہو۔ یہاں میں بڑے آرام سے ہوں۔ خوب کھاتا اور موج کرتا ہوں۔ سُنتی ہو؟ بابوجی کے سامنے کہنا۔ سمجھ گئی۔ مجھے کسی کا ڈر نہیں ہے اور جو کرنا چاہیں سو کر ڈالیں۔ جس سے دل میں کوئی ارمان نہ رہ جائے۔ وہ کہیں تو الہ آباد، لکھنؤ، کلکتہ چلا جاؤں۔ میرے لیے جیسے بنارس ایسے دوسرا شہر۔ یہاں کیا رکھا ہے؟''

بھنگی۔ بھیا! مٹھائی رکھ لو۔ نہیں تو بہوجی رو رو کر مرجائیں گی۔ سچ مانو رو کر مرجائیں گی۔

منسارام نے آنسوؤں کے جوش کو روک کر کہا۔ ''مرجائیں گی، میری بلا سے! کون سا مجھے بڑا سُکھ دے دیا ہے۔ جس کے لیے پچھتاؤں۔ میرا تو انھوں نے ستیاناس کر دیا۔ کہہ دینا کہ میرے پاس کوئی سندیسہ نہ بھیجیں۔ اس کی کوئی ضرورت نہیں۔''

بھنگی۔ بھیا، تم کہتے ہو کہ یہاں خوب کھاتا اور موج کرتا ہوں۔ مگر دیہہ تو آدھی بھی نہیں رہی۔ جیسے آئے تھے اس کے آدھے بھی نہیں رہے۔

منسارام۔ یہ تیری آنکھوں کا پھیر ہے۔ دیکھنا کہ دو چار روز میں موٹا ہوکر کولھو ہوجاتا ہوں یا نہیں۔ ان سے یہ بھی کہہ دینا کہ رونا دھونا بند کریں۔ جو میں نے سُنا کہ روتی ہیں اور کھانا نہیں کھاتیں تو مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔ مجھے گھر سے نکالا ہے تو اب چین سے رہیں۔ چلی ہیں محبت دکھانے۔ میں ایسے تریا چرتر بہت پڑھے بیٹھا ہوں۔

بھنگی چلی گئی۔ منسارام کو اس سے باتیں کرتے ہی کرتے کچھ سردی معلوم ہونے لگی تھی۔ یہ تماشا کرنے کے لیے اسے اپنے جذبات کو جتنا دبانا پڑا تھا۔ وہ اس کے لیے بہت مشکل تھا۔ اس کی خودداری اسے اس پُرفریب روش کا جلد سے جلد خاتمہ کردینے کے لیے

مجبور کررہی تھی۔ مگر اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ کیا نرملا یہ صدمہ برداشت کر لے گی اب تک وہ اپنی موت کا خیال کرتے وقت کسی اور شخص کا خیال نہ کرتا تھا مگر آج یکایک اس کو معلوم ہوا کہ میری زندگی کے ساتھ ایک اور شخص کا رشتۂ زندگی بھی وابستہ ہے۔ نرملا یہی سمجھے گی کہ میری بے اعتنائی نے ان کی جان لی۔ یہ سمجھ کر کیا اس کا نازک دل شق نہ ہوجائے گا؟ اس کی زندگی تو اب بھی مصیبت میں ہے۔ بدگمانی کے سنگین پنجہ میں پھنسی ہوئی عورت کیا اپنے کو قاتلہ سمجھ کر بہت دنوں تک زندہ رہ سکتی ہے؟

منسارام نے پلنگ پر لیٹ کر لحاف اوڑھ لیا۔ پھر بھی سردی سے کلیجہ کانپ رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں اس کو شدت سے بخار آگیا۔ وہ بے ہوش ہوگیا۔ اس غشی کی حالت میں اس کو طرح طرح کے خواب دکھائی دینے لگے۔ ذرا ذرا دیر بعد چونک پڑتا۔ آنکھیں کھلتیں، پھر بے ہوش ہوجاتا۔

دفعتاً وکیل صاحب کی آواز سُن کر وہ چونک پڑا۔ ہاں وکیل صاحب ہی کی آواز تھی۔ اس نے لحاف پھینک دیا اور پلنگ سے اُتر کر نیچے کھڑا ہوگیا۔ اس کے دل میں ایک فوری جذبہ پیدا ہوا کہ اسی وقت ان کے سامنے جان دے دوں۔ اسے ایسا معلوم ہوا کہ میں مرجاؤں گا تو انھیں سچی خوشی ہوگی۔ شاید اسی لیے یہ دیکھنے آئے ہیں، کہ میرے مرنے میں کتنی دیر ہے۔ وکیل صاحب نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا کہ وہ گر نہ پڑے اور پوچھا۔ "کیسی طبیعت ہے؟ لیٹے کیوں نہ رہے؟ لیٹ جاؤ۔ کھڑے کیوں ہوگئے؟"

منسارام۔ میری طبیعت تو بہت اچھی ہے۔ آپ کو ناحق تکلیف ہوئی۔

منشی جی نے کچھ جواب نہ دیا۔ لڑکے کی حالت دیکھ کر ان کی آنکھوں سے آنسوں نکل آئے۔ وہ تندرست لڑکا جسے دیکھ کر دل مسرور ہوجاتا تھا۔ اب سوکھ کر کانٹا ہوگیا ہے۔ پانچ چھ روز ہی میں اتنا لاغر ہوگیا تھا کہ اسے پہچاننا مشکل تھا۔ منشی جی نے اس کو آہستہ سے پلنگ پر لٹا دیا اور لحاف اچھی طرح اُڑھا کر سوچنے لگے کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ کہیں لڑکا ہاتھ سے تو نہ نکل جائے گا۔ یہ خیال کرکے وہ رنج سے پریشان ہوگئے۔ اور اسٹول پر بیٹھ کر زار وقطار رونے لگے۔ منسارام بھی لحاف میں منہ لپیٹے رو رہا تھا۔ ابھی چند ہی روز قبل اسے دیکھ کر باپ کا دل غرور سے پھول اُٹھتا تھا۔ مگر آج اُسے اس نازک حالت میں بھی دیکھ کر وہ سوچ رہا ہے کہ اسے گھر لے چلوں یا نہیں؟ کیا یہاں دوا نہیں

ہو سکتی؟ میں یہاں چوبیسوں گھنٹے بیٹھا رہوں گا۔ ڈاکٹر صاحب یہاں موجود ہی ہیں، کوئی دقت نہ ہوگی۔ گھر لے جانے میں انھیں دقت ہی دقت نظر آتی تھی۔ سب سے زیادہ اندیشہ یہ تھا کہ وہاں نرملا اس کے پاس ہر وقت بیٹھی رہے گی۔ اور میں منع نہ کرسکوں گا۔ یہ ان کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔

اتنے میں سپرنٹنڈنٹ نے آکر کہا۔ "میں تو بہتر سمجھتا ہوں کہ آپ انھیں اپنے ساتھ لے جائیں۔ گاڑی ہے ہی کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ یہاں بخوبی تیمارداری نہ ہوسکے گی۔"

منشی جی۔ ہاں آیا تو میں اسی خیال سے تھا لیکن ان کی حالت نہایت ہی نازک معلوم ہوتی ہے۔ ذرا سی غفلت سے سرسام ہوجانے کا اندیشہ ہے۔

سپرنٹنڈنٹ۔ یہاں سے انھیں لے جانے میں تھوڑی سی دقت تو ضرور ہے مگر یہ تو آپ خود ہی سوچ سکتے ہیں کہ گھر پر جو آرام مل سکتا ہے وہ یہاں کسی طرح نہیں مل سکتا۔ اس کے علاوہ کسی بیمار لڑکے کو یہاں رکھنا خلافِ قاعدہ بھی ہے۔

منشی جی۔ کہیے تو میں ہیڈ ماسٹر صاحب سے اجازت لے لوں۔ مجھے ان کو یہاں سے اس حالت میں لے جانا کسی طرح مناسب نہیں معلوم ہوتا۔

سپرنٹنڈنٹ نے ہیڈماسٹر کا نام سُنا تو سمجھے کہ یہ حضرت مجھے دھمکی دے رہے ہیں۔ ذرا تنک کر بولے۔ "ہیڈماسٹر قاعدہ کے خلاف کوئی بات نہیں کرسکتے ہیں۔ میں اتنی بڑی ذمہ داری کیسے لے سکتا ہوں۔"

اب کیا ہو؟ کیا گھر لے جانا ہی پڑے گا؟ یہاں رکھنے کا تو یہ بہانہ تھا کہ لے جانے سے بیماری بڑھ جانے کا اندیشہ ہے۔ یہاں سے لے جاکر اسپتال میں ٹھہرانے کے لیے کوئی بہانہ نہیں ہے۔ جو سُنے گا وہ یہ کہے گا کہ ڈاکٹر کی فیس بچانے کے لیے لڑکے کو ہسپتال میں پھینک آئے۔ مگر اب لے جانے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ اگر سپرنٹنڈنٹ صاحب اس وقت رشوت لینے پر آمادہ ہوجاتے تو شاید دو چار سال کی تنخواہ لے سکتے تھے۔ لیکن قاعدے کے پابند لوگوں میں اتنی عقل اتنی ہوشیاری کہاں؟ اگر اس وقت منشی جی کو کوئی ایسی بات سمجھا دیتا کہ انھیں منسارام کو گھر نہ لے جانا پڑے تو وہ تمام عمر اس کا احسان مانتے۔ سوچنے کا موقع بھی نہ تھا۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب شیطان کی طرح سر پر سوار تھے۔ مجبور ہوکر منشی جی نے دونوں سائیسوں کو بلایا اور منسا رام کو اُٹھانے لگے۔ منسا رام نیم غشی کی حالت میں تھا۔

چونک کر بولا۔ "کیا ہے؟ کون ہے؟"

منشی جی۔ کوئی نہیں بیٹا۔ میں تمھیں گھر لے جانا چاہتا ہوں۔ آؤ میں گود میں اُٹھا لوں۔

منسارام۔ مجھے گھر کیوں لے چلتے ہیں میں وہاں نہیں جاؤں گا۔

منشی جی۔ یہاں تو رہ نہیں سکتے۔ قاعدہ ہی ایسا ہے۔

منسارام۔ کچھ بھی ہو۔ میں وہاں نہ جاؤں گا۔ مجھے اور کہیں لے چلیے۔ کسی درخت کے نیچے، کسی جھونپڑے میں جہاں چاہے رکھیے مگر گھر نہ لے چلیے۔

سپرنٹنڈنٹ نے منشی جی سے کہا۔ "آپ ان باتوں کا خیال نہ کریں یہ اس وقت ہوش میں نہیں ہیں۔"

منسارام۔ کون ہوش میں نہیں ہے؟ میں ہوش میں نہیں ہوں! کسی کو گالیاں دیتا ہوں؟ دانت کاٹتا ہوں؟ کیوں ہوش میں نہیں ہوں؟ مجھے یہیں پڑا رہنے دیجیے جو کچھ ہونا ہوگا وہ یہیں ہوگا۔ اگر ایسا ہی ہے تو مجھے ہسپتال لے چلیے۔ میں وہاں پڑا رہوں گا۔ جینا ہوگا جیوں گا۔ مرنا ہوگا مروں گا۔ مگر گھر تو کسی طرح بھی نہ جاؤں گا۔

یہ زور پاکر منشی جی پھر سپرنٹنڈنٹ سے التجا کرنے لگے۔ لیکن یہ قاعدہ کا پابند شخص کچھ سنتا ہی نہ تھا۔ اگر چھوت کی بیماری ہوئی اور کسی دوسرے لڑکے کو چھوت لگ گئی تو اس کا ذمہ دار کون ہوگا؟ اس دلیل کے سامنے منشی جی کی قانونی دلیلیں بھی مات ہوگئیں۔ آخر منشی جی نے منسا رام سے کہا۔ "بیٹا، تمھیں گھر چلنے سے کیوں انکار ہو رہا ہے؟ وہاں تو سبھی طرح کا آرام رہے گا۔ منشی جی نے کہنے کو تو یہ بات کہہ دی مگر خوف تھا کہ کہیں سچ مچ منسارام چلنے پر راضی نہ ہوجائے۔ وہ منسا رام کو ہسپتال میں رکھنے کا کوئی حیلہ تلاش کر رہے تھے اور اس کی ذمہ داری منسا رام ہی کے سر ڈالنا چاہتے تھے۔ یہ سپرنٹنڈنٹ کے سامنے کی بات تھی۔ وہ اس بات کی شہادت دے سکتے تھے کہ منسارام اپنی ہی ضد سے ہسپتال جا رہا ہے۔ منشی جی کا اس میں ذرا بھی قصور نہیں ہے۔

منسارام نے جھلا کر کہا۔ "نہیں نہیں، سو بار نہیں۔ میں گھر نہیں جاؤں گا۔ مجھے ہسپتال لے چلیے اور گھر کے سب آدمیو کو منع کردیجیے کہ مجھے دیکھنے نہ آئیں۔ مجھے کچھ نہیں ہوا ہے بالکل بیمار نہیں ہوں۔ آپ مجھے چھوڑ دیجیے۔ میں اپنے پیروں چل سکتا ہوں۔"

وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور دیوانہ وار دروازہ کی طرف چلا۔ مگر پیر لڑکھڑا گئے۔ اگر منشی جی نے نہ سنبھال لیا ہوتا تو اس کو سخت چوٹ آتی۔ دونوں نوکروں کی مدد سے منشی جی اس کو گاڑی کے پاس لائے اور اندر بٹھا دیا۔ گاڑی ہسپتال کی طرف چلی۔ وہی ہوا جو منشی جی چاہتے تھے۔ اس غم میں بھی ان کا دل مطمئن تھا۔ لڑکا اپنی خوشی سے ہسپتال جا رہا ہے۔ کیا یہ اس بات کا ثبوت نہیں کہ اس کو کچھ بھی محبت نہیں ہے؟ کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ منسارام بے گناہ ہے۔ وہ اس پر بلا وجہ شک کر رہے تھے۔ لیکن ذرا ہی دیر بعد اس اطمینان کی جگہ ان کے دل میں پشیمانی کا احساس ہوا۔ وہ اپنے پیارے بیٹے کو گھر نہ لے جاکر ہسپتال لیے جارہے تھے۔ ان کی عالی شان محل میں ان کے لڑکے کے لیے بھی جگہ نہ تھی۔ اس حالت میں بھی جب کہ اس کے جینے مرنے کا سوال تھا۔ کتنا اندھیر ہے!

ایک لمحہ بعد یکایک منشی جی کے دل میں یہ سوال پیدا ہوا۔ کہیں منسارام ان کے خیالوں کو تاڑ تو نہیں گیا؟ اس لیے تو اس کو گھر سے نفرت ہوگئی ہے۔ اگر ایسا ہے تو غضب ہوجائے گا۔

اس بات کے خیال ہی سے منشی جی کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ اور ان کا دل دھڑکنے لگا قلب میں ایک دھکا سا لگا۔ اگر اس بخار کا یہی سبب ہے تو ایشور ہی مالک ہے۔ اس وقت ان کی حالت بہت ہی قابل رحم تھی۔ وہ آگ جو انھوں نے اپنے ٹھٹھرے ہوئے ہاتھوں کو سینکنے کے لیے جلائی تھی، اب ان کے گھر میں لگی جارہی تھی۔ اس رنج و غم، پشیمانی اور اندیشے سے ان کا دل گھبرا اُٹھا۔ ان کے مخفی گریہ کی آواز باہر نکل سکتی تو سننے والے رو پڑتے۔ ان کے آنسو باہر نِکل سکتے تو ان کا سینہ بندھ جاتا۔ انھوں نے لڑکے کے زرد افسردہ چہرہ کی طرف ایک بار محبت بھری نگاہوں سے دیکھا۔ رنج سے بے قرار ہوکر اسے سینے سے لگا لیا۔ اور اتنا روئے کہ ہچکی بندھ گئی!

سامنے ہسپتال تھا۔ پھاٹک دکھائی دے رہا تھا۔

(۱۱)

منشی طوطا رام شام کو کچہری سے گھر پہنچے تو نرملا نے پوچھا۔ ''انھیں دیکھا؟ کیا حال ہے؟'' منشی جی نے دیکھا کہ نرملا کے چہرے پر رنج یا فکر کا نام و نشان بھی نہیں ہے، اس کا بناؤ سنگار اور دنوں سے بھی کچھ بڑھ چڑھ کر ہوا ہے۔ مثلاً وہ گلے میں ہار نہ پہنتی تھی۔

مگر آج وہ بھی گلے میں پڑا ہوا ہے۔ جھومر سے بھی اس کو بہت رغبت نہ تھی۔ مگر آج وہ بھی باریک ریشمی ساڑھی کے نیچے سیاہ سیاہ بالوں کے اوپر چراغ فانوس کی طرح چمک رہا تھا۔ منشی جی نے منہ پھیر کر کہا۔ "بیمار ہے اور کیا حال بتاؤں؟"

نرملا۔ تم انھیں یہاں لانے کے لیے گئے تھے؟

منشی جی نے جھنجھلا کر کہا۔"وہ یہاں نہیں آیا تو کیا میں جبراً اُٹھا لاتا؟ کتنا سمجھایا، کہ بیٹا گھر چلو، تمھیں وہاں کوئی تکلیف نہ ہونے پائے گی۔ مگر گھر کا نام سُن کر اس کو جیسے دوگنا بخار ہو جاتا تھا۔ کہنے لگا کہ میں یہاں مر جاؤں گا۔ لیکن گھر نہ جاؤں گا۔ آخر مجبور ہو کر ہسپتال پہنچایا آیا، اور کیا کرتا؟

رکمنی بھی آکر برآمدے میں کھڑی ہوگئی تھی۔ بولی۔"وہ جنم کا ہٹی ہے۔ یہاں کسی طرح نہ آئے گا۔ اور یہ بھی دیکھ لینا کہ وہاں اچھا بھی نہ ہوگا۔"

منشی جی نے دبی آواز میں کہا۔"تم دو چار دن کے لیے وہاں چلی جاؤ تو بڑا اچھا ہو۔ بہن! تمھارے رہنے سے اسے تسکین ہوتی رہے گی۔ میری بہن، میری یہ بات مان لو۔ اکیلے وہ رو رو کر جان دے دے گا۔ بس "ہائے اماں ہائے اماں" کی رٹ لگا لگا کر رویا کرتا ہے۔ میں وہاں جارہا ہوں۔ میرے ساتھ ہی چلی چلو۔ اس کی حالت اچھی نہیں بہن! وہ صورت ہی نہیں رہی۔ دیکھیں ایشور کیا کرتے ہیں۔"

یہ کہتے کہتے منشی جی کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ لیکن رکمنی نے استقلال سے کہا۔"میں جانے کو تیار ہوں۔ میرے وہاں رہنے سے اگر میرے بچّے کی جان بچ جائے تو میں سر کے بل دوڑی جاؤں گی۔ لیکن میرا کہنا گرہ باندھ لو بھیا، وہ اچھا نہ ہوگا۔ میں اسے خوب جانتی ہوں اسے کوئی بیماری نہیں ہے۔ صرف گھر سے نکالے جانے کا رنج ہے۔ یہی رنج بخار کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ تم ایک نہیں لاکھ دوا کرو۔ سول سرجن ہی کو کیوں نہ دکھلاؤ۔ مگر اس کو کوئی دوا اثر نہ کرے گی۔

منشی جی۔ بہن اسے گھر سے نکالا کس نے ہے؟ میں نے تو صرف اس کی پڑھائی کے خیال سے اسے وہاں بھیجا تھا۔

رکمنی۔ تم نے چاہے جس خیال سے بھیجا ہو۔ مگر یہ بات اس کو لگ گئی ہے۔ میں تو اب کسی گنتی میں نہیں ہوں۔ مجھے کسی بات میں بولنے کا کوئی اختیار نہیں۔ مالک تم،

مالکن تمھاری عورت۔ میں تو صرف تمھاری روٹیوں پر پڑی ہوں۔ ابھاگن ودھوا ہوں۔ میری کون سُنے گا۔ اور کون پرواہ کرے گا؟ بغیر بولے رہا نہیں جاتا۔ منسارام
تبھی اچھا ہوگا۔ جب گھر آئے گا اور جب تمھارا دل وُہی ہوجائے گا جو پہلے تھا۔
یہ کہہ کر رُکمنی وہاں سے چلی گئی۔ ان کی کمزور مگر تجربہ کار آنکھوں کے سامنے جو تماشے ہو رہے تھے ان کا بھید وہ خوب سمجھتی تھی۔ اور ان کا سارا غصہ بے گناہ نرملا ہی پر اُترتا تھا۔ اس وقت بھی وہ یہ کہتے کہتے رُک گئی کہ جب تک یہ لکشمی اس گھر میں رہیں گی۔ اس گھر کی حالت بگڑتی ہی جائے گی۔ مگر اس کے ظاہرانہ کہنے پر بھی اس کا مطلب منشی جی سے چھپا نہیں رہا۔ اس کے چلے جانے پر منشی جی نے سر جھکا لیا اور سوچنے لگے۔ انھیں اپنے اوپر اس وقت اتنا غصہ آرہا تھا کہ دیوار سے سر ٹکراکر اپنی زندگی کا خاتمہ کردیں۔ انھوں نے کیوں شادی کی؟ شادی کی کیا ضرورت تھی؟ ایشور نے انھیں ایک نہیں، تین بچے دیئے تھے۔ ان کی عمر بھی چالیس کے قریب پہنچ گئی تھی۔ پھر انھوں نے کیوں شادی کی؟ کیا اسی بہانے ایشور کو انھیں تباہ کرنا منظور تھا۔ انھوں نے سر اُٹھاکر ایک بار نرملا کی متبسم مگر پُرسکون صورت دیکھی۔ اور ہسپتال چلے گئے۔ نرملا کا متبسم حُسن نے ان کی دلی تسکین کردی تھی۔ آج کئی روز کے بعد انھیں یہ تسکین ملی تھی۔ پُرمحبت دل کیا اس حالت میں اتنا پُرسکون رہ سکتا ہے؟ نہیں ہرگز نہیں۔ دل کا صدمہ ظاہری جذبات سے نہیں چھپایا جاسکتا۔ اپنے دل کی کمزوری پر اس وقت انھیں بہت ہی غصہ آیا انھوں نے بلا سبب ہی بدگمانی کو دل میں جگہ دے کر اتنی بے انصافی کی۔ منسارام کی طرف سے بھی ان کا دل صاف ہوگیا۔ ہاں اس کے بجائے اب ایک نیا اندیشہ پیدا ہوگیا۔ کیا منسارام بھانپ تو نہیں گیا؟ کیا اسی لیے تو گھر آنے سے انکار نہیں کر رہا؟ اگر وہ تاڑ گیا ہے تو بڑا غضب ہوجائے گا۔ اس خیال ہی سے ان کا دل گھبرا اُٹھا۔ ان کے بدن کی ساری ہڈیاں گویا اس فریاد و فغاں پر پانی ڈالنے کے لیے بے قرار ہوگئیں۔ انھوں نے کوچوان سے گھوڑا تیز کرنے کے لیے کہا۔ آج کئی دنوں کے بعد ان کے دل پر چھائی ہوئی کالی گھٹا پھٹ گئی تھی اور نور کی شعاعیں اندر سے نکلنے کے لیے بے قرار ہورہی تھیں۔ انھوں نے باہر سر نکال کر دیکھا کہ کوچوان سو تو نہیں رہا۔ گھوڑے کی رفتار انھیں سست کبھی نہ معلوم ہوئی تھی۔
ہسپتال پہنچ کر وہ دوڑے ہوئے منسارام کے پاس گئے۔ دیکھا تو ڈاکٹر صاحب ان کے

مگر آج وہ بھی گلے میں پڑا ہوا ہے۔ جھومر سے بھی اس کو بہت رغبت نہ تھی۔ مگر آج وہ بھی باریک ریشمی ساڑھی کے نیچے سیاہ سیاہ بالوں کے اوپر چراغ فانوس کی طرح چمک رہا تھا۔ منشی جی نے منہ پھیر کر کہا۔ "بیمار ہے اور کیا حال بتاؤں؟"

نرملا۔ تم انھیں یہاں لانے کے لیے گئے تھے؟

منشی جی نے جھنجھلا کر کہا۔"وہ یہاں نہیں آیا تو کیا میں جبراً اُٹھا لاتا؟ کتنا سمجھایا، کہ بیٹا گھر چلو، تمھیں وہاں کوئی تکلیف نہ ہونے پائے گی۔ مگر گھر کا نام سُن کر اس کو جیسے دوگنا بخار ہوجاتا تھا۔ کہنے لگا کہ میں یہاں مرجاؤں گا۔ لیکن گھر نہ جاؤں گا۔ آخر مجبور ہوکر ہسپتال پہنچایا آیا، اور کیا کرتا؟

رکمنی بھی آکر برآمدے میں کھڑی ہوگئی تھی۔ بولی۔"وہ جنم کا ہٹی ہے۔ یہاں کسی طرح نہ آئے گا۔ اور یہ بھی دیکھ لینا کہ وہاں اچھا بھی نہ ہوگا۔"

منشی جی نے دبی آواز میں کہا۔"تم دو چار دن کے لیے وہاں چلی جاؤ تو بڑا اچھا ہو۔ بہن! تمھارے رہنے سے اسے تسکین ہوتی رہے گی۔ میری بہن، میری یہ بات مان لو۔ اکیلے وہ رورو کر جان دے دے گا۔ بس "ہائے اماں ہائے اماں" کی رٹ لگا لگاکر رویا کرتا ہے۔ میں وہاں جارہا ہوں۔ میرے ساتھ ہی چلی چلو۔ اس کی حالت اچھی نہیں بہن! وہ صورت ہی نہیں رہی۔ دیکھیں ایشور کیا کرتے ہیں۔"

یہ کہتے کہتے منشی جی کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ لیکن رکمنی نے استقلال سے کہا۔"میں جانے کو تیار ہوں۔ میرے وہاں رہنے سے اگر میرے بچّہ کی جان بچ جائے تو میں سر کے بل دوڑی جاؤں گی۔ لیکن میرا کہنا گرہ باندھ لو بھیا، وہ اچھا نہ ہوگا۔ میں اسے خوب جانتی ہوں اسے کوئی بیماری نہیں ہے۔ صرف گھر سے نکالے جانے کا رنج ہے۔ یہی رنج بخار کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ تم ایک نہیں لاکھ دوا کرو۔ سول سرجن ہی کو کیوں نہ دکھلاؤ۔ مگر اس کو کوئی دوا اثر نہ کرے گی۔

منشی جی۔ بہن اسے گھر سے نکالا کس نے ہے؟ میں نے تو صرف اس کی پڑھائی کے خیال سے اسے وہاں بھیجا تھا۔

رکمنی۔ تم نے چاہے جس خیال سے بھیجا ہو۔ مگر یہ بات اس کو لگ گئی ہے۔ میں تو اب کسی گنتی میں نہیں ہوں۔ مجھے کسی بات میں بولنے کا کوئی اختیار نہیں۔ مالک تم،

مالکن تمھاری عورت۔ میں تو صرف تمھاری روٹیوں پر پڑی ہوں۔ ابھاگن وِدھوا ہوں۔ میری کون سُنے گا۔ اور کون پرواہ کرے گا؟ بغیر بولے رہا نہیں جاتا۔ منسارام تبھی اچھا ہوگا۔ جب گھر آئے گا اور جب تمھارا دل وہی ہوجائے گا جو پہلے تھا۔

یہ کہہ کر رُکمنی وہاں سے چلی گئی۔ ان کی کمزور مگر تجربہ کار آنکھوں کے سامنے جو تماشے ہو رہے تھے ان کا بھید وہ خوب سمجھتی تھی۔ اور ان کا سارا غصہ بے گناہ نرملا ہی پر اُترتا تھا۔ اس وقت بھی وہ یہ کہتے کہتے رُک گئی کہ جب تک یہ لکشمی اس گھر میں رہیں گی۔ اس گھر کی حالت بگڑتی ہی جائے گی۔ مگر اس کے ظاہرانہ کہنے پر بھی اس کا مطلب منشی جی سے چھپا نہیں رہا۔ اس کے چلے جانے پر منشی جی نے سر جھکا لیا اور سوچنے لگے۔ انھیں اپنے اوپر اس وقت اتنا غصہ آرہا تھا کہ دیوار سے سر ٹکراکر اپنی زندگی کا خاتمہ کردیں۔ انھوں نے کیوں شادی کی؟ شادی کی کیا ضرورت تھی؟ ایشور نے انھیں ایک نہیں، تین بچے دیئے تھے۔ ان کی عمر بھی چالیس کے قریب پہنچ گئی تھی۔ پھر انھوں نے کیوں شادی کی؟ کیا اسی بہانے ایشور کو انھیں تباہ کرنا منظور تھا۔ انھوں نے سر اُٹھاکر ایک بار نرملا کی متبسم مگر پُرسکون صورت دیکھی۔ اور ہسپتال چلے گئے۔ نرملا کا متبسم حُسن نے ان کی دلی تسکین کردی تھی۔ آج کئی روز کے بعد انھیں یہ تسکین ملی تھی۔ پُر محبت دل کیا اس حالت میں اتنا پُرسکون رہ سکتا ہے؟ نہیں ہرگز نہیں۔ دل کا صدمہ ظاہری جذبات سے نہیں چھپایا جاسکتا۔ اپنے دل کی کمزوری پر اس وقت انھیں بہت ہی غصہ آیا انھوں نے بلا سبب ہی بدگمانی کو دل میں جگہ دے کر اتنی بے انصافی کی۔ منسارام کی طرف سے بھی ان کا دل صاف ہوگیا۔ ہاں اس کے بجائے اب ایک نیا اندیشہ پیدا ہوگیا۔ کیا منسارام بھانپ تو نہیں گیا؟ کیا اسی لیے تو گھر آنے سے انکار نہیں کر رہا؟ اگر وہ تاڑ گیا ہے تو بڑا غضب ہوجائے گا۔ اس خیال ہی سے ان کا دل گھبرا اُٹھا۔ ان کے بدن کی ساری ہڈیاں گویا اس فریاد و فغاں پر پانی ڈالنے کے لیے بے قرار ہوگئیں۔ انھوں نے کوچوان سے گھوڑا تیز کرنے کے لیے کہا۔ آج کئی دنوں کے بعد ان کے دل پر چھائی ہوئی کالی گھٹا پھٹ گئی تھی اور نور کی شعاعیں اندر سے نکلنے کے لیے بے قرار ہورہی تھیں۔ انھیوں نے باہر سر نکال کر دیکھا کہ کوچوان سو تو نہیں رہا۔ گھوڑے کی رفتار انھیں سست کبھی نہ معلوم ہوئی تھی۔ ہسپتال پہنچ کر وہ دوڑے ہوئے منسارام کے پاس گئے۔ دیکھا تو ڈاکٹر صاحب ان کے

سامنے متفکر کھڑے تھے۔ منشی جی کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ منہ سے آواز نہ نکل سکی۔ بھرائی ہوئے آواز میں بڑی مشکل سے بولے۔"کیا حال ہے ڈاکٹرصاحب؟" یہ کہتے کہتے وہ رو پڑے اور جب ڈاکٹرصاحب کو ان کے سوال کا جواب دینے میں ایک لمحہ کی تاخیر ہوئی تو ان کے ہوش اڑ گئے۔ انھوں نے پلنگ پر بیٹھ کر بے ہوش لڑکے کو گود میں اُٹھا لیا اور بچوں کی طرح سسک سسک کر رونے لگے۔ منسارام کا جسم بخار سے جل رہا تھا۔ اس نے ایک بار آنکھیں کھولیں۔ آہ! کتنی خوفناک اور ساتھ ہی کتنی عاجزی بھری نگاہ تھی۔ منشی جی نے اسے گلے سے لگا کر ڈاکٹر صاحب سے پوچھا۔"کیا حال ہے صاحب؟ آپ خاموش کیوں ہیں؟"

ڈاکٹر نے شک آمیز لہجہ میں کہا۔"حال جو کچھ ہے وہ آپ دیکھ ہی رہے ہیں۔ ۱۰۶ ڈگری کا بخار ہے اور میں کیا بتلاؤں؟ ابھی بخار کا زور بڑھتا ہی جاتا ہے۔ میرے کیے جو کچھ ہوسکتا ہے، وہ کر رہا ہوں۔ ایشور مالک ہے۔ جب سے آپ گئے ہیں۔ میں ایک منٹ کے لیے یہاں سے نہیں ہلا۔ کھانا تک نہیں کھاسکا۔ حالت اتنی نازک ہے کہ ایک منٹ میں کیا ہوجائے گا یہ نہیں کہا جاسکتا یہ مہلک بخار ہے۔ مریض کو بالکل ہوش نہیں ہے۔ رہ رہ کر سرسام کا دورہ ہوجاتا ہے۔ کیا گھر میں ان کو کسی نے کچھ کہا ہے؟ بار بار "اماں جی! تم کہاں ہو؟" کی آواز منہ سے نکلتی ہے۔"

ڈاکٹر صاحب یہ کہہ ہی رہے تھے کہ دفعتاً منسارام اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اور ایک دھکے سے منشی جی کو پلنگ کے نیچے دھکیل کر دیوانگی کے لہجہ میں بولا۔"کیوں دھمکاتے ہیں۔ آپ مار ڈالیے مار ڈالیے۔ تلوار نہیں ملتی۔ رسی کا پھندا ہے یا وہ بھی نہیں ہے؟ میں اپنے گلے میں لگا لوں گا۔ ہائے اماں جی! تم کہاں ہو؟" یہ کہتے کہتے وہ پھر بے ہوش ہوکر گر پڑا۔

منشی جی ایک لمحہ تک منسارام کے افسردہ چہرہ کی طرف غمناک نگاہوں سے دیکھتے رہے پھر انھوں نے ڈاکٹر صاحب کا ہاتھ پکڑ لیاو اور بہت ہی التجا آمیز اصرار سے بولے۔ "ڈاکٹر صاحب! اس لڑکے کو بچا لیجیے۔ ایشور کے لیے بچا لیجیے۔ ورنہ میں تباہ ہوجاؤں گا۔ میں امیر نہیں ہوں۔ مگر آپ جو کچھ کہیں گے وہ حاضر کروں گا۔ اسے بچا لیجیے۔ آپ بڑے سے بڑے ڈاکٹروں کو بلائیے اور ان کی رائے لیجیے۔ میں سارا صرفہ دے دوں گا۔ اس کی یہ حالت اب نہیں دیکھی جاتی۔ ہائے میرا ہونہار بیٹا!"

ڈاکٹر صاحب نے دردناک لہجہ میں کہا۔ "بابو صاحب میں آپ سے سچ کہتا ہوں، کہ

میں ان کے لیے اپنی طرف سے کسی قسم کی کوتاہی نہیں کررہا ہوں۔ اب آپ دیگر ڈاکٹروں سے مشورہ کے لیے کہتے ہیں، میں ابھی ڈاکٹر لاہری، ڈاکٹر بھاٹیا اور ڈاکٹر ناتھ کو بلاتا ہوں لیکن میں آپ کو بے فائدہ تشفی نہیں دینا چاہتا۔ حالت بہت نازک ہے۔"

منشی جی نے روتے ہوئے کہا۔ "نہیں ڈاکٹر صاحب! یہ لفظ منہ سے نہ نکالیے حالت اس کے دشمنوں کی نازک ہے۔ ایشور مجھ پر اتنا قہر نہ کریں گے۔ آپ کلکتہ اور بمبئی کے ڈاکٹروں کو تار دیجیے۔ میں زندگی بھر آپ کی غلامی کروں گا۔ یہی میرا چراغ خاندان ہے۔ یہی میری زندگی کا سہارا ہے۔ میرا دل پھٹا جا رہا ہے۔ کوئی ایسی دوا دیجیے کہ اس ہوش آجائے۔ میں ذرا اپنے کانوں سے اس کی باتیں سنوں۔ یہ جان سکوں کہ اسے کیا تکلیف ہو رہی ہے۔ ہائے میرا بچہ!"

ڈاکٹر۔ آپ ذرا دل کو تسکین دیجیے۔ آپ بزرگ آدمی ہیں، یوں ہائے ہائے کرنے سے اور ڈاکٹروں کی فوج جمع کرنے سے کوئی نتیجہ نہ نکلے گا۔ خاموش ہوکر بیٹھیے۔ میں شہر کے ڈاکٹروں کو بلا رہا ہوں۔ دیکھیے وہ کیا کہتے ہیں۔ آپ تو خود ہی بدحواس ہوئے جاتے ہیں۔

منشی جی۔ اچھا ڈاکٹر صاحب۔ میں اب نہ بولوں گا۔ زبان تک نہ کھولوں گا۔ آپ جو چاہیں کریں۔ بچہ اب آپ کے ہاتھ میں ہے۔ آپ ہی اسے بچا سکتے ہیں میں اتنا ہی چاہتا ہوں کہ ذرا اُسے ہوش آجائے۔ مجھے پہچان لے اور میری باتیں سمجھنے لگے۔ کیا کوئی ایسی دوا نہیں؟ کوئی ایسی سنجیونی بوٹی نہیں؟ بس میں اس سے دو چار باتیں کرلیتا۔

یہ کہتے کہتے منشی جی پھر جوش میں آکر منسارام سے بولے۔ "بیٹا ذرا آنکھیں کھولو کیسا جی ہے؟ میں تمھارے پاس بیٹھا رو رہا ہوں۔ مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ میرا دل تمھاری طرف سے صاف ہے۔"

ڈاکٹر۔ پھر آپ نے واہیات باتیں شروع کردیں۔ ارے صاحب آپ بچے نہیں ہیں۔ بزرگ آدمی ہیں۔ ذرا صبر سے کام لیجیے۔

منشی جی۔ اچھا ڈاکٹر صاحب اب نہ بولوں گا۔ خطا ہوئی۔ آپ جو چاہیں، کریں۔ میں نے سب کچھ آپ پر چھوڑ دیا۔ کوئی ایسی تدبیر نہیں ہے۔ جس سے میں اس کو اتنا سمجھا سکوں کہ میرا دل صاف ہے۔ آپ ہی کہہ دیجیے ڈاکٹر صاحب! کہہ دیجیے کہ تمھارا

بدنصیب باپ بیٹھا رو رہا ہے۔ اس کا دل تمھاری طرف سے بالکل صاف ہے۔ اسے کچھ وہم ہوا تھا۔ وہ اب دور ہوگیا۔ بس اتنا ہی کہہ دیجیے۔ میں اور کچھ نہیں چاہتا۔ میں خاموش بیٹھا ہوں، زبان تک نہیں کھولتا۔ مگر آپ اتنا ضرور کہہ دیجیے۔

ڈاکٹر۔ ایشور کے لیے بابو صاحب ذرا صبر کیجیے۔ ورنہ مجبور ہوکر آپ سے کہنا پڑے گا کہ آپ گھر تشریف لے جایئے۔ میں ذرا دفتر میں جاکر ڈاکٹر صاحبان کو خط لکھ رہا ہوں۔ آپ یہاں خاموش بیٹھے رہیے گا۔

بے رحم ڈاکٹر! نوجوان بیٹے کی یہ حالت دیکھ کر کون باپ ہے جو صبر سے کام لے گا؟ منشی جی بہت سنجیدہ مزاج تھے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اس وقت ہائے ہائے کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ مگر پھر بھی اس وقت چپ چاپ بیٹھنا ان کے لیے ناممکن تھا۔ اگر اتفاقاً یہ بیماری ہوتی تو وہ صبر کرسکتے تھے۔ دوسروں کو سمجھا سکتے تھے اور خود ڈاکٹروں کو بلاسکتے تھے۔ مگر کیا یہ جانتے ہوئے بھی وہ صبر کرسکتے تھے کہ یہ سب آگ میری ہی لگائی ہوئی ہے کوئی باپ اتنے سخت دل کا ہوسکتا ہے؟ ان کا رُواں رُواں اس وقت ان پر لعنت کر رہا تھا۔ انھوں نے سوچا کہ مجھ میں یہ بدگمانی پیدا ہی کیوں ہوئی؟ میں نے کیوں بلا چشم دید ثبوت کے ایسا فرض کرلیا؟ اچھا، مجھے اس حالت میں کیا کرنا چاہیے تھا؟ جو کچھ انھوں نے کیا، اس کے سوا وہ اور کیا کرتے؟ اِسے وہ نہ تجویز کرسکے۔ دراصل شادی کے جھگڑے میں پڑنا ہی اپنے پیروں میں کلہاڑی مارنا تھا۔ ہاں یہی سارے فساد کی بنیاد ہے!

مگر میں نے یہ کوئی انوکھی بات نہیں کی۔ سبھی عورت مرد شادی کرتے ہیں۔ ان کی زندگی لطف سے بسر ہوتی ہے۔ لطف ہی کی خواہش سے تو ہم شادی کرتے ہیں۔ اسی محلّہ میں صدہا اشخاص نے دوسرا، تیسرا، چوتھا، یہاں تک کہ ساتواں بیاہ کیا ہے۔ اور مجھ سے بھی کہیں زیادہ عمر میں! وہ جب تک جئے آرام سے جئے۔ یہ بھی نہیں ہوا کہ سبھی بیوی سے پہلے مر گئے ہوں۔ دو دو تین تین شادیاں کرنے پر بھی بلا عورت کے ہوگئے۔ اگر میرے جیسی حالت سب کی ہوتی تو بیاہ کا نام ہی کون لیتا؟ میرے والد صاحب ہی نے پچپن سال کی عمر میں بیاہ کیا تھا۔ اور میری پیدائش کے وقت ان کی عمر ساٹھ برس سے کم نہ تھی۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ تب اور اب میں کچھ فرق ہوگیا ہے۔ پہلے عورتیں پڑھی لکھی نہ ہوتی تھیں۔ شوہر خواہ کیسا ہو، اسے قابل پرستش سمجھتی تھیں۔ یا یہ بات ہوکہ مرد

سب کچھ دیکھ سُن کر بھی بے حیائی سے کام لیتا ہو۔ ضرور یہی بات ہے۔ جب جوان مرد بوڑھی عورت کے ساتھ خوش نہیں رہ سکتا، تو جوان عورتیں کیوں کسی بڈھے سے خوش رہنے لگیں۔ لیکن میں تو کچھ ایسا بڈھا نہ تھا مجھے دیکھ کر کوئی چالیس سال سے زیادہ کا نہیں بتلا سکتا۔ کچھ بھی ہو، جوانی ڈھل جانے پر نوجوان عورت سے بیاہ کرکے کچھ نہ کچھ بے حیائی ضرور کرنی پڑتی ہے۔ اس میں شک نہیں، عورت قدرتاً حیادار ہوتی ہے۔ فاحشہ عورتوں کی بات تو دوسری ہے۔ مگر عموماً عورت مرد سے کہیں زیادہ پاکباز ہوتی ہے۔ جوڑ کا شوہر پاکر وہ چاہے غیر شخص سے ہنسی مذاق کرے۔ مگر اس کا دل ہمیشہ صاف رہتا ہے۔ بے جوڑ بیاہ ہو جانے سے وہ چاہے کسی کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھے، مگر اس کا دل مغموم رہتا ہے۔ وہ پختہ دیوار ہے۔ اس میں سیری کا اثر نہیں ہوتا۔ یہ خام دیوار ہے اور اسی وقت تک کھڑی رہتی ہے جب تک اس پر سیری نہ چلائی جائے۔

اسی طرح سوچتے سوچتے منشی جی کو ایک جھپکی آگئی۔ دلی خیالات نے فوراً خواب کی صورت اختیار کرلی۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ان کی پہلی بیوی منسارام کے سامنے کھڑی کہہ رہی ہے۔ سوامی، یہ تم نے کیا کیا؟ جس بچّہ کو میں اپنا خون پلا پلا کر پالا۔ اس کو تم نے اتنی بیدردی سے مار ڈالا۔ ایسے اچھے چال چلن والے لڑکے پر تم نے اتنا بڑا کلنک لگا دیا۔ اب بیٹھے کیا بسورتے ہو؟ تم نے اس سے ہاتھ دھو لیا۔ تمھارے بے درد ہاتھوں سے چھین کر میں اس کو اپنے ساتھ لیے جاتی ہوں۔ تم تو اتنے شکی کبھی نہ تھے۔ کیا بیاہ کرتے ہی شک کو بھی گلے باندھ لائے؟ اس ننھے دل پر اتنی کڑی چوٹ۔ اتنا بڑا کلنک اُٹھا کر جینے والے کوئی بے حیا ہوں گے میرا بیٹا نہیں۔ یہ کہتے ہوئے اس نے لڑکے کو گود میں اُٹھا لیا اور چلی۔ منشی جی نے روتے ہوئے اس کی گود سے منسارام کو چھین لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو ان کی آنکھیں ایکدم کھل گئیں اور ڈاکٹر لاہری، ڈاکٹر بھاٹیا وغیرہ نصف درجن ڈاکٹر صاحبان ان کے سامنے کھڑے ہوئے نظر آئے۔

(۱۲)

تین دن گزر گئے اور منشی جی گھر نہ آئے۔ رکمنی دونوں وقت شفاخانہ جاتی۔ اور منسارام کو دیکھ آتی۔ دونوں لڑکے بھی جاتے تھے۔ مگر نرملا کیسے جاتی۔ اس کے پیروں میں تو بیڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ وہ منسارام کی علالت کی کیفیت معلوم کرنے کے لیے بے قرار

رہتی۔ اگر رکمنی سے کچھ پوچھتی تھی تو طعن و تشنیع میں جواب ملتا تھا۔ اگر لڑکوں سے کوئی بات دریافت کرتی تو وہ بے سر پیر کی باتیں کرنے لگتے تھے۔ ایک مرتبہ خود جاکر دیکھنے کے لیے اس کا دل بے چین ہو رہا تھا۔ اس کو یہ اندیشہ ہو رہا تھا کہ بدگمانی نے کہیں منشی جی کی شفقت پدری کو مفقود نہ کردیا ہو۔ یا مبادا ان کا بخل تو منسارام کی صحت میں حارج نہیں ہو رہا۔ ڈاکٹر لوگ کسی کے عزیز نہیں ہوتے۔ انھیں تو اپنی فیس سے مطلب ہے۔ خواہ مردہ دوزخ میں جائے، یا بہشت میں! اس کے دل میں زبردست خواہش ہوتی تھی کہ وہ خود ہسپتال جاکر اور ڈاکٹر کو ایک ہزار کی تھیلی دے کر کہے کہ اس کو آپ آرام کردیجیے۔ یہ تھیلی آپ کی نذر ہے۔ مگر اس کے پاس نہ تو اتنے روپے تھے، نہ اس کے دل میں اتنی ہمت تھی۔ اب بھی اگر وہ وہاں پہنچ سکتی، تو منسارام صحت پاجاتا۔ اس کی جیسی تیمارداری ہونی چاہیے ویسی نہیں ہو رہی ہے۔ ورنہ کیا تین روز تک بخار نہ اُترتا؟ یہ جسمانی بخار نہیں، دلی بخار ہے۔ اور دل کی تسکین ہی سے اس کا زور گھٹ سکتا ہے۔ اگر وہ وہاں تمام رات بھی بیٹھی رہ سکتی اور منشی جی کو ذرا بھی بدگمانی نہ ہوتی تو شاید منسارام کو یقین ہوجاتا کہ باپ کا دل میری طرف سے صاف ہے اور پھر اس کی صحت میں دیر نہ لگتی۔ لیکن کیا ایسا ہوگا؟ منشی جی اس کو وہاں دیکھ کر مطمئن رہ سکیں گے؟ کیا اب بھی ان کے دل میں کدورت ہے؟ یہاں سے جاتے وقت تو ایسا معلوم ہوا تھا کہ وہ اپنے کیے پر پچھتا رہے ہیں۔ ایسا تو نہ ہوگا کہ اس کے وہاں جاتے ہی منشی جی کے دل میں پھر شک پیدا ہوجائے۔ اور وہ بیٹے کی جان لے کر ہی چھوڑیں۔

اسی شش و پنج میں تین روز گزر گئے۔ نہ گھر میں چولھا جلا اور نہ کسی نے کچھ کھایا۔ لڑکوں کے لیے بازار سے پوریاں منگا لی جاتی تھیں، رکمنی اور نرملا بھوکی سہی سوجاتی تھیں انھیں کھانے کی خواہش ہی نہ ہوتی تھی۔

چوتھے روز جیارام اسکول سے لوٹا تو ہسپتال ہوتا ہوا مکان آیا۔ نرملا نے پوچھا۔ "کیوں بھیا، ہسپتال بھی گئے تھے۔ آج کیا حال ہے۔ تمھارے بھیا اُٹھے یا نہیں؟"

جیارام رونی صورت بناکر بولا۔ "اماں جی، آج تو وہ کچھ بولتے ہی نہ تھے چپ چاپ چارپائی پر پڑے زور زور سے ہاتھ پیر پٹک رہے تھے۔

نرملا کے چہرے کا رنگ فق ہوگیا۔ گھبرا کر پوچھا۔ "تمھارے بابوجی وہاں نہ تھے؟"

جیارام۔ تھے کیوں نہیں، آج وہ بہت روتے تھے۔

نرملا کا دل دھڑکنے لگا۔ پوچھا۔"ڈاکٹر لوگ وہاں نہ تھے؟"

جیارام۔ ڈاکٹر بھی کھڑے تھے اور آپس میں کچھ صلاح کر رہے تھے۔ سب سے بڑا سول سرجن انگریزی میں کہہ رہا تھا کہ مریض کے بدن میں کچھ تازہ خون ڈالنا چاہیے۔ اس پر بابو جی نے کہا کہ میرے جسم سے جتنا خون چاہیے لے لیجیے۔ سول سرجن نے ہنس کر کہا، کہ آپ کے خون سے کام نہیں چلے گا۔ کسی جوان آدمی کا خون چاہیے۔ آخر اس نے پچکاری سے کوئی دوا بھیا کے خون میں دی۔ چار انگل سے کم کی سوئی نہ رہی ہوگی۔ مگر بھیا نے "ہے" تک نہیں کی۔ میں نے تو مارے ڈر کے آنکھیں بند کرلی تھیں۔

بڑے بڑے منصوبے جوش کی حالت میں پیدا ہوتے ہیں۔ کہاں تو نرملا ڈر سے سوکھی جاتی تھی۔ کہاں اس کے چہرے پر مصمم ارادے کی جھلک آگئی۔ اس نے اپنے جسم کا تازہ خون دینے کا تہیہ کرلیا۔ اگر اس کے خون سے منسارام کی جان بچ جائے تو وہ اپنے خون کا آخری قطرہ تک دینے کے لیے بخوشی تیار تھی۔ اب جس کا جو جی چاہے سمجھے، وہ کسی کی پرواہ نہ کرے گی۔ اس نے جیارام سے کہا۔"تم لپک کر ایک تانگہ بلا لو۔ میں ہسپتال جاؤں گی۔"

جیارام۔ وہاں تو اس وقت بہت سے آدمی ہوں گے۔ ذرا رات ہوجانے دیجیے۔

نرملا۔ نہیں تم ابھی یکہ بلا لو۔

جیارام۔ کہیں بابو جی خفا نہ ہوں۔

نرملا۔ خفا ہونے دو۔ تم ابھی جاکر سوار لاؤ۔

جیارام۔ میں کہہ دوں گا کہ اماں نے خود ہی مجھ سے سواری منگائی تھی۔

نرملا۔ ہاں، کہہ دینا۔

جیارام تو ادھر تانگہ لانے گیا۔ اُدھر نرملا نے سر میں کنگھی کی، بال باندھے، کپڑے بدلے، گہنے پہنے۔ پان کھایا اور دروازہ پر آکر تانگہ کا انتظار کرنے لگی۔

رکمنی اپنے کمرہ میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اسے اس طرح تیار ہوکر آتے دیکھ کر بولی۔"کہاں جاتی ہو بہو؟"

نرملا۔ ذرا ہسپتال تک جاتی ہوں۔
رکمنی۔ وہاں جاکر کیا کروگی؟
نرملا۔ کچھ نہیں، کروں گی کیا؟ کرنے والے تو بھگوان ہیں۔ دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔
رکمنی۔ میں کہتی ہوں تم نہ جاؤ۔

نرملا نے عاجزی سے کہا۔ ''ابھی چلی آؤں گی دیدی جی! جیارام کہہ رہا ہے کہ اس وقت ان کی حالت اچھی نہیں ہے۔ دل نہیں مانتا، آپ بھی چلیے نہ؟

رکمنی۔ میں دیکھ آئی ہوں۔ اتنا ہی سمجھ لو کہ اب باہری خون پہنچنے ہی پر جینے کی امید ہے؟
کون اپنا تازہ خون دے گا اور کیوں دے گا؟ اس میں بھی تو جان جوکھم کا ڈر ہے۔
نرملا۔ اسی لیے تو میں جاتی ہوں۔ میرے خون سے کیا کام نہ چلے گا؟
رکمنی۔ چلے گا کیوں نہیں۔ جوان ہی کا خون تو چاہیے۔ مگر تمھارے خون سے منسا کی جان بچے اس سے تو کہیں اچھا ہے کہ اسے پانی میں بہا دیا جائے۔

تانگہ آگیا۔ نرملا اور جیارام دونوں جا بیٹھے۔ تانگہ روانہ ہوگیا۔ رکمنی دروازہ پر کھڑی دیر تک روتی رہی۔ آج پہلی بار اس کو نرملا پر رحم آیا۔ اس کا بس چلتا تو وہ نرملا کو باندھ رکھتی۔ رحم اور ہمدردی کا جوش اسے کہاں لیے جاتا ہے۔ اسے وہ مخفی طریقہ پر دیکھ رہی تھی۔ آہ! اس میں بدنصیبی کا ہاتھ ہے، یہ تباہی کا راستہ ہے۔

نرملا ہسپتال پہنچی تو چراغ جل چکے تھے۔ ڈاکٹر صاحبان اپنی اپنی رائے دے کر رخصت ہوگئے تھے۔ منسارام کا بخار کچھ کم ہوگیا تھا۔ وہ ٹکٹکی باندھے دروازہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی نگاہ آسمان کی کھلی فضا کی طرف لگی ہوئی تھی۔ گویا وہ کسی دیوتا کا انتظار کر رہا ہو۔ وہ کہاں ہے اور کس حالت میں ہے اس کا اسے کچھ علم نہ تھا۔

دفعتاً نرملا کو دیکھتے ہی وہ چونک کر اُٹھ بیٹھا۔ اس کی محویت غائب ہوگئی۔ اس کا مٹا ہوا حِس عود کر آیا۔ اسے اپنی حالت کا علم ہوگیا۔ گویا کوئی بھولی ہوئی بات یاد آگئی ہو۔ اس نے آنکھیں پھاڑ کر نرملا کو دیکھا اور منہ پھیر لیا۔

یکایک منشی جی تیز لہجہ میں بولے۔''تم یہاں کیا کرنے آئیں؟'' نرملا ساکت رہ گئی۔ یا وہ بتلائے کہ کیا کرنے آئی ہے۔ اتنے سادہ سوال کا بھی وہ کیا جواب نہ دے سکی؟ وہ کیا کرنے آئی؟ اتنا مشکل سوال کس کے سامنے آیا ہوگا؟ گھر کا لڑکا بیمار ہے اسے دیکھنے آئی

ہے۔ یہ بات کیا بلادریافت کے معلوم نہ ہوسکتی تھی؟ پھر یہ سوال کیوں؟

وہ مبہوت سی کھڑی رہی۔ گویا بالکل بدحواس ہوگئی ہو۔ اس نے دونوں لڑکوں سے منشی جی کے دکھ درد کی باتیں سُن کر یہ قیاس کیا تھا کہ اب ان کا دل صاف ہوگیا ہے۔ اب اسے معلوم ہوا کہ وہ محض خیال تھا۔ اگر وہ جانتی کہ آنسوؤں کی بارش نے بھی شک کی آگ نہیں بجھائی تو وہ وہاں کبھی نہ جاتی۔ وہ کڑھ کڑھ کر مرجاتی مگر گھر سے باہر قدم نہ رکھتی۔

منشی جی نے پھر وہی سوال کیا۔"تم یہاں کیوں آئیں؟"

نرملا نے بے خوفی سے جواب دیا۔"آپ یہاں کیا کرنے آئے ہیں؟"

منشی جی کے نتھنے پھڑکنے لگے۔ وہ طیش میں آکر پلنگ سے اُٹھے۔ اور نرملا کا ہاتھ پکڑ کر بولے۔"تمھارے یہاں آنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ جب میں بلاؤں تب آنا۔ سمجھ گئیں؟"

ارے یہ کیا ہوا؟ منسارام جو پلنگ سے ہل بھی نہ سکتا تھا۔ اُٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ اور نرملا کے پیروں پر گرکر روتے ہوئے بولا۔"اماں جی، اس اَبھاگے کے لیے آپ کو ناحق اتنی تکلیف ہوئی۔ میں آپ کی محبت کبھی نہ بھولوں گا۔ ایشور سے میری یہی بنتی ہے کہ میرا دوسرا جنم آپ ہی کے بطن سے ہو کہ میں آپ کے احسانات کا بدلہ دے سکوں۔ ایشور جانتا ہے کہ میں نے آپ کو سوتیلی ماں نہیں سمجھا۔ میں آپ کو اپنی ماں سمجھتا رہا۔ آپ کی عمر مجھ سے بہت زیادہ نہ ہو، مگر آپ میری ماں کی جگہ پر تھیں۔ اور میں نے آپ کو ہمیشہ اسی نظر سے دیکھا...... اب نہیں بولا جاتا اماں جی۔ معاف کیجیے یہ آخری ملاقات ہے۔"

نرملا نے آنسوؤں کو روکتے ہوئے کہا۔"تم ایسی باتیں کیوں کرتے ہو؟ دوچار دن میں اچھے ہوجاؤ گے۔"

منسارام نے کمزور آواز میں کہا۔"اب جینے کی خواہش نہیں اور نہ بولنے کی طاقت ہے۔" یہ کہتے کہتے منسارام کمزوری کے سبب وہیں زمین پر لیٹ گیا۔ نرملا نے شوہر کی طرف بے خوفی سے دیکھتے ہوئے کہا۔"ڈاکٹروں نے کیا صلاح دی؟"

منشی جی۔ سب کے سب بھنگ کھائے ہوئے ہیں۔ کہتے ہیں تازہ خون چاہیے۔

نرملا۔ تازہ خون مل جائے تو جان بچ سکتی ہے؟

منشی جی نے نرملا کی طرف تیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔"میں ایشور نہیں ہوں۔ اور نہ ڈاکٹروں کی ایشور سمجھتا ہوں۔"

نرملا۔ تازہ خون تو ایسی نایاب چیز نہیں۔

منشی جی۔ آسمان کے تارے بھی تو نایاب نہیں، منہ کے سامنے خندق کیا چیز ہے۔

نرملا۔ میں اپنا خون دینے کو تیار ہوں۔ ڈاکٹر کو بلائیے۔

منشی جی نے حیرت سے کہا۔ "تم!"

نرملا۔ ہاں، کیا میرے خون سے کام نہ چلے گا؟

منشی جی۔ تم اپنا خون دوگی؟ نہیں، تمھارے خون کی ضرورت نہیں، اس میں جان کا خطرہ ہے۔

نرملا۔ میری جان اور کس دن کام آئے گی؟

منشی جی نے آبدیدہ ہوکر کہا۔ "نہیں نرملا۔ اس کی قیمت اب میری نگاہوں میں بہت بڑھ گئی ہے۔ آج تک وہ میری نفس پرستی کی چیز تھی، آج سے وہ میری عقیدت کی چیز ہے۔ میں نے تمھارے ساتھ سخت ناانصافی کی ہے۔ مجھے معاف کرو۔

(۱۴)

جو کچھ ہونا تھا ہو گیا۔ کسی کی کچھ نہ چلی۔ ڈاکٹرصاحب نرملا کے جسم سے خون نکالنے کی کوشش کرہی رہے تھے کہ منسارام اپنی پاکیزگی کی آخری جھلک دکھلاکر اس عالم وہم خیال سے رخصت ہوگیا۔ شاید اتنی دیر تک اس کی جان نرملا ہی کے انتظار میں اٹک رہی تھی۔ اسے بے گناہ ثابت کیے بغیر وہ جسم کو کیسے چھوڑ دیتی؟ اب اس کا مقصد پورا ہوگیا۔ منشی جی کو نرملا کے بے گناہ ہونے کا یقین ہوگیا۔ مگر کب؟ جب کمان سے تیر نکل چکا تھا۔

اس صدمہ سے منشی جی کو جینا دوبھر ہوگیا۔ اس روز سے پھر ان کے ہونٹوں پر ہنسی نہ آئی۔ زندگی بیکار معلوم ہونے لگی۔ وہ کچہری جاتے مگر مقدمات کی پیروی کے لیے نہیں۔ بلکہ محض دل بہلانے کے لیے۔ گھنٹہ دو گھنٹہ میں وہاں سے اکتا کر چلے آتے کھانے بیٹھتے تو لقمہ منہ میں نہ جاتا۔ نرملا اچھے سے اچھے کھانے پکاتی۔ مگر منشی جی دوچار نوالوں سے زیادہ نہ کھاسکتے۔ ایسا معلوم ہوتا کہ کھانا منہ سے نکلا پڑتا ہے۔ منسارام کے کمرہ کی طرف جاتے ہی ان کا دل پاش پاش ہوجاتا تھا۔ جہاں ان کی امیدوں کا چراغ جلتا رہتا تھا وہاں اب

تاریکی تھی۔ ان کے دو بیٹے اب بھی تھے مگر پھولنے پھلنے والا درخت گر پڑا۔ تو ننھے پودوں کا کیا اعتبار؟ یوں تو جوان، بڈھے سبھی مرتے ہیں مگر رنج اس بات کا تھا کہ انھوں نے خود لڑکے کی جان لی۔ جس وقت یہ بات یاد آجاتی تو ایسا معلوم ہوتا کہ ان کا سینہ شق ہوجائے گا اور ان کا دل باہر نکل پڑے گا۔

نرملا کو شوہر سے سچی ہمدردی تھی۔ حتی الامکان وہ انھیں خوش رکھنے کی کوشش کرتی تھی۔ اور گئی گزری باتوں کا بھول کر بھی ذکر نہ کرتی تھی۔ منشی جی اس سے منسارام کے متعلق کچھ کہتے شرماتے تھے۔ ان کی کبھی کبھی ایسی خواہش ہوتی کہ ایک بار نرملا سے اپنے دل کی ساری باتیں کھول کر کہہ دوں مگر ندامت سے زبان بند ہوجاتی تھی۔ اس طرح ان کو وہ تسکین بھی نہ ملتی تھی۔ جو اپنا دکھ کہہ ڈالنے سے، دوسروں کو اپنے دُکھ میں شریک کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ مواد فاسد باہر نہ نکل کر اندر ہی اندر اپنا زہر پھیلاتا جاتا تھا۔ روز بروز بدن گھلتا جاتا تھا۔

ادھر کچھ دنوں سے منشی جی اور ان ڈاکٹر صاحب میں جنھوں نے منسارام کا علاج کیا تھا۔ دوستانہ ہوگیا تھا۔ بے چارے کبھی کبھی آکر منشی جی کی تشفی کیا کرتے۔ کبھی کبھی اپنے ساتھ ہوا کھانے کے لیے کھینچ لے جاتے۔ ان کی بیوی بھی دوچار مرتبہ نرملا سے ملنے آئی تھی، نرملا بھی کئی بار ان کے گھر جا چکی تھی۔ مگر جب وہ وہاں سے واپس آتی تو کئی دن تک اُداس رہتی۔ ان دونوں کی خوش گزراں زندگی دیکھ کر اسے اپنی حالت پر رنج ہوئے بغیر نہ رہتا۔ ڈاکٹر صاحب کو کُل دو سو روپے ماہوار ملتے تھے مگر اسی میں دونوں کی بہ آرام بسر ہوتی تھی۔ گھر میں صرف ایک مہری تھی۔ خانہ داری کا بہت سارا کام ڈاکٹر صاحب کی بیوی کو اپنے ہی ہاتھوں کرنا پڑتا تھا۔ اس کے بدن پر گہنے بھی بہت کم تھے مگر ان دونوں میں وہ محبت تھی جسے دولت کی ذرا بھی پرواہ نہیں ہوتی۔ شوہر کو دیکھ کر بیوی بشاش ہوجاتی تھی، اور بیوی کو دیکھ کر شوہر کا چہرہ شگفتہ ہوجاتا تھا۔ نرملا کے مکان میں دولت اس سے کہیں زیادہ تھی۔ گہنوں کے بوجھ سے اس کا جسم دبا جاتا تھا۔ اس کو گھر کا کوئی کام اپنے ہاتھ سے نہ کرنا پڑتا تھا۔ مگر نرملا امیر ہونے پر بھی بہت مغموم تھی۔ جو نرملا کے پاس نہ ہو۔ جس کے سامنے اسے اپنی امارت ہیچ معلوم ہوتی تھی۔ حتیٰ کی وہ سُدھا کے گھر گہنے پہن کر جاتے ہوئے شرماتی تھی۔

ایک روز نرملا ڈاکٹر صاحب کے گھر گئی تو اسے بہت اُداس دیکھ کر سُدھا نے پوچھا۔ ''بہن آج بہت اُداس ہو۔ وکیل صاحب کی طبیعت تو اچھی ہے نہ؟''

نرملا۔ کیا کہوں سُدھا۔ ان کی حالت روز بروز ابتر ہوتی جارہی ہے۔ کچھ کہتے نہیں بنتا۔ نہ جانے ایشور کو کیا منظور ہے۔

سُدھا۔ ہمارے بابو جی تو کہتے ہیں کہ انھیں کہیں تبدیل آب و ہوا کے لیے جانا ضروری ہے۔ ورنہ کوئی مہلک عارضہ لاحق ہوجائے گا۔ وہ کئی بار وکیل صاحب سے کہہ بھی چکے ہیں مگر وہ یہی جواب دیتے ہیں کہ میں تو بہت اچھا ہوں مجھے کوئی شکایت نہیں۔ آج تم بھی کہنا۔

نرملا۔ جب ڈاکٹر صاحب کی نہیں سنتے تو میری کیا سنیں گے؟

یہ کہتے کہتے نرملا کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ اور وہ بات جو ادھر مہینوں سے اسے پریشان کر رہی تھی۔ اس کے منہ سے نکل پڑی۔ اب تک اس نے چھپا رکھا تھا مگر اب نہ چھپا سکی۔ بولی۔ ''بہن مجھے تو کچھ اچھے آثار نظر نہیں آتے۔ دیکھیں ایشور کیا کرتے ہیں۔

سدھا۔ تم آج ان سے کافی زور دے کر کہنا کہ کہیں تبدیل آب و ہوا کے لیے چلیے۔ دوچار مہینے باہر رہنے سے بہت سی باتیں بھول جائیں گے۔ میں تو سمجھتی ہوں کہ شاید مکان تبدیل کردینے سے بھی ان کا رنج کچھ گھٹ جائے گا۔ تم کہیں باہر جا بھی تو نہ سکوگی۔ یہ کون سا مہینہ ہے؟

نرملا۔ آٹھواں مہینہ جارہا ہے۔ یہ اندیشہ تو مجھے اور بھی ہلاک کیے ڈالتا ہے۔ میں نے تو اس کے لیے ایشور سے کبھی بینتی نہیں کی تھی۔ یہ بلا میرے سر نہ جانے کیوں ڈال دی۔ میں بڑی بدنصیب ہوں۔ بیاہ کے ایک ماہ قبل باپ کا انتقال ہوگیا۔ ان کے مرتے ہی میرے سر پر سنیچر سوار ہوا۔ جہاں پہلے بیاہ کی گفتگو پختہ ہوچکی تھی، وہاں کے لوگوں نے بے رخی کا برتاؤ کیا۔ بے چاری اماں جی کو ہار مان کر میرا بیاہ یہاں کرنا پڑا۔ اب چھوٹی بہن کا بیاہ ہونے والا ہے دیکھیں اس کی ناؤ کس گھاٹ جاتی ہے۔

سدھا۔ جہاں پہلے بیاہ کی گفتگو ہوئی تھی ان لوگوں نے انکار کیوں کردیا تھا؟

نرملا۔ یہ تو وہی جانیں۔ باپ ہی نہ رہا تو سونے کی گٹھڑی کون دیتا؟

سدھا۔ یہ تو کمینہ پن ہے۔ کہاں کے رہنے والے تھے؟
نرملا۔ لکھنؤ کے۔ نام تو یاد نہیں، مگر آبکاری کے کوئی بڑے افسر تھے۔
سدھا نے متانت سے پوچھا۔"ان کا لڑکا کیا کرتا تھا؟" سدھا نے سر نیچا کر کے کہا۔"اس نے اپنے باپ سے کچھ نہ کہا؟ وہ تو جوان تھا۔ کیا اپنے باپ کو مجبور نہ کرسکتا تھا؟"
نرملا۔ اب میں یہ کیا جانوں بہن۔ سونے کی گٹھڑی کسے اچھی نہیں لگتی۔ جو پنڈت میرے یہاں سے سندیسہ لے کر گیا تھا۔ اس نے تو کہا تھا کہ لڑکا ہی انکار کررہا ہے۔ لڑکے کی ماں البتہ دیوی تھی۔ اس نے ان دونوں باپ بیٹے کو سمجھایا۔ مگر اس کی ایک نہ چلی۔
سدھا۔ میں اس لڑکے کو پاتی تو خوب آڑے ہاتھوں لیتی۔
نرملا۔ میرے نصیب میں تو جو لکھا تھا وہ ہوچکا۔ بے چاری کرشنا پر نہ جانے کیا بیتے گی؟
شام کے وقت نرملا کے چلے جانے پر جب ڈاکٹرصاحب باہر سے آئے تو سدھا نے کہا۔"کیوں جی تم اس آدمی کو کیا کہوگے جو ایک جگہ بیاہ طے کرلینے کے بعد پھر لالچ سے کسی دوسری جگہ بیاہ کرلے۔
ڈاکٹر سنہا نے بیوی کی طرف حیرت سے دیکھ کہا۔"ایسا نہیں کرنا چاہیے اور کیا؟"
سدھا۔ یہ کیوں نہیں کہتے کہ بھاری کمینہ پن ہے؟
سنہا۔ ہاں۔ یہ کہنے سے بھی مجھے انکار نہیں۔
سنہا کی سمجھ میں ابھی تک یہ نہیں آیا تھا کہ سدھا کے ان سوالوں کا کیا مطلب ہے۔ تعجب سے بولے۔"جیسی حالت ہو۔ اگر وہ باپ کا تابع ہوتو باپ ہی کا قصور سمجھو۔"
سدھا۔ تابع ہونے پر بھی کیا جوان آدمی کا کوئی فرض نہیں ہے؟ اگر اس کو اپنے لیے نئے کوٹ کی ضرورت ہو تو وہ باپ کی مخالفت پر بھی اسے رودھوکر بنوا ہی لیتا ہے۔ کیا ایسی اہم بات کے متعلق وہ اپنی آواز کو باپ کے کانوں تک نہیں پہنچا سکتا ؟ یہ کہو کہ لڑکا اور لڑکے کا باپ دونوں ہی قصوروار ہیں مگر زیادہ تر لڑکا! بڈھا آدمی سوچتا ہے کہ مجھے تو سارا خرچ برداشت کرنا پڑے گا۔ پس لڑکی والوں سے جتنا اینٹھ سکوں اتنا ہی اچھا۔ مگر لڑکے کا فرض ہے کہ اگر وہ خودغرضی کے ہاتھوں بالکل بک نہیں

گیا ہے، تو اپنی قوت سے کام لے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو میں کہوں گی کہ وہ حریص بھی ہے اور بزدل بھی۔ بدقسمتی سے ایسا ہی ایک شخص میرا شوہر ہے اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کن الفاظ میں اسے ملامت کروں۔

سنہا نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "وہ ...... وہ ...... وہ دوسری بات تھی۔ لین دین کا سبب نہیں تھا۔ بالکل دوسری بات تھی۔ لڑکی کے باپ کا انتقال ہوگیا تھا۔ ایسی حالت میں ہم لوگ کیا کرتے؟ یہ بھی سننے میں آیا تھا کہ لڑکی میں کوئی نقص ہے۔ وہ بالکل دوسری بات تھی۔ مگر تم سے یہ داستان کس نے کہی؟

سدھا۔ کہہ دو نہ کہ وہ لڑکی کانی تھی۔ کبڑی تھی، آوارہ تھی، یا نائن کے پیٹ کی تھی۔ اتنی کسر کیوں چھوڑ رکھی۔ بھلا سنوں تو اس لڑکی میں کیا نقص تھا؟

سنہا۔ میں نے دیکھا تو تھا نہیں، سننے میں آیا تھا کہ اس میں کوئی نقص ہے۔

سدھا۔ سب سے بڑا نقص یہی تھا کہ اس کے باپ کا انتقال ہوگیا تھا۔ اور وہ کوئی بھاری رقم نہ دے سکتی تھی۔ اتنا قبول کرتے ہوئے کیوں جھینپتے ہو؟ میں کچھ تمھارے کان تو نہ کاٹ لوں گی۔ اگر دوچار فقرے کہوں تو اس کان سے سُن کر اس کان سے اُڑا دینا۔ زیادہ بکواس کروں تو چھڑی سے کام لے سکتے ہو عورت ذات ڈنڈے ہی سے ٹھیک رہتی ہے۔ اگر اس لڑکی میں کوئی عیب تھا تو میں کہوں گی کہ لکشمی بھی بے عیب نہیں۔ تمھاری قسمت کھوٹی تھی۔ بس اور کیا۔ تمھیں تو میرے پالے پڑنا تھا۔

سنہا۔ تم سے کس نے کہا وہ ایسی تھی اور ویسی تھی۔ جیسے تم نے کسی سے سُن کر مان لیا ویسے ہی ہم لوگوں نے بھی سُن کر مان لیا۔

سدھا۔ میں نے سُن کر نہیں مان لیا اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ زیادہ کیا تعریف کروں؟ میں نے ایسی خوبصورت عورت کبھی نہیں دیکھی تھی۔

سنہا نے بے قرار ہوکر پوچھا۔ کیا وہ یہیں کہیں ہے۔ سچ بتاؤ۔ اس کو کہاں دیکھا کیا تمھارے گھر آئی تھی؟

سدھا۔ ہاں میرے گھر آئی تھی۔ اور ایک بار نہیں، کئی بار آچکی ہے۔ میں بھی اس کے یہاں کئی بار جا چکی ہوں۔ وکیل صاحب کی بیوی وہی لڑکی ہے جس کو آپ نے نقص کے سبب سے چھوڑ دیا تھا۔

سنہا۔ سچ؟

سدھا۔ بالکل سچ۔ اگر آج اسے معلوم ہوجائے کہ آپ وہی حضرت ہیں تو شاید پھر اس مکان میں قدم نہ رکھے۔ ایسی نیک مزاج، گھر کے کاموں میں ایسی ہوشیار اور ایسی شکل و صورت والی عورتیں اس شہر میں دو ہی چار ہوں گے۔ تم میری تعریف کرتے ہو۔ میں اس کی لونڈی ہونے کے قابل بھی نہیں ہوں۔ گھر میں ایشور کا دیا ہوا سب کچھ ہے۔ مگر جب جوڑا ہی ٹھیک نہیں، تو اور سب چیزوں کا ہونا کس کام کا؟ آفریں ہے اس کے ضبط و تحمل پر کہ اس بوڑھے کھوسٹ وکیل کے ساتھ اپنے دن کاٹ رہی ہے۔ میں نے تو کب کا زہر کھا لیا ہوتا۔ مگر دل کی کہنے ہی سے تھوڑے ظاہر ہوتی ہے۔ خود بھی ظاہر ہوجاتی ہے۔ وہ ہنستی ہے بولتی ہے گہنے کپڑے پہنتی ہے۔ مگر اس کا ایک ایک رونگٹا رویا ہی کرتا ہے۔

سنہا۔ وکیل صاحب کی خوب شکایت کرتی ہوگی۔

سدھا۔ شکایت کیوں کرے گی؟ کیا وہ اس کے شوہر نہیں ہیں؟ اب تو دنیا میں اس کے لیے جو کچھ ہے وہ وکیل صاحب ہی ہیں۔ وہ بڈھے ہوں یا مریض مگر ہیں تو اس کے شوہر! شریف عورتیں شوہر کی ہجو نہیں کرتیں۔ یہ بدذاتوں کا کام ہے۔ وہ ان کی حالت دیکھ کر کڑھتی ہے مگر زبان سے کچھ نہیں کہتی۔

سنہا۔ ان وکیل صاحب کو کیا سوجھی تھی جو اس عمر میں بیاہ کرنے چلے؟

سدھا۔ ایسے آدمی نہ ہوں، تو غریب کنواریوں کی ناؤ کون پار لگائے؟ تم اور تمھارے جیسے لوگ بلا بھاری گٹھڑی لیے بات نہیں کرتے۔ تو پھر یہ بے چاری کس کے گھر جائیں، تم نے یہ بڑا بھاری انیائے کیا ہے اور تمھیں اس کا پرائشچت (کفارہ) کرنا پڑے گا۔ ایشور اس کا سہاگ امر کرے۔ مگر وکیل صاحب کو کہیں کچھ ہوگیا تو بے چاری کی زندگی غارت ہوجائے گی۔ آج وہ بہت روتی تھی۔ تم لوگ واقعی بڑے بے رحم ہو۔ میں تو اپنے سوہن کا بیاہ کسی غریب سے کروں گی۔

ڈاکٹر صاحب نے آخری جملہ نہیں سنا۔ وہ گہری فکر میں ڈوب گئے۔ ان کے دل میں یہ سوال بار بار پیدا ہوکر انھیں پریشان کرنے لگا کہ کہیں وکیل صاحب کو کچھ ہوگیا تو؟ آج انھیں اپنی خودغرضی کی خوفناک صورت نظر آئی۔ واقعی یہ انھیں کا قصور تھا۔ اگر

انھوں نے باپ سے بہ اصرار کہا ہوتا کہ میں اور کہیں بیاہ نہ کروں گا تو کیا وہ ان کی مرضی کے خلاف ان کا بیاہ کردیتے؟

دفعتاً سُدھا نے کہا۔"اگر کہو تو کل نرملا سے تمھاری ملاقات کرادوں۔ وہ بھی ذرا تمھاری صورت دیکھ لے۔ وہ کچھ بولے گی تو نہ مگر شاید وہ ایک ہی نظر سے تمھاری اتنی ملامت کردے گی کہ تم تمام عمر نہ بھولو گے۔ بولو۔ کل ملادوں؟ تمھارا مختصر حال بھی بتلا دوں گی۔

سنہا نے کہا۔ "نہیں سدھا، تمھارے سامنے ہاتھ جوڑتا ہوں۔ کہیں ایسا غضب نہ کرنا ورنہ میں سچ کہتا ہوں کہ گھر چھوڑ کر بھاگ جاؤں گا۔"

سدھا۔ جو کانٹا بویا ہے اس کا پھل کھاتے کیوں اتنا ڈرتے ہو؟ جس کی گردن پر کٹار چلائی ہے اسے ذرا تڑپتا ہوا بھی تو دیکھو۔ میرے دادا جی نے پانچ ہزار دیئے نہ؟ ابھی چھوٹے بھائی کے بیاہ میں پانچ ہزار اور مل جائیں گے۔ پھر تو تمھارے برابر دولت مند دنیا میں کوئی دوسرا نہ ہوگا۔ گیارہ ہزار بہت ہوتے ہیں۔ باپ رے باپ! گیارہ ہزار! اُٹھا اُٹھا کر رکھنے لگے تو مہینوں لگ جائیں۔ اگر لڑکے اُڑانے بھی لگیں تو تین پشتوں کو کافی ہو۔ کہیں سے گفتگو درپیش ہے یا نہیں؟

اس طعن آمیز کلام سے ڈاکٹر صاحب اس قدر نادم ہوئے کہ سر تک نہ اُٹھا سکے۔ ان کی ساری گویائی سلب ہوگئی۔ ذرا سا منہ نکل آیا۔ گویا طمانچے پڑگئے ہوں۔ اسی وقت کسی نے ڈاکٹر صاحب کو باہر سے پکارا۔ بے چارے جان لے کر بھاگے۔ عورت طعنہ زنی میں کتنی ہوشیار ہوتی ہے اس کا آج انھیں پتہ چل گیا۔

رات کو ڈاکٹر صاحب لیٹتے ہوئے سدھا سے بولے۔"نرملا کی تو کوئی بہن اور ہے نہ؟"

سدھا۔ ہاں آج اس کا ذکر تو کرتی تھی۔ اس کی فکر ابھی سے دامنگیر ہے۔ نرملا پر تو جو کچھ بیتنی تھی بیت چکی۔ بہن کی فکر میں پڑی ہوئی ہے۔ ماں کے پاس تو اب اور بھی کچھ نہیں رہا۔ مجبوراً کسی ایسے بوڑھے بابا کے گلے وہ بھی منڈھ دی جائے گی۔

سنہا۔ نرملا تو اب اپنی ماں کی مدد کرسکتی ہے؟

سدھا نے تیز لہجہ میں کہا۔"تم بھی کبھی کبھی بالکل بے سر پیر کی باتیں کرنے لگتے

ہو۔ نرملا بہت کرے گی تو دوچار سور روپے دے دے گی۔ اور کیا کرسکتی ہے۔ وکیل صاحب کا یہ حال ہو رہا ہے۔ اسے تو ابھی پہاڑ سی عمر کاٹنی ہے۔ پھر کون جانے اس کے گھر کا کیا حال ہے؟ اِدھر چھ مہینے سے بے چارے گھر بیٹھے ہیں۔ روپے آسمان سے تھوڑا ہی برستے ہیں۔ دس بیس ہزار ہوں گے بھی تو بینک میں ہوں گے۔ کچھ نرملا کے پاس تو رکھے نہ ہوں گے۔ ہمارا دو سو ماہوار کا خرچ ہے تو کیا ان کا چار سو ماہوار کا بھی نہ ہوگا؟''

سدھا تو سو گئی مگر ڈاکٹر صاحب بہت دیر تک کروٹیں بدلتے رہے۔ پھر کچھ سوچ کر اُٹھے اور میز پر جاکر ایک خط لکھنے لگے۔

(۱۴)

تینوں باتیں ایک ساتھ ہی ہوئیں۔ نرملا کے لڑکی پیدا ہوئی۔ کرشنا کا بیاہ طے ہوا اور منشی طوطا رام کا مکان نیلام ہوگیا۔ لڑکی کا پیدا ہونا تو معمولی بات تھی۔ اگرچہ نرملا کی نگاہوں میں یہ اس کی زندگی کا اہم ترین واقعہ تھا۔ بقیہ دونوں واقعے غیر معمولی تھے۔ کرشنا کا بیاہ ایسے باثروت خاندان میں کیوں کر طے ہوا۔ اس کی ماں کے پاس تو جہیز کے نام پھوٹی کوڑی نہ تھی۔ اور ادھر بوڑھے سنہا صاحب جو اَب پنشن لے کر مکان آگئے تھے۔ اپنی برادری میں بڑے ہی لالچی مشہور تھے۔ وہ اپنے لڑکے کا بیاہ ایسے مفلس گھرانے میں طے کرنے پر کیسے رضامند ہوئے۔ کسی کو یکایک اس کا یقین نہ آتا تھا۔ اس سے بھی زیادہ تعجب خیز امر منشی جی کے مکان کا نیلام ہوجانا تھا۔ لوگ منشی جی کو اگر لکھ پتی کروڑ پتی نہیں تو کم از کم بڑا آدمی ضرور خیال کرتے تھے۔ ان کا مکان کیسے نیلام ہوا؟ بات یہ تھی کہ منشی جی نے ایک مہاجن سے کچھ روپے قرض لے کر ایک گاؤں رہن رکھا تھا۔ انھیں امید تھی کہ سال چھ مہینے میں یہ روپے ادا کردیں گے اور پھر دس پانچ برس میں اس گاؤں پر بھی پورا قبضہ کرلیں گے۔ کیونکہ زمیندار اصل اور سود کے کچھ روپے ادا نہ کرسکے گا۔ اسی امید پر منشی جی نے یہ معاملہ کیا تھا گاؤں بہت بڑا تھا۔ چار پانچ سو روپیہ سالانہ کا منافع تھا۔ مگر دل کی بات دل ہی میں رہ گئی۔ منشی جی اپنے کو بہت کچھ سمجھانے پر بھی کچہری کا کام نہ کرسکے۔ لڑکے کے سوگ نے ان میں کوئی کام کرنے کی طاقت ہی باقی نہ رکھی۔ کون ایسا بے درد باپ ہے۔ جو لڑکے کے حلق پر تلوار پھیر کر بھی اپنے دل کو مطمئن کرسکے؟

مہاجن کے پاس جب سال بھر تک سود نہ پہنچا۔ اور نہ اس کے بار بار بلانے پر

منشی جی اس کے پاس ہی گئے۔ یہاں تک کہ آخری مرتبہ انھوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ ہم کسی کے غلام نہیں ہیں۔ ساہو جی جو چاہیں کریں۔ تو ساہو جی کو بھی غصہ آگیا۔ اس نے نالش کردی۔ منشی جی جواب دہی کرنے بھی نہ گئے۔ یکطرفہ ڈگری ہوئی۔ یہاں مکان میں روپے کہاں رکھے تھے۔ اتنے ہی دنوں میں منشی جی کی ساکھ بھی زائل ہوگئی تھی۔ وہ روپیہ کا کوئی بندوبست نہ کرسکے۔ نتیجہ یہ کہ مکان نیلام پر چڑھ گیا۔ نرملا زچہ خانہ میں تھی۔ یہ خبر سُنی تو کلیجہ دھک سے ہوگیا۔ زندگی میں اور کوئی سکھ نہ ہونے پر بھی روپے پیسے کی فکر سے آزاد تھی۔ دولت اگر انسانی زندگی کے لیے بہترین شے نہیں تو قریب قریب بہترین ضرور ہے۔ اب دیگر ضروریات کے ساتھ اس کی فکر بھی اس کے سر پر سوار ہوئی۔ اس نے دایہ سے کہلا بھیجا کہ میرے سب گہنے فروخت کرکے مکان کو بچا لیجیے۔ مگر منشی جی نے یہ بات کسی طرح منظور نہ کی۔

اس روز سے منشی جی اور بھی متفکر رہنے لگے۔ جس امارت کا لطف اُٹھانے کے لیے انھوں نے بیاہ کیا تھا۔ وہ اب ماضی کی محض یادگار تھی۔ وہ اب پشیمانی سے نرملا کو اپنا منہ تک نہ دکھلاسکتے تھے۔ انھیں اب اپنی اس بے انصافی کا اندازہ ہو رہا تھا۔ جو انھوں نے نرملا کے ساتھ کی تھی اور لڑکی کی ولادت نے تو بقیہ کسر بھی پوری کردی۔ سب چوپٹ ہی ہوگیا۔

بارہوں روز زچہ خانہ سے نکل کر نرملا نوزائیدہ بچہ کو گود میں لیے شوہر کے پاس گئی وہ اس ناداری کی حالت میں بھی اتنی خوش تھی گویا اُسے کوئی فکر نہیں ہے۔ ننھی بچی کو سینہ سے لگا کر وہ اپنے سارے تفکرات بھول گئی تھی۔ لڑکی کی کشادہ اور پُرمسرت آنکھوں کو دیکھ کر اس کا دل شگفتہ ہورہا تھا۔ مامتا کے اس ظہور میں اس کے سارے دکھ درد دور ہوگئے تھے۔ وہ لڑکی کو شوہر کی گود میں دے کر خوش ہوجانا چاہتی تھی۔ مگر منشی جی لڑکی کو دیکھ کر سہم گئے۔ انھیں اس کو گود میں لینے کا حوصلہ نہ ہوا۔ مگر انھوں نے ایک بار اسے دُکھ بھری نگاہوں سے دیکھا۔ اور پھر سر جھکا لیا۔ لڑکی کی صورت منسارام کے بالکل مشابہ تھی۔

نرملا نے ان دلی خیالات کی کچھ اور ہی تعبیر کی۔ اس نے سو گنے پیار کے ساتھ لڑکی کو سینہ سے لگا لیا۔ گویا ان سے کہہ رہی تھی۔ اگر تم اس کے بوجھ سے دبے جاتے ہو

تو آج سے میں اس پر تمھارا سایہ بھی نہ پڑنے دوں گی۔ جس دُر بے بہا کو میں نے اتنی ریاضت کے بعد پایا ہے۔ اس کی تحقیر کرتے ہوئے تمھارا دل نہیں پھٹ جاتا؟ وہ اسی وقت لڑکی کو اپنے سینہ سے لگائے ہوئے اپنے کمرہ میں چلی گئی اور دیر تک روتی رہی۔ اس نے شوہر کی اس بے دلی کو سمجھنے کی ذرا بھی کوشش نہ کی۔ ورنہ شاید ان کو اتنا بے درد نہ خیال کرتی۔ اس کے سر پر ذمہ داری کا اتنا زبردست بار کہاں تھا جو اس کے شوہر پر آپڑا تھا؟ کیا وہ سمجھنے کی کوشش کرتی تو اتنا بھی اس کی سمجھ میں نہ آتا؟

منشی جی کو ایک ہی لمحہ میں اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ ماں کا دل محبت میں اتنا محو رہتا ہے کہ مستقبل کی فکر و پریشانی سے اس کو ذرا بھی ہراس نہیں ہوتا۔ اسے اپنے دل میں ایسی طاقت کا احساس ہوتا ہے۔ جو تمام تکالیف کو دور کردینے کی کفیل ہوتی ہے۔ منشی جی فوراً دوڑے ہوئے مکان میں گئے اور بچہ کو گود میں لے کر بولے۔ ”مجھے یاد آتا ہے کہ منسا بھی ایسا ہی تھا۔ بالکل ایسا ہی!“

نرملا۔ دیدی جی بھی تو یہی کہتی ہیں۔

منشی جی۔ بالکل وہی۔ بڑی بڑی آنکھیں اور سُرخ سُرخ ہونٹ ہیں۔ ایشور نے مجھے میرے منسارام کو اس شکل میں دیا۔ وہی پیشانی ہے، وہی مُنہ، وہی ہاتھ پیر، ایشور تمھاری لیلا اُپار ہے!

اتفاقاً اسی وقت رکمنی بھی آگئی اور منشی جی کو دیکھتے ہی بولی۔ ”دیکھو بابو۔ منسارام ہے کہ نہیں۔ وہی آیا ہے۔ کوئی لاکھ کہے میں نہ مانوں گی۔ صاف منسارام ہے۔ سال بھر کے قریب ہو بھی تو گیا۔“

منشی جی۔ بہن، ایک ایک عضو ملتا ہے۔ بس بھگوان نے مجھے میرا منسارام دے دیا۔ (بچہ سے) کیوں ری۔ تو منسارام ہی ہے؟ چھوڑکر جانے کا نام نہ لینا۔ ورنہ پھر کھینچ لاؤں گا۔ دیکھو بہن، کیسا ٹکر ٹکر تاک رہی ہے۔

اسی لمحہ میں منشی جی نے دوبارہ آرزوؤں کا محل بنانا شروع کیا۔ نفس نے انھیں پھر دنیا کی طرف راغب کیا۔ انسانی زندگی! تو کتنی ناپائیدار ہے۔ مگر تیرے منصوبے کتنے وسیع! وہی طوطا رام جو تارک الدنیا ہو رہے تھے۔ جو رات دن موت کو بلاتے رہتے تھے۔ تنکے کا سہارا پاکر کنارے پر پہنچنے کے لیے اپنی پوری طاقت سے ہاتھ پیر مار رہے تھے۔ مگر تنکے کا

سہارا پاکر کوئی کنارے پر پہنچتا ہے؟

(۱۵)

اگرچہ نرملا کو اپنے ہی گھر کے جھنجھٹ سے فرصت نہ تھی۔ مگر کرشنا کے بیاہ کی خبر پاکر وہ کسی طرح نہ رُک سکی۔ اس کی ماں نے اُسے بہ اصرار طلب کیا تھا۔ سب سے بڑی ترغیب یہ تھی کہ کرشنا کا بیاہ اسی گھر میں ہو رہا تھا۔ جہاں خود نرملا کا بیاہ پہلے طے ہوا تھا۔ تعجب یہی تھا کہ اس مرتبہ بلا کسی جہیز کے بیاہ کرنے پر کیسے راضی ہوگئے۔ نرملا کو کرشنا کے متعلق بہت تشویش رہتی تھی کہ میری طرح وہ بھی کسی کے گلے منڈھ دی جائے گی۔ وہ بہت چاہتی تھی کہ ماں کی کچھ مدد کرے۔ جس سے کرشنا کے لیے کوئی اچھا لڑکا مل سکے۔ لیکن ادھر وکیل صاحب کی بیکاری اور مہاجن کی نالش کے سبب اس کا ہاتھ بھی تنگ تھا۔ ایسی حالت میں اس خبر سے اس کو بہت اطمینان ہوا۔ روانگی کی تیاری کردی۔ وکیل صاحب اسٹیشن تک پہنچانے گئے ننھی بچّی سے انھیں بڑی محبت تھی۔ مگر شادی کے ایک ماہ قبل ہی سے ان کا سسرال میں جاکر رہنا نرملا کو مناسب نہ معلوم ہوا۔

نرملا نے اپنی ماں سے اب تک اپنی مصیبت کا حال بیان نہ کیا تھا۔ جو بات ہوگئی۔ اس کا رونا روکر ماں کو بھی رُلانے سے کیا فائدہ؟ پس اس کی ماں سمجھتی تھی کہ نرملا نہایت آرام سے ہے۔ اب جو نرملا کی صورت دیکھی تو اس کے دل کو دھکا سا لگا۔ لڑکیاں سسرال سے گھل کر نہیں آتیں۔ پھر نرملا جیسی لڑکی۔ جس کے لیے آسائش کے سبھی سامان موجود تھے۔ اس نے کتنی ہی لڑکیوں کو نیا چاند بن کر سسرال جاتے اور پورا چاند بن کر واپس آتے دیکھا تھا۔ دل میں سوچ رکھا تھا کہ نرملا کا رنگ نکھر گیا ہوگا۔ جسم بھر کر سڈول ہوگیا ہوگا۔ اور اس کے ہر عضو کا رنگ روپ کچھ اور ہی ہوگیا ہوگا۔ اب جو دیکھا تو اس کا آدھا بدن بھی نہ رہ گیا تھا۔ نہ شباب کی شوخی تھی اور نہ وہ متبسم جلوہ جو دل کو کھینچ لیتا ہے۔ وہ خوبصورتی وہ نزاکت جو آرام و آسائش کی زندگی کا نتیجہ ہے۔ یہاں نام کو نہ تھی۔ چہرہ زرد، اعضا سُست، حالت گری ہوئی۔ نرملا اُنیس سال ہی کی عمر میں بڈھی ہوگئی تھی۔ جب ماں بیٹیاں رودھوکر فارغ ہوگئیں۔ تو ماں نے پوچھا۔ ”کیوں ری، کیا وہاں تجھے کھانے کو نہ ملتا تھا؟ اس سے کہیں اچھی تو تو یہیں تھی۔ وہاں تجھے کیا تکلیف ہوئی؟“

کرشنا نے ہنس کر کہا۔ ”وہاں مالکہ تھیں کہ نہیں! مالکہ کو جو دنیا بھر کے تفکرات

رہتے ہیں۔ کھانا کب کھاتیں؟

نرملا۔ نہیں اماں۔ وہاں کی آب و ہوا میرے موافق نہیں۔ طبیعت بھاری رہتی ہے۔

ماں۔ وکیل صاحب جب شادی میں آئیں گے نہ؟ اس وقت پوچھوں گی، کہ آپ نے پھول سی لڑکی لے جاکر اس کی یہ گت بنا ڈالی! اچھا اب یہ بتا کہ تونے یہاں روپے کیوں بھیجے تھے؟ میں نے تو تجھ سے کبھی نہ مانگے تھے۔ لاکھ گئی گزری ہوں مگر بیٹی کا دھن کھانے کی نیت نہیں۔

نرملا نے حیرت سے پوچھا۔"کس نے روپے بھیجے تھے اماں؟ میں نے تو نہیں بھیجے۔"

ماں۔ جھوٹ نہ بول۔ تو نے پانچ سو کے نوٹ نہیں بھیجے تھے؟

کرشنا۔ بھیجے نہیں تھے تو کیا آسمان سے گر پڑے۔ تمھارا نام صاف لکھا تھا۔ مُہر بھی وہیں کی تھی۔

نرملا۔ تمھارے پیر چھوکر کہتی ہوں کہ میں نے روپے نہیں بھیجے۔ یہ کب کی بات ہے؟

ماں۔ ارے بھائی۔ دو ڈھائی مہینے ہوئے ہوں گے۔ مگر تونے نہیں بھیجے، تو آئے کہاں سے؟

نرملا۔ یہ میں کیا جانوں؟ مگر میں نے روپے نہیں بھیجے۔ ہمارے یہاں تو جب سے جوان بیٹا مرا ہے کچہری ہی نہیں جاتے۔ میرا ہاتھ تو آپ ہی تنگ تھا۔ روپے کہاں سے آتے؟

ماں۔ یہ تو بڑے تعجب کی بات ہے۔ وہاں اور کوئی تیرا قریبی رشتہ دار تو نہیں ہے؟ وکیل صاحب نے تجھ سے چھپا کر تو نہیں بھیجے؟

نرملا۔ نہیں اماں۔ مجھے تو یقین نہیں۔

ماں۔ اس کا پتہ لگانا چاہیے۔ میں نے سارے روپے کرشنا کے گہنے میں خرچ کر ڈالے۔ یہی بڑی مشکل ہوئی۔

دونوں لڑکوں میں کسی بات پر جھگڑا شروع ہوا اور کرشنا اس کا نپٹارا کرنے ادھر چلی گئی تو نرملا نے ماں سے کہا۔اس بیاہ کی بات سُن کر مجھے بڑا تعجب ہوا یہ کیسے ہوا اماں؟"

ماں۔ یہاں جو سُنتا ہے وہی تعجب کرتا ہے۔ جن لوگوں نے طے شدہ شادی سے انکار کردیا تھا۔ اور وہ بھی محض تھوڑے روپے کے لالچ سے، وہ اب بغیر کچھ لیے کیسے بیاہ کرنے پر تیار ہوگئے۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ انھوں نے خود ہی خط بھیجا۔

میں نے صاف لکھ دیا کہ میرے پاس دینے کو کچھ نہیں ہے۔ صرف کنیا ہی سے
آپ کی خدمت کر سکتی ہوں۔

نرملا۔ اس کا کچھ جواب نہیں دیا؟

ماں۔ شاستری جی خط لے کر گئے تھے۔ وہ تو یہ کہتے تھے کہ اب منشی جی کچھ لینے کے
خواہش مند نہیں ہیں۔ اپنی سابق وعدہ خلافی پر کچھ نادم بھی ہیں۔ منشی جی سے تو
اتنی فیاضی کی امید نہیں تھی۔ مگر سنتی ہوں کہ ان کے بڑے صاحبزادے نہایت
شریف آدمی ہیں۔ انھوں نے کہہ سُن کر باپ کو راضی کیا ہے۔

نرملا۔ پہلے تو وہ حضرت بھی تھیلی چاہتے تھے نہ؟

ماں۔ ہاں۔ مگر اب تو شاستری جی کہتے تھے کہ جہیز کے نام سے چڑتے ہیں۔ سُنا ہے کہ
یہاں بیاہ نہ کرنے پر پچھتاتے بھی تھے۔ روپے کے لیے بات بگاڑی تھی۔ روپے
بھی خوب ملے۔ مگر عورت پسند نہیں۔

نرملا کے دل میں اس شخص کے دیکھنے کی زبردست خواہش ہوئی۔ جو اُس سے بے
رُخی کرکے اب اس کی بہن کا اودھار کرنا چاہتا ہے۔ یہ کفارہ سہی مگر کتنے ایسے انسان ہیں
جو اس کفارہ کے لیے بھی تیار ہوں؟ ان سے باتیں کرنے کے لیے ملائم الفاظ میں ان کی
ملامت کرنے کے لیے اور اپنے حُسنِ بے نظیر کی جھلک سے انھیں بھی جلانے کے لیے نرملا
کا دل بے چین ہوگیا۔

رات کو دونوں بہنیں ایک ہی کمرہ میں سوئیں۔ محلّہ میں کِن کِن لڑکیوں کا بیاہ
ہوگیا۔ کِن کِن کے بچے ہوئے۔ کس کس کا بیاہ دھوم دھام سے ہوا؟ کس کس کو خاطر خواہ
شوہر ملے۔ کون کتنے اور کیسے گہنے چڑھاوے میں لایا؟ انھیں مسئلوں پر دونوں میں بڑی دیر
تک گفتگو ہوتی رہی۔ کرشنا باربار چاہتی تھی کہ بہن کے گھر کا کچھ حال دریافت کروں مگر
نرملا اسے اس کا موقعہ نہ دیتی تھی کہ یہ جو باتیں پوچھے گی مجھے اس کے بتلانے میں تامّل
ہوگا۔ آخر ایک بار کرشنا پوچھ ہی بیٹھی۔ ”جیجاجی بھی آئیں گے نہ؟“

نرملا۔ آنے کو کہا تو ہے۔

کرشنا۔ اب تو تم سے خوش رہتے ہیں نہ؟ یا اب بھی وہی حال ہے؟ میں تو سُنا کرتی تھی کہ
دوبارہ شادی کرنے والے لوگ اپنی بیوی کو جان سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ مگر یہاں

بالکل اُلٹی ہی بات دیکھی۔ آخر کس بات پر بگڑتے رہتے ہیں؟

نرملا۔ اب میں کسی کے جی کی کیا بات جانوں؟

کرشنا۔ میں تو سمجھتی ہوں کی تمھاری رکھائی سے وہ چڑھے ہوں گے۔ تم تو یہیں سے جلی ہوئی گئی تھیں وہاں بھی انھیں کچھ کہا ہوگا۔

نرملا۔ یہ بات نہیں ہے کرشنا! میں قسم کھاکر کہتی ہوں جو میرے دل میں ان کی طرف سے ذرا بھی میل ہو۔ مجھ سے جہاں تک ہوسکتا ہے۔ ان کی خدمت کرتی ہوں اگر ان کی بجائے کوئی دیوتا بھی ہوتا تو بھی میں اس سے زیادہ اور کچھ نہ کرسکتی۔ انھیں بھی مجھ سے محبت ہے۔ برابر میرا مُنہ دیکھتے رہتے ہیں۔ لیکن جو بات ان کے اور میرے قابو سے باہر ہے۔ اس کے لیے وہ کیا کرسکتے ہیں اور میں کیا کرسکتی ہوں۔ نہ وہ جوان ہوسکتے ہیں، نہ میں بوڑھی ہوسکتی ہوں۔ جوان بننے کے لیے وہ نہ جانے کتنے کشتہ جات کھاتے رہتے ہیں۔ میں بھی بوڑھی ہوجانے کے لیے دودھ گھی سب ترک کیے بیٹھی ہوں سوچتی ہوں کہ میرے دُبلے ہونے ہی سے عمر کا فرق کچھ کم ہوجائے۔ مگر نہ انھیں مقوی چیزوں سے کوئی فائدہ ہوتا ہے اور نہ مجھے فاقوں سے! جب سے منسارام کا انتقال ہوگیا ہے۔ ان کی حالت اور بھی ابتر ہوگئی ہے۔

کرشنا۔ منسارام کو تو تم بھی بہت پیار کیا کرتی تھیں؟

نرملا۔ وہ لڑکا ہی ایسا تھا۔ ایسی بڑی بڑی ڈورے دار آنکھیں میں نے کسی کی نہیں دیکھیں۔ کنول سا چہرہ ہر وقت کھلا رہتا تھا۔ جری ایسا تھا کہ موقع پر آگ میں بھی کود پڑتا! کرشنا! میں تجھ سے سچ کہتی ہوں کہ جب وہ میرے پاس آکر بیٹھ جاتا تھا۔ تو میں اپنے کو بھول جاتی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ یہ ہر دم سامنے بیٹھا رہے اور میں دیکھا کروں۔ میرے دل میں پاپ کا نام بھی نہ تھا۔ اگر ایک لمحہ کے لیے بھی میں نے اس کی طرف کسی اور نیت سے دیکھا ہے تو میری آنکھیں پھوٹ جائیں۔ مگر نہ جانے کیوں اُسے اپنے پاس دیکھ کر میرا دل پھولا نہ سماتا تھا۔ اسی لیے میں پڑھنے کا سوانگ رچا۔ ورنہ وہ گھر میں آتا ہی نہ تھا۔ یہ میں جانتی ہوں کہ اگر اس کے دل میں پاپ ہوتا تو میں اس کے لیے سب کچھ کرسکتی تھی۔

کرشنا۔ ارے بہن! چُپ رہو۔ کیسی باتیں مُنہ سے نکالتی ہو۔

نرملا۔ ہاں یہ بات سننے میں بُری معلوم ہوتی ہے۔ اور ہے بھی بُری۔ مگر انسانی فطرت کو تو کوئی تبدیل نہیں کرسکتا۔ تو ہی بتا۔ ایک پچاس برس کے مرد سے تیرا بیاہ ہوجائے تو تو کیا کرے گی؟

کرشنا۔ بہن میں تو زہر کھاکر سو رہوں۔ مجھے تو اس کا منہ بھی نہ دیکھتے بنے۔

نرملا۔ تو بس یہی سمجھ لے۔ اس لڑکے نے کبھی میری طرف آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھا، مگر بڈھے تو شکی ہوتے ہی ہیں۔ تمھارے جیجا اس لڑکے کے دشمن ہوگئے۔ اور آخر اس کی جان ہی لے کر چھوڑا۔ جس روز اسے معلوم ہوگیا کہ باپ کے دل میں میری طرف سے شبہ ہے۔ اسی روز سے اس کو بخار چڑھا جو جان لے کر ہی اُترا۔ ہائے وہ آخری وقت کا نظارہ آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوتا۔ میں ہسپتال گئی تھی وہ بخار میں بے ہوش پڑا تھا۔ اُٹھنے کی طاقت نہ تھی۔ مگر جوں ہی میری آواز سُنی۔ چونک کر اُٹھ بیٹھا اور اماں اماں کہہ کر میرے پیروں پر گر پڑا۔ (روکر) کرشنا! اس وقت ایسا جی چاہتا تھا کہ اپنی جان نکال کر اسے دے دوں۔ میرے پیروں پر ہی اسے غش آگیا۔ پھر اس نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ ڈاکٹر نے اس کے جسم میں تازہ خون پہنچانا تجویز کیا تھا۔ یہی سن کر میں دوڑی گئی تھی۔ لیکن جب تک ڈاکٹر لوگ وہ عمل شروع کریں اس کی جان ہی ہوا ہوگئی۔

کرشنا۔ تازہ خون پہنچ جانے سے اس کی جان بچ جاتی؟

نرملا۔ کون جانتا ہے؟ مگر میں تو اپنے خون کا آخری قطرہ تک دے ڈالنے پر آمادہ تھی۔ اس حالت میں بھی اس کا چہرہ چمک رہا تھا۔ اور اگر وہ دیکھتے ہی دوڑ کر میرے پیروں پر نہ گر پڑتا، اگر پہلے ہی کچھ خون بدن میں پہنچ جاتا تو شاید بچ جاتا۔

کرشنا۔ تو تم نے اسی وقت اس کو لِٹا کیوں نہیں دیا تھا؟

نرملا۔ ارے پگلی! تو ابھی تک بات نہیں سمجھی۔ وہ میرے پیروں پر گر کر اور ماں بیٹے کا رشتہ دکھلاکر اپنے باپ کے دل میں وہ شبہ دور کردینا چاہتا تھا۔ صرف اسی لیے وہ اُٹھا تھا۔ میری تکلیف رفع کرنے کے لیے اس نے جان دی۔ اور اس کی وہ خواہش پوری ہوگئی۔ تمھارے جیجا اسی دن سیدھے ہوگئے۔ اب تو ان کی حالت پر مجھے رحم آتا ہے بیٹے کا غم ان کی جان لے کر چھوڑے گا۔ مجھ پر شک کرکے میرے ساتھ

جو نا انصافی کی ہے اب اس کی تلافی کر رہے ہیں۔ اب کے ان کی شکل دیکھ کر تو
ڈر جائے گی۔ بوڑھے بابا بن گئے ہیں، کمر بھی کچھ جھک گئی ہے۔

کرشنا۔ بڈھے اتنے شکی کیوں ہوتے ہیں بہن؟

نرملا۔ یہ جاکر بڈھوں سے پوچھ!

کرشنا۔ میں تو سمجھتی ہوں کہ ان کے دل میں ہردم ایک چور سا بیٹھا رہتا ہے کہ میں اس
نوجوان عورت کو خوش نہیں رکھ سکتا۔ اسی لیے ذرا ذرا سی بات پر انھیں شک
ہونے لگتا ہے۔

نرملا۔ جانتی تو ہے پھر مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہے؟

کرشنا۔ اسی لیے بے چارہ عورت سے دبتا بھی ہوگا۔ دیکھنے والے سمجھتے ہوں گے کہ یہ بہت
پیار کرتا ہے۔

نرملا۔ تونے اتنے ہی دنوں میں اتنی باتیں کہاں سے سیکھ لیں؟ ان باتوں کو جانے دے۔ بتا
تجھے اپنا دولھا پسند ہے؟ اس کی تصویر تو دیکھی ہوگی؟

ایک لمحہ میں کرشنا نے تصویر لاکر نرملا کے ہاتھ میں رکھ دی۔ نرملا نے مسکراکر
کہا۔"تو بڑی خوش نصیب ہے۔"

کرشنا۔ اماں جی نے بھی بہت پسند کیا۔

نرملا۔ تجھے پسند ہے کہ نہیں، یہ بتلا! دوسروں کی بات نہ کہہ!

کرشنا۔ (شرماتی ہوئی) صورت تو بری نہیں ہے۔ مزاج کا حال ایشور جانے۔ شاستری جی تو
کہتے تھے کہ ایسے نیک مزاج اور نیک چلن لڑکے کم ہوں گے۔

نرملا۔ یہاں سے تیری تصویر بھی گئی تھی؟

کرشنا۔ گئی تو تھی۔ شاستری جی ہی تو لے گئے تھے۔

نرملا۔ انھیں پسند آئی؟

کرشنا۔ اب کسی کے دل کی بات میں کیا جانوں؟ شاستری جی تو کہتے تھے کہ بہت خوش
ہوئے تھے۔

نرملا۔ اچھا، بتا! تجھے کیا تحفہ دوں؟ ابھی سے بتلا دے کہ بنوا رکھوں۔

کرشنا۔ جو تمھارا جی چاہے دینا۔ انھیں کتابوں سے بہت رغبت ہے۔ عمدہ عمدہ کتابیں منگوا دینا۔

نرملا۔ ان کے لیے نہیں پوچھتی، تیرے لیے پوچھتی ہوں۔
کرشنا۔ اپنے ہی لیے تو میں کہہ رہی ہوں۔
نرملا۔ (تصویر کی طرف دیکھتی ہوئی) کپڑے سب کھدر کے معلوم ہوتے ہیں۔
کرشنا۔ ہاں، کھدر کے بڑے پریمی ہیں۔ سنتی ہوں کہ پیٹھ پر کھدر لاد کر دیہاتوں میں بیچنے جایا کرتے ہیں۔ لیکچر دینے میں بھی ہوشیار ہیں۔
نرملا۔ تب تو تجھے بھی کھدر پہننا پڑے گا۔ تجھے تو موٹے کپڑوں سے چڑھ ہے۔
کرشنا۔ جب انھیں موٹے کپڑے پسند ہیں تو مجھے کیوں چڑھ ہوگی۔ میں نے تو چرخہ چلانا سیکھ لیا ہے۔
نرملا۔ سچ! سوت کات لیتی ہے؟
کرشنا۔ ہاں بہن۔ تھوڑا تھوڑا کات لیتی ہوں۔ جب وہ کھدر کے اتنے شائق ہیں، تو چرخہ بھی ضرور چلاتے ہوں گے۔ میں نہ چلا سکوں گی تو مجھے کتنی شرم معلوم ہوگی۔

اس طرح باتیں کرتے دونوں بہنیں سوگئیں۔ تقریباً دو بجے رات کو بچّی روئی تو نرملا کی آنکھ کھلی۔ دیکھا تو کرشنا کا پلنگ خالی پڑا تھا۔ نرملا کو تعجب ہوا کہ اتنی رات گئے کرشنا کہاں چلی گئی۔ شاید پانی پینے گئی ہو۔ مگر پانی تو سرہانے رکھا ہوا ہے۔ پھر کہاں گئی۔ اس نے دو تین بار اس کا نام لے کر پکارا۔ مگر کرشنا کا پتہ نہ تھا۔ تب تو نرملا گھبرا اُٹھی۔ اس کے دل میں طرح طرح کے اندیشے ہونے لگے۔ دفعتاً اسے خیال آیا کہ شاید اپنے کمرہ میں نہ چلی گئی ہو۔ بچّی کے سوجانے پر وہ اُٹھ کر کرشنا کے کمرہ کے دروازہ پر گئی۔ اس کا خیال ٹھیک تھا۔ کرشنا اپنے کمرہ میں تھی۔ سارا گھر سو رہا تھا۔ اور وہ بیٹھی چرخہ چلا رہی تھی۔ اتنی محویت سے شاید اس نے تھیٹر بھی نہ دیکھا ہوگا۔ نرملا دنگ رہ گئی۔ اندر جاکر بولی۔"یہ کیا کررہی ہے رے! یہ چرخہ چلانے کا وقت ہے؟

کرشنا چونک کر اُٹھ بیٹھی اور شرم سے سر جھکا کر بولی۔"تمھاری نیند کیسے کھل گئی؟ پانی بھی تو میں نے وہیں رکھ دیا تھا۔"
نرملا۔ میں کہتی ہوں کہ دن کو تجھے وقت نہیں ملتا جو رات کے پچھلے پہر میں چرخہ لے کر بیٹھی ہے۔
کرشنا۔ دن میں تو فرصت ہی نہیں ملتی۔

نرملا۔ (سوت دیکھ کر) سوت تو بہت باریک ہے۔

کرشنا۔ کہاں بہن! یہ سوت تو موٹا ہے۔ میں باریک سوت کات کر ان کے لیے ایک صافہ بنوانا چاہتی ہوں۔ یہی میری بھینٹ ہوگی۔

نرملا۔ بات تو تونے خوب سوچی ہے۔ اس سے زیادہ قیمتی چیز ان کی نگاہوں میں اور کیا ہوگی۔ اچھا اُٹھ اس وقت! کل کاتنا۔ کہیں بیمار ہوجائے گی تو یہ سب دھرا رہ جائے گا۔

کرشنا۔ نہیں میری بہن! تم جاکر سوؤ۔ میں ابھی آتی ہوں۔

نرملا نے زیادہ اصرار نہیں کیا۔ لیٹنے چلی گئی۔ مگر نیند نہیں آئی۔ کرشنا کا یہ اشتیاق اور حوصلہ دیکھ کر اس کا دل کسی نامعلوم تحریک سے متحرک ہو اُٹھا۔ آہ! اس وقت اس کا دل کتنا مسرور ہورہا ہے! محبت نے اسے کتنا مست بنا رکھا ہے! اس وقت اپنے بیاہ کی یاد آئی جس روز تلک کیا گیا تھا۔ اسی روز سے اس کی ساری خوشی، ساری زندہ دلی رخصت ہوگئی تھی۔ وہ اپنی کوٹھری میں بیٹھی اپنی قسمت کو روتی تھی۔ اور ایشور سے بنتی کرتی تھی، کہ جان نکل جائے۔ جس طرح مجرم سزا کا انتظار کرتا ہے اسی طرح وہ بیاہ کے دن کو دیکھ رہی تھی۔ جس بیاہ میں اس کی ساری تمناؤں کا خون ہوجائے گا۔ جس بیاہ کے منڈپ میں بنے ہوئے ہون کنڈ کے اندر اس کی تمام امیدیں جل خاک سیاہ ہوجائیں گی۔

(۱۶)

مہینہ گزرتے دیر نہ لگی۔ بیاہ کا شبھ مہورت آپہنچا۔ مہمانوں سے مکان بھر گیا۔ منشی طوطا رام ایک روز قبل ہی آگئے۔ اور ان کے ساتھ نرملا کی سکھی بھی آئی۔ نرملا نے تو زیادہ اصرار نہ کیا تھا۔ مگر اسے خود ہی آنے کا حوصلہ تھا۔ نرملا کی سب سے بڑی خواہش یہی تھی کہ دولھا کے بڑے بھائی کے درشن کروں گی اور بشرط ممکن ان کی خیراندیشی کا شکریہ ادا کروں گی!

سدھا نے ہنس کر کہا۔"تم ان سے بول سکوگی؟"

نرملا۔ کیوں، بولنے میں کیا ہرج ہے! اب تو دوسرا ہی رشتہ ہوگیا۔ اور میں نہ بول سکوں گی تو تم تو موجود ہی ہو۔

سدھا۔ نہ بھئی۔ مجھ سے یہ نہ ہوگا۔ میں غیرمرد سے نہیں بول سکتی۔ نہ جانے کیسے آدمی

ہوں۔

نرملا۔ آدمی تو بُرے نہیں ہیں۔ اور تمھیں ان سے کچھ بیاہ تو کرنا نہیں۔ ذرا سا بولنے میں کیا ہرج ہے؟ ڈاکٹر صاحب یہاں ہوتے تو میں تمھیں اجازت دلا دیتی۔

سدھا۔ جو لوگ دل کے فیاض ہوتے ہیں کیا ان کا چال چلن بھی اچھا ہوتا ہے...... ؟ پرائی عورت کو تاکنے میں تو کسی مرد کو تامّل نہیں ہوتا۔

نرملا۔ اچھا نہ بولنا۔ میں خود ہی باتیں کرلوں گی۔ تاک لیں گے جتنا تاکتے بنے گا۔ بس اب تو راضی ہوئیں؟ اتنے میں کرشنا آکر بیٹھ گئی۔ نرملا نے مسکراکر کہا۔ سچ بتا کرشنا۔ تیرا دل اس وقت کیوں اُچاٹ ہو رہا ہے؟

کرشنا۔ جیجا بلا رہے ہیں۔ پہلے جاکر سُن آؤ۔ پھر غپ شپ کرلینا بہت بگڑ رہے ہیں۔

نرملا۔ کیا ہے؟ تو نے کچھ پوچھا نہیں؟

کرشنا۔ کچھ بیمار سے معلوم ہوتے ہیں بہت دُبلے ہوگئے ہیں۔

نرملا۔ تو ذرا بیٹھ کر ان کا دل بہلا دیتی۔ یہاں دوڑی کیوں چلی آئی؟ یہ کہو کہ ایشور نے اپنا فضل کیا۔ ورنہ ایسا ہی مرد تجھے بھی ملتا۔ ذرا بیٹھ کر باتیں تو کر۔ بڈھے بڑی لچھے دار باتیں کرتے ہیں جوان آدمی اتنا بڑھ بڑھ کر باتیں نہیں کرتے۔

کرشنا۔ نہیں بہن! تم جاؤ۔ مجھ سے تو وہاں نہیں بیٹھا جاتا۔

نرملا چلی گئی تو سُدھا نے کرشنا سے کہا۔"اب تو بارات آگئی ہوگی۔ دروازہ چار کیوں نہیں ہوتا؟"

کرشنا۔ کیا جانے بہن! شاستری جی سامان اکٹھا کررہے ہیں۔

سدھا۔ سُنا ہے کہ دولھا کی بھاوج بہت سخت مزاج کی عورت ہے۔

کرشنا۔ کیسے معلوم ہوا؟

سدھا۔ میں نے سنا ہے اسی لیے آگاہ کیے دیتی ہوں۔ چار باتیں غم کھا کر رہنا ہوگا۔

کرشنا۔ میری جھگڑنے کی عادت ہی نہیں ہے۔ جب میری طرف سے کوئی شکایت ہی نہ ہوگی، تو کیا خواہ مخواہ بگڑیں گی؟

سدھا۔ ہاں سُنا تو ایسا ہی ہے۔ جھوٹ موٹ لڑا کرتی ہیں۔

کرشنا۔ میں تو سو بات کی ایک بات جانتی ہوں۔ عاجزی پتھر کو بھی موم کردیتی ہے۔ دفعتاً

شور مچا کہ بارات آرہی ہے۔ دونوں اُٹھ کر کھڑکی کے سامنے جا بیٹھیں۔ ایک لمحہ میں نرملا بھی وہاں آگئی۔ اس کے دل میں دولھا کے بڑے بھائی کو دیکھنے کی بڑی خواہش ہو رہی تھی!

سدھا نے کہا۔"کیسے پتہ چلے گا کہ بڑے بھائی کون ہیں؟"

نرملا۔ شاستری جی سے پوچھو تو معلوم ہو۔ ہاتھی پر تو کرشنا کے سسر جی ہیں۔ اچھا، ڈاکٹر صاحب یہاں کیسے آپہنچے۔ وہ گھوڑے پر کیا ہیں، دیکھتی نہیں ہو؟

سدھا۔ ہاں۔ ہیں تو وہی۔

نرملا۔ ان لوگوں سے دوستی ہوگی۔ کوئی رشتہ تو نہیں؟

سدھا۔ اب ملاقات ہو تو پوچھوں مجھے تو کچھ نہیں معلوم!

نرملا۔ پالکی میں جو صاحب بیٹھے ہوئے وہ تو دولھا کے بھائی جیسے نہیں دکھائی دیتے۔

سدھا۔ بالکل نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ سارے جسم میں پیٹ ہی پیٹ ہے۔

نرملا۔ دوسرے ہاتھی پر کون بیٹھا ہوا ہے سمجھ میں نہیں آتا۔

سدھا۔ کوئی ہو۔ دولھا کا بھائی نہیں ہوسکتا۔ اس کی عمر نہیں دیکھتی ہو چالیس کے اوپر ہوگی۔

نرملا۔ شاستری جی تو اس وقت دروازہ چار کی فکر میں ہیں ورنہ ان سے پوچھتی۔ اتفاقاً حجام آگیا۔ صندوقوں کی کنجیاں نرملا کے پاس تھیں۔ اس وقت دروازہ چار کے لیے کچھ روپیوں کی ضرورت تھی۔ ماں نے بھیجا تھا۔ یہی حجام پنڈت موٹے رام جی کے ساتھ تلک لے کر گیا تھا۔ نرملا نے کہا۔ "کیا ابھی روپے چاہئیں؟"

حجام۔ ہاں بہن جی۔ چل کر دے دیجیے۔

نرملا۔ اچھا چلتی ہوں، پہلے یہ بتلا کہ تو دولھا کے بڑے بھائی کو پہچانتا ہے؟

حجام۔ جانتا کاہے نہیں، وہ کیا سامنے ہیں۔

نرملا۔ کہاں، میں تو نہیں دیکھتی۔

حجام۔ ارے وہ کیا گھوڑے پر سوار ہیں، وہی تو ہیں۔

نرملا نے تعجب سے کہا۔ "کیا کہتا ہے؟ گھوڑے پر دولھا کے بھائی ہیں؟ پہچانتا ہے کہ اٹکل سے کہہ رہا ہے؟"

حجام۔ ارے بہن جی، کیا اتنا بھول جاؤں گا؟ ابھی تو کلیوا (ناشتہ) کا سامان دیے چلا آتا ہوں۔

نرملا۔ ارے یہ تو ڈاکٹر صاحب ہیں، میرے پڑوس میں رہتے ہیں۔

حجام۔ ہاں ہاں۔ وہی تو ڈاکٹر صاحب ہیں۔

نرملا نے سدھا کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''سنتی ہو بہن، اس کی باتیں؟

سدھا نے ہنسی ضبط کر کے کہا۔ ''جھوٹ بولتا ہے۔''

حجام۔ اچھا سرکار، جھوٹ ہی سہی، اب بڑوں کے منہ کون لگے؟ ابھی شاستری جی سے پوچھوا دوں گا تب تو مانیے گا۔

حجام کے جانے میں دیر ہوئی تو موٹے رام خود صحن میں جاکر شور مچانے لگے۔ ''اس گھر کی مرجاد (عزت) رکھنا ایشور ہی کے ہاتھ ہے۔ نائی گھنٹے بھر سے آیا ہوا ہے اور ابھی تک روپے نہیں ملے۔

نرملا۔ ذرا یہاں آیئے گا شاستری جی۔ کتنے روپے چاہئیں۔ نکال دوں۔

شاستری جی گنگناتے اور زور زور سے ہانپتے ہوئے اوپر گئے۔ اور ایک لمبی سانس لے کر بولے۔ ''کیا ہے؟ یہ باتوں کا وقت نہیں ہے۔ جلدی سے روپے نکال دو۔''

نرملا۔ لیجیے نکال تو رہی ہوں۔ اب کیا مُنہ کے بل گر پڑوں؟ پہلے یہ بتایئے، کہ دولھا کے بڑے بھائی کون ہیں؟

شاستری۔ رام رام! اتنی سی بات کے لیے مجھے آسمان پر لٹکا دیا۔ کیا نائی نہ جانتا تھا؟

نرملا۔ نائی تو کہتا ہے کہ وہ جو گھوڑے پر سوار ہیں وہی ہیں۔

شاستری۔ تو پھر اور کسے بتادے؟ وہی تو ہیں ہی!

نائی۔ گھڑی بھر سے کہہ رہا ہوں۔ بہن جی مانتی ہی نہیں۔نرملا نے سدھا کی طرف محبت، مذاق اور مصنوعی حقارت کی نظر سے دیکھ کر کہا۔ ''اچھا، تو تم اب تک میرے ساتھ یہ تریا چرتر کر رہی تھیں، میں جانتی تو تمھیں یہاں بلاتی ہی نہیں، آہ۔ بڑا گہرا پیٹ ہے۔ تمھارا! تم مہینوں سے میرے ساتھ یہ شرارت کرتی چلی آرہی ہو۔ اور کبھی بھول کر بھی اس بات کے متعلق ایک لفظ تمھاری زبان سے نہ نکلا۔ میں تو دو چار ہی روز میں اُبل پڑتی۔''

سدھا۔ تمھیں معلوم ہوجاتا تو تم میرے یہاں آتی ہی کیوں!

نرملا۔ اُف غضب! میں ڈاکٹر صاحب سے کئی بار باتیں کرچکی ہوں۔ تمھیں پر یہ سارا پاپ پڑے گا۔ دیکھی کرشنا تو نے اپنی جٹھانی کی شرارت؟ یہ ایسی جعل ساز ہیں ان سے ڈرتی رہنا۔

کرشنا۔ میں تو ایسی دیوی کے پیر دھوکر ماتھے پر لگاؤں گی۔ دھنیہ بھاگ کہ ان کے درشن ہوئے۔

نرملا۔ اب سمجھ گئی۔ روپے بھی تمھیں نے بھجوائے ہوں گے۔ اب سر ہلایا تو سچ کہتی ہوں مار بیٹھوں گی۔

سدھا۔ اپنے گھر بلا کر مہمان کا نرادر نہیں کیا جاتا۔

نرملا۔ دیکھو تو ابھی کیسی کیسی خبر لیتی ہوں۔ میں نے تمھاری دلجوئی کے لیے ذراسا لکھ دیا تھا اور تم سچ مچ آپہنچیں۔ بھلا وہاں کے لوگ کیا کہتے ہوں گے؟

سدھا۔ سب سے کہہ کر آئی ہوں۔

نرملا۔ اب تمھارے پاس کبھی نہ آؤں گی۔ اتنا تو اشارہ کردیتیں کہ ڈاکٹر صاحب سے پردہ رکھنا۔

سدھا۔ ان کے دیکھ لینے ہی سے کون برائی ہوگئی۔ نہ دیکھتے تو اپنی قسمت کو روتے کیسے؟ جانتے کیسے کہ لالچ میں پڑکر کیسی چیز کھودی۔ اب تو تمھیں دیکھ کر لالہ صاحب ہاتھ مل کر رہ جاتے ہیں۔ منہ سے تو کچھ نہیں کہتے۔ مگر اپنی غلطی پر پچھتاتے ہیں۔

نرملا۔ اب تمھارے گھر کبھی نہ جاؤں گی۔

سدھا۔ اب پنڈ نہیں چھوٹ سکتا۔ میں نے کون تمھارے گھر کی راہ نہیں دیکھی ہے دروازہ چار ختم ہوگیا۔ مہمان بیٹھے ناشتہ کر رہے تھے۔ منشی طوطا رام کے پاس ہی ڈاکٹر سنہا بیٹھے ہوئے تھے۔ نرملا نے کوٹھے پر چق کی اوٹ سے انھیں بیٹھے دیکھا۔ وہ اپنا دل تھام کر رہ گئی۔ ایک صحت، شباب اور نیت کا دیوتا تھا اور دوسرا ...... اس بارے میں کچھ نہ کہنا ہی مناسب ہے۔

نرملا نے ڈاکٹر صاحب کو سینکڑوں بار دیکھا تھا۔ مگر آج اس کے دل میں جو خیالات

پیدا ہوئے وہ کبھی نہ ہوئے تھے۔ باربار یہی جی چاہتا تھا کہ بُلا کر خوب فضیحت کروں۔ ایسے ایسے طعنے دوں کہ وہ بھی یاد کریں۔ رُلا رُلا کر چھوڑوں۔ مگر سہم کر رہ جاتی تھی۔ بارات جنواسہ چلی گئی تھی۔ کھانے کی تیاری ہو رہی تھی۔ نرملا کھانوں کے تھال سجانے میں مصروف تھی کہ دفعتاً مہری نے آکر کہا۔ "بیٹی۔ تمھیں سُدھا رانی بلا رہی ہیں۔ تمھارے کمرہ میں بیٹھی ہیں۔"

نرملا نے تھال چھوڑ دیا۔ اور گھبرائی ہوئی سدھا کے پاس گئی۔ مگر اندر قدم رکھتے ہی ٹھٹھک گئی۔ ڈاکٹر سنہا کھڑے تھے۔

سدھا نے مسکرا کر کہا۔ "لو بہن، بلا لیا۔ اب جتنا چاہو، ڈانٹ لو۔ میں دروازہ روکے کھڑی ہوں۔ بھاگ نہیں سکتے۔"

ڈاکٹر صاحب نے متانت سے کہا۔ "بھاگتا کون ہے؟ یہاں تو سر جھکائے کھڑے ہیں۔

نرملا نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "اسی طرح ہمیشہ مہربانی کی نظر رکھیے گا۔ بھول نہ جایئے گا یہی میری بینتی ہے۔"

(۱۷)

کرشنا کے بیاہ کے بعد سدھا چلی گئی۔ لیکن نرملا میکے میں رہ گئی۔ وکیل صاحب بار بار لکھتے تھے مگر وہ نہ جاتی تھی۔ وہاں جانے کو اس کا جی ہی نہ چاہتا تھا۔ وہاں کوئی ایسی چیز نہ تھی جو اسے کھینچ لے جائے۔ یہاں ماں کی خدمت اور چھوٹے بھائیوں کی دیکھ بھال میں اس وقت بڑے مزے سے کٹ جاتا تھا۔ وکیل صاحب خود آتے تو شاید وہ جانے پر راضی ہوجاتی مگر اس بیاہ میں محلّہ کی کئی عورتوں نے ان کی وہ دُرگت کی تھی کہ بے چارے آنے کا نام ہی نہ لیتے تھے۔ سدھا نے بھی کئی مرتبہ خط لکھا۔ مگر نرملا نے اس سے بھی حیلہ حوالہ کردیا۔ آخر ایک روز سدھا نے نوکر کو ساتھ لیا اور خود آدھمکی۔

جب دونوں مل بھینٹ چکیں تو سدھا نے کہا۔ "تمھیں تو وہاں جاتے ہوئے گویا خوف معلوم ہوتا ہے۔"

نرملا۔ ہاں بہن! خوف تو معلوم ہوتا ہے۔ بیاہ کی گئی ہوئی تین سال میں آئی ہوں اب کے تو وہاں عمر ہی ختم ہوجائے گی۔ پھر کون بلاتا ہے اور کون آتا ہے؟

سدھا۔ آنے کو کیا ہوا؟ جب جی چاہے چلی آنا۔ وکیل صاحب وہاں بے چین ہورہے ہیں۔

نرملا۔ بہت بے چین؟ رات کو شاید نیند نہ آتی ہو؟

سدھا۔ بہن تمھارا کلیجہ پتھر کا ہے۔ ان کی حالت دیکھ کر ترس آتا ہے کہتے تھے، کہ گھر میں کوئی پوچھنے والا نہیں۔ نہ کوئی لڑکا، نہ بالا۔ کس سے جی بہلاویں۔ جب سے دوسرے مکان میں اُٹھ آئے ہیں بہت ملول رہتے ہیں۔

نرملا۔ لڑکے تو ایشور کے دیے دو دو ہیں۔

سدھا۔ ان دونوں کی تو بڑی شکایت کرتے تھے۔ جیارام تو اب بات ہی نہی سنتا ترکی بہ ترکی جواب دیتا ہے۔ رہا چھوٹا، وہ بھی اسی کے کہنے میں ہے۔ بے چارے بڑے لڑکے کو یاد کرکے رویا کرتے ہیں۔

نرملا۔ جیارام تو شریر نہ تھا۔ وہ شرارت کب سے سیکھ گیا؟ میری تو کوئی بات نہ ٹالتا تھا، اشارہ پر کام کرتا تھا۔

سدھا۔ کیا جانے بہن، سنا ہے کہا کرتا ہے کہ آپ ہی نے بھیا کو زہر دے کر مار ڈالا ہے۔ آپ ہتیارے ہیں۔ کئی بار تم سے بیاہ کرنے پر طعنے دے چکا ہے۔ ایسی ایسی باتیں کہتا ہے کہ وکیل صاحب رو دیتے ہیں۔ ارے اور تو کیا کہوں۔ ایک روز پتھر اُٹھا کر مارنے دوڑا تھا۔

نرملا نے گہری سوچ میں پڑ کر کہا۔ ''یہ لڑکا تو بڑا شیطان نکلا۔ اس سے یہ کس نے کہا کہ اس کے بھائی کو انھوں نے زہر دیا؟''

سدھا۔ وہ تم سے ہی ٹھیک ہوگا۔

نرملا کو نئی فکر پیدا ہوئی۔ اگر جیا کا یہی رنگ ہے، اپنے باپ سے لڑنے پر تیار رہتا ہے تو مجھ سے کیوں دبنے لگا؟ وہ رات کو بڑی دیر تک اسی فکر میں ڈوبی رہی۔ منسارام کی آج اُسے بہت یاد آئی۔ اس کے ساتھ زندگی آرام سے گزر جاتی۔ اِس لڑکے کا جب اپنے باپ کے سامنے ہی یہ حال ہے تو ان کے بعد اس کے ساتھ کیسے نباہ ہوگا؟ مکان ہاتھ سے نکل ہی گیا۔ کچھ نہ کچھ قرض بھی ہوگا ہی۔ آمدنی کا یہ حال، ایشور ہی بیڑا پار لگائیں۔ آج پہلی بار نرملا کو بچّی کی فکر پیدا ہوئی۔ اس بے چاری کا نہ جانے کیا حال ہوگا۔ ایشور نے یہ مصیبت بھی سر پر ڈال دی۔ مجھے تو اس کی ضرورت نہ تھی۔ پیدا ہی ہونا تھا تو کسی بھاگوان کے گھر پیدا ہوتی۔ بچّی اس کے سینے سے لپٹی ہوئی سو رہی تھی۔ ماں نے اس کو اور بھی لپٹا

لیا۔ گویا کوئی اس کے ہاتھ سے اُسے چھینے لیے جاتا ہے۔

نرملا کے پاس ہی سدھا کا پلنگ تھا۔ نرملا تو بحرِ تفکر میں غرق ہو رہی تھی اور سدھا خوابِ شیریں کا لطف اُٹھا رہی تھی۔ کیا اسے اپنے بچہ کی فکر ستاتی ہے؟ موت تو بڈھے اور جوان کا امتیاز نہیں کرتی۔ پھر سدھا کو کیوں کوئی فکر نہیں ستاتی؟ اسے تو کبھی مستقبل کی فکر سے اداس نہیں دیکھا۔

دفعتاً سدھا کی آنکھ کُھل گئی۔ اس نے نرملا کو ابھی تک جاگتے دیکھا تو بولی۔ ''ارے ابھی تم سوئیں نہیں؟''

نرملا۔ نیند ہی نہیں آتی۔

سدھا۔ آنکھیں بند کرلو۔ نیند آپ ہی آجائے گی۔ میں تو پلنگ پر لیٹتے ہی مر جاتی ہوں۔ وہ جاگتے بھی ہیں تو خبر نہیں ہوتی۔ نہ جانے مجھے کیوں اتنی نیند آتی ہے۔ شاید کوئی عارضہ ہے۔

نرملا۔ ہاں بڑا بھاری عارضہ ہے۔ اسے راج روگ کہتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب سے کہو کہ علاج شروع کردیں۔

سدھا۔ تو آخر جاگ کر کیا سوچوں؟ کبھی کبھی میکے کی یاد آجاتی ہے تو اس روز ذرا دیر سے آنکھ لگتی ہے۔

نرملا۔ ڈاکٹر صاحب کی یاد نہیں آتی؟

سدھا۔ کبھی نہیں، ان کی یاد کیوں آئے؟ جانتی ہوں کہ ٹینس کھیل کر آئے ہوں گے کھانا کھایا ہوگا اور آرام سے لیٹے ہوں گے۔

نرملا۔ سوہن بھی جاگ اُٹھا۔ جب تم جاگیں تو بھلا وہ کیوں سونے لگا۔

سدھا۔ ہاں بہن! اس کی عجیب عادت ہے۔ میرے ساتھ سوتا ہے، میرے ساتھ جاگتا ہے۔ اس جنم کا کوئی سادھو ہے۔ دیکھو اس کے ماتھے پر تلک کا کیسا نشان ہے۔ بازوؤں پر بھی ایسے ہی نشانات ہیں۔ ضرور کوئی سادھو ہے۔

نرملا۔ سادھو تو چندن تلک نہیں لگاتے۔ اس جنم کا کوئی مکار پجاری ہوگا۔ کیوں رے تو کہاں کا پجاری تھا بتا۔''

سدھا۔ اس کا بیاہ میں بچّی سے کروں گی۔

نرملا۔ چلو بہن گالی دیتی ہو۔ بہن سے بھی بھائی کا بیاہ ہوتا ہے؟
سدھا۔ میں تو کروں گی۔ خواہ کوئی کچھ کہے۔ ایسی خوبصورت بہو اور کہاں پاؤں گی۔ ذرا دیکھو تو بہن، اس کا بدن کچھ گرم ہے یا مجھی کو معلوم ہوتا ہے؟

نرملا نے سوہن کا ماتھا چھوکر کہا۔ "نہیں نہیں، بدن گرم ہے۔ یہ بخار کب آگیا؟ دودھ تو پی رہا ہے نہ؟"
سدھا۔ ابھی سویا تھا تب تو بدن سرد تھا۔ شاید سردی لگ گئی۔ اُڑھاکر سُلائے دیتی ہوں۔ سویرے تک ٹھیک ہوجائے گا۔

سویرا ہوا تو سوہن کی حالت زیادہ خراب ہوگئی۔ اس کی ناک جاری ہوگئی اور بخار بھی تیز ہوگیا۔ آنکھیں چڑھ گئیں اور سر جھک گیا۔ نہ وہ ہاتھ پیر ہلاتا تھا۔ اور نہ ہنستا بولتا۔ چپ چاپ پڑا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کو اس وقت کسی کا بولنا اچھا نہیں لگتا۔ کچھ کچھ کھانسی بھی آنے لگی۔ اب تو سدھا گھبرائی۔ نرملا کی بھی رائے ہوئی کہ ڈاکٹر صاحب کو بلایا جائے۔ مگر اس کی بوڑھی ماں نے کہا۔ "ڈاکٹر حکیم کا یہاں کچھ کام نہیں، صاف تو دیکھ رہی ہوں کہ بچّہ کو نظر لگ گئی ہے۔ بھلا ڈاکٹر آکر کیا کرے گا؟"
سدھا۔ اماں۔ بھلا یہاں نظر کوں لگائے گا؟ ابھی تک تو باہر کہیں گیا بھی نہیں۔
ماں۔ نظر کوئی لگاتا نہیں بیٹی، کسی کسی آدمی کی نظر ہی بد ہوتی ہے۔ وہ آپ ہی آپ لگ جاتی ہے۔ کبھی کبھی ماں باپ تک کی نظر لگ جاتی ہے۔ جب سے آیا ہے ایک بار بھی نہیں رویا۔ ننھے بچّوں کی یہی گت ہوتی ہے۔ میں تو اسے ہمکتے دیکھ کر ڈری تھی کہ کچھ نہ کچھ بُرا ہونے والا ہے۔ آنکھیں نہیں دیکھتی ہو کتنی چڑھ گئی ہیں۔ یہی نظر کی سب سے بڑی پہچان ہے۔

بڑھیا مہری اور پڑوس کی مہراجن نے اس بات کی تائید کی۔ بس مہنگو اوجھا بلا لیا گیا۔ مہنگو نے آکر بچّہ کا منہ دیکھا۔ اور ہنس کر بولا۔ "مالکن یہ ڈیٹھ ہے اور کچھ نہیں۔ ذرا پتلی پتلی تیلیاں تو منگوا لیجیے۔ بھگوان نے چاہا تو سانجھ تک بچّہ کھیلنے لگے گا۔

سرکنڈے کے پانچ ٹکڑے لائے گئے۔ مہنگو نے انھیں برابر کرکے ایک تاگے سے باندھ دیا۔ اور کچھ زیر لب کہتے ہوئے ان ہی سے ڈھیلے ہاتھوں کے ساتھ پانچ بار سوہن کا سر سہلایا۔ اب جو دیکھا تو پانچوں تیلیاں گھٹ بڑھ گئی تھیں۔ سب عورتیں یہ تماشہ دیکھ کر

دنگ رہ گئیں۔ اب نظر لگنے میں کس کو شبہہ ہوسکتا تھا۔ مہنگو نے پھر بچّہ کو تیلیوں سے سہلانا شروع کیا۔ اب کے تیلیاں برابر ہوگئیں۔ صرف ذرا سا فرق رہ گیا۔ یہ اس امر کا ثبوت تھا کہ نظر کا اثر اب تھوڑا سا باقی رہ گیا ہے۔ مہنگو سب کو تسلّی دے کر شام کو پھر آنے کا وعدہ کرکے چلا گیا۔ لڑکے کی حالت دن میں اور ابتر ہوگئی۔ کھانسی شدت سے آنے لگی۔ شام کے وقت مہنگو نے آکر پھر تیلیوں کا تماشا کیا۔ اس وقت پانچوں تیلیاں برابر نکلیں۔ عورتیں بے فکر ہوگئیں۔ لیکن سوہن کو ساری رات کھانستے گزری۔ یہاں تک کہ کئی بار اس کی آنکھیں اُلٹ گئیں۔ سدھا اور نرملا دونوں نے بیٹھ کر سویرا کیا۔ خیر رات بخیریت تمام گزری۔ اب بوڑھی ماں جی نیا رنگ لائیں۔ مہنگو نظر نہ اُتار سکا۔ اس لیے اب کسی مولوی سے پھونک ڈلوانا ضروری ہوگیا۔ سدھا پھر اپنے شوہر کو مطلع نہ کرسکی۔ مہری سوہن کو ایک چادر میں لپیٹ کر ایک مسجد میں لے گئی۔ اور پھونک ڈالوا لائی۔ شام کو بھی پھونک ڈالی گئی۔ مگر سوہن نے سر نہ اُٹھایا۔ رات ہوگئی۔ سدھا نے آج دل میں ارادہ کرلیا کہ رات خیریت سے گزری تو علی الصباح شوہر کو تار دوں گی۔

مگر رات خیریت سے نہ گزرنے پائی۔ آدھی رات ہوتے ہوتے بچّہ ہاتھ سے نکل گیا۔ سدھا کا سرمایۂ حیات دیکھتے دیکھتے اس کے ہاتھوں سے چھن گیا۔

وہی جس کے بیاہ کا دو روز پہلے کھیل ہو رہا تھا۔ آج سارے گھر کو رُلا رہا ہے۔ جس کی بھولی بھالی صورت دیکھ کر ماں کی چھاتی پھول اُٹھتی تھی اسی کو دیکھ کر آج ماں کی چھاتی پھٹی جاتی تھی۔ سارا گھر سدھا کو سمجھاتا تھا۔ مگر اس کے آنسو نہ تھمتے تھے۔ صبر نہ ہوتا تھا۔ سب سے بڑا رنج اس بات کا تھا کہ شوہر کو کون سا منہ دکھاؤں گی کہ انھیں خبر تک نہ دی۔

رات ہی کو تار دے دیا گیا اور دوسرے روز ڈاکٹر سنہا نو بجتے بجتے موٹر پر آپہنچے۔ سدھا نے ان کے آنے کی خبر پائی تو اور بھی زار و قطار رونے لگی۔ بچّہ کی لاش کو دریا میں ڈال دیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب کئی بار اندر آئے گئے۔ مگر سدھا ان کے پاس نہ گئی۔ ان کے سامنے کیسے جائے؟ انھیں کون سا منہ دکھائے۔ اس نے اپنی حماقت سے ان کی زندگی کے انمول جواہر کو چھین کر دریا میں ڈال دیا تھا۔ اب ان کے پاس جاتے ہوئے اس کی چھاتی پھٹی جاتی تھی۔ بچّہ کو اس کی گود میں دیکھ کر باپ کی آنکھیں چمک اُٹھتی تھیں۔ بچّہ ہمک

کر باپ کی گود میں چلا جاتا تھا۔ ماں پھر بلاتی تو باپ کے سینہ سے لپٹ جاتا تھا۔ اور لاکھ لاڈ پیار سے بلانے پر بھی باپ کی گود نہ چھوڑتا تھے۔ ماں کہتی تھی بڑا مطلبی ہے آج وہ کسے گود میں لے کر شوہر کے آگے جائے گی۔ اس کی سونی گود دیکھ کر کہیں وہ چلا کر رو نہ پڑیں۔ شوہر کے سامنے جانے کی بہ نسبت اسے مرجانا کہیں سہل معلوم ہوتا تھا۔ وہ ایک لمحہ کے لیے بھی نرملا کو نہ چھوڑتی تھی کہ کہیں شوہر کا سامنا نہ ہوجائے۔

نرملا نے کہا۔"بہن! اب جو ہونا تھا وہ تو ہو ہی چکا۔ اب ان سے کب تک بھاگتی پھروگی؟ رات ہی کو چلے جائیں گے اماں کہتی تھیں۔

سدھا نے آنسو بھری آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔"کون سا منہ لے کر ان کے پاس جاؤں۔ مجھے ڈر لگتا ہے کہ ان کے سامنے جاتے ہی میرے پاؤں نہ تھرتھرانے لگیں اور میں گر نہ پڑوں۔

نرملا۔ چلو میں تمھارے ساتھ چلتی ہوں۔ تمھیں سنبھالے رہوں گی۔

سدھا۔ مجھے چھوڑکر بھاگ ......

نرملا۔ نہیں نہیں۔ بھاگوں گی نہیں۔

سدھا۔ میرا کلیجہ تو ابھی سے اُمڈ آتا ہے۔ میں اتنی سخت مصیبت پڑنے پر بھی بیٹھی ہوں مجھے یہی تعجب ہو رہا ہے۔ سوہن کو وہ بہت پیار کرتے تھے بہن! نہ جانے ان کے دل کی کیا حالت ہوگی۔ میں انھیں ڈھارس کیا دوں گی خود ہی روتی رہوں گی۔ کیا رات ہی کو چلے جائیں گے۔

نرملا۔ ہاں، اماں جی کہتی تھیں، رخصت نہیں لی ہے۔

دونوں سہیلیاں مردانہ کمرہ کی طرف چلیں، لیکن کمرہ کے دروازہ پر پہنچ کر سدھا نے نرملا کو رخصت کردیا۔ تنہا کمرہ میں داخل ہوئی۔

ڈاکٹر صاحب گھبرا رہے تھے کہ نہ جانے سدھا کی کیا حالت ہوگی۔ طرح طرح کے اندیشے دل میں پیدا ہو رہے تھے۔ جانے کو تیار تو بیٹھے تھے مگر دل نہ چاہتا تھا۔ زندگی سونی سی معلوم ہوتی تھی۔ دل ہی دل میں کڑھ رہے تھے۔ اگر ایشور کو اتنی جلدی یہ چیز دے کر چھین لینی تھی تو دی ہی کیوں تھی؟ انھوں نے تو کبھی اولاد کے لیے ایشور سے التجا نہ کی تھی۔ وہ تمام عمر بے اولاد رہ سکتے تھے۔ مگر اولاد پاکر اس سے محروم ہوجانا انھیں نا قابلِ

برداشت معلوم ہوتا تھا۔ کیا واقعی انسان ایشور کے ہاتھوں کا کھلونا ہے۔ یہی انسانی زندگی کی اہمیت ہے۔ وہ صرف بچّوں کا گھروندا ہے۔ جس کے بننے کا کوئی سبب ہے نہ بگڑنے کا! پھر بچّوں کو بھی تو اپنے گھروندے سے، اپنی کاغذی کشتیوں سے، اپنے لکڑی کے گھوڑوں سے محبت ہوتی ہے۔ اچھے کھلونے کو وہ جان کے پیچھے چھپا کر رکھتے ہیں۔ اگر ایشور بچّہ ہی ہے تو عجیب بچّہ ہے!

مگر عقل سلیم تو ایشور کی ایسی شکل کو قبول نہیں کرتی۔ لامحدود خلقت کا خالق شریر بچّہ نہیں ہوسکتا۔ ہم اسے ان تمام اوصاف سے متصف کرتے ہیں جو ہماری عقل کے پرے ہیں کھلاڑی پن تو ان زبردست اوصاف میں نہیں آتا۔ ہنستے کھیلتے بچّوں کی جان لینا کوئی کھیل ہے؟ کیا ایشور ایسے شیطانی کھیل کھیلتا ہے؟

دفعتاً سدھا دبے پاؤں کمرہ میں داخل ہوئی، ڈاکٹر صاحب اُٹھ کھڑے ہوگئے اور اس کے پاس جاکر بولے۔"تم کہاں تھیں سدھا؟ میں تمھاری راہ دیکھ رہا تھا۔

سدھا کی آنکھوں میں کمرہ تیرتا ہوا معلوم ہوا۔ شوہر کی گردن میں ہاتھ ڈال کر اس نے ان کے سینہ پر سر رکھ دیا اور رونے لگی۔ لیکن اس رونے میں اسے بے حد صبر و تسکین کا احساس ہو رہا تھا۔ شوہر کے سینے سے لپٹی ہوئی وہ اپنے دل میں ایک عجیب طاقت و تازگی پیدا ہوتی ہوئی محسوس کرتی تھی۔ گویا ہوا سے ہلتا ہوا چراغ دامن کو اوٹ میں آگیا ہو۔

ڈاکٹر صاحب نے بیوی کے اشک آلود رخساروں کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر کہا۔"سدھا! تم اتنا چھوٹا دل کیوں کرتی ہو؟ سوہن اپنی زندگی میں جو کچھ کرنے آیا تھا۔ اُسے کرچکا تھا۔ پھر وہ کیوں بیٹھا رہتا؟ جیسے کوئی درخت پانی اور دھوپ سے بڑھتا ہے مگر ہوا کے تند جھونکوں سے مضبوط ہوتا ہے، اسی طرح محبت میں بھی رنج کی چوٹ ہی سے ارتقاء ہوتا ہے۔ خوشی میں ساتھ ہنسنے والے بہت مل جاتے ہیں۔ رنج میں جو ساتھ روئے وہی ہمارا سچّا دوست ہے! جن دوستوں کو ساتھ مل کر رونا نہیں نصیب ہوا، وہ محبت کے مزے کیا جانیں، سوہن کی موت نے آج ہماری دوئی کو بالکل مٹا دیا۔ آج ہی ہم نے ایک دوسرے کا سچّا روپ دیکھا ہے۔ سدھا نے سسکتے ہوئے کہا۔"میں نظر کے دھوکے میں تھی۔ ہائے تم اس کا منہ بھی نہ دیکھ پائے۔ نہ جانے ان دنوں اتنی سمجھ اُسے کہاں سے آگئی تھی

جب مجھے روتے دیکھتا، تو اپنی تکلیف بھول کر مسکرا دیتا۔ تیسرے ہی روز میرے لاڈلے کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ کچھ دوا دارو بھی نہ کرنے پائی۔"

یہ کہتے کہتے سدھا کے آنسو پھر اُمنڈ آئے۔ ڈاکٹر سنہا نے اسے سینہ سے لگا کر رقّت بھری آواز میں کہا۔ "پیاری! آج تک کوئی بچّہ یا بوڑھا نہ مرا ہوگا۔ جس کے گھر والوں کی دوا دارو والی خواہش پوری ہو گئی ہو۔

سدھا۔ نرملا نے میری بڑی مدد کی۔ میں تو ایک آدھ جھپکی لے بھی لیتی تھی مگر اس کی آنکھیں نہیں جھپکیں، رات رات بھر لیے بیٹھی یا ٹہلاتی رہتی تھی۔ اس کا احسان کبھی نہ بھولوں گی کیا تم آج ہی جا رہے ہو؟

ڈاکٹر۔ ہاں رخصت لینے کا موقعہ نہ تھا۔ سول سرجن شکار کھیلنے گیا ہوا تھا۔

سدھا۔ یہ صاحب ہمیشہ شکار ہی کھیلا کرتے ہیں؟

ڈاکٹر۔ بادشاہوں کا اور کام ہی کیا ہے!

سدھا۔ میں تو آج نہ جانے دوں گی۔

ڈاکٹر۔ جی تو میرا بھی نہیں چاہتا۔

سدھا۔ تو نہ جاؤ، تار دے دو۔ میں بھی تمھارے ساتھ چلوں گی۔ نرملا کو بھی لیتی چلوں گی۔

سدھا وہاں سے لوٹی تو اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہوگیا تھا۔ شوہر کی محبت آمیز گفتگو نے اس کے تمام رنج و غم کو دور کردیا تھا۔ محبت میں بے حد تسکین ہے اور بے حد طاقت ہے!

(۱۸)

جب ہم پر کوئی بھاری مصیبت آ پڑتی ہے تو اس سے ہمیں صرف رنج ہی نہیں ہوتا بلکہ ہمیں دوسروں کے طعنے بھی سہنے پڑتے ہیں۔ عوام کو ہمارے متعلق رائے زنی کرنے کا وہ اچھا موقعہ مل جاتا ہے جس کے وہ متلاشی رہتے ہیں۔ منسارام کیا مرا۔ لوگوں کو آوازے کسنے کا بہانہ مل گیا۔ اندر کی بات کون جانے ظاہری بات تو یہ تھی کہ یہ سب سوتیلی ماں کے کرتوت ہیں۔ چاروں طرف یہی چرچا تھا۔ ایشور نہ کرے۔ لڑکوں کو سوتیلی ماں سے پالا پڑے جس کو اپنا بنا ہوا گھر اُجاڑنا ہو، اپنے پیارے بچّوں کی گردنوں پر چھری پھیرنی ہو وہ

بچّوں کے ہوتے اپنی دوسری شادی کرے۔ ایسا کبھی نہیں دیکھا کہ سوت کے آنے پر گھر نہ تباہ ہوگیا ہو۔ وہی باپ جو بچوں پر جان دیتا تھا، سوت کے آتے ہی انھیں بچّوں کا دشمن ہوگیا۔ اس کی مت ہی بدل جاتی ہے۔ ایسی دیوی نے جنم ہی نہیں لیا جس نے سوت کے بچّوں کو اپنا سمجھا ہو۔

مشکل یہ تھی کہ لوگ ایسی رائے زنی کرنے ہی پر قانع نہ ہوتے تھے۔ کچھ ایسے بھلے لوگ بھی تھے جنھیں اب جیارام اور سیارام سے خاص محبت ہوگئی تھی۔ وہ دونوں لڑکوں سے بڑی ہمدردی ظاہر کرتے۔ حتیٰ کہ دو چار عورتیں تو ان کی ماں کے مزاج اور برتاؤ کو یاد کرکے آنسو بہانے لگتی تھیں۔ ہائے ہائے، بے چاری کیا جانتی تھی کہ اس کے مرتے ہی اس کے لاڈلوں کی یہ درگت ہوگی؟ اب دودھ مکھن کاہے کو ملتا ہوگا؟

جیارام کہتا۔ "ملتا کیوں نہیں؟"

عورت کہتی۔"ملتا ہے! ارے بیٹا، ملنا بھی کئی طرح کا ہوتا ہے۔ پانی ملا دودھ ٹکے سیر کا منگا کر رکھ دیا، پیو چاہے نہ پیو، کون پوچھتا ہے؟ نہیں تو بے چاری نوکر سے دودھ دُہا کر منگاتی تھی۔ وہ تو چہرہ ہی کہے دیتا ہے۔ دودھ کی صورت چھپی نہیں رہتی ۔ وہ صورت ہی نہیں رہی۔

جیارام کو اپنی ماں کے وقت کے دودھ کا ذائقہ تو یاد تھا۔ نہیں، جو اس الزام کی تردید کرتا۔ اور نہ اس وقت کی اپنی صورت ہی یاد تھی۔ ناچار خاموش ہوجاتا۔ ان خیرخواہیوں کا اثر بھی ہونا قدرتی تھا۔ جیارام کو اپنے گھر والوں سے نفرت ہوتی جاتی تھی۔ منشی جی مکان نیلام ہوجانے کے بعد دوسرے گھر میں آگئے تو کرایہ کی فکر ہوئی۔ نرملا نے مکھن منگانا بند کردیا جب وہ آمدنی نہ رہی تو خرچ کیسے رہتا؟ دونوں کہار علاحدہ کردیے گئے۔ جیارام کو پڑھانے والے ماسٹر کو بھی جواب دے دیا گیا۔ جیارام کو یہ قطع وبرید ناگوار معلوم ہوتی تھی۔ جب نرملا میکے چلی گئی تو منشی جی نے دودھ بھی بند کردیا۔ نوزائیدہ لڑکی کی فکر ابھی سے ان کے سر پر سوار ہوگئی تھی!

جیارام نے بگڑ کر کہا۔ "دودھ بند کردینے سے تو آپ کا محل بن رہا ہوگا۔ کھانا بھی بند کردیجیے!"

منشی جی۔ دودھ پینے کا شوق ہے تو جاکر دوہا کیوں نہیں لاتے؟ پانی کے پیسے تو مجھ سے نہ

دیے جائیں گے۔
جیارام۔ میں دودھ دُہانے جاؤں، کوئی اسکول کا لڑکا دیکھ لے تب؟
منشی جی۔ تب کچھ نہیں۔ کہہ دینا کہ اپنے لیے دودھ لیے جاتا ہوں۔ دودھ لانا کوئی عیب نہیں ہے۔
جیارام۔ عیب نہیں ہے؟ آپ ہی کو کوئی دودھ لاتے دیکھ لے۔ تو آپ کو شرم نہ آئے گی؟
منشی جی۔ بالکل نہیں۔ میں نے تو اِن ہی ہاتھوں سے پانی کھینچا ہے۔ اناج کی گٹھریاں اُٹھائی ہیں، میرے باپ لکھ پتی نہیں تھے۔
جیارام۔ میرے باپ تو غریب نہیں ہیں، میں کیوں دودھ دُہانے جاؤں۔ آخر آپ نے کہاروں کو کیوں جواب دے دیا؟
منشی جی۔ کیا تمھیں اتنا بھی نہیں سوجھتا کہ میری آمدنی اب پہلی سی نہیں رہی؟ اتنے نادان تو نہیں ہو۔
جیارام۔ آخر آپ کی آمدنی کیوں کم ہوگئی؟
منشی جی۔ جب تمھیں عقل ہی نہیں ہے تو کیا سمجھاؤں؟ یہاں زندگی سے تنگ آگیا ہوں، مقدمے کون لے؟ اور لے بھی تو تیار کون کرے؟ وہ دل ہی نہیں رہا۔ اب زندگی کے دن پورے کر رہا ہوں۔ سارے ارمان رتن کے ساتھ چلے گئے۔
جیارام۔ اپنے ہی ہاتھوں نہ؟
منشی جی نے چیخ کر کہا۔ ”ارے احمق وہ ایشور کی مرضی تھی، اپنے ہاتھوں کوئی اپنا گلا کاٹتا ہے؟“
جیارام۔ ایشور تو آپ کا بیاہ کرنے نہ آیا تھا۔
منشی جی اب ضبط نہ کرسکے۔ سُرخ سُرخ آنکھیں نکال کر بولے۔ ”کیا تم لڑنے کے لیے کمر باندھ کر آئے ہو؟ آخر کس برتے پر؟ میری روٹیاں تو نہیں چلاتے۔ جب اس قابل ہوجانا تو مجھے نصیحت کرنا۔ تب میں سُن لوں گا۔ ابھی تم کو مجھے نصیحت کرنے کا حق نہیں ہے۔ کچھ دنوں ادب اور تمیز سیکھو۔ تم میرے صلاح کار نہیں ہو کہ میں جو کام کروں۔ اس میں تم سے صلاح لوں۔ میری پیدا کی ہوئی دولت ہے اُسے جس طرح چاہوں

خرچ کرسکتا ہوں۔ تمھیں زبان کھولنے کا بھی اختیار نہیں ہے۔ اگر پھر تم نے مجھ سے ایسی بے ادبی کی تو نتیجہ بُرا ہوگا۔ جب منسارام جیسا رتن کھوکر میری جان نہ نکلی تو تمھارے بغیر میں مر نہ جاؤں گا۔ سمجھ گئے!

ایسی بُری طرح ڈانٹے جانے پر بھی جیارام وہاں سے نہ ٹلا۔ بے خوفی سے بولا۔ ''تو کیا آپ چاہتے ہیں کہ ہمیں خواہ کتنی ہی تکلیف ہو مگر زبان نہ ہلائیں؟ مجھ سے تو یہ نہ ہوگا۔ بھائی صاحب کو ادب و تمیز کا جو انعام ملا اس کی مجھے حاجت نہیں۔ مجھ میں زہر کھا کر جان دینے کی جرأت نہیں۔ ایسے ادب کو دور ہی سے سلام کرتا ہوں۔

منشی جی۔ تمھیں ایسی باتیں کرتے شرم نہیں آتی؟

جیارام۔ لڑکے اپنے بزرگوں ہی کی نقل کرتے ہیں۔

منشی جی کا غصہ فرو ہوگیا۔ جیارام پر اس کا کچھ اثر نہ ہوگا۔ اِس کا انھیں یقین ہوگیا اُٹھ کر ٹہلنے چلے گئے۔ آج انھیں معلوم ہوگیا کہ یہ گھر جلد ہی تباہ ہونے والا ہے۔

اس روز سے باپ بیٹے میں کسی نہ کسی بات پر ہمیشہ کھٹ پٹ ہوجاتی۔ منشی جی جوں جوں طرح دیتے تھے۔ جیارام اور بھی شیر ہوتا جاتا تھا۔ ایک روز جیارام نے رکمنی سے یہاں تک کہہ ڈالا۔ ''باپ ہے، یہ سمجھ کر درگزر کرتا ہوں۔ ورنہ میرے ایسے ساتھی ہیں کہ چاہوں تو سربازار پٹوا دوں۔'' رکمنی نے منشی جی سے کہہ دیا۔ منشی جی نے ظاہراً تو لاپروائی دکھائی۔ مگر ان کے دل میں اندیشہ پیدا ہوگیا۔ شام کو ہوا خوری کرنا چھوڑ دیا۔ یہ نئی فکر لاحق ہوگئی۔ اسی خوف سے نرملا کو بھی نہ بلاتے تھے کہ یہ شیطان اس کے ساتھ بھی ویسا ہی سلوک کرے گا۔ جیارام ایک بار دبی زبان سے کہہ بھی چکا تھا کہ دیکھوں اب کے کیسے اس گھر میں آتی ہیں۔ دور ہی سے نہ دھتکاروں تو جیارام نام نہیں۔ بوڑھے میاں کرہی کیا سکیں گے؟

منشی جی بھی خوب سمجھ گئے تھے کہ میں اس کا کچھ بھی نہیں کرسکتا۔ کوئی غیر شخص ہوتا، تو اس کو پولیس اور قانون کے شکنجہ میں کستے۔ اپنے لڑکے کو کیا کریں۔ سچ کہا ہے کہ آدمی ہارتا ہے تو اپنے لڑکوں ہی سے!

ایک روز ڈاکٹر سنہا نے جیارام کو بلاکر سمجھانا شروع کیا۔ جیارام ان کا ادب کرتا تھا۔ چپ چاپ بیٹھا سنتا رہا۔ جب ڈاکٹر صاحب نے آخر میں دریافت کیا کہ تم چاہتے کیا ہو، تو

وہ بولا۔ "صاف صاف کہہ دوں نہ؟ بُرا تو نہ مانیے گا؟"

سنہا۔ نہیں، جو کچھ تمھارے دل میں ہو صاف صاف کہہ دو۔

جیارام۔ تو سنیئے۔ جب سے بھیا مرے ہیں، مجھے باپ کی صورت دیکھ کر غصہ آتا ہے مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھیں نے ان کو ہلاک کیا ہے۔ اور کسی روز موقعہ پاکر ہم دونوں بھائیوں کو بھی ہلاک کر ڈالیں گے۔ اگر ان کی یہ خواہش نہ ہوتی تو شادی ہی کیوں کرتے؟

ڈاکٹر صاحب نے بڑی مشکل سے ہنسی روک کر کہا۔ "تمھیں ہلاک کرنے کے لیے انھیں شادی کرنے کی کیا ضرورت تھی، یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔ بلا شادی کے بھی تو وہ ہلاک کرسکتے تھے۔"

جیارام۔ کبھی نہیں، اس وقت تو ان کا دل ہی کچھ اور تھا۔ اب منہ تک نہیں دیکھنا چاہتے۔ ان کی یہی مرضی ہے کہ ان دونوں آدمیوں کے سوا گھر میں اور کوئی نہ رہے۔ اب جو لڑکے ہوں گے ان کے راستہ سے ہم لوگوں کو ہٹا دینا چاہتے ہیں۔ یہی ان دونوں کا دلی منشا ہے۔ ہمیں طرح طرح کی تکلیفیں دے کر بھگا دینا چاہتے ہیں۔ اسی لیے آج کل مقدمے نہیں لیتے۔ ہم دونوں بھائی آج مرجائیں تو پھر دیکھیے کیسی بہار ہوتی ہے۔

ڈاکٹر۔ اگر تمھیں بھگانا ہی ہوتا تو کوئی الزام لگا کر گھر سے نکال نہ دیتے؟

جیارام۔ اس کے لیے پہلے ہی سے تیار بیٹھا ہوں۔

ڈاکٹر۔ میں بھی سنوں، کیا تیاری کی ہے؟

جیارام۔ جب موقع آئے گا دیکھ لیجیے گا۔

یہ کہہ کر جیارام چلتا ہوا۔ ڈاکٹر سنہا نے بہت پکارا مگر اس نے مُڑکر دیکھا بھی نہیں! کئی روز کے بعد ڈاکٹر صاحب کی جیارام سے پھر ملاقات ہوگئی۔ ڈاکٹر صاحب سینما دیکھنے کے شائق تھے۔ اور جیارام کی تو جان ہی سینما میں تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے سینما پر رائے زنی کرتے ہوئے جیارام کو باتوں میں لگا لیا۔ اور اپنے گھر لائے۔ کھانے کا وقت آگیا تھا۔ دونوں کھانے پر بیٹھے۔ جیارام کو یہاں کھانا بہت لذیذ معلوم ہوا۔ بولا۔ میرے یہاں تو جب سے مہراجی علاحدہ ہوا کھانے کا مزا ہی جاتا رہا۔ بوا جی پکّا ویشنوی کھانا بناتی ہیں۔ جبراً

کھا لیتا ہوں۔ مگر دراصل کھانے کی طرف دیکھنے کو بھی جی نہیں چاہتا۔

ڈاکٹر۔ میرے یہاں تو جب گھر میں کھانا پکتا ہے تو اس سے کہیں زیادہ مزے دار ہوتا ہے۔ تمھاری بوا جی پیاز لہسن نہ چھوڑتی ہوں گی۔

جیارام۔ ہاں صاحب۔ اُبال کر رکھ دیتی ہیں۔ لالہ جی کو اس کی پرواہ نہیں کہ کوئی کھاتا ہے یا نہیں۔ اسی لیے تو مہراجی کو علاحدہ کردیا ہے۔ اگر روپے نہیں ہیں تو روز گہنے کہاں سے بنتے ہیں؟

ڈاکٹر۔ یہ بات نہیں جیارام! ان کی آمدنی واقعی بہت کم ہوگئی ہے۔ تم انھیں بہت دق کرتے ہو؟

جیارام۔ (ہنس کر) میں انھیں دق کرتا ہوں۔ مجھ سے قسم لے لیجیے کہ جو کبھی ان سے بولتا ہوں۔ مجھے بدنام کرنے کا انھوں نے بیڑا اُٹھا لیا ہے۔ بے سبب، بے وجہ پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ میرے دوستوں سے بھی انھیں چڑھ ہے۔ آپ ہی سوچئے کہ دوستوں کے بغیر کوئی زندہ رہ سکتا ہے؟ میں کوئی لقہ نہیں ہوں کہ لقوں کی صحبت کروں۔ مگر آپ دوستوں ہی کے پیچھے مجھے روزانہ تنگ کیا کرتے ہیں۔ کل تو میں نے صاف کہہ دیا۔ میرے دوست میرے گھر آئیں گے کسی کو اچھا لگے یا بُرا۔ جناب کوئی ہو ہر وقت کی دھونس نہیں سہ سکتا۔

ڈاکٹر۔ مجھے تو بھئی ان پر بہت رحم آتا ہے۔ یہ وقت ان کے آرام کرنے کا تھا۔ ایک تو بڑھاپا۔ اس پر بیٹے کی جوانمرگی کا غم، صحت بھی اچھی نہیں، ایسا آدمی کیا کرسکتا ہے وہ جو کچھ تھوڑا بہت کرتے ہیں، وہی بہت ہے۔ تم ابھی اور کچھ نہیں کرسکتے تو کم از کم اپنی نیک اطواری سے تو انھیں خوش رکھ سکتے ہو۔ بوڑھوں کو خوش رکھنا بہت مشکل کام نہیں۔ یقین مانو کہ تمھارا ہنس کر بولنا ہی انھیں خوش کرنے کو کافی ہے۔ اتنا پوچھنے میں تمھارا کیا خرچ ہوتا ہے کہ بابو آپ کا مزاج کیسا ہے؟ وہ تمھاری یہ کج روی دیکھ کر دل ہی دل میں کڑھتے ہیں۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ کئی مرتبہ رو چکے ہیں۔ مان لو کہ انھوں نے شادی کرنے میں غلطی کی۔ اسے وہ بھی تسلیم کرتے ہیں۔ مگر تم اپنے فرض سے کیوں منہ موڑتے ہو؟ وہ تمھارے باپ ہیں تمھیں ان کی خدمت کرنی چاہیے۔ ایک بات بھی ایسی مُنہ سے نہ نکالنی چاہیے۔ جس

سے ان کا دل دُکھے۔ انھیں یہ خیال کرنے کا موقعہ ہی کیوں دو کہ سب میری کمائی کھانے والے ہیں۔ بات پوچھنے والا کوئی نہیں؟ میری عمر تم سے کہیں زیادہ ہے جیا رام، مگر آج تک میں نے اپنے والد صاحب کو کسی بات پر جواب نہیں دیا۔ وہ آج بھی مجھے ڈانٹتے ہیں تو سر جھکا کر سُن لیتا ہوں۔ جانتا ہوں کہ یہ جو کچھ کہتے ہیں میرے بھلے ہی کے لیے کہتے ہیں۔ ماں باپ سے بڑھ کر ہمارا بہی خواہ اور کون ہوسکتا ہے۔ ان کے احسان سے کون سبکدوش ہوسکتا ہے؟

(۱۹)

جیارام بیٹھا روتا رہا۔ ابھی اس کی نیک دلی بالکل زائل نہیں ہوگئی تھی۔ اپنی ناخلفی اُسے صاف نظر آرہی تھی۔ اتنی پشیمانی اُسے بہت روز سے نہ ہوئی تھی۔ اس نے رو کر ڈاکٹر صاحب سے کہا۔ ”میں بہت نادم ہوں۔ میں دوسروں کے بہکانے میں آگیا تھا اب آپ میری ذرا بھی شکایت نہیں سُنیں گے۔ آپ والد صاحب سے میرا قصور معاف کرادیجیے میں واقعی بڑا بدنصیب ہوں۔ انھیں میں نے بہت ستایا۔ ان سے کہیے کہ میرا قصور معاف کردیں ورنہ میں اپنے منہ میں کالکھ لگا کر کہیں نکل جاؤں گا۔ کہیں ڈوب مروں گا۔“

ڈاکٹر صاحب نصیحت دہی پر پھولے نہ سمائے۔ انھوں نے جیارام کو گلے لگا کر رخصت کیا۔ جیارام گھر پہنچا تو گیارہ بج گئے تھے۔ منشی جی کھانا کھاکر ابھی باہر آئے تھے۔ اسے دیکھتے ہی بولے۔ ”جانتے ہو کتنے بجے ہیں؟ بارہ کا وقت ہے؟“

جیارام نے نہایت عاجزی سے کہا۔ ”ڈاکٹر سنہا مل گئے۔ ان کے ساتھ ان کے مکان تک چلا گیا۔ انھوں نے کھانے کے لیے اصرار کیا۔ مجبوراً کھانا پڑا۔“

منشی جی۔ ڈاکٹر سنہا سے دُکھڑا رونے گئے ہوگے؟ یا اور کوئی کام تھا؟

جیارام کی عاجزی کا ایک چوتھائی حصہ مفقود ہوگیا۔ بولا۔”دُکھڑا رونے کی میری عادت نہیں ہے۔“

منشی جی۔ ذرا بھی نہیں۔ تمھارے منہ میں تو زبان ہی نہیں ہے! مجھ سے جو لوگ تمھاری باتیں کہا کرتے ہیں وہ یوں ہی کہا کرتے ہوں گے؟“

جیارام۔ اور دنوں کی تو میں نہیں کہتا۔ مگر آج ڈاکٹر سنہا کے یہاں میں نے کوئی ایسی بات نہیں کی جو اس وقت آپ کے روبرو نہ کہہ سکوں۔

منشی جی۔ بڑی خوشی کی بات ہے۔ بے حد خوشی ہوئی۔ آج سے مریدی کرلی ہے کیا۔ جیارام

کی عاجزی کا ایک چوتھائی حصہ اور غائب ہوگیا۔ سر اُٹھا کر بولا۔ ''آدمی بلا مرید ہوئے بھی اپنی برائیوں پر نادم ہوسکتا ہے۔ اپنا سدھار کرنے کے لیے گورو کا منتر کوئی چیز نہیں۔''

منشی جی۔ اب تو شہدے نہ جمع ہوں گے؟

جیارام۔ آپ کسی کو شہدا کیوں کہتے ہیں، جب تک ایسا کہنے کے لیے آپ کے پاس کوئی ثبوت نہیں؟

منشی جی۔ تمھارے دوست سب شہدے لگتے ہیں۔ میں تم سے کئی بار کہہ چکا ہوں، کہ انھیں یہاں نہ جمع کیا کرو۔ مگر تم نے سُنا نہیں۔ آج میں آخری بار کہے دیتا ہوں کہ اگر تم نے ان کو پھر جمع کیا تو مجھے پولیس کی مدد لینی پڑے گی۔

جیارام کی عاجزی کا ایک چوتھائی حصہ اور غائب ہوگیا، کڑک کر بولا۔''اچھی بات ہے۔ پولیس کی مدد لیجیے۔ دیکھوں پولیس کیا کرتی ہے؟ میرے دوستوں میں نصف سے زیادہ پولیس افسروں کے ہی لڑکے ہیں۔ جب آپ ہی میرا سدھار کرنے پر تلے ہوئے ہیں تو میں بے فائدہ کیوں تکلیف برداشت کروں؟''

یہ کہتا ہوا جیارام اپنے کمرہ میں چلا گیا اور ایک لمحہ کے بعد ہارمونیم کے نغمۂ شیریں کی آواز باہر آنے لگی۔

ہمدردی کا جلایا ہوا چراغ بے دردانہ طنز والی ہوا کے ایک جھونکے سے بجھ گیا۔ یا اڑا ہوا گھوڑا دم دلاسا سے ذرا آگئے بڑھنے کو تھا۔ مگر چابک پڑتے ہی اڑ گیا اور گاڑی کو پیچھے دھکیلنے لگا۔

اب کے سُدھا کے ساتھ نرملا کو بھی آنا پڑا۔ وہ تو میکے میں کچھ دنوں اور رہنا چاہتی تھی مگر مغموم سُدھا تنہا کیسے رہتی؟ اس کی خاطر سے نرملا کو آنا ہی پڑا۔

رکمنی نے بھنگی سے کہا۔ ''دیکھتی ہے۔ بہو میکے سے کیسی نکھر کر آئی ہے؟''

بھنگی نے کہا۔ ''دیدی! ماں کے ہاتھ کی روٹیاں لڑکیوں کو بہت اچھی لگتی ہیں۔''

رکمنی۔ ٹھیک کہتی ہے بھنگی! کھلانا تو کچھ ماں ہی جانتی ہے۔

نرملا کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گھر کا کوئی آدمی اس کے آنے سے خوش نہیں۔ منشی جی نے خوشی تو بہت دِکھائی مگر دلی تفکر کو نہ چھپا سکے۔ بچّی کا نام سُدھا نے آشا رکھ دیا

تھا۔ وہ آشا کی مورت سی تھی بھی۔ اسے دیکھ کر ساری فکر دور ہوجاتی تھی۔ منشی جی نے اسے گود میں لینا چاہا تو وہ رونے لگی۔ اور دوڑ کر ماں سے لپٹ گئی۔ گویا باپ کو جانتی ہی نہ تھی۔ منشی جی نے شیرینی کے ذریعہ اسے مانوس کرانا چاہا۔ گھر میں کوئی نوکر تو تھا نہیں۔ جاکر سیارام سے دو آنہ کی مٹھائی لانے کو کہا۔ جیارام بھی بیٹھا ہوا تھا بول اُٹھا۔ ''ہم لوگوں کے لیے تو کبھی مٹھائی نہیں آتی۔''

منشی جی نے جھنجھلا کر کہا۔ ''تم لوگ بچے نہیں ہو!''

جیارام۔ اور کیا بوڑھے ہیں؟ مٹھائیاں منگوا کر رکھ دیجیے تو معلوم ہو کہ بچے ہیں، یا بوڑھے۔ نکالیے چار آنے اور، آشا کی بدولت ہمارے نصیب بھی جاگیں۔

منشی جی۔ اس وقت میرے پاس پیسے نہیں ہیں، جاؤ سیا! جلد آنا۔

جیارام۔ سیا نہیں جائے گا۔ کسی کا غلام نہیں ہے۔ آشا اپنے باپ کی بیٹی ہے، تو وہ بھی اپنے باپ کا بیٹا ہے۔

منشی جی۔ کیا فضول سی باتیں کرتے ہو۔ ننھی سی بچی کی برابری کرتے تمھیں شرم نہیں آتی؟ جاؤ سیارام، یہ پیسے لو۔

جیارام۔ مت جانا سیا۔ تم کسی کے نوکر نہیں ہو۔

سیارام بڑے کشش و پنج میں پڑگیا۔ کس کا کہنا کرے؟ بالآخر اس نے جیارام کا کہنا ماننے کا ارادہ کرلیا۔ باپ زیادہ سے زیادہ ڈانٹ دیں گے۔ جیا تو مارے گا۔ پھر وہ کس کے پاس فریاد لے کر جائے گا؟ بولا۔ ''میں نہ جاؤں گا۔''

منشی جی نے دھمکا کر کہا۔ ''اچھا تو میرے پاس کوئی چیز مانگنے مت آنا۔''

منشی جی خود بازار چلے گئے اور ایک روپیہ کی شیرینی لے کر لوٹے۔ دو آنے کی مٹھائی لیتے ہوئے انھیں شرم معلوم ہوئی۔ حلوائی انھیں پہچانتا تھا۔ دل میں کیا کہے گا؟

مٹھائی لیے ہوئے منشی جی اندر چلے گئے۔ سیارام نے مٹھائی کا بڑا سا دونا دیکھا، تو باپ کا کہنا نہ ماننے کا اسے رنج ہوا۔ اب وہ کس منہ سے مٹھائی لینے اندر جائے گا؟ بڑی غلطی ہوئی۔ وہ دل ہی میں جیارام کے طمانچوں کی چوٹ کا شیرینی کو حلاوت سے موازنہ کرنے لگا۔

دفعتاً بھنگی نے دو طشتریاں دونوں کے سامنے لاکر رکھ دیں۔ جیارام نے بگڑ کر کہا۔

"اِسے اُٹھا لے جاؤ۔"

بھنگی۔ کاہے کو بگڑتے ہو بابو؟ کیا مٹھائی اچھی نہیں لگتی؟

جیارام۔ مٹھائی آشا کے لیے آئی ہے۔ ہمارے لیے نہیں۔ لے جاؤ ورنہ میں سڑک پر پھینک دوں گا۔ ہم تو پیسے کے لیے ترستے رہتے ہیں۔ اور یہاں روپیوں کی مٹھائی آتی ہے۔

بھنگی۔ تم لے لو سیا بابو! نہ لیں گے نہ سہی۔

سیارام نے ڈرتے ڈرتے ہاتھ بڑھایا تھا کہ جیارام نے ڈانٹ کر کہا۔ "مت چھونا مٹھائی۔ ورنہ ہاتھ توڑ کر رکھ دوں گا۔ لالچی کہیں کا!" سیارام یہ ڈانٹ سن کر سہم گیا۔ مٹھائی کھانے کی ہمت نہ پڑی۔ نرملا نے یہ ماجرا سُنا، تو دونوں لڑکوں کو منانے چلی۔ منشی جی نے کڑی قسم رکھا دی۔

نرملا۔ آپ سمجھتے نہیں ہیں، یہ سارا غصہ مجھ پر ہے۔

منشی جی۔ گستاخ ہوگیا ہے۔ اس خیال سے کوئی سختی نہیں کرتا کہ لوگ کہیں گے بلا ماں کے بچوں کو ستاتے ہیں۔

نرملا۔ اِسی بدنامی کا مجھے بھی تو خوف ہے۔

منشی جی۔ اب نہ ڈروں گا۔ جس کے منہ میں جو آئے کہے۔

نرملا۔ پہلے تو یہ ایسے نہ تھے۔

منشی جی۔ اجی کہتا ہے کہ آپ کے لڑکے موجود تھے، آپ نے بیاہ کیوں کیا؟ یہ کہنے میں بھی اسے تامّل نہیں ہوتا کہ آپ لوگوں نے منسارام کو زہر دے دیا۔ لڑکا نہیں دشمن ہے۔

جیارام دروازہ کے پاس چھپا ہوا کھڑا تھا۔ میاں بیوی میں مٹھائی کے بارے میں کیا باتیں ہوتی ہیں یہی سننے وہ آیا تھا۔ منشی جی کا آخری جملہ سُن کر اس سے نہ رہا گیا۔ بول اٹھا۔"دشمن نہ ہوتا تو آپ اس کے پیچھے کیوں پڑتے؟ آپ جو اس وقت کہہ رہے ہیں، وہ میں بہت پیشتر سے سمجھے ہوئے بیٹھا ہوں۔ بھیّا نہ سمجھتے تھے۔ دھوکا کھا گئے۔ ہمارے ساتھ آپ کی دال نہ گلے گی۔ سارا زمانہ کہہ رہا ہے کہ بھائی صاحب کو زہر دیا گیا۔ میں کہتا ہوں، تو کیوں آپ کو غصہ آتا ہے؟

نرملا تو سناٹے میں آگئی۔ معلوم ہوا کِسی نے اس کے بدن پر انگارے ڈال دیئے۔

منشی جی نے ڈانٹ کر جیارام کو چپ کرنا چاہا۔ مگر جیارام بے خوفی کے ساتھ اینٹ کا جواب پتھر سے دیتا رہا۔ یہاں تک کہ نرملا کو بھی اس پر غصہ آگیا۔ یہ کل کا چھوکرا۔ کسی کام کا نہ کاج کا یوں کھڑا ٹرا رہا ہے۔ جیسے سارے گھر والوں کی پرورش یہی کرتا ہے۔ تیوریاں چڑھا کر بولی "بس اب بہت ہوا جیارام۔ معلوم ہوا کہ تم بڑے لائق ہو۔ باہر جاکر بیٹھو۔"

منشی جی اب تک تو ذرا دب دب کر بولتے تھے۔ اب نرملا کی شہ پائی تو دل بڑھ گیا دانت پیس کر لپکے اور اس سے قبل کہ نرملا ان کے ہاتھ پکڑ سکے ایک تھپڑ چلا ہی دیا۔ تھپڑ نرملا کے منہ پر پڑا۔ وہی سامنے پڑگئی تھی۔ سر چکرا گیا۔ منشی جی کے خشک ہاتھوں میں بھی اتنی سکت ہے اس کا وہ قیاس نہ کرسکتی تھی۔ سر تھام کر بیٹھ گئی۔ منشی جی کا غصہ اور بھی بھڑک اُٹھا۔ پھر گھونسہ چلایا مگر اب کے جیارام نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور پیچھے دھکیل کر بولا۔ "دور سے باتیں کیجیے۔ کیوں ناحق اپنی بے عزتی کراتے ہیں اماں جی کا لحاظ کر رہا ہوں ورنہ دکھا دیتا۔"

یہ کہتا ہوا وہ باہر چلا گیا۔ منشی جی بے حس سے کھڑے رہ گئے۔ اس وقت اگر جیارام پر خدائی قہر نازل ہوتا تو شاید انھیں دلی مسرت ہوتی۔ جس لڑکے کو کبھی گود میں لے کر خوش ہوجاتے تھے۔ اسی کے متعلق آج انواع و اقسام کی بداندیشیاں دل میں پیدا ہو رہی تھیں۔

رکمنی اب تک اپنی کوٹھری میں تھی۔ اب آکر بولی۔ "بیٹا اپنے برابر ہوجائے تو اس پر ہاتھ نہ چلانا چاہیے۔"

منشی جی نے ہونٹ چبا کر کہا۔ "میں اسے گھر سے نکال کر دم لوں گا۔ بھیک مانگے یا چوری کرے۔ مجھ سے کوئی واسطہ نہیں۔"

رکمنی۔ ناک کس کی کٹے گی؟

منشی جی۔ اس کی پرواہ نہیں۔

نرملا۔ میں اگر جانتی کہ میرے آنے سے یہ طوفان اُٹھ کھڑا ہوگا۔ تو بھول کر بھی نہ آتی اب بھی بہتر ہے۔ اب بھیج دیجیے۔ اس گھر میں مجھ سے رہا نہ جائے گا۔

رکمنی۔ تمھارا بہت لحاظ کرتا ہے بہو، ورنہ آج آفت ہوجاتی۔

نرملا۔ اب اور کیا آفت ہوگی دیدی جی! میں تو پھونک پھونک کر قدم رکھتی ہوں پھر بھی

کلنک لگ ہی جاتا ہے۔ ابھی گھر میں قدم رکھتے دیر نہیں ہوئی اور یہ حال ہوگیا۔ ایشور ہی کسل کریں۔

رات کو کھانے کے لیے کوئی نہ اُٹھا۔ تنہا منشی جی نے کھایا۔ نرملا کے دل میں آج ایک نئی فکر پیدا ہوگئی تھی۔ زندگی کیسے پار ہوگی۔ اپنا پیٹ ہوتا تو کوئی خاص تردد نہ تھا۔ اب تو ایک نئی بلا گلے پڑگئی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ میری ننھی بچّی کے بھاگ میں کیا لکھا ہے رام؟

(۲۰)

فکر میں نیند کب آتی ہے؟ نرملا پلنگ پر پڑی کروٹیں بدل رہی تھی۔ کتنی ہی کوشش کرتی تھی کہ نیند آجائے۔ مگر نیند نے تو آنے کی قسم کھا لی تھی۔ چراغ ٹھنڈا کردیا تھا۔ کھڑکی کھول دی تھی۔ ٹک ٹک کرنے والی گھڑی بھی دوسرے کمرے میں رکھ آئی تھی۔ مگر نیند کا نام نہ تھا۔ جتنی باتیں سوچتی تھیں سب سوچ چکی۔ تفکرات کا بھی خاتمہ ہوگیا۔ پلک نہ جھپکی۔ تب اس نے پھر لیمپ جلایا۔ اور ایک کتاب پڑھنے لگی۔ دوہی چار صفحے پڑھے ہوں گی کہ جھپکی آگئی۔ کتاب کھلی کی کھلی رہ گئی۔

دفعتاً جیارام نے کمرہ میں قدم رکھا۔ اس کے پیر تھر تھر کانپ رہے تھے۔ اس نے کمرے کے اوپر نیچے دیکھا۔ نرملا سوئی ہوئی تھی۔ اس کے سرہانے طاق پر ایک چھوٹا سا پیتل کا صندوقچہ رکھا ہوا تھا۔ جیارام دبے پاؤں گیا، آہستہ سے صندوقچہ اُتارا اور بڑی تیزی سے کمرہ سے باہر نکلا۔ اسی وقت نرملا کی آنکھیں کھل گئیں۔ چونک کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ دروازہ پر آکر دیکھا۔ کلیجہ دھک سے ہوگیا۔ کیا یہ جیارام ہے؟ میرے کمرے میں کیا کرنے آیا تھا؟ کہیں مجھے دھوکا تو نہیں ہوا؟ شاید دیدی جی کے کمرہ سے آیا ہو۔ یہاں اس کا کام ہی کیا تھا؟ شاید مجھے کچھ کہنے آیا ہو اور سوتا دیکھ کر چلا گیا ہو۔ لیکن اس وقت کیا کہنے آیا ہوگا؟ اس کی نیّت کیا ہے؟ اس کا دل کانپ اُٹھا۔

منشی جی اوپر چھت پر سو رہے تھے۔ منڈیر نہ ہونے کے سبب نرملا اوپر نہ سوسکتی تھی۔ اس نے سوچا کہ چل کر انھیں جگاؤں۔ مگر جانے کی ہمّت نہ پڑی۔ شکی آدمی ہیں۔ نہ جانے کیا سمجھ بیٹھیں۔ اور کیا کرنے پر آمادہ ہوجائیں۔ آکر پھر وہی کتاب پڑھنے لگی۔ سویرے پوچھنے پر آپ ہی معلوم ہوجائے گا۔ کون جانے مجھے دھوکا ہی ہوا ہو۔ نیند میں کبھی

دھوکا ہوجاتا ہے۔ لیکن صبح پوچھنے کا ارادہ کرلینے پر بھی اس کو نیند نہ آئی۔

صبح وہ ناشتہ لے کر خود جیارام کے پاس گئی تو اسے وہ دیکھ کر چونک پڑا۔ روز بھنگی آتی تھی آج یہ کیوں آرہی ہیں؟ نرملا کی طرف دیکھنے کی اُسے جرأت نہ ہوئی۔

نرملا نے اس کی طرف تیقّن آمیز نگاہوں سے دیکھ کر پوچھا۔"رات کو تم میرے کمرے میں گئے تھے؟"

جیارام نے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "میں! بھلا میں رات کو کیا کرنے جاتا۔ کیا کوئی گیا تھا؟"

نرملا نے اس لہجہ میں کہا۔ گویا اسے اس کی بات کا پورا یقین ہوگیا تھا۔" ہاں! مجھے ایسا معلوم ہوا کہ کوئی میرے کمرہ سے نکلا۔ میں نے اس کا چہرہ تو نہ دیکھا۔ مگر اس کی پیٹھ دیکھ کر قیاس کیا کہ شاید تم کسی کام سے آئے ہو۔ اس کا پتہ کیسے چلے کون تھا؟ کوئی تھا ضرور! اس میں ذرا بھی شبہہ نہیں۔"

جیارام اپنے کو بے قصور ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہنے لگا۔"میں تو رات کو تھیٹر دیکھنے چلا گیا تھا۔ وہاں سے لوٹا تو ایک دوست کے گھر میں لیٹ رہا۔ تھوڑی دیر ہوئی لوٹا ہوں۔ میرے ساتھ اور بھی کئی دوست تھے۔ جس سے جی چاہے پوچھ لیجیے۔ ہاں بھئی، میں بہت ڈرتا ہوں۔ ایسا نہ ہوکہ کوئی چیز اُٹھ گئی ہو تو میرا نام لگے۔ چور کو تو کوئی پکڑ نہیں سکتا۔ میرے ماتھے جائے گی۔ بابو جی کو تو آپ جانتی ہیں، مجھے مارنے دوڑیں گے۔ نرملا۔ تمھارا نام کیوں لگے گا؟ اگر تم ہی ہوتے تو بھی کوئی چوری نہیں لگا سکتا۔ چوری دوسرے کی چیز کی جاتی ہے اپنی چیز کی چوری کوئی نہیں کرتا۔

ابھی تک نرملا کی نگاہ اپنے صندوقچہ پر نہ پڑی تھی۔ کھانا پکانے لگی۔ جب وکیل صاحب کچہری چلے گئے۔ تو وہ سُدھا سے ملنے چلی۔ ادھر کئی روز سے ملاقات نہ ہوئی تھی۔ پھر رات والے واقعہ پر باہمی گفتگو بھی ہونی تھی۔ بھنگی سے کہا۔ "کمرہ سے گہنے کا بکس اُٹھا لا۔"

بھنگی نے واپس آکر کہا۔ "وہاں تو کہیں بکس نہیں ہے۔ کہاں رکھا تھا؟"

نرملا نے چڑھ کر کہا۔ "ایک مرتبہ میں تو کبھی میرا کام ہی نہیں ہوتا۔ وہاں چھوڑ کر اور جائے گا کہاں؟ الماری میں دیکھا تھا؟"

بھنگی بولی۔ نہیں بہو جی! الماری میں تو نہیں دیکھا، جھوٹ کیوں بولوں؟"

نرملا مسکرا پڑی۔ بولی۔ "جا دیکھ! جلدی آ۔"

ایک لمحہ میں بھنگی پھر خالی ہاتھ لوٹ آئی۔ "الماری میں بھی تو نہیں ہے۔ اب جہاں بتاؤ وہاں دیکھوں۔"

نرملا جھنجھلا کر یہ کہتی ہوئی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ "تجھے ایشور نے آنکھیں نہ جانے کس لیے دیں۔ دیکھ اسی کمرہ میں سے لاتی ہوں کہ نہیں۔"

بھنگی بھی پیچھے پیچھے کمرہ میں گئی۔ نرملا نے طاق پر نگاہ ڈالی۔ الماری کھول کر دیکھا، پلنگ کے نیچے جھانک کر دیکھا۔ پھر کپڑوں کا بڑا صندوق کھول کر دیکھا۔ مگر بکس کا کہیں پتہ نہ تھا۔ تعجب ہوا کہ آخر بکس گیا کہاں؟

دفعتاً رات کا واقعہ بجلی کی طرح اس کی آنکھوں کے سامنے چمک گیا۔ کلیجہ اچھل پڑا اب تک بے فکری سے تلاش کر رہی تھی۔ اب بخار سا ہوگیا۔ بڑی بے تابی سے چاروں طرف کھوجنے لگی۔ کہیں پتہ نہ تھا۔ جہاں کھوجنا چاہیے تھا وہاں بھی تلاش کیا۔ اور جہاں نہ کھوجنا چاہیے تھا وہاں بھی۔ اتنا بڑا صندوقچہ بستر کے نیچے کیسے چُھپ جاتا؟ مگر اُسے بھی جھاڑ کر دیکھا۔ لمحہ لمحہ چہرے کا رنگ فق ہوتا جاتا تھا۔ جان ناخنوں میں آرہی تھی۔ آخر مایوس ہوکر اس نے چھاتی پر ایک گھونسہ مارا اور رونے لگی۔

گہنے ہی عورتوں کی پونجی ہوتے ہیں۔ شوہر کی اور کسی پونجی پر اس کا اختیار نہیں ہوتا۔ اسی پونجی کا اس کو گھمنڈ اور بل ہوتا ہے۔ نرملا کے پاس پانچ چھ ہزار کے گہنے تھے۔ جب انھیں پہن کر وہ نکلتی تھی تو اتنی دیر کے لیے مسرت سے اس کا دل شگفتہ رہتا تھا۔ ایک ایک زیور گویا مصائب دنیوی سے محفوظ رکھنے کے لیے ایک ایک ہتھیار تھا۔ ابھی رات ہی اس نے سوچا تھا کہ جیارام کی لونڈی بن کر وہ نہ رہے گی۔ ایشور نہ کرے کہ وہ کسی کے آگے ہاتھ پھیلائے۔ اس ڈانڈ سے وہ اپنی ناؤ کو بھی پار لگا دے گی اور اپنی بچّی کو بھی کسی نہ کسی گھاٹ پہنچا دے گی۔ اسے کس بات کی فکر ہے؟ گہنے تو اس سے کوئی نہ چھین لے گا۔ آج یہ میرے سنگار ہیں۔ کل یہی میرے سہارے کا کام دیں گے۔ اس خیال سے اس کے دل کی کتنی تسکین ہوتی تھی۔ وہی پونجی آج اس کے ہاتھ سے نکل گئی۔ اب وہ بے کس تھی۔ دنیا میں اس کے لیے کوئی وسیلہ، کوئی سہارا نہ تھا۔ اس کی امیدوں کی بیخ کنی

ہوگئی۔ وہ زاروقطار رونے لگی۔ ایشور! تم سے اتنا بھی نہ دیکھا گیا؟ مجھ دُکھیا کو تم نے یوں ہی مجہول بنا دیا تھا۔ اب آنکھیں بھی پھوڑ دیں! اب وہ کِس کے سامنے ہاتھ پھیلائے گی؟ کِس کے دروازے پر بھیک مانگے گی؟ اس کا جسم پسینہ سے شل ہوگیا۔ روتے روتے آنکھیں سوج گئیں۔ وہ سر جھکائے رو رہی تھی۔ اور رُکمنی اسے دلاسہ دے رہی تھی۔ مگر اس کے آنسو نہ تھمتے تھے۔ رنج کی آگ فرو نہ ہوتی تھی۔

تین بجے جیارام اسکول سے لوٹا۔ نرملا اس کے آنے کی خبر پاکر دیوانہ وار اُٹھی۔ اور اس کے کمرہ کے دروازہ پر جاکر بولی۔ "بھیا، دل لگی کی ہو تو دے دو۔ دُکھیا کو ستاکر کیا پاؤگے؟"

جیارام ایک لمحہ کے لیے مضمحل ہوگیا۔ چوری میں اس کی یہ پہلی ہی کوشش تھی۔ وہ سنگدلی جسے ستانے میں مزا آتا ہے ابھی تک اس میں نہ پیدا ہوئی تھی۔ اگر اس کے پاس صندوقچہ ہوتا اور پھر اسے موقعہ ملتا کہ وہ اسکول اسی طاق پر رکھ دے تو شاید وہ اس موقعہ کو ہاتھ سے نہ جانے دیتا۔ مگر اب صندوقچہ اس کے ہاتھ سے نکل چکا تھا یار لوگوں نے اسے صرّافہ میں پہنچا دیا تھا۔ اور گہنے کم و بیش قیمت پر فروخت کر ڈالے تھے۔ چوری کی آڑ جھوٹ کے سوا اور کیا ہوسکتی ہے۔ بولا۔ "بھلا اماں جی! میں آپ سے ایسی دل لگی کروں گا؟ آپ ابھی تک مجھ پر شک کرتی جارہی ہیں۔ میں کہہ چکا ہوں کہ میں رات کو گھر میں نہ تھا۔ مگر آپ کو یقین نہیں آتا۔ بڑے افسوس کی بات ہے، کہ آپ مجھے اتنا کمینہ سمجھتی ہیں۔"

نرملا نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "میں تمھارے اوپر شک نہیں کرتی بھیا، تمھیں چوری نہیں لگاتی، میں نے سمجھا کہ شاید دل لگی کی ہو۔"

جیارام پر وہ چوری کا شبہہ کیسے کرسکتی تھی؟ دنیا یہی تو کہے گی کہ لڑکے کی ماں مر گئی تو اس پر چوری کا الزام لگایا جارہا ہے۔ میرے منہ میں تو کالکھ لگ جائے گی۔

جیارام نے تشفی دیتے ہوئے کہا۔ "چلیے۔ میں تو دیکھوں۔ آخر لے کون گیا؟ چور آیا کس راستہ سے؟"

بھتی۔ بھیا۔ تم بھی چوروں کے آنے کو کہتے ہو۔ چوہے کے بل سے تو نکل ہی آتے ہیں۔ یہاں تو چاروں طرف کھڑکیاں ہیں۔

جیارام۔ خوب اچھی طرح تلاش کرلیا ہے؟

نرملا۔ سارا گھر تو چھان مارا۔ اب کہاں کھوجنے کہتے ہو؟

جیارام۔ آپ لوگ سو بھی تو جاتی ہیں مُردوں سے بازی لگا کر!

چار بجے منشی جی گھر میں آئے تو نرملا کی حالت دیکھ کر دریافت کیا کیسی طبیعت ہے؟ کہیں درد تو نہیں ہے؟ یہ کہہ کر انھوں نے آشا کو گود میں اُٹھا لیا۔

نرملا کوئی جواب نہ دے سکی۔ پھر رونے لگی۔

بھنگی نے کہا۔ "ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ میری ساری عمر اسی گھر میں کٹ گئی۔ آج تک ایک پیسہ کی چوری نہیں ہوئی۔ دنیا یہی کہے گی کہ بھنگی کا کام ہے اب تو بھگوان ہی آبرو رکھیں۔"

منشی جی اچکن کے بٹن کھول رہے تھے۔ پھر بٹن کرتے ہوئے بولے۔ "کیا ہوا؟ کیا کوئی چیز چوری ہوگئی؟"

بھنگی۔ بہو جی کے سارے گہنے اُٹھ گئے۔

منشی جی۔ رکھے کہاں تھے؟

نرملا نے سسکیاں بھرتے ہوئے رات کا سارا واقعہ بیان کردیا۔ مگر جیارام کے صورت والے آدمی کے اپنے کمرہ سے نکلنے کی بات نہ کہی۔ منشی جی نے آہ سرد بھر کر کہا۔ "ایشور بھی بڑا انیائی ہے۔ جو مَرے ہیں انھیں کو مارتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بُرے دن آگئے۔ مگر چور آیا، تو آیا کدھر سے؟ کہیں نقب نہیں ہوئی۔ اور کسی طرف سے آنے کا راستہ نہیں۔ میں نے تو کوئی ایسا گناہ بھی نہیں کیا جس کی مجھے یہ سزا مل رہی ہے۔ بار بار کہتا رہا کہ یہ زیور کا صندوقچہ طاق پر نہ رکھو۔ مگر کون سُنتا ہے؟"

نرملا۔ میں کیا جانتی تھی کہ یہ غضب ٹوٹ پڑے گا۔

منشی جی۔ اتنا تو جانتی تھیں کہ سب دن برابر نہیں جاتے۔ آج بنوانے جاؤں تو دس ہزار سے کم نہ لیں گے۔ پھر آج کل اپنی جو حالت ہے۔ وہ تم سے پوشیدہ نہیں ہے خرچ بھر کو مشکل سے ملتا ہے۔ زیور کہاں سے بنیں گے؟ جاتا ہوں تھانہ میں اطلاع کیے آتا ہوں۔ مگر ملنے کی کوئی امید نہ سمجھو۔

نرملا نے معترضانہ لہجہ میں کہا۔ "جب جانتے ہیں کہ تھانہ میں اطلاع کرنے سے کچھ

نہ ہوگا تو کیوں جا رہے ہیں؟"
منشی جی۔ دل نہیں مانتا اور کیا؟ اتنا بڑا نقصان اُٹھا کر خاموش تو نہیں بیٹھا جاتا۔
نرملا۔ ملنے والے ہوتے تو جاتے ہی کیوں؟ تقدیر کے نہ تھے تو کیسے رہتے؟
منشی جی۔ تقدیر کے ہوں گے تو مل جائیں گے ورنہ گئے تو ہیں ہی۔

منشی جی کمرے سے نکلے۔ نرملا نے ان کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "میں کہتی ہوں نہ جاؤ۔ کہیں ایسا نہ ہو لینے کے دینے پڑجائیں۔"

منشی جی نے ہاتھ چھڑا کر کہا۔ "تم بھی کیسی بچّوں کی سی ضد کر رہی ہو؟ دس ہزار کا نقصان ایسا نہیں ہے جس کو میں یوں ہی برداشت کرلوں۔ میں رو نہیں رہا ہوں۔ مگر میرے دل پر جو کچھ گزر رہی ہے وہ میں ہی جانتا ہوں۔ یہ چوٹ میرے کلیجہ پر لگی ہے۔"

منشی جی اور کچھ نہ کہہ سکے۔ گلا بھر آیا۔ وہ تیزی کے ساتھ کمرہ سے باہر نکلے، اور تھانہ جا پہنچے۔ تھانہ دار ان کا بہت لحاظ کرتا تھا۔ اسے ایک رشوت کے مقدمہ سے رہا کراچکے تھے۔ وہ ان کے ساتھ ہی تفتیش کرنے آپہنچا۔ نام تھا اللہ یار خاں۔

شام ہوگئی تھی۔ تھانہ دار نے مکان کے آگے پیچھے گھوم گھوم کر دیکھا۔ اندر جاکر نرملا کے کمرہ کو غور سے دیکھا۔ اوپر کی منڈیر کی جانچ کی۔ اور تب منشی جی سے بولا۔ "جناب خدا کی قسم! یہ کسی باہر کے آدمی کا کام نہیں۔ خدا کی قسم! اگر کوئی باہری آدمی نکلے تو میں آج سے تھانہ داری کرنا چھوڑ دوں۔ آپ کے گھر میں کوئی ملازم تو ایسا نہیں ہے جس پر آپ کو شبہہ ہو؟"

منشی جی۔ گھر میں تو آج کل صرف ایک مہری ہے۔
تھانیدار۔ اجی وہ پاگل ہے۔ یہ کسی بڑے شاطر کا کام ہے۔ خدا کی قسم!
منشی جی۔ تو گھر میں اور کون ہے؟ میرے دونوں لڑکے ہیں، بیوی ہے اور بہن ہے۔ اِن میں سے کس پر شبہہ کروں؟
تھانیدار۔ خدا کی قسم، گھر ہی کے کسی آدمی کا کام ہے خواہ وہ کوئی بھی ہو۔ انشاء اللہ دو چار روز میں میں آپ کو اس کی خبر دوں گا۔ یہ نہیں کہہ سکتا کہ مال بھی سب مل جائے گا۔ مگر خدا کی قسم، چور کو ضرور پکڑ لوں گا۔

تھانہ دار چلا گیا تو منشی جی نے آکر نرملا سے اس کی باتیں کہیں۔ نرملا سہم گئی بولی۔

"آپ تھانیدار سے کہہ دیجیے کہ تفتیش نہ کریں۔ میں آپ کے پیروں پڑتی ہوں۔"
منشی جی۔ آخر کیوں؟
نرملا۔ اب کیوں بتاؤں؟ وہ کہہ رہا ہے کہ گھر ہی کے کسی آدمی کا کام ہے۔
منشی جی۔ اُسے بکنے دو۔

جیارام اپنے کمرہ میں بیٹھا ہوا ایشور کو یاد کررہا تھا۔ اس کے مُنہ پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں، وہ سُن چکا تھا کہ پولیس والے چہرہ سے بھانپ جاتے ہیں۔ باہر نکلنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ دونوں آدمیوں میں کیا باتیں ہو رہی ہیں، یہ جاننے کے لیے وہ بے قرار ہو رہا تھا۔ جوں ہی تھانیدار چلا گیا اور بھنگی کسی کام سے باہر نکلی تو جیارام نے پوچھا "تھانیدار کیا کہہ رہا تھا بھنگی۔"

بھنگی نے پاس جاکر کہا۔ "ڈاڑھی جار کہتا تھا کہ گھر ہی کے کسی آدمی کا کام ہے باہر کا کوئی نہیں ہے۔"

جیارام۔ دادا جی نے کچھ نہیں کہا؟
بھنگی۔ کچھ تو نہیں کہا۔ کھڑے ہوں ہوں کرتے رہے۔ گھر میں ایک بھنگی ہی بیگانی ہے نہ؟
اور تو سب اپنے ہی ہیں۔
جیارام۔ میں بھی تو بیگانہ ہوں، تو ہی کیوں؟
بھنگی۔ تم بیگانہ کاہے کو ہو بھیا؟
جیارام۔ بابو جی نے تھانیدار سے کہا نہیں کہ گھر میں کسی پر ان کا شبہہ نہیں۔
بھنگی۔ کچھ تو کہتے نہیں سُنا۔ بے چارے تھانیدار نے پہلے ہی کہا کہ بھنگی تو پاگل ہے یہ کیا
چوری کرے گی؟ بابو جی تو مجھے پھنسائے ہی دیتے تھے۔
جیارام۔ تب تو تُو بھی نکل گئی۔ اکیلا میں ہی رہ گیا۔ تو ہی بتا کہ تونے مجھے اس دن گھر
میں دیکھا تھا؟
بھنگی۔ نہیں بھیا، تم تو تھیٹر دیکھنے گئے تھے۔
جیارام۔ گواہی دے گی نہ؟
بھنگی۔یہ کیا کہتے ہو بھیا؟ بہو جی تحقیقات بند کرادیں گی۔
جیارام۔ سچ؟

بھنگی۔ ہاں بھیا، بار بار کہتی ہیں کہ تحقیقات نہ کراو۔ گہنے گئے تو جانے دو۔ بابو جی مانتے ہی نہیں۔

پانچ چھ روز تک جیارام نے پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا۔ کبھی دو چار لقمے کھالیتا اور کبھی کہہ دیتا بھوک نہیں ہے۔ اس کے چہرے کا رنگ فق رہتا تھا۔ راتیں جاگتے گزرتیں۔ ہر لمحہ تھانیدار کا خوف لگا رہتا تھا۔ اگر وہ جانتا کہ معاملہ اتنا طول پکڑے گا تو کبھی ایسا کام نہ کرتا۔ اس نے تو سمجھا تھا کہ کسی چور پر شبہہ ہوگا۔ میری طرف کسی کا دھیان بھی نہ جائے گا۔ مگر اب بھنڈا پھوٹتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ کم بخت تھانیدار جس ڈھنگ سے چھان بین کر رہا تھا اس سے جیارام کو سخت اندیشہ ہو رہا تھا۔

ساتویں روز شام کے وقت جیارام گھر لوٹا تو بہت متفکر تھا۔ آج تک اسے بچنے کی کچھ نہ کچھ امید تھی۔ مال ابھی تک برآمد نہیں ہوا تھا۔ مگر آج اسے مال کے برآمد ہونے کی خبر مل گئی تھی۔ اِسی دم تھانیدار کانسٹبلوں کو لیے ہوئے آتا ہوگا۔ بچنے کی کوئی سبیل نہیں۔ یہ ممکن ہے کہ تھانیدار رشوت دینے سے معاملہ کو دبا دے۔ روپے بھی ہاتھ میں تھے۔ مگر کیا بات چُھپی رہے گی؟ ابھی مال برآمد نہیں ہوا پھر بھی کل شہر میں افواہ تھی کہ بیٹے ہی نے مال اُڑایا ہے۔ مال مل جانے پر تو گلی گلی بات پھیل جائے گی پھر وہ کسی کو منہ نہ دکھا سکے گا۔

منشی جی کچہری سے لوٹے تو بہت گھبرائے ہوئے تھے۔ سر پکڑ کر پلنگ پر بیٹھ گئے۔

نرملا نے کہا۔ "کپڑے کیوں نہیں اُتارتے؟ آج تو اور دنوں سے دیر ہوگئی ہے!"

منشی جی۔ کیا کپڑے اُتاروں۔ تم نے کچھ سُنا؟

نرملا۔ کیا بات ہے؟ میں نے تو کچھ نہیں سُنا!

منشی جی۔ مال برآمد ہوگیا۔ اب جیا کا بچنا مشکل ہے۔

نرملا کو تعجب نہیں ہوا۔ اس کے چہرہ سے ایسا معلوم ہوا گویا اس کو یہ بات معلوم تھی۔ بولی۔ "میں تو پہلے ہی کہہ رہی تھی کہ تھانہ میں اطلاع نہ کیجیے۔"

منشی جی۔ تمھیں جیا پر شبہہ تھا؟

نرملا۔ شبہہ کیوں نہیں تھا۔ میں نے اسی کو اپنے کمرہ سے نکلتے دیکھا تھا۔

منشی جی۔ پھر تم نے مجھ سے کیوں نہ کہہ دیا؟

نرملا۔ یہ بات میرے کہنے کی نہ تھی۔ آپ کے دل میں ضرور خیال گزرتا کہ یہ حسد سے
الزام لگا رہی ہے۔ کہیے یہ خیال گزرتا یا نہیں؟ جھوٹ نہ بولیے گا۔

منشی جی۔ ممکن ہے۔ میں انکار نہیں کرسکتا۔ اس حالت میں بھی تمھیں مجھ سے کہہ دینا
چاہیے تھا۔ رپورٹ کی نوبت نہ آتی۔ تم نے اپنی نیک نامی کی تو فکر کی۔ یہ نہ سوچا
کہ نتیجہ کیا ہوگا۔ میں ابھی تھانہ سے چلا آتا ہوں۔ اللہ یار خاں آتا ہی ہوگا۔

نرملا نے مایوسی سے پوچھا۔ ''پھر اب؟''

منشی جی نے آسمان کی طرف تاکتے ہوئے کہا۔ ''پھر جیسی ایشور کی مرضی۔ ہزار
دوہزار روپے رشوت دینے کے لیے ہوتے تو شاید معاملہ دب جاتا، مگر میری حالت تو تم
جانتی ہو، تقدیر کھوٹی ہے اور کچھ نہیں۔ پاپ تو میں نے کیے ہیں، سزا کون بھوگے گا؟ ایک
لڑکا تھا اس کی وہ حالت ہوئی۔ دوسرے کی یہ حالت ہو رہی ہے۔ نالائق تھا۔ گستاخ تھا۔
نکما تھا، مگر تھا تو اپنا ہی لڑکا! کبھی نہ کبھی چیتتا ہی، یہ صدمہ اب نہ اُٹھایا جاسکے گا۔

نرملا۔ اگر کچھ دے دلا کر جان بچ سکے تو میں روپے کا بندوبست کروں۔

منشی جی۔ کرسکتی ہو؟ کتنے روپے دے سکتی ہو؟

نرملا۔ کتنا درکار ہوگا؟

منشی جی۔ ایک ہزار سے کم میں تو شاید بات چیت نہ ہوسکے۔ میں نے ایک مقدمہ میں اس
سے ایک ہزار لیے تھے وہ اس کی کسر آج نکالے گا۔

نرملا۔ ہوجائے گا۔ آپ ابھی تھانہ جائیے۔

منشی جی کو تھانے میں بہت دیر لگی۔ بہت دیر بعد تنہائی میں گفتگو کرنے کا موقعہ ملا۔
اللہ یار خاں پُرانا عُرّانٹ تھا۔ بڑی مشکل سے ہتھے چڑھا۔ پانچ سو روپے لے کر بھی احسان کا
بوجھ سر پر لا دہی دیا۔ کام ہوگیا۔ منشی جی واپس آکر نرملا سے بولے۔ ''لو بھئی۔ بازی مار
لی۔ روپے تم نے دیئے۔ مگر کام میری زبان ہی نے کیا۔ بڑی مشکل سے راضی ہوگیا۔ یہ
بھی یاد رہے گی۔ جیارام کھانا کھا چکا ہے؟''

نرملا۔ کہاں، وہ تو ابھی گھوم کر لوٹا ہی نہیں۔

منشی جی۔ بارہ تو بج رہے ہوں گے؟

نرملا۔ کئی مرتبہ جاجا کر دیکھ آئی۔ کمرہ میں اندھیرا پڑا ہوا ہے۔

منشی جی۔ اور سیارام؟
نرملا۔ وہ تو کھا پی کر سویا ہے۔
منشی جی۔ اس سے پوچھا نہیں کہ جیا کہاں گیا ہے؟
نرملا۔ وہ تو کہتا ہے کہ مجھ سے کچھ کہہ کر نہیں گیا۔
منشی جی کو اندیشہ ہوا۔ سیارام کو جگا کر پوچھا۔ "تم سے جیارام نے کچھ کہا نہیں؟ کب تک لوٹے گا؟ گیا کہا ہے؟"
سیارام سر کھجلاتے اور آنکھیں ملتے ہوئے بولا۔ "مجھ سے کچھ کہا نہیں۔
منشی جی۔ کپڑے سب پہن کر گیا ہے؟
سیارام۔ جی نہیں، صرف کرتہ اور دھوتی!
منشی جی۔ جاتے وقت خوش تھا؟
سیارام۔ خوش تو نہیں معلوم ہوتے تھے۔ کئی بار اندر آنے کا ارادہ کیا۔ مگر دروازہ سے لوٹ گئے۔ کئی منٹ تک سائبان کے نیچے کھڑے رہے۔ چلنے لگے تو آنکھیں پونچھ رہے تھے۔ ادھر کئی دنوں سے اکثر رویا کرتے ہیں۔
منشی جی نے ایسی ٹھنڈی سانس لی۔ گویا زندگی میں اب کچھ نہیں رہا۔ نرملا سے بولے۔ "تم نے کیا تو اپنی سمجھ میں بھلے ہی کے لیے، مگر کوئی دشمن بھی مجھ پر اس سے زیادہ سخت چوٹ نہ کرسکتا تھا۔ جیارام سچ کہتا تھا کہ بیاہ کرنا ہی میری زندگی کی سب سے بڑی خطا تھی۔"
اور کسی وقت ایسے سخت الفاظ سُن کر نرملا تلملا جاتی۔ مگر اس وقت وہ خود اپنی غلطی پر پچھتا رہی تھی۔ اگر جیارام کی ماں ہوتی تو کیا وہ اس میں تامّل کرتی؟ ہرگز نہیں، بولی۔ "ڈاکٹر صاحب کے یہاں کیوں نہیں چلے جاتے؟ شاید وہاں بیٹھا ہو۔ کئی لڑکے روز آتے ہیں۔ ان ہی سے پوچھئے شاید کچھ پتہ لگ جائے۔ پھونک پھونک کر قدم رکھنے پر بھی کلنک لگ ہی گیا۔"
منشی جی نے بے دلی سے کہا۔ "ہاں جاتا ہوں اور کیا کروں گا؟"
منشی جی باہر آئے تو دیکھا ڈاکٹر سنہا کھڑے ہیں۔ چونک کر پوچھا۔ "کیا آپ دیر سے کھڑے ہیں؟"

ڈاکٹر۔ جی نہیں۔ ابھی آیا ہوں۔ آپ اس وقت کہاں جا رہے ہیں؟ ساڑھے بارہ بج گئے ہیں۔

منشی جی۔ آپ ہی کی طرف جا رہا تھا۔ جیارام ابھی تک گھوم کر نہیں آیا۔ آپ کی طرف تو نہیں گیا تھا؟

ڈاکٹر سنہا نے منشی جی کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔ اور اتنا کہہ پائے تھے۔ "بھائی صاحب اب صبر سے کام ......" کہ منشی جی گولی کھائے ہوئے آدمی کی طرح زمین پر گر پڑے۔

(۲۱)

رکمنی نے نرملا سے تیوریاں بدل کر کہا۔ "کیا لڑکا ننگے پیر ہی مدرسہ جائے گا؟

نرملا نے بچّی کے بال گوندھتے ہوئے کہا۔ "میں کیا کروں۔ میرے پاس روپے نہیں ہیں۔"

رکمنی۔ گہنے بنوانے کے لیے روپے ہیں۔ لڑکے کے جوتے کے لیے روپوں میں آگ لگ جاتی ہے۔ دو تو چلے ہی گئے۔ کیا تیسرے کو بھی رُلا رُلا کر مار ڈالنے کا ارادہ ہے؟

نرملا نے آہ سرد بھر کر کہا۔ "جس کو جینا ہے، جئے گا، جس کو مرنا ہے مر جائے گا۔ میں کسی کو مارنے جلانے نہیں جاتی۔"

آج کل ایک نہ ایک بات پر نرملا اور رکمنی میں روز ہی کھٹ پٹ ہو جاتی تھی۔ جب سے گہنے چوری گئے ہیں۔ نرملا کا مزاج بالکل تبدیل ہو گیا ہے۔ وہ ایک ایک کوڑی کو دانت سے پکڑنے لگی ہے۔ سیارام روتے روتے چاہے جان دے دے۔ مگر اسے مٹھائی کے لیے پیسے نہیں ملتے۔ اور یہ برتاؤ کچھ سیارام ہی کے ساتھ نہیں ہے، نرملا خود اپنی ضرورتوں کو ٹالتی رہتی ہے۔ دھوتی جب تک پھٹ کر تار تار نہ ہو جائے۔ نئی دھوتی نہیں آتی۔ مہینوں سر کا تیل نہیں منگایا جاتا۔ پان کھانے کا اسے شوق تھا۔ اب کئی کئی روز تک پاندان خالی پڑا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ بچّی کے لیے دودھ بھی نہیں آتا۔ ننھی بچّی کا مستقبل خوفناک صورت اختیار کر کے اس کے خیالات کی فضا پر منڈلایا کرتا ہے۔

منشی جی نے اپنے کو بالکل نرملا کے ہاتھوں میں سونپ رکھا ہے۔ اس کے کسی کام میں دخل نہیں دیتے۔ نہ جانے اس سے کیوں کچھ دبے رہتے ہیں۔ وہ اب بلا ناغہ کچہری

جاتے ہیں۔ اس قدر محنت انھوں نے جوانی میں بھی نہ کی تھی۔ آنکھیں خراب ہوگئی ہیں، ڈاکٹر سنہا نے رات میں پڑھنے لکھنے کی ممانعت کردی ہے۔ ہاضمہ پہلے ہی کمزور تھا۔ اب اور بھی خراب ہوگیا ہے۔ تنفس کی شکایت بھی پیدا ہو چلی ہے۔ مگر بے چارے صبح سے نصف شب تک کام کرتے رہتے ہیں۔ کام کرنے کو جی چاہے یا نہ چاہے، طبیعت اچھی ہو یا نہ ہو، کام کرنا ہی پڑتا ہے۔ نرملا کو ان پر ذرا بھی رحم نہیں آتا ہے۔ وہی مستقبل کی خوفناک فکر اس کی نیک مزاجی کو غارت کر رہی ہے۔ کسی فقیر کی آواز پر وہ جھلا اُٹھتی ہے۔ وہ ایک کوڑی بھی نہیں خرچ کرنا چاہتی۔

ایک روز نرملا نے سیارام کو گھی لانے کے لیے بازار بھیجا۔ بھنگی کا اسے اعتبار نہ تھا۔ اس سے اب کوئی سودا نہ منگاتی تھی۔ سیارام میں کاٹ کپٹ کی عادت نہ تھی۔ آنے کو پون آنہ کرنا نہ جانتا تھا۔ عموماً بازار کا سارا کام اسی کو کرنا پڑتا۔ نرملا ایک ایک چیز کو تولتی۔ ذرا بھی کم ہوتی تو اسے لوٹا دیتی۔ سیارام کا بہت سا وقت اسی لوٹا پھیری میں گزر جاتا تھا۔ بازار والے اسے جلدی کوئی سودا نہ دیتے۔ آج بھی وہی نوبت آئی۔ سیارام اپنے خیال سے بہت اچھا گھی کئی دکانیں دیکھ کر لایا تھا۔ مگر نرملا نے اسے سونگھتے ہی کہا۔ ”گھی خراب ہے لوٹا آؤ۔“

سیارام نے جھنجلا کر کہا۔ ”اس سے اچھا گھی بازار میں نہیں ہے۔ میں تمام دُکانیں دیکھ کر لایا ہوں۔“

نرملا۔ تو میں جھوٹ کہتی ہوں؟

سیارام۔ یہ میں نہیں کہتا۔ مگر بنیا اب گھی واپس نہ لے گا۔ اس نے مجھ سے کہہ دیا تھا کہ جس طرح دیکھنا چاہو، یہیں دیکھ لو۔ مال تمھارے سامنے ہے۔ بوہنی کے وقت سودا واپس نہ لوں گا۔ میں نے سونگھ کر، چکھ کر دیکھ لیا تھا۔ اب کس منہ سے واپس کرنے جاؤں؟

نرملا نے دانت پیس کر کہا۔ ”گھی میں صاف چربی ملی ہوئی ہے اور تم کہتے ہو کہ گھی اچھا ہے۔ میں اسے رسوئی میں نہ لے جاؤں گی۔ تمھارا جی چاہے لوٹا دو۔ جی چاہے کھا جاؤ۔“

گھی کی ہانڈی وہیں چھوڑ کر نرملا اندر چلی گئی۔ سیارام غم و غصّہ سے گھبرا اُٹھا وہ کون سا منہ لے کر لوٹانے جائے۔ بنیا صاف کہہ دے گا کہ میں نہیں لوٹاتا۔ تب وہ کیا کرے

گا؟ قریب کے دس پانچ بنیے اور سڑک پر چلنے والے لوگ وہاں جمع ہو جائیں گے ان سبھوں کے سامنے اسے شرمندہ ہونا پڑے گا۔ بازار میں یوں ہی کوئی بنیا اسے جلدی سودا نہیں دیتا۔ وہ کسی دکان پر کھڑا نہیں ہونے پاتا۔ چاروں طرف اسی پر پھٹکار پڑے گی۔ اس نے دل ہی دل میں جھنجلا کر کہا۔ "پڑا رہے گھی، میں لوٹانے نہیں جاؤں گا۔"

بلا ماں کے بچّہ کا سا غریب، بیکس اور مغموم جاندار دنیا میں نہیں ہوتا۔ اور دُکھ بھول جاتے ہیں مگر بچّہ ماں کی یاد کبھی نہیں بھولتا۔ سیارام کو اس وقت ماں کی یاد آئی۔ اماں ہوتی تو کیا آج مجھے یہ سب سہنا پڑتا؟ بھیّا بھی چلے گئے۔ جیارام بھی چلے گئے۔ میں ہی اکیلا یہ ساری مصیبت اُٹھانے کے لیے کیوں بچ رہا؟ سیارام کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ اس کے بھرے ہوئے گلے سے ایک گہری سانس کے ساتھ ملے ہوئے یہ لفظ نکل پڑے۔ "اماں! تم مجھے کیوں بھول گئیں؟ کیوں مجھے نہیں بلا لیتیں؟"

دفعتاً نرملا پھر کمرہ کی طرف آئی۔ اس نے سمجھا تھا کہ سیارام چلا گیا ہوگا۔ اُسے بیٹھا دیکھا تو غصہ سے بولی۔ "تم ابھی تک بیٹھے ہی ہو؟ آخر کھانا کب بنے گا؟"

سیارام نے آنکھیں پونچھ ڈالیں اور بولا۔ "مجھے اسکول جانے کو دیر ہو جائے گی؟"

نرملا۔ ایک روز دیر ہو جائے گی تو کیا ہرج ہے؟ یہ بھی تو گھر ہی کا کام ہے؟

سیارام۔ روز تو یہی دھندا لگا رہتا ہے۔ میں کبھی وقت پر نہیں پہنچتا۔ گھر پر بھی پڑھنے کا وقت نہیں ملتا۔ کوئی سودا بلا دو چار بار لوٹائے نہیں لیا جاتا۔ ڈانٹ تو مجھ پر پڑتی ہے، شرمندہ تو مجھے ہونا پڑتا ہے آپ کو کیا؟

نرملا۔ ہاں مجھے کیا، میں تو تمھاری دشمن ہوں، اپنا ہوتا تب تو اس سے تعلق ہوتا میں ایشور سے منایا ہی کرتی ہوں کہ تم پڑھ لکھ نہ سکو۔ مجھ میں تو ساری برائیاں ہیں تمھارا کوئی قصور نہیں، سوتیلی ماں کا نام ہی بُرا ہوتا ہے۔ اپنی ماں زہر بھی دے تو امرت ہے میں امرت بھی دوں تو زہر ہو جائے۔ تم لوگوں کے کارن مٹی میں مل گئی۔ روتے روتے عمر کٹی جاتی ہے۔ معلوم ہی نہ ہوا کہ ایشور نے کس لیے جنم دیا تھا۔ اور تمھاری سمجھ میں مزا کر رہی ہوں۔ تمھیں ستانے میں مجھے مزا آتا ہے۔ ایشور بھی نہیں پوچھتا کہ سب دُکھ درد کا خاتمہ ہو جاتا۔

یہ کہتے کہتے نرملا کی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ اندر چلی گئی۔ سیارام اُسے روتا دیکھ کر

سہم گیا۔ اسے رنج تو نہیں ہوا۔ البتہ یہ خوف ہوا کہ نہ جانے کون سی سزا ملے۔ چپکے سے ہانڈی اُٹھا لی اور گھی لوٹانے چلا۔ اس طرح جیسے کوئی کتا کسی نئے گاؤں میں جاتا ہے اسی کتے کی طرح اس کا دلی رنج اس کے ایک ایک عضو سے ظاہر ہو رہا تھا۔ اسے دیکھ کر معمولی عقل والا انسان بھی قیاس کرسکتا تھا کہ یہ اَناتھ ہے۔

سیارام جوں جوں آگے بڑھتا تھا۔ آنے والے جھگڑے کے خوف سے اس کے دل کی حرکت زیادہ ہوجاتی تھی۔ اس نے طے کرلیا کہ اگر بنیے نے گھی نہ لوٹایا تو وہ گھی کو وہیں چھوڑ کر چلا آئے گا۔ جھک مار کر بنیا آپ ہی اُٹھائے گا۔ بنیے کو ڈانٹنے کے لیے بھی اس نے الفاظ سوچ لیے۔ وہ کہے گا۔ "کیوں ساہ جی، آنکھوں میں دھول جھونکتے ہو؟ دِکھاتے ہو بڑھیا مال اور دیتے ہو رَدّی؟ مگر یہ سب سوچ لینے پر بھی اس کے قدم بہت آہستہ آہستہ آگے پڑتے تھے۔ وہ یہ نہ چاہتا تھا کہ بنیا اسے آتا ہوا دیکھے۔ وہ یکبارگی ہی اس کے سامنے پہنچ جانا چاہتا تھا۔ اس لیے وہ چکر کاٹ کر دوسری گلی سے بنیے کی دُکان پر گیا۔

بنیے نے اسے دیکھتے ہی کہا۔ "ہم نے کہہ دیا تھا کہ ہم سودا واپس نہ لیں گے۔ بولو کہا تھا کہ نہیں؟"

سیارام نے بگڑ کر کہا۔ "تم نے وہ گھی کہاں دیا جو دِکھایا تھا؟ دِکھایا ایک مال، اور دیا دوسرا مال۔ لوٹاؤ گے کیسے نہیں، کیا کچھ رہزنی ہے؟

ساہ۔ اس سے چوکھا گھی بازار میں نکل آئے تو جرمانہ دوں۔ اُٹھاؤ ہانڈی اور دوچار دُکان دیکھ آؤ۔

سیارام۔ ہمیں اتنی فرصت نہیں ہے۔ اپنا گھی لوٹا لو۔

ساہ۔ گھی نہ لوٹے گا۔

بنیے کی دُکان پر ایک جٹادھاری سادھو بیٹھا ہوا یہ تماشہ دیکھ رہا تھا۔ اُٹھ کر سیارام کے پاس گیا اور ہانڈی کا گھی سونگھ کر بولا۔ "بچہ، گھی تو بہت بڑھیا معلوم ہوتا ہے۔"

ساہ نے شہ پاکر کہا۔ "بابا جی، ہم لوگ تو آپ ہی ان کو گھٹیا سودا نہیں دیتے۔ بُرا مال کیا جانے بوجھے گاہکوں کو دیا جاتا ہے؟"

سادھو۔ گھی لے جاؤ بچہ! بہت اچھا ہے!

سیارام رو پڑا۔ گھی کو بُرا ثابت کرنے کے لیے اس کے پاس اب کیا ثبوت تھا بولا۔

"وہی تو کہتی ہیں کہ گھی اچھا نہیں ہے۔ لوٹا آؤ۔ میں تو کہتا تھا کہ گھی اچھا ہے۔"

سادھو۔ کون کہتا ہے؟

ساہ۔ ان کی اماں کہتی ہوں گی۔ کوئی سودا ان کے من ہی نہیں بھاتا۔ بے چارے لڑکے کو باربار دوڑایا کرتی ہیں۔ سوتیلی ماں ہیں نہ؟ اپنی ماں ہو تو کچھ خیال بھی کرے۔

سادھو نے سیارام کو ترحمانہ نگاہوں سے دیکھا۔ گویا اسے نجات دینے کے لیے اس کا دل بے چین ہو رہا ہے۔ تب ہمدردانہ لہجہ میں بولا۔ "تمھاری ماں کا سورگباش ہوئے کتنے دن ہوئے بچہ!"

سیارام۔ چھٹا سال ہے۔

سادھو۔ تب تو تم اس وقت بہت ہی چھوٹے رہے ہوگے۔ بھگوان! تمھاری لیلا کتنی انوکھی ہے۔ اِس دودھ مُنہے بچہ سے تم نے ماں کا پیار چھین لیا۔ بڑا اَنیائے کرتے ہو بھگوان! ہائے چھ سال کا بچہ اور راکشسی سوتیلی ماں کے پالے پڑا۔ دھنیہ ہے تمھاری دَیا! ساہ جی۔ لڑکے پر دَیا کرو۔ گھی لوٹا لو۔ نہیں تو اس کی ماں گھر میں نہ آنے دے گی۔ بھگوان کی دَیا سے تمھارا گھی جلدی بِک جائے گا۔ میرا آشیرواد تمھارے ساتھ رہے گا۔

ساہ جی نے روپے نہ واپس کیے۔ آخر لڑکے کو پھر گھی لینے آنا ہی پڑے گا۔ نہ جانے دن میں کتنی بار چکر لگانا پڑے۔ اور کس فریبی سے پالا پڑے۔ اس کی دکان میں جو گھی سب سے بڑھیا تھا وہ اس نے سیارام کو دے دیا۔ سیارام دل میں سوچ رہا تھا کہ باباجی کتنے رحیم ہیں۔ انھوں نے نہ سفارش کی ہوتی تو ساہ جی کیوں اچھا گھی دیتے؟

سیارام گھی لے کر چلا تو باباجی بھی اس کے ساتھ ہولیے۔ راستہ میں میٹھی میٹھی باتیں کرنے لگے۔ "بچہ میری ماں بھی مجھے تین سال کا چھوڑ کر پرلوک سدھار گئی تھی۔ تبھی سے بلا ماں والے بچوں کو دیکھتا ہوں تو میرا دل پھٹنے لگتا ہے۔"

سیارام نے پوچھا۔ "آپ کے باپ نے بھی دوسرا بیاہ کرلیا تھا؟"

سادھو۔ ہاں بچہ! نہیں تو آج سادھو کیوں ہوتا۔ پہلے باپ بیاہ نہ کرتے تھے۔ مجھے بہت چاہتے تھے۔ پھر نہ جانے کیوں من بدل گیا۔ بیاہ کرلیا۔ سادھو ہوں۔ کڑی بات منہ سے نہیں نکالنا چاہیے۔ مگر میری دوسری ماں جتنی سُندر تھی اتنی ہی کڑے دل کی

تھی۔ مجھے دن دن بھر کھانے کو نہ دیتی۔ روتا تو مارتی۔ باپ کی آنکھیں بھی پھر گئیں۔ انھیں میری صورت سے گھن ہونے لگی۔ میرا رونا سُن کر مجھے پیٹنے لگتے۔ آخر میں ایک دن گھر سے بھاگ کھڑا ہوا۔

سیارام کے دل میں بھی گھر سے بھاگ نکلنے کا ارادہ کئی بار ہوا تھا۔ اس وقت بھی اس کے دل میں یہی خیال پیدا ہورہا تھا۔ بڑے جوش سے بولا۔ "گھر سے نکل کر آپ کہاں گئے؟"

بابا جی نے ہنس کر کہا۔ "اسی دن میرے سارے دُکھ دَرد دُور ہوگئے۔ جس دن گھر کے مایا موہ سے چھوٹا اور درمن سے دور ہوا۔ اسی دن میرا اُودھار سا ہوگیا۔ دن بھر تو میں ایک پُل کے نیچے بیٹھا رہا۔ سانجھ ہوتے ہوتے مجھے ایک مہاتما مل گئے۔ ان کا نام سوامی پرمانند تھا۔ وہ بال برہمچاری تھے۔ انھوں نے مجھ پر دَیا کی اور مجھے اپنے ساتھ رکھ لیا۔ ان کے ساتھ میں تمام دیسوں میں گھومنے لگا۔ وہ بڑے بھاری جوگی تھے۔ مجھے بھی انھوں نے جوگ وِدّیا سکھلائی۔ اب تو مجھ میں اتنا ابھیاس ہوگیا ہے کہ جب مَن میں آتا ہے ماتا جی کے درشن کرکے ان سے باتیں کرلیا کرتا ہوں۔

سیارام نے حیرت آمیز نگاہوں سے دیکھ کر پوچھا۔ "آپ کی ماتا جی کا تو سورگباش ہوچکا تھا؟"

سادھو۔ تو کیا ہوا بچہ؟ جوگ میں اتنی شکتی (طاقت) ہے کہ جس مرے ہوئے آتما کو چاہے بلا لے۔

سیارام۔ میں وِدّیا سیکھ لوں تو مجھے بھی ماتا جی کے درشن ہوں گے؟

سادھو۔ ضرور۔ ابھیاس (مشق) سے سب کچھ ہوسکتا ہے۔ ہاں اچھا گرو چاہیے جوگ سے بڑی بڑی سدھیاں مل سکتی ہیں۔ جتنا دھن چاہو لمحہ میں منگا سکتے ہو۔ کیسی ہی بیماری ہو اس کی دوا بتاسکتے ہو۔

سیارام۔ آپ کا استھان کہاں ہے؟

سادھو۔ بچہ! میرا استھان کہیں نہیں ہے۔ دیس دیس میں رمتا پھرتا ہوں۔ اچھا بچہ۔ اب تم جاؤ۔ اب میں بھی اشنان دھیان کرنے جاؤں گا۔

سیارام۔ چلیے۔ میں بھی اسی طرف چلتا ہوں۔ آپ کے درشن سے جی نہیں بھرا۔

سادھو۔ نہیں بچہ! پاٹھ شالا جانے کو دیر ہو رہی ہے۔
سیارام۔ پھر آپ کے درشن کب ہوں گے؟
سادھو۔ کبھی آجاؤں گا بچہ! تمھارا گھر کہاں ہے؟

سیارام خوش ہوکر بولا۔ ''چلیے گا میرے گھر؟ بہت نزدیک ہے۔ آپ کی بڑی کرپا ہو گی۔

سیارام قدم بڑھا کر آگے آگے چلنے لگا۔ اتنا خوش تھا گویا سونے کی گٹھری لیے جاتا ہو۔ گھر کے سامنے پہنچ کر بولا۔ ''آیئے بیٹھیے کچھ دیر۔''

سادھو۔ نہیں بچہ بیٹھوں گا نہیں۔ پھر کل پرسوں کسی وقت آجاؤں گا۔ یہی تمھارا گھر ہے؟
سیارام۔ کل کس وقت آیئے گا؟
سادھو۔ ٹھیک نہیں کہہ سکتا۔ کسی وقت آؤں گا۔

سادھو آگے بڑھا تو تھوڑی ہی دور پر انھیں دوسرا سادھو ملا۔ اس کا نام تھا ہری ہیرانند!

پرمانند نے پوچھا۔ ''کہاں کہاں سیر کی؟ کوئی شکار پھنسا؟

ہری ہیرانند۔ ادھر تو چاروں طرف گھوم آیا۔ کوئی شکار نہ ملا۔ ایک آدھ ملا بھی تو میری ہنسی اُڑانے لگا۔

پرمانند۔ مجھے تو ایک ملتا ہوا جان پڑتا ہے۔ پھنس جائے تو جانوں۔
ہری ہیرانند۔ تم تو یوں ہی کہا کرتے ہو۔ جو آتا ہے دوائیوں کے پیچھے نکل بھاگتا ہے۔
پرمانند۔ اب کی نہ بھاگے گا دیکھ لینا۔ اس کی ماں مر گئی ہے۔ باپ نے دوسرا بیاہ کرلیا ہے۔ ماں ستایا کرتی ہے۔ گھر سے روب گیا ہے۔
ہری ہیرانند۔ ہاں یہ بات ہے تو ضرور پھنسے گا۔ لاسہ لگا دیا ہے نہ؟
پرمانند۔ بہت اچھّی طرح! یہی ترکیب سب سے اچھی ہے۔ پہلے یہ پتہ لگا لینا چاہیے کہ کن کن گھروں میں سوتیلی مائیں ہیں۔ بس انھیں گھروں میں پھندا ڈالنا چاہیے۔

(۲۲)

نرملا نے پکڑ کر پوچھا۔ ''اتنی دیر کہاں لگائی؟''
سیارام نے گستاخانہ لہجہ میں کہا۔ ''راستہ میں سو گیا تھا۔''

نرملا۔ یہ تو میں نہیں کہتی۔ مگر جانتے ہو کتنے بج گئے ہیں؟ دس کبھی کے بج گئے بازار کچھ دور بھی تو نہیں ہے۔

سیارام۔ کچھ دور نہیں ہے۔ دروازے ہی پر تو ہے۔

نرملا۔ سیدھے منہ کیوں نہیں بات کرتے؟ ایسا بگڑ رہے ہو گویا میرا ہی کچھ کام کرنے گئے ہو۔

سیارام۔ تو آپ فضول بکواس کیوں کرتی ہیں؟ لیا ہوا سودا لوٹانا کیا آسان کام ہے؟ بنیے سے گھنٹوں حجت کرنی پڑی۔ وہ تو کہو ایک باباجی نے کہہ سُن کر واپس کرا دیا۔ ورنہ وہ کبھی واپس نہ لیتا۔ راستہ میں ایک منٹ بھی کہیں نہیں رُکا۔ سیدھا چلا آتا ہوں۔

نرملا۔ گھی کے لیے گئے تو تم گیارہ بجے لوٹے ہو۔ لکڑی کے لیے جاؤگے، تو شام ہی کردو گے۔ تمھارے بابو جی بغیر کھائے ہی چلے گئے۔ تمھیں اتنی دیر لگانی تھی، تو پہلے ہی کیوں نہ کہہ دیا تھا؟ جاتے ہو لکڑی کے لیے؟

سیارام نے اب ضبط نہ کرسکا۔ جھلا کر بولا۔ ''لکڑی کسی اور سے منگائیے۔ مجھے اسکول جانے کی دیر ہو رہی ہے۔

نرملا۔ کھانا نہ کھاؤگے؟

سیارام۔ نہ کھاؤں گا۔

نرملا۔ کھانا بنانے کو تیار ہوں۔ مگر لکڑی لانے تو نہیں جاسکتی۔

سیارام۔ بھنگی کو کیوں نہیں بھیجتیں؟

نرملا۔ بھنگی کا لایا ہوا سودا کیا تم نے کبھی دیکھا نہیں ہے؟

سیارام۔ اب میں تو اس وقت نہ جاؤں گا۔

نرملا۔ پھر مجھے دُکھ نہ دینا۔

سیارام کئی دنوں سے اسکول نہیں گیا تھا۔ بازار ہاٹ کے سبب اُسے کتابیں پڑھنے کا وقت ہی نہ ملا تھا۔ اسکول جاکر جھڑکیاں کھانے، بنچ پر کھڑے ہونے یا اونچی ٹوپی دینے کے سوا اور کیا ملتا؟ وہ گھر سے کتابیں لے کر جاتا مگر شہر کے باہر جاکر کسی درخت کے سائے میں بیٹھا رہتا یا پلٹنوں کی قواعد دیکھتا۔ آج بھی وہ گھر سے چلا مگر بیٹھنے میں اس کا جی نہ لگا۔ اس پر آنتیں الگ جل رہی تھیں۔ ہائے اسے اب روٹیوں کے بھی لالے پڑگئے۔ دس بجے

کیا کھانا نہ بن سکتا تھا؟ مانا کہ بابو جی چلے گئے۔ تو کیا میرے لیے گھر میں دو چار پیسے بھی نہ تھے؟ اماں ہوتیں تو اس طرح بلا کچھ کھائے پیے آنے دیتیں؟ میرا اب کوئی نہیں رہا!

سیارام کا دل بابا جی کے درشن کے لیے بے قرار ہوگیا۔ اس نے سوچا کہ اس وقت وہ کہاں ملیں گے؟ کہاں چل کر دیکھوں؟ ان کی دلکش گفتگو، ان کی حوصلہ افزا تشفی اس کے دل کو کھینچنے لگیں۔ اس نے گھبرا کر کہا۔ "میں ان کے ساتھ ہی کیوں نہ چلا گیا؟ گھر پر میرے لیے کیا رکھا ہے؟"

وہ آج یہاں سے چلا تو گھر نہ جاکر سیدھا ساہ جی گھی والے کی دُکان پر گیا۔ شاید بابا جی سے وہاں ملاقات ہوجائے۔ مگر وہ وہاں نہ تھے۔ بڑی دیر تک کھڑا رہا۔ پھر لوٹ آیا۔ مکان میں آکر بیٹھا ہی تھا کہ نرملا نے کہا۔ "آج دیر کہاں لگائی؟ سویرے کھانا نہیں بنا۔ اس وقت بھی اُپاس ہوگا؟ جاکر بازار سے کوئی ترکاری لاؤ۔"

سیارام نے جھلا کر کہا۔ "دن بھر کا بھوکا چلا آتا ہوں۔ کچھ ناشتہ تک نہیں لائیں اوپر سے بازار جانے کا حکم دے دیا۔ میں نہیں جاتا بازار۔ کسی کا نوکر نہیں ہوں۔ آخر روٹیاں ہی تو کھلاتی ہو۔ یا اور کچھ؟ ایسی روٹیاں جہاں محنت کروں گا وہیں مل جائیں گی۔ جب مزدوری ہی کرنا ہے تو آپ کی نہ کروں گا۔ جائیے میرے لیے کھانا نہ بنائیے گا۔"

نرملا ساکت رہ گئی۔ لڑکے کو آج یہ کیا ہوگیا؟ اور دن تو چپکے سے جاکر کام کرلاتا تھا۔ آج کیوں تیوریاں بدل رہا ہے؟ اب بھی اس کو یہ نہ سوجھی کہ سیارام کو دو چار پیسے کچھ کھانے کو دے دے۔ وہ اتنی بخیل ہوگئی تھی۔ بولی۔ "گھر کا کام کرنا تو مزدوری نہیں کہلاتی۔ اسی طرح میں بھی کہہ دوں کہ میں کھانا نہیں پکاتی۔ تمھارے بابو جی کہہ دیں کہ میں کچہری نہیں جاتا تو کیا ہے بتاؤ۔ نہیں جانا چاہتے نہ جاؤ۔ میں بھنگی سے منگا لوں گی میں اگر جانتی کہ تمھیں بازار جانا بُرا لگتا ہے، تو بلا سے پیسے کی چیز دو پیسے کو آتی مگر تمھیں نہ بھیجتی۔ لو آج سے کان پکڑتی ہوں۔"

سیارام دل میں کچھ نادم ہوا۔ مگر بازار نہ گیا۔ اس کا دھیان بابا جی پر لگا ہوا تھا اپنی ساری تکالیف کا خاتمہ اور زندگی کی ساری امیدیں اسے اب بابا جی کے آشیرواد میں معلوم ہوتی تھیں۔ انھیں کی خدمت میں جاکر اس کی زندگی کا مقصد حاصل ہوگا۔ غروب آفتاب کے وقت وہ گھبرا اُٹھا۔ سارا بازار چھان مارا۔ مگر بابا جی کا کہیں پتہ نہ تھا۔ دن بھر کا بھوکا

پیاسا وہ نادان لڑکا دُکھتے ہوئے دل کو ہاتھوں میں دبائے امید و بیم کا مجسمہ بنا ہوا گلیوں اور مندروں میں بابا جی کو ڈھونڈتا پھرتا تھا۔ اس کے بعد اسے کوئی سادھو کھڑا دکھائی دیا۔ اس نے سمجھا وہی ہیں۔ وہ خوشی سے پھول گیا۔ دوڑا اور سادھو کے پاس جاکر کھڑا ہوگیا۔ مگر یہ کوئی اور ہی مہاتما تھے۔ مایوس ہوکر آگے بڑھ گیا۔

رفتہ رفتہ سڑکوں پر سناٹا چھا گیا۔ مکانوں کے دروازے بند ہونے لگے سڑک کی پٹریوں پر اور گلیوں میں بورے بچھاکر ہندوستان کی رعایا خواب شیریں کا لطف اُٹھانے لگی۔ مگر سیارام گھر نہ واپس گیا۔ اس گھر سے اس کا دل متنفر ہوگیا تھا۔ جہاں کسی کو اس سے محبت نہ تھی۔ جہاں وہ کسی محتاج کی طرح پڑا ہوا تھا۔ اور یہ صرف اس لیے کہ اس کا کہیں اور ٹھکانہ نہ تھا۔ اس وقت بھی اس کے گھر واپس نہ جانے کی کسے فکر ہوگی۔ بابو جی کھانا کھاکر لیٹے ہوں گے اماں جی بھی آرام کرنے جارہی ہوں گی کسی نے میرے کمرہ کی طرف جھانک کر دیکھا بھی نہ ہوگا۔ ہاں بوا جی گھبرا رہی ہوں گی۔ جب تک میں نہ جاؤں گا وہ کھانا نہ کھائیں گی۔

رکمنی کی یاد آتے ہی سیارام گھر کی طرف چلا۔ وہ اگر اور کچھ نہ کرسکتی تھی، تو کم از کم اُسے گود میں لِٹا کر روتی تو تھی۔ اس کے باہر سے آنے پر ہاتھ منہ دھونے کے لیے پانی تو رکھ دیتی تھی۔ دنیا میں سبھی لڑکے دودھ کی کلّیاں نہیں کرتے۔ سبھی سونے کے لقمے نہیں کھاتے۔ کتنوں کو پیٹ بھر کھانا بھی نہیں ملتا۔ مگر گھر سے متنفر وہی ہوتے ہیں جو مہرمادری سے محروم ہیں۔

سیارام گھر کی طرف چلا ہی تھا کہ دفعتاً بابا پرمانند ایک گلی سے آتے ہوئے دِکھائی دیے۔ سیارام نے جاکر ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔ پرمانند نے چونک کر پوچھا۔ "بچہ تم یہاں کہاں؟"

سیارام نے بات بناکر کہا۔ "ایک دوست سے ملنے آیا تھا۔ آپ کا ستھان یہاں سے کتنی دور ہے؟"

پرمانند۔ ہم لوگ تو یہاں سے جا رہے ہیں بچہ! ہردوار کی جاترا ہے۔

سیارام نے نراس ہوکر کہا۔ "کیا آج ہی چلے جایئے گا؟"

پرمانند۔ ہاں بچہ! اب لوٹ کر آؤں گا تب درشن دوں گا۔

سیارام نے مایوسی سے کہا۔ "لوٹ کر؟"

پرمانند۔ جلد ہی آؤں گا بچہ!

سیارام نے انکساری سے کہا۔ "میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا۔"

پرمانند۔ میرے ساتھ؟ تمھارے گھر کے لوگ جانے دیں گے؟

سیارام۔ گھر کے لوگوں کو میری کیا پرواہ ہے؟

اس کے آگے سیارام اور کچھ نہ کہہ سکا۔ اس کی آنسو بھری آنکھوں نے اس کی داستانِ غم کو اس سے کہیں زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کردیا۔ جتنی اس کی زبان سے ادا ہوسکتی تھی۔

پرمانند نے بچہ کو گلے سے لگا کر کہا۔ "اچھا بچہ! تیری اِچھا (خواہش) ہے تو چل! سادھو سنتوں کی سنگت کا بھی آنند اُٹھا۔ بھگوان کی اِچھا ہوگی تو تیری اِچھا پوری ہوگی۔"

دانہ پر منڈلاتا ہوا طائر بالآخر دانہ پر گر پڑا۔ اس کی زندگی کا خاتمہ پنجرے میں ہوگا یا صیّاد کی چھری تلے، یہ کون جانتا ہے؟

(۲۳)

منشی جی پانچ بجے کچہری سے لوٹے۔ اور اندر جاکر پلنگ پر گر پڑے۔ بڑھاپے کا بدن، اس پر آج تمام دن کھانا نہ نصیب ہوا۔ مُنہ سوکھ گیا تھا۔ نرملا سمجھ گئی۔ آج دن خالی گیا۔

نرملا نے پوچھا۔ "آج کچھ نہ ملا؟"

منشی جی۔ سارا دن دوڑتے گزرا۔ مگر ہاتھ کچھ نہ لگا۔

نرملا۔ فوجداری والے میں کیا ہوا؟

منشی جی۔ میرے مؤکل کو سزا ہوگئی۔

نرملا۔ اور پنڈت والے مقدمے میں؟

منشی جی۔ پنڈت جی پر ڈگری ہوگئی۔

نرملا۔ آپ تو کہتے تھے کہ دعویٰ خارج ہوجائے گا۔

منشی جی۔ کہتا تو تھا، اور اب بھی کہتا ہوں کہ دعویٰ خارج ہوجانا چاہیے تھا۔ مگر اتنا سر مغزن کون کرے؟

نرملا۔ اور اس سیر والے مقدمے میں؟

منشی جی۔ اس میں بھی ہار ہوگئی۔
نرملا۔ تو آج آپ کسی ابھاگے کا منہ دیکھ کر اُٹھے تھے۔

منشی جی سے اب کام بالکل نہ ہوسکتا تھا۔ ایک تو ان کے پاس مقدمے آتے ہی نہ تھے اور جو آتے بھی تھے وہ خراب ہوجاتے تھے۔ مگر اپنی ناکامیوں کو وہ نرملا سے چھپاتے رہتے تھے۔ جس روز کچھ نہ ملتا اس روز کسی سے دو چار روپے اُدھار لاکر نرملا کو دے دیتے۔ عموماً سبھی دوستوں سے کچھ نہ کچھ لے چکے تھے آج وہ ڈول بھی نہ لگا۔

نرملا نے متفکرانہ لہجہ میں کہا۔ ''آمدنی کا یہ حال ہے۔ تو ایشور ہی مالک ہے۔ اس پر بیٹے کا یہ حال ہے کہ بازار جانا مشکل ! بھنگی ہی سے سب کام کرانے کو جی چاہتا ہے گھی لے کر گیارہ بجے لوٹے۔ کتنا کہہ کر ہار گئی کہ لکڑی لیتے آؤ۔ مگر سُنا ہی نہیں۔
منشی جی۔ تو کھانا نہیں پکایا؟
نرملا۔ ایسی ہی باتوں سے تو آپ مقدمے ہارتے ہیں۔ ایندھن کے بغیر کسی نے کھانا بنایا ہے کہ میں بنا لیتی؟
منشی جی۔ تو وہ بلا کھائے ہی چلا گیا؟
نرملا۔ گھر میں اور کیا رکھا تھا جو کھلا دیتی؟

منشی جی نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ''کچھ پیسے نہ دے دیئے؟''

نرملا نے بھویں سکیڑ کر کہا۔ ''گھر میں پیسے پھلتے ہیں نہ؟''

منشی جی نے کچھ جواب نہ دیا۔ ذرا دیر تو انتظار کرتے رہے کہ شاید ناشتہ کے لیے کچھ ملے گا۔ لیکن جب نرملا نے پانی تک نہ منگایا تو بے چارے مایوس ہوکر چلے گئے۔ سیارام کی تکلیف کا اندازہ کرکے ان کا دل بے چین ہوگیا۔ سارا دن گزر گیا۔ بے چارے نے اب تک کچھ نہیں کھایا۔ کمرہ میں پڑا ہوگا۔ ایک بار بھنگی ہی سے لکڑی منگالی جاتی تو ایسا کیا نقصان ہوجاتا؟ ایسی کفایت بھی کس کام کی کہ گھر کے آدمی بھوکے رہ جائیں۔ اپنا صندوقچہ کھول کر ٹٹولنے لگے کہ شاید دوچار آنے پیسے مل جائیں۔ اس کے اندر کے سارے کاغذات نکال ڈالے۔ ایک ایک خانہ دیکھا۔ نیچے ہاتھ ڈال کر دیکھا۔ مگر نہ ملا۔ اگر نرملا کے صندوق میں پیسے نہ پھلتے تھے تو اس صندوقچہ میں شاید اس کے پھول بھی نہ لگتے ہوں۔ لیکن اتفاق ہی کہیے کہ کاغذات کو جھاڑتے ہوئے ایک چوّنی گر پڑی۔ مارے خوشی کے منشی جی

اچھل پڑے اس کے پیشتر بڑی بڑی رقمیں کما چکے تھے۔ مگر یہ چونّی اس وقت! انھیں جتنی خوشی ہوئی اتنی پیشتر کبھی نہ ہوئی تھی۔ چونّی ہاتھ میں لیے ہوئے سیارام کے کمرے کے سامنے جاکر پکارا۔ کوئی جواب نہ ملا۔ تب کمرہ میں جاکر دیکھا۔ سیارام کا کہیں پتہ نہ تھا۔ کیا ابھی اسکول سے نہیں لوٹا؟ دل میں یہ سوال پیدا ہوتے ہی منشی جی نے اندر جاکر بھنگی سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ اسکول سے آچکا ہے۔

منشی جی نے پوچھا۔ "کچھ پانی پیا ہے؟"

بھنگی نے کچھ جواب نہ دیا۔ ناک سکیڑ کر منہ پھیرے ہوئے چلی گئی۔

منشی جی آہستہ آہستہ آکر اپنے کمرہ میں بیٹھ گئے۔ آج پہلی بار انھیں نرملا پر غصہ آیا۔ لیکن ایک ہی لمحہ میں غصہ کا حملہ اپنے ہی اوپر ہونے لگا۔ اس اندھیرے کمرے میں فرش پر لیٹے ہوئے وہ اپنے لڑکے کی طرف سے اتنا بے پرواہ ہوجانے پر خود کو لعنت ملامت کرنے لگے۔ دن بھر کے تھکے تھے۔ ذرا ہی دیر بعد انھیں نیند آگئی۔

بھنگی نے آکر پکارا۔ "بابو جی۔ رسوئی تیار ہے۔"

منشی جی چونک کر اُٹھ بیٹھے۔ کمرہ میں لیمپ جل رہا تھا۔ پوچھا۔ "کتنے بج گئے بھنگی، مجھے تو نیند آگئی تھی۔"

بھنگی نے کہا۔ "کوتوالی کے گھنٹے میں تو نو بج گئے ہیں۔"

منشی جی۔ سیا بابو آئے؟

بھنگی۔ آئے ہوں گے تو گھر ہی میں نہ ہوں گے؟

منشی جی نے جھنجلا کر پوچھا۔"میں پوچھتا ہوں، آئے کہ نہیں اور تو نہ جانے کیا کیا جواب دیتی ہے۔ آئے کہ نہیں؟"

بھنگی۔ میں نے تو نہیں دیکھا۔ جھوٹ کیسے کہہ دوں؟

منشی جی پھر لوٹ گئے اور بولے۔ "ان کو آجانے دے تب چلوں گا۔"

نصف گھنٹہ تک دروازہ کی طرف آنکھیں لگائے ہوئے منشی جی دیکھتے رہے۔تب وہ اُٹھ کر باہر آئے۔ اور داہنے ہاتھ کو کوئی دو تین فرلانگ تک چلے، تب لوٹ کر دروازے پر آئے اور پوچھا۔ "سیا بابو آگئے؟"

اندر سے جواب ملا۔ "ابھی نہیں۔"

منشی جی پھر بائیں طرف چلے اور گلی کے موڑ تک گئے۔ سیارام کہیں نہ دِکھائی دیا۔ وہاں سے پھر گھر لوٹے۔ اور دروازہ پر کھڑے ہوکر پوچھا۔ "سیا بابو آگئے؟" جواب ملا "نہیں۔"

منشی جی پھر اپنے کمرہ میں چلے گئے اور ایک لمبی سانس لی۔ ساتھ ہی درد سے بھرے ہوئے یہ الفاظ ان کے منہ سے نکل پڑے۔ "ایشور! کیا ابھی سزا پوری نہیں ہوئی؟ کیا اس اندھے کی لکڑی کو بھی ہاتھ سے چھین لوگے؟"

نرملا نے آکر کہا۔ "آج سیارام ابھی تک نہیں آئے۔ کہتی رہی کہ کھانا بنا دیتی ہوں کھالو۔ مگر نہ جانے کب اُٹھ کر چل دیے۔ نہ جانے کہاں گھوم رہے ہیں۔ بات تو سنتے نہیں۔ اب کب تک ان کی راہ دیکھا کروں؟ آپ چل کر کھانا کھا لیجیے۔ ان کے لیے کھانا اُٹھا کر رکھ دوں گی۔

منشی جی نے نرملا کی طرف تیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "ابھی کتے بجے ہوں گے؟"

نرملا۔ کیا جانے، شاید دس بجے ہوں گے۔

منشی جی۔ جی نہیں، بارہ بجے ہیں۔

نرملا۔ بارہ! بارہ بج گئے۔ اتنی دیر تو کبھی نہ کرتے تھے۔ تو اب کب تک ان کی راہ دیکھو گے؟ دوپہر کو بھی تو کچھ نہیں کھایا۔ ایسا سیلانی لڑکا میں نے کہیں نہیں دیکھا۔

منشی جی۔ جی، تمھیں بہت دق کرتا ہے۔ کیوں؟

نرملا۔ دیکھیے نہ، کہ اتنی رات آگئی اور گھر کی سدھ ہی نہ رہی۔

منشی جی۔ شاید یہ آخری شرارت ہو۔

نرملا۔ کیسی باتیں منہ سے نکالتے ہیں۔ جائیں گے کہاں؟ کسی یار دوست کے گھر پڑ رہے ہوں گے۔

منشی جی۔ شاید ایسا ہی ہو۔ ایشور کرے ایسا ہی ہو۔

کوتوالی کے گھنٹے میں دس بجنے لگے۔ منشی جی بڑی تیزی سے کمپنی باغ کی طرف چلے سوچنے لگے کہ شاید وہاں گھومنے گیا ہو۔ اور گھاس پر لیٹے لیٹے نیند آگئی ہو۔ باغ میں پہنچ کر انھوں نے ہر بنچ کو دیکھا، چاروں طرف گھومے۔ بہت سے آدمی گھاس پر پڑے ہوئے

تھے۔ مگر سیارام کا کہیں پتہ نہ تھا۔ انھوں نے سیارام کا نام لے کر زور سے پکارا مگر کہیں سے آواز نہ آئی۔

پھر خیال آیا کہ شاید اسکول میں کوئی تماشا ہو رہا ہو۔ اسکول ایک میل سے کچھ زیادہ فاصلہ پر تھا۔ وہ اسکول کی طرف چلے۔ مگر نصف ہی راستے سے لوٹ پڑے۔ بازار بند ہوگیا تھا۔ اسکول میں اتنی رات تک تماشا نہیں ہوسکتا۔ اب کے انھیں امید ہو رہی تھی کہ سیارام لوٹ آیا ہوگا۔ دروازہ پر آکر انھوں نے پکارا۔ بھنگی کواڑ کھول کر بولی۔ "ابھی تو نہیں آئے۔"

منشی جی نے آہستہ سے بھنگی کو اپنے پاس بلایا۔ اور درد بھری آواز میں بولے۔ "تُو تو گھر کی سب باتیں جانتی ہے۔ بتا آج کیا ہوا تھا؟"

بھنگی۔ بابو جی جھوٹ نہ بولوں گی۔ مالکن چھڑا دیں گی اور کیا۔ دوسرے کا لڑکا اس طرح نہیں رکھا جاتا۔ جہاں کوئی کام ہوا کہ بس بازار بھیج دیا۔ دن بھر بازار دوڑتے بیتا تھا۔ آج لکڑی لانے نہ گئے۔ تو چولھا ہی نہ جلا۔ کہو تو منہ پھلائیں۔ جب آپ ہی نہیں دیکھتے تو دوسرا کون دیکھے گا؟ چلیے کھانا کھا لیجیے۔ بہو جی کب سے بیٹھی ہیں۔

منشی جی۔ کہہ دے اس وقت نہ کھائیں گے۔ (اتنے میں نرملا آگئی)

نرملا۔ سویرے آئیں تو ذرا تنبیہہ کر دیجیے گا۔

منشی جی۔ خوب اچھی طرح کروں گا۔

نرملا۔ چلیے کھانا کھا لیجیے۔ بہت دیر ہوگئی ہے۔

منشی جی۔ سویرے اس کی تنبیہہ کرکے کھاؤں گا۔ کہیں نہ آیا تو تمھیں ایسا ایماندار نوکر کہاں ملے گا؟

نرملا نے اینٹھ کر کہا۔ "تو کیا میں نے بھگا دیا؟"

منشی جی۔ نہیں، یہ کون کہتا ہے؟ تم اسے کیوں بھگانے لگیں؟ تمھارا تو کام کرتا تھا۔ شامت آگئی ہوگی۔

نرملا نے اور کچھ نہیں کہا۔ بات بڑھ جانے کا خوف تھا۔ اندر چلی گئی۔ سونے کو بھی نہیں کہا۔ ذرا دیر میں بھنگی نے اندر سے کواڑ بند کر لیے۔

کیا منشی جی کو نیند آسکتی تھی؟ تین لڑکوں میں صرف ایک بچ رہا تھا۔ وہ بھی ہاتھ

سے نکل گیا۔ تو زندگی میں تاریکی کے سوا اور کیا ہے؟ کوئی نام لیوا بھی نہ رہ جائے گا۔ ہائے کیسے کیسے جواہر ہاتھ سے نکل گئے۔ منشی جی کی آنکھوں سے اگر اس وقت آنسوؤں کا تار بندھا ہوا تھا تو اس میں کیا تعجب ہوسکتا ہے؟ اس بڑی پشیمانی، اس گھنی تاریکی میں امید کی ایک ہلکی سی جھلک انھیں سنبھالے ہوئے تھی۔ جس وقت یہ جھلک غائب ہوجائے گی۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ان پر کیا بیتے گی؟ ان کی اس پریشانی کا اندازہ کون کرسکتا ہے؟

کئی بار منشی جی کی آنکھیں جھپکیں، مگر ہر بار سیارام کی آہٹ کے دھوکے میں چونک پڑے۔ صبح ہوتے ہی منشی جی پھر سیارام کو ڈھونڈنے نکلے۔ کسی سے پوچھتے ہوئے شرم آتی تھی۔ کس منہ سے پوچھیں؟ انھیں کسی سے ہمدردی کی امید نہ تھی۔ ظاہرا نہ کہہ کر بھی دل میں سب یہی کہیں گے کہ جیسا کیا ویسا بھوگو۔ تمام دن وہ اسکول کے میدانوں، بازاروں، اور باغیچوں کا چکر لگاتے رہے۔ دو دن فاقہ سے رہنے پر بھی ان میں یہ سکت کہاں سے آئی یہ وہی جانیں۔

رات کے بارہ بجے منشی جی گھر لوٹے۔ دروازے پر لالٹین جل رہی تھی۔ نرملا دروازہ پر کھڑی تھی۔ دیکھتے ہی بولی۔ ”کہا بھی نہیں۔ نہ جانے کب چل دیے۔ کچھ پتہ چلا؟

منشی جی نے جلتی ہوئی آنکھوں سے تاکتے ہوئے کہا۔ ”ہٹ جاؤ سامنے سے۔ ورنہ بُرا ہوگا۔ میں آپے میں نہیں ہوں۔ یہ تمھاری کرتوت ہے۔ تمھاری ہی سبب آج میری یہ حالت ہو رہی ہے۔ آج سے چھ سال قبل کیا اس گھر کی یہی حالت تھی؟ تم نے میرا بنا ہوا گھر بگاڑ دیا۔ تم نے میرے لہلہاتے ہوئے باغ کو اُجاڑ ڈالا۔ صرف ایک ٹھونٹھ رہ گیا ہے اس کا نشان بھی مٹا کر ہی تمھیں صبر ہوگا۔ میں اپنی تباہی کے لیے تمھیں اپنے گھر نہیں لایا تھا۔ آسائش کی زندگی کو اور بھی آسائش والی بنانا چاہتا تھا۔ یہ اسی کا خمیازہ ہے۔ جو لڑکے پان کی طرح پھیرے جاتے تھے انھیں میرے جیتے جی تم نے غلام سمجھ لیا۔ اور میں آنکھوں سے سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی اندھا بنا بیٹھا رہا۔ جاؤ میرے لیے تھوڑا سا سنکھیا بھیج دو۔ بس یہی کسر رہ گئی ہے وہ بھی پوری ہوجائے۔

نرملا نے روتے ہوئے کہا۔ ”میں تو اَبھاگن ہی ہوں۔ کیا جب آپ کہیں گے، تب جانوں گی۔ نہ جانے ایشور نے مجھے جنم کیوں دیا تھا۔ مگر یہ آپ نے کیسے سمجھ لیا کہ سیارام اب آئیں گے ہیں نہیں؟“

منشی جی نے اپنے کمرہ کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ ”جاؤ مت۔ جاکر خوشیاں مناؤ۔ تمھاری دلی خواہش پوری ہو رہی ہوگی۔“

(۲۴)

نرملا ساری رات روتی رہی۔ اتنا بڑا کلنک! اس نے جیارام کو گہنے لے جاتے ہوئے دیکھنے پر بھی منہ کھولنے کی جرأت نہ کی تھی۔ کیوں؟ اسی لیے تو یہ سمجھیں گے کہ وہ جھوٹا الزام لگا کر لڑکے سے دشمنی کر رہی ہے۔ آج اس کے خاموش رہنے پر قصوروار ٹھہرایا جارہا ہے۔ اگر وہ جیارام کو اسی وقت روک دیتی اور جیارام شرم سے کہیں بھاگ جاتا تو کیا اس کے سر پر الزام نہ رکھا جاتا؟

سیارام ہی کے ساتھ اس نے کون سی بدسلوکی کی تھی؟ وہ کچھ بچت کرنے کے ہی خیال سے تو سیارام کی معرفت سودا منگوایا کرتی تھی۔ کیا بچت کرکے اپنے لیے زیور بنوانا چاہتی تھی؟ جب آمدنی کا یہ حال ہو رہا تھا تو پیسے پیسے پر نگاہ رکھنے کے سوا کچھ جمع کرنے کا اس کے پاس اور ذریعہ ہی کیا تھا۔ جوانوں کی زندگی کا تو کوئی بھروسہ نہیں، پھر بوڑھوں کا کیا ٹھکانا؟ بچّی کے بیاہ کے لیے وہ کس کے آگے ہاتھ پھیلاتی؟ بچّی کا بار کچھ اس پر تو نہیں تھا؟ وہ صرف شوہر کی آسانی کے لیے کچھ جمع کرنے کی کوشش کررہی تھی۔ شوہر کی کیوں؟ سیارام ہی تو باپ کے گھر کا مالک ہوتا۔ بہن کے بیاہ کا بار اس کے سر پر نہ پڑتا۔ نرملا ساری کاٹ چھانٹ شوہر اور لڑکے کی تکالیف رفع کرنے کے خیال سے کر رہی تھی۔ موجودہ حالات میں بچّی کا بیاہ بجز تکلیف دہی کے اور کیا ہوسکتا تھا؟ مگر اس کے لیے بھی اس کے نصیب میں بدنامی بدی تھی۔

دوپہر ہوگئی تھی، مگر آج بھی چولھا نہیں جلا۔ کھانا بھی زندگی کا کام ہے اس کا کسی کو ہوش نہ تھا۔ منشی جی باہر بے جان سے پڑے تھے اور نرملا اندر۔ بچّی کبھی باہر جاتی کبھی اندر۔ کوئی اس سے بولنے والا نہ تھا۔ بار بار سیارام کے کمرہ کے دروازے پر جاکر کھڑی ہوتی اور ”بیا بیا“ پکارتی۔ مگر ”بیا“ کوئی جواب نہ دیتا تھا۔

شام کو منشی جی آکر نرملا سے بولے۔ ”تمھارے پاس کچھ روپے ہیں؟“

نرملا نے چونک کر پوچھا۔ ”کیا کیجیے گا؟“

منشی جی۔ میں جو پوچھتا ہوں اس کا جواب دو۔

نرملا۔ کیا آپ کو نہیں معلوم ہے؟ دینے والے تو آپ ہی ہیں۔
منشی جی۔ تمھارے پاس کچھ روپے ہیں یا نہیں؟ اگر ہوں تو مجھے دے دو، ورنہ صاف جواب دو۔

نرملا نے اب بھی صاف ۔۔۔ نہ دیا۔ بولی۔ "ہوں گے تو گھر ہی میں نہ ہوں گے۔ میں نے کہیں اور تو نہیں بھیج دیے۔"

منشی جی باہر چلے گئے۔ وہ جانتے تھے کہ نرملا کے پاس روپے ہیں۔ واقعی تھے بھی۔ نرملا نے یہ بھی نہیں کہا کہ نہیں ہیں یا میں نہ دوں گی۔ مگر اس کی گفتگو سے ظاہر ہوگیا کہ وہ دینا نہیں چاہتی۔ نو بجے رات کو منشی جی نے آکر رکمنی سے کہا۔ "بہن! میں ذرا باہر جارہا ہوں۔ میرا بستر بھنگی سے بندھوا دینا اور ٹرنک میں کچھ کپڑے رکھواکر بند کردینا۔"

رکمنی کھانا پکا رہی تھی بولی۔ "بہو تو کمرہ میں ہیں، کہہ کیوں نہیں دیتے؟ کہاں جانے کا ارادہ ہے؟"

منشی جی۔ میں تم سے کہتا ہوں۔ بہو سے کہنا ہوتا تو تم سے کیوں کہتا؟ آج تم کیوں کھانا پکا رہی ہو؟

رکمنی۔ کون پکائے؟ بہو کے سر میں درد ہورہا ہے۔ آخر اس وقت کہاں جارہے ہو۔ سویرے چلے جانا۔

منشی جی۔ اس طرح ٹالتے ٹالتے تو آج تین روز ہوگئے۔ اِدھر اُدھر گھوم گھام کر دیکھوں، شاید کہیں سیارام کا پتہ چل جائے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ایک سادھو کے ساتھ باتیں کررہا تھا۔ شاید وہی کہیں بہکا کر لے گیا ہو۔

رکمنی۔ تو لوٹوگے کب تک؟

منشی جی۔ کچھ کہہ نہیں سکتا۔ ہفتہ بھر لگ جائے مہینہ لگ جائے۔ کون سا ٹھکانا ہے؟

رکمنی۔ آج کون سا دن ہے؟ کسی پنڈت سے پوچھ لیا ہے۔ جاترا ہے کہ نہیں؟"

منشی جی کھانا کھانے بیٹھے۔ نرملا کو اس وقت ان پر بڑا ترس آیا۔ اس کا سارا غصہ فرو ہوگیا۔ خود تو نہ بولی مگر بچّی کو جگا کر چمکارتی ہوئی بولی۔ "دیکھ تیرے بابو جی کہاں جا رہے ہیں؟ پوچھ تو!"

بچّی نے دروازہ سے جھانک کر پوچھا۔ "بابو دی، تہاں داتے ہو؟"

منشی جی۔ بڑی دور جاتا ہوں بیٹی، تمھارے بھیا کو کھوجنے جاتا ہوں۔"

بچّی نے وہیں سے کھڑے کھڑے کہا۔ "ام بی تلیں گے۔"

منشی جی۔ بڑی دور جاتے ہیں بچّی! تمھارے لیے چیزیں لائیں گے۔ یہاں کیوں نہیں آتی؟

بچّی مسکراکر چھپ گئی اور ایک لمحہ بعد پھر کواڑ سے سر نکال کر بولی۔ "ام بی تلیں گے۔"

منشی جی نے اسی لہجہ میں کہا۔ "تم کو نہیں لے تلیں گے۔"

بچّی۔ ام کو کیوں نہیں لے تلو گے؟

منشی جی۔ تم تو ہمارے پاس آتی نہیں ہو۔

بچّی۔ ٹھمکتی ہوئی آکر باپ کی گود میں بیٹھ گئی۔ ذرا دیر کے لیے منشی جی اس کی طفلانہ حرکتوں میں اپنا دکھ بھول گئے۔

کھانا کھاکر منشی جی باہر چلے گئے۔ نرملا کھڑی تاکتی رہی۔ کہنا چاہتی تھی کہ بے فائدہ جارہے ہو۔ مگر کہہ نہ سکتی تھی۔ کچھ روپے نکال کر دینے کا ارادہ کرتی تھی مگر دے نہ سکتی تھی۔

آخر رہا نہ گیا۔ رکمنی سے بولی۔ "دیدی جی ذرا سمجھا دیجیے۔ کہاں جارہے ہیں؟ میری تو زبان پکڑی جائے گی۔ مگر بغیر بولے رہا نہیں جاتا۔ بلا ٹھکانا کہاں کھوجیں گے۔ بے فائدہ حیرانی ہوگی۔

رکمنی نے رقّت بھری نظروں سے دیکھا اور اپنے کمرہ میں چلی گئی۔

نرملا بچّی کو گود میں لیے ہوئے سوچ رہی تھی کہ شاید جانے کے قبل بچّی کو دیکھنے یا مجھ سے ملنے کے لیے آئیں۔ مگر اسے مایوس ہونا پڑا۔ منشی جی نے بستر اُٹھایا اور تانگہ پر جا بیٹھے۔ اسی وقت نرملا کا کلیجہ مسوسنے لگا۔ اسے ایسا معلوم ہوا کہ اب ان سے ملاقات نہ ہوگی۔ وہ بے صبری سے دروازہ پر آئی کہ منشی جی کو روک لے۔ مگر تانگہ روانہ ہوگیا تھا۔

(۲۵)

دن گزرنے لگے۔ پورا ایک مہینہ گزر گیا۔ مگر منشی جی نہ لوٹے۔ کوئی خط بھی نہ بھیجا نرملا کو اب روز یہی تردّد رہتا تھا کہ وہ لوٹ کر نہ آئے تو کیا ہوگا؟ اسے اس کی فکر نہ

ہوتی تھی کہ ان پر کیا بیت رہی ہوگی۔ وہ کہاں مارے مارے پھرتے ہوں گے۔ ان کی صحت کیسی ہوگی؟ اسے صرف اپنی اور اس سے بھی زیادہ بچّی کی فکر تھی۔ گرہستی کیسے چلے گی۔ ایشور کیسے بیڑا پار لگائیں گے؟ بچّی کی کیا حالت ہوگی؟ اس نے کاٹ چھانٹ کر کے جو روپے جمع کیے تھے۔ اس میں ہر روز کچھ نہ کچھ کمی ہوتی جاتی تھی۔ نرملا کو اس میں سے ایک ایک پیسہ نکالنا اس قدر کھلتا تھا گویا کوئی اس کے بدن سے خون نکال رہا ہو۔ جھنجلاکر منشی جی کو کوستی۔ لڑکی کسی چیز کے لیے روتی تو اسے "کمبخت منحوس" وغیرہ کہہ کر ڈانٹ دیتی۔ یہی نہیں۔ رکمنی کا گھر میں رہنا بھی اسے اس قدر ناگوار تھا کہ گویا وہ اس کی گردن پر سوار ہے۔ جب دل جلتا ہے تو الفاظ بھی جلے کٹے نکلتے ہیں۔ نرملا بڑی شیریں زبان عورت تھی۔ مگر اب اس کا شمار بدزبان عورتوں میں کیا جاتا تھا۔ تمام دن اس کے منہ سے سخت باتیں نکلا کرتیں۔ اس کے الفاظ کی نرمی نہ جانے کیا ہوگئی تھی۔ جذبات میں حلاوت کا کہیں نام نہ تھا۔ بھنگی بہت دنوں سے اس گھر میں نوکر تھی۔ مزاج میں بردباری تھی۔ مگر یہ ہر وقت کی بکواس اس سے بھی برداشت نہ ہوسکی۔ ایک روز اس نے بھی گھر کی راہ لی۔ یہاں تک کی جس بچّی کو وہ جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتی تھی، اس کی صورت سے بھی نفرت ہوگئی۔ بات بات پر جھڑک دیتی۔ کبھی کبھی مار بیٹھتی رکمنی روتی ہوئی لڑکی کو گود میں اُٹھا لیتی۔ اور لاڈ پیار کرکے چپ کراتی۔ اس بے کس کے لیے اب یہی ایک سہارا رہ گیا تھا۔

نرملا کو اب اگر کچھ اچھا لگتا تھا تو سدھا سے باتیں کرنا۔ وہ وہاں جانے کا موقعہ تلاش کرتی رہتی تھی۔ بچّی کو اب وہ اپنے ساتھ نہ لے جانا چاہتی تھی۔ پہلے جب بچّی کو اپنے گھر میں سبھی چیزیں کھانے کو ملتی تھیں تو وہ وہاں جاکر ہنستی کھیلتی تھی۔ اب وہاں جاکر اسے بھوک لگتی تھی۔ نرملا اُسے گھور گھور کر دیکھتی۔ مُٹھیاں باندھ کر دھمکاتی۔ مگر لڑکی بھوک کی رٹ لگانا نہ چھوڑتی تھی۔ اس لیے نرملا اب اسے ساتھ نہ لے جاتی تھی۔ سدھا کے پاس جاکر اُسے معلوم ہوتا تھا کہ میں آدمی ہوں۔ اتنی دیر کے لیے اسے تفکرات سے نجات مل جاتی تھی۔ جیسے شرابی کو شراب کے نشہ میں بے فکری ہوجاتی ہے۔ اسی طرح نرملا سدھا کے گھر جاکر مطمئن ہوجاتی۔ اس کے مزاج میں تبدیلی نظر آتی۔ وہی بدزبان عورت یہاں آکر حلاوت اور خوش گفتار کا مجسمہ بن جاتی تھی۔ شباب کی قدرتی تحریکیں وہاں گھر میں

راستہ بند پاکر یہاں متحرک ہوجاتی تھیں۔ وہ یہاں اپنا پورا بناؤ سنگار کر کے آتی۔ اور حتی الامکان اپنے رنج و غم کو اپنے دل ہی میں رکھتی۔ یہاں وہ رونے کے لیے نہیں، ہنسنے کے لیے آتی تھی۔

مگر شاید اس کے نصیب میں یہ سکھ بھی نہیں بدا تھا۔ نرملا معمولاً دوپہر یا تیسرے پہر میں سدھا کے گھر جایا کرتی تھی۔ ایک روز اس کا جی اس قدر گھبرایا کہ سویرے ہی جا پہنچی، سدھا دریا نہانے گئی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب ہسپتال جانے کے لیے کپڑے پہن رہے تھے۔ مہری اپنے کام دھندے میں لگی ہوئی تھی۔ نرملا اپنی سکھی کے کمرے میں جاکر اطمینان سے بیٹھ گئی۔ اس نے سمجھا کہ سدھا کوئی کام کر رہی ہوگی، اور ابھی آتی ہوگی۔ جب بیٹھے بیٹھے دو تین منٹ گزر گئے تو اس نے الماری سے تصاویر کی ایک کتاب نکال لی۔ اور بال کھولے ہوئے پلنگ پر لیٹ کر تصویریں دیکھنے لگی۔ اسی اثناء میں ڈاکٹر صاحب کو ضرورتاً سدھا کے کمرہ میں آنا پڑا۔ شاید عینک تلاش کر رہے تھے۔ بے دھڑک اندر چلے آئے۔ نرملا دروازہ کی طرف بال کھولے لیٹی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کو دیکھتے ہی ایک دم اُٹھ بیٹھی۔ اور سر کو ڈھانکتی ہوئی پلنگ سے اتر کر نیچے کھڑی ہوگئی۔ ڈاکٹر صاحب نے لوٹتے ہوئے چتا کے پاس کھڑے ہوکر کہا۔ "معاف کرنا نرملا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ تم یہاں ہو۔ میری عینک کمرہ میں نہیں مل رہی ہے۔ نہ جانے کہاں اُتار کر رکھ دی تھی۔ میں نے سمجھا کہ شاید یہاں ہو۔"

نرملا نے پلنگ کے سرہانے والے طاق پر نگاہ ڈالی تو عینک کا خانہ دکھائی پڑا۔ اس نے آگے بڑھ کر اُتار لیا۔ اور سر جھکائے، بدن سمیٹے، شرم سے منہ پھیرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ڈاکٹر صاحب نے نرملا کو دو ایک بار پیشتر بھی دیکھا تھا۔ مگر اس وقت کے سے ارادے کبھی دل میں نہ پیدا ہوئے تھے۔ جس آگ کو دو برس سے وہ دل میں دبائے ہوئے تھے آج ہوا کا جھونکا پاکر بھڑک اُٹھی۔ انھوں نے عینک لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو ہاتھ کانپ رہا تھا، عینک لے کر بھی وہ باہر نہ گئے۔ وہیں ساکت سے کھڑے رہے۔ نرملا نے اس تنہائی سے خوف زدہ ہوکر پوچھا۔ "سدھا کہیں گئی ہیں کیا؟"

ڈاکٹر صاحب نے سر جھکائے ہوئے جواب دیا۔ "ہاں۔ ذرا نہانے گئی ہیں۔"

پھر بھی ڈاکٹر صاحب باہر نہ گئے۔ وہیں کھڑے رہے۔ نرملا نے پھر پوچھا۔ "کب

تک آئیں گی؟"

ڈاکٹر صاحب نے سر جھکائے ہوئے کہا۔ "آتی ہی ہوں گی۔"

پھر بھی وہ باہر نہیں گئے۔ ان کے دل میں سخت تلاطم ہو رہا تھا۔ اخلاقی رُکاوٹ نہیں بلکہ کم ہمتی کا کچا تاگا ان کی زبان کو باندھے ہوئے تھا۔

نرملا نے پھر کہا۔ "کہیں گھومنے لگی ہوں گی۔ میں بھی اس وقت جاتی ہوں۔"

کم ہمتی کا کچا تاگا بھی ٹوٹ گیا۔ دریا کی ساحلی بلندیوں پر پہنچ کر بھاگتی ہوئی فوج میں غیر معمولی طاقت آجاتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے سر اُٹھا کر نرملا کو دیکھا اور نہایت محبت آمیز لہجہ میں کہا۔ "نہیں نرملا۔ اب آتی ہی ہوں گی۔ ابھی نہ جاؤ۔ روز سُدھا کی خاطر سے بیٹھتی ہو تو آج میری خاطر سے بیٹھو۔ بتاؤ کب تک اس آگ میں جلا کروں؟ سچ کہتا ہوں نرملا......"

نرملا نے اور کچھ نہ سُنا۔ اُسے ایسا معلوم ہوا گویا ساری زمین چکر کھا رہی ہے۔ گویا اس کی جان پر ہزاروں بجلیاں گر رہی ہیں۔ اس نے جلدی سے الگنی پر لٹکتی ہوئی چادر اُتار لی اور بغیر منہ سے ایک لفظ نکالے کمرہ کے باہر نکل گئی۔ ڈاکٹر صاحب کھِسیانے ہوئے سے رونی صورت بنائے کھڑے رہ گئے۔ اسے روکنے کی یا اور کچھ کہنے کی ہمت نہ پڑی۔

نرملا جوں ہی دروازہ پر پہنچی کہ اس نے سُدھا کو تانگے سے اترتے دیکھا۔ سُدھا اُسے دیکھتے ہی جلدی سے اُتر کر اس کی طرف دوڑی اور کچھ کہنا چاہتی تھی، مگر نرملا نے اس کو موقعہ نہ دیا۔ وہ تیر کی طرح تیزی سے چلی گئی۔ سدھا ایک لمحہ تک متحیّر کھڑی رہی۔ وہ کچھ نہ سمجھ سکی کہ بات کیا ہے۔ وہ گھبرا اُٹھی۔ جلد اندر گئی اور مہری سے پوچھا کہ کیا بات ہوئی۔ اسے معلوم ہوا کہ مہری یا اور کسی نوکر نے اس کو کوئی توہین کی بات کہہ دی ہے۔ وہ مجرم کا پتہ لگائے گی۔ اور اس کو کھڑے کھڑے نکال دے گی۔ دوڑی ہوئی وہ اپنے کمرے میں گئی۔ اندر قدم رکھتے ہی ڈاکٹر صاحب کو سر جھکائے پلنگ پر بیٹھے دیکھا۔ پوچھا۔ "نرملا یہاں آئی تھیں؟"

ڈاکٹر نے سر کھجلاتے ہوئے کہا۔ "ہاں آئی تو تھیں۔"

سُدھا۔ کسی مہری نے انھیں کچھ کہہ تو نہیں دیا؟ مجھ سے بولیں تک نہیں تیزی سے نکل گئیں۔

ڈاکٹر صاحب کا چہرہ اور اداس ہوگیا۔ بولے۔ "یہاں تو انھیں کسی نے بھی کچھ نہیں کہا۔

سُدھا۔ کسی نے کچھ کہا ہے۔ دیکھو میں پوچھتی ہوں۔ ایشور جانتا ہے کہ پتہ پا جاؤں گی تو کھڑے کھڑے نکال دوں گی۔

ڈاکٹر صاحب سٹ پٹا کر بولے۔ "میں نے تو کسی کو کچھ کہتے نہیں سُنا۔ تمھیں انھوں نے دیکھا ہی نہ ہوگا۔

سُدھا۔ واہ دیکھا ہی نہ ہوگا! ان کے سامنے تو میں تانگے سے اُتری۔ انھوں نے میری طرف دیکھا بھی مگر بولیں کچھ نہیں۔ اس کمرہ میں آئی تھیں؟"

ڈاکٹر صاحب کی روح فنا ہوتی تھی ہچکتے ہوئے بولے۔ "آئی کیوں نہیں تھیں۔"

سُدھا۔ تمھیں یہاں بیٹھا دیکھ کر چلی گئی ہوں گی۔ بس کسی مہری نے کچھ کہہ دیا ہوگا۔ نیچ ذات ہیں نہ؟ کسی کو بات کرنے کی تمیز تو ہے نہیں ماری او سندریا۔ ذرا یہاں تو آنا۔

ڈاکٹر۔ اسے کیوں بُلاتی ہو؟ وہ یہاں سے سیدھے دروازے کی طرف گئی۔ مہریوں سے تو بات تک نہیں ہوئی۔

سُدھا۔ تو پھر تمھیں نے کچھ کہا ہوگا۔

ڈاکٹر صاحب کا دل دھڑکنے لگا۔ بولے۔ "میں بھلا کیا کہہ دیتا۔ کیا ایسا گنوار ہوں؟"

سُدھا۔ تم نے انھیں آتے دیکھا تب بھی بیٹھے رہ گئے؟

ڈاکٹر۔ میں یہاں تھا ہی نہیں۔ باہر کمرہ میں اپنی عینک ڈھونڈتا رہا۔ جب وہاں نہ ملی تو میں نے سوچا کہ شاید اندر ہو۔ یہاں آیا تو انھیں بیٹھا دیکھا۔ میں باہر جانا چاہتا تھا کہ انھوں نے خود پوچھا۔ کسی چیز کی ضرورت ہے؟ میں نے کہا۔ ذرا دیکھنا یہاں میری عینک تو نہیں ہے۔ عینک اسی سرہانے والے طاق پر تھی۔ انھوں نے اُٹھا کر دے دی۔ بس اتنی ہی تو بات ہوئی۔

سُدھا۔ بس تمھیں عینک دیتے ہی وہ جھلائی ہوئی باہر چلی گئیں، کیوں؟

ڈاکٹر۔ جھلائی ہوئی تو نہیں چلی گئیں۔ جانے لگیں تو میں نے کہا۔ بیٹھیے۔ وہ آتی ہوں گی۔ نہ بیٹھیں تو میں کیا کرتا؟

سُدھا نے کچھ سوچ کر کہا۔ "بات سمجھ میں نہیں آتی۔ میں ذرا اُن کے پاس جاتی ہوں دیکھوں کیا بات ہے؟"

ڈاکٹر۔ تو چلی جانا۔ ایسی جلدی کیا ہے؟ سارا دن تو پڑا ہے۔

سُدھا تیزی سے قدم بڑھاتی ہوئی نرملا کے گھر کی طرف چلی۔ اور پانچ منٹ میں جا پہنچی۔ دیکھا تو نرملا اپنے کمرہ میں پلنگ پر پڑی ہوئی رو رہی تھی۔ اور بچّی اس کے پاس کھڑی ہوئی پوچھ رہی تھی۔ "اماں! کیوں لوتی ہو"' سدھا نے لڑکی کو گود میں اُٹھا لیا اور نرملا سے بولی۔ "بہن! سچ بتاؤ۔ کیا بات ہے؟ میرے یہاں کسی نے تمھیں کچھ کہا ہے؟ میں سب سے پوچھ چکی۔ کوئی کچھ نہیں بتلاتا۔"

نرملا۔ کسی نے کچھ نہیں کہا بہن! بھلا وہاں مجھے کون کچھ کہتا؟

سُدھا۔ تو پھر مجھ سے بولیں کیوں نہیں؟ اور آتے ہی رونے کیوں لگیں؟

نرملا۔ اپنے نصیبوں کو رو رہی ہوں۔

سُدھا۔ تم یوں نہ بتاؤگی تو میں قسم رکھا دوں گی۔

نرملا۔ قسم نہ رکھانا بھئی۔ مجھے کسی نے کچھ نہیں کہا۔ جھوٹ کیسے کہہ دوں

سُدھا۔ کھاؤ میری قسم!

نرملا۔ تم ناحق ضد کرتی ہو۔

سُدھا۔ اگر تم نے نہ بتلایا نرملا تو میں سمجھوں گی کہ تمھیں مجھ سے ذرا بھی محبت نہیں ہے۔ بس سب زبانی جمع خرچ ہے۔ میں تم سے کسی بات کا پردہ نہیں رکھتی۔ اور تم مجھے غیر سمجھتی ہو مجھے تم پر بڑا بھروسہ تھا۔ اب جان گئی کہ کوئی کسی کا نہیں ہوتا۔

سُدھا آبدیدہ ہوگئی۔ اس نے بچّی کو گود سے اُتار دیا اور دروازہ کی طرف چلی۔ نرملا نے اُٹھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی۔ "سُدھا میں تمھارے پیروں پڑتی ہوں کچھ مت پوچھو۔ تمھیں سُن کر رنج ہوگا۔ اور شاید میں پھر تمھیں اپنا منہ نہ دِکھا سکوں۔ میں ابھاگن نہ ہوتی تو یہ دن ہی کیوں دیکھتی؟ اب تو ایشور سے یہی بنتی ہے کہ وہ اس دنیا سے مجھے اُٹھا لیں۔ ابھی یہ دُرگت ہو رہی ہے تو آگے نہ جانے کیا ہوگا۔"

ان الفاظ میں جو اشارہ تھا وہ سدھا سے مخفی نہ رہ سکا۔ وہ سمجھ گئی کہ ڈ[illegible]ب نے کچھ چھیڑ چھاڑ کی ہے۔ ان کا ہچکتے ہوئے باتیں کرنا اور اس کے سوالوں کا ٹا[illegible]

اُداس اور بدرنگ چہرہ اسے یاد آگیا۔ وہ سر سے پیر تک کانپ اُٹھی اور بلا کچھ کہے سُنے شیرنی کی طرح غصّہ میں بھری ہوئی دروازہ کی طرف چلی۔ نرملا نے اسے روکنا چاہا مگر نہ روک سکی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ سڑک پر ہوتی گھر کی طرف چل دی۔ تب نرملا وہیں زمین پر بیٹھ گئی۔ اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

(۲۶)

نرملا تمام دن پلنگ پر پڑی رہی۔ معلوم ہوتا ہے اس کے بدن میں جان ہی نہیں ہے۔ نہ نہایا اور نہ کھانا کھانے کے لیے اُٹھی۔ شام کو اُسے بخار ہوگیا۔ تمام رات بدن توے کی طرح جلتا رہا۔ دوسرے روز بھی بخار نہ اُترا۔ البتہ کچھ کم ہوگیا تھا۔ وہ پلنگ پر لیٹی ہوئی ٹکٹکی باندھ کر دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ چاروں طرف سونا تھا۔ اندر بھی سونا اور باہر بھی سونا۔ نہ کوئی فکر تھی نہ کچھ یاد تھا۔ نہ کسی کا رنج تھا۔ دماغ میں احساس کی قوت ہی باقی نہ رہی تھی۔

دفعتاً رکمنی بچّی کو گود میں لیے آکر کھڑی ہوگئی۔ نرملا نے پوچھا۔ "کیا یہ بہت روتی تھی؟"

رکمنی۔ نہیں، یہ بولی تک نہیں، رات بھر چپ چاپ پڑی رہی۔ سدھا نے تھوڑا دودھ بھیج دیا تھا وہی پلا دیا تھا۔

نرملا۔ اہیرن دودھ نہ دے گئی تھی۔

رکمنی۔ [illegible] تھی کہ پچھلے پیسے دے دو تو دودھ دوں گی۔ تمھارا جی کیسا ہے؟

نرملا   کچھ نہیں ہوا ہے۔ کل ذرا بدن گرم ہوگیا تھا۔

[illegible] لٹر صاحب کا تو بُرا حال ہوگیا۔

[illegible] ھبرا کر) کیا ہوا؟ سب خیریت ہے نہ؟

[illegible] خیریت ہے کہ لاش اُٹھانے کی تیاری ہو رہی ہے۔ کوئی کہتا ہے زہر کھا لیا۔ کوئی کہتا [illegible] دل کی چال بند ہوگئی۔ بھگوان جانیں کیا ہوا۔

[illegible] نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور رُندھے ہوئے گلے سے بولی۔ "ہائے ایشور! سدھا کی کیا حا[illegible]ت [illegible] گی۔ وہ کیسے جئے گی۔" یہ کہتے ہوئے وہ رو پڑی، اور بڑی دیر تک سسکتی رہی۔ پھر پلنگ سے اُتر کر سدھا کے پاس جانے کو تیار ہوگئی۔ پاؤں تھر تھر کانپ رہے تھے۔

دیوار تھامے کھڑی تھی۔ مگر دل نہ مانتا تھا۔ نہ جانے سُدھا نے یہاں سے جاکر شوہر سے کیا کہا۔ میں نے تو اس سے کچھ کہا بھی نہیں۔ نہ جانے میری باتوں کا وہ کیا مطلب سمجھی۔ ہائے! ایسی شکل و صورت والے، ایسے مہربان شخص کا یہ حال! اگر نرملا کو معلوم ہوتا کہ اس کے غصہ کا یہ عبرتناک نتیجہ ہوگا۔ تو وہ زہر کا گھونٹ پی کر بھی اس بات کو ہنسی میں اُڑا دیتی۔

یہ سوچ کر میری ہی بے دردی کے سبب ڈاکٹر صاحب کا یہ حال ہوا۔ نرملا کا دل پاش پاش ہوگیا۔ ایسی تکلیف ہوئی گویا دل میں شدت کا درد ہو رہا ہے۔ وہ ڈاکٹر صاحب کے گھر چلی۔

لاش اُٹھ چکی تھی۔ باہر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ گھر میں عورتیں جمع تھیں۔ سدھا زمین پر بیٹھی رو رہی تھی۔ نرملا کو دیکھتے ہی وہ زور سے چلّا کر رو پڑی۔ اور آکر اس کے سینہ سے لپٹ گئی۔ دونوں دیر تک روتی رہیں۔

جب عورتیں چلی گئیں۔ تو تنہائی میں نرملا نے پوچھا۔ "یہ کیا ہوگیا بہن؟ کیا تم نے کہہ دیا؟"

سدھا اپنے دل کو آج کتنی ہی بار ایسے سوال کا جواب دے چکی تھی۔ اس کا دل جس جواب سے تشفی پاچکا تھا وہی جواب اس نے نرملا کو دیا۔ بولی۔"چُپ بھی تو نہ رہ سکتی تھی۔ غصہّ کی بات پر غصہّ آتا ہی ہے۔"

نرملا۔ میں نے تو تم سے کوئی ایسی بات بھی نہ کہی تھی۔"

سدھا۔ تم کیسے کہتیں؟ کہہ نہیں سکتی تھیں! مگر جو بات ہوئی تھی وہ خود انھوں نے کہہ دی۔ اس پر میں نے جو کچھ منہ میں آیا کہا۔ جب ایک بات دل میں آگئی تو اسے ہوا ہی سمجھنا چاہیے۔ موقعہ ملے تو وہ ضرور پوری ہو۔ یہ کہہ کر کوئی نہیں نکل سکتا کہ میں نے تو ہنسی کی تھی۔ تنہائی میں ایسا لفظ زبان پر لانا ہی کہہ دیتا ہے کی نیت بُری تھی۔ میں نے تم سے کبھی کہا نہیں بہن! مگر میں نے انھیں کئی بار تمھاری طرف تاکتے دیکھا۔ اس وقت میں نے یہی سمجھا کہ شاید مجھے دھوکا ہو رہا ہے۔ اب معلوم ہوا کہ اس تاک جھانک کا کیا مطلب تھا۔ اگر میں نے دنیا زیادہ دیکھی ہوتی تو تمھیں اپنے گھر نہ آنے دیتی۔ کم از کم تم پر اُن کی نگاہ نہ پڑنے دیتی۔ لیکن یہ کیا

جانتی تھی کہ مردوں کی زبان پر کچھ اُور اور ان کے دل میں کچھ اور ہوتا ہے؟ ایشور کو جو منظور تھا وہ ہوا۔ ویسے سہاگ سے تو میں ودھوا ہونا بُرا نہیں سمجھتی۔ غریب اس امیر سے کہیں زیادہ سکھی ہے۔ جسے اس کی دولت سانپ بن کر کاٹنے دوڑے۔ فاقہ آسان ہے۔ مگر زہریلا کھانا کھا لینا اس سے بدرجہا مشکل!

اسی وقت ڈاکٹر سنہا کے چھوٹے بھائی اور کرشنا نے گھر میں قدم رکھا۔ ان کے آتے ہی گھر میں کہرام مچ گیا۔

(۲۷)

ایک مہینہ اور گزر گیا۔ سُدھا اپنے شوہر کے بھائی کے ساتھ تیسرے ہی روز چلی گئی۔ اب نرملا تنہا تھی۔ پہلے ہنس بول کر دل بہلا لیا کرتی تھی۔ اب صرف رونے سے کام تھا۔ اس کی صحت روز بروز ابتر ہوگئی۔ پُرانے مکان کا کرایہ زیادہ تھا دوسرا مکان کرایہ پر لیا۔ یہ ایک تنگ گلی میں تھا۔ اندر ایک کمرہ تھا اور چھوٹا سا صحن۔ نہ روشنی کا گزر تھا نہ ہوا کا۔ بدبو پھیلی ہوئی تھی۔ کھانے کا یہ حال کہ پیسے ہوتے ہوئے بھی اکثر فاقہ کرنا پڑتا تھا۔ بازار سے لائے کون؟ پھر اب گھر میں کوئی مرد نہیں، کوئی لڑکا نہیں، تو کھانا ہر روز پکانے کی زحمت کون اُٹھائے۔ عورتوں کے لیے روز کھانے کی ضرورت ہی کیا؟ اگر ایک وقت کھا لیا تو دو روز کے لیے فراغت مل گئی۔ بچّی کے لیے تازہ حلوا روٹیاں بن جاتی تھی، ایسی حالت میں صحت کیوں نہ خراب ہوتی تفکر، رنج، تباہی۔ ایک ہو تو کوئی کہے۔ یہاں تو تین تین بلائیں نازل ہوئی تھیں، اس پر نرملا نے دوا کھانے کی قسم کھا لی تھی۔ کرتی ہی کیا؟ تھوڑے سے روپیوں میں دوا کی گنجائش ہی کہاں تھی؟ جہاں کھانے کا ٹھکانا نہ تھا وہاں دوا کا ذکر ہی کیا؟ روز بروز خشک ہوتی جارہی تھی۔

ایک روز رکمنی نے کہا۔ ”بہو! اس طرح کب تک گھلا کروگی؟ جان ہے تو جہان ہے۔ چلو کسی وید کو دِکھا لاؤں۔“

نرملا نے بے پروائی سے کہا۔ ”جسے رونے ہی کے لیے جینا ہو اس کا مرجانا ہی بہتر ہے۔“

رکمنی۔ بُلانے سے تو موت نہیں آتی۔

نرملا۔ موت تو بغیر بُلائے آتی ہے۔ بُلانے پر کیوں نہ آئے گی؟ اس کے آنے میں اب

بہت دن نہ لگیں گے۔ بہن جتنے روز جیتی ہوں اتنے ہی برس سمجھ لیجیے۔

رکمنی۔ دل ایسا چھوٹا مت کرو بہو! ابھی تم نے سنسار کا سکھ ہی کیا دیکھا ہے؟

نرملا۔ اگر سنسار کا یہی سکھ ہے جو اتنے دنوں سے دیکھ رہی ہوں تو اس سے جی بھر گیا۔ سچ کہتی ہوں بہن! اس بچّی کا موہ مجھے باندھے ہوئے ہے ورنہ اب تک کبھی کی چلی گئی ہوتی۔ نہ جانے اس بے چاری کے بھاگ میں کیا لکھا ہے۔

دونوں عورتیں رونے لگیں۔ ادھر جب سے نرملا نے چارپائی پکڑی ہے، رکمنی کے دل پر رحم کا چشمہ اُبل رہا ہے۔ نفرت کا نام بھی نہیں رہا۔ کوئی کام کرتی ہو مگر نرملا کی آواز سنتے ہی دوڑتی ہے۔ گھنٹوں اس کے پاس بیٹھ کر کتھا پوران سُنایا کرتی ہے۔ کوئی ایسی چیز پکانا چاہتی ہے جسے نرملا رغبت سے کھائے۔ نرملا کو کبھی ہنستے دیکھ لیتی ہے تو خوش ہوجاتی ہے اور بچّی کو تو اپنے گلے کا ہار بنائے رہتی ہے۔ اس کی نیند سوتی ہے۔ اسی کی نیند جاگتی ہے۔ وہی بچّی اب اس کی زندگی کا سہارا ہے۔

رکمنی نے ذرا دیر بعد کہا۔ "بہو تم اتنی نراس کیوں ہوتی ہو؟ بھگوان چاہیں گے تو تم دو چار روز میں اچھی ہوجاؤ گی۔ میرے ساتھ آج وید جی کے پاس چلو۔ بڑے بھلے آدمی ہیں۔"

نرملا۔ دیدی جی! اب مجھے کسی وید حکیم کی دوا فائدہ نہ کرے گی۔ آپ میری فکر نہ کریں۔ بچّی کو آپ گود میں چھوڑے جاتی ہوں۔ اگر جیتی جاگتی بچے تو کسی اچھے گھرانے میں بیاہ دینا۔ میں تو اس کے لیے اپنی زندگی میں کچھ نہ کرسکی۔ صرف جنم دینے بھر کے لیے گنہگار ہوں۔ چاہے کنواری رکھیے گا چاہے زہر دے کر مار ڈالیے گا۔ مگر نا اہل کے گلے نہ باندھیے گا۔ اتنی ہی آپ سے میری بنتی ہے۔ میں نے آپ کی کچھ خدمت نہ کی اس کا مجھے بڑا رنج ہورہا ہے۔ مجھ ابھاگن سے کسی کو سکھ نہیں ملا۔ جس پر سایہ بھی پڑگیا، وہ بالکل تباہ ہوگیا۔ اگر سوامی جی کبھی گھر آئیں تو ان سے کہیے گا کہ اس بدنصیب کا قصور معاف کردیں۔

رُکمنی روتی ہوئی بولی۔ "بہو، تمھارا کوئی قصور نہیں، ایشور کی ساکھی دے کر کہتی ہوں کہ تمھاری طرف سے میرے دل میں ذرا بھی میل نہیں ہے۔ ہاں میں نے ہمیشہ تمھارے ساتھ بُرائی کی اس کا مجھے مرتے دم تک رنج رہے گا۔

نرملا نے آزردہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "دیدی جی! کہنے کی بات نہیں، مگر میں نے کبھی دل میں بھی ان کی بے عزتی کا خیال نہیں آنے دیا۔ جو ہونا تھا وہ تو ہوچکا اُدھرم کرکے اپنا پرلوک کیوں بگاڑتی؟ اُس جنم میں نہ جانے کون سے پاپ کیے تھے۔ جن کا یوں بدلہ چکانا پڑا۔ اس جنم میں کانٹے بوتی تو کیا گت ہوتی؟"

نرملا کی سانس بڑی تیزی سے چلنے لگی۔ پھر پلنگ پر لیٹ گئی۔ اور بچّی کی طرف ایسی نگاہ سے دیکھا جو اس کی ساری زندگی کی مصیبت بھری داستان کی مفصل تنقید تھی۔ الفاظ میں اس کے اظہار کی قدرت کہاں؟

تین روز تک نرملا کی آنکھوں سے آنسوؤں کا تار بندھا رہا۔ وہ نہ کسی سے بولتی تھی اور نہ کسی کی طرف دیکھتی تھی۔ نہ کسی کی سنتی تھی۔ بس روئے چلی جاتی تھی۔ اس دلی تکلیف کا کون اندازہ کرسکتا ہے؟

چوتھے روز شام کے وقت یہ دردِدُکھ کی کہانی ختم ہوگئی۔ اسی وقت جب چرند پرند اپنی اپنی جائے قیام کو واپس ہو رہے تھے نرملا کا طائر روح بھی تمام دن شکاریوں کی نشانہ بازیوں، شکاری چڑیوں کے پنجوں اور ہوا کے تیز جھونکوں سے مضروب و مجروح ہوکر اپنے بسیرے کی طرف اُڑ گیا۔

محلّے کے لوگ جمع ہوگئے۔ لاش باہر نکالی گئی۔ کون داہ (جلانے کی رسم) کرے گا۔ یہ سوال اُٹھا۔ لوگ اسی فکر میں تھے کہ ایک بڈھا مسافر ایک بقچہ لٹکائے وہاں جاکر کھڑا ہوگیا۔ یہ منشی طوطا رام تھے!

تمام شد

غبن

(۱)

برسات کے دن ہیں، ساون کا مہینہ آسمان پر سنہری گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ رہ رہ کر رم جھم بارش ہونے لگتی ہے۔ ابھی تیسرا ہی پہر ہے پر ایسا معلوم ہو رہا ہے گویا شام ہوگئی۔ آموں کے باغ میں جھولا پڑا ہوا ہے لڑکیاں بھی جھول رہی ہیں اور ان کی مائیں بھی، دو چار جھول رہی ہیں۔ دو چار جھولنے کے انتظار میں کھڑی ہیں۔ کوئی کجلی گانے لگتی ہے کوئی بارہ ماسہ، یہ موسم دیویوں کے دل میں بچپن کی یاد تازہ کردیتا ہے۔ یہ پھوہاریں گویا فکروں کو دل سے دھو ڈالتی ہیں۔ سبھی کے دل امنگوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ دھانی ساڑھیاں قدرت کی ہریالی سے ہم رنگ ہو رہی ہیں۔

اسی وقت ایک بساطی آکر جھولے کے پاس کھڑا ہو گیا۔ اسے دیکھتے ہی جھولا بند ہوگیا۔ چھوٹی بڑی سبھوں نے آکر اسے گھیر لیا۔ بساطی نے اپنا صندوق کھولا اور چمکتی دمکتی چیزیں نکال کر دکھانے لگا کچے موتی کے گہنے تھے۔ کچے لیس اور گوٹے، رنگین موزے، خوبصورت گڑیاں۔ بچوں کے لٹو اور جھنجھنے، طرح طرح کے بگل اور سیٹیاں، سبھی نے اپنی اپنی پسند کی چیزیں چھانٹنی شروع کیں۔ ایک بڑی بڑی آنکھوں والی لڑکی نے وہ چیز پسند کی جو ان چمکتی ہوئی چیزوں میں سب سے زیادہ خوشنما تھی۔ وہ فیروزہ رنگ کا ایک چندن ہار تھا۔

ماں نے بساطی سے پوچھا۔ یہ ہار کتنے کا ہے؟

بساطی نے ہار کو رومال سے پونچھتے ہوئے کہا۔ خرید تو بیس آنے کی ہے آپ جو

چاہیں دے دیں۔

ماں نے کہا۔ یہ تو بڑا مہنگا ہے۔ چار دن میں اس کی یہ چمک دمک جاتی رہے گی۔

بساطی نے پُر معنی انداز سے سر ہلا کر کہا۔ بہو جی۔ چار دن میں تو بٹیا کو اصلی چندن ہار مل جائے گا۔

ماں کے دل پر ان ہمدردانہ الفاظ نے چوٹ کی۔ ہار خرید لیا گیا۔

اس بھولی بھالی لڑکی کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ شاید ہیروں کے ہار سے بھی اُسے اتنی خوشی نہ ہوتی۔ اُسے پہن کر وہ سارے گاؤں میں ناچتی پھری۔ اس کی ملکیت میں جو چیز سب سے قیمتی اور سب سے عزیز تھی وہ یہی بلّور کا ہار تھا۔

لڑکی کا نام جالپا تھا۔ ماں کا مانکی۔

(۲)

منشی دین دیال الہ آباد کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہتے تھے۔ وہ کسان نہ تھے۔ مگر کھیتی کرتے تھے۔ زمیندار نہ تھے۔ مگر زمینداری کرتے تھے۔ تھانیدار نہ تھے مگر تھانیداری کرتے تھے۔ وہ زمیندار کے مختار تھے۔ گاؤں میں ان کی دھاک تھی۔ ان کے پاس چار چپراسی تھے۔ ایک گھوڑا۔ کئی گائیں اور بھینسیں۔ تنخواہ کل پانچ روپے تھی جو ان کے تمباکو کے خرچ کو بھی کافی نہ ہوتی تھی۔ مگر اس میں کچھ ایسی برکت تھی کہ رئیسانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ جالپا انھیں کی لڑکی تھی۔ پہلے اس کے تین بھائی اور تھے۔ مگر اس وقت وہ اکیلی تھی۔ اس سے کوئی پوچھتا تیرے بھائی کیا ہوئے؟ تو وہ بڑی سادگی سے کہتی۔ بڑی دُور کھیلنے گئے ہیں۔ کہتے ہیں۔ مختار صاحب نے ایک غریب کسان کو اتنا پٹوایا تھا کہ وہ ایک ہفتہ کے اندر مر گیا اور سال کے اندر منشی جی کے تینوں لڑکے جاتے رہے۔ تب بے چارے بہت سنبھل کر چلتے تھے۔ اب یہی لڑکی ماں باپ کی زندگی کا سہارا تھی۔

منشی جی جب کبھی باہر جاتے تو جالپا کے لیے کوئی نہ کوئی زیور ضرور لاتے۔ ان کے پختہ کار ذہن میں یہ خیال بھی نہ آتا تھا کہ جالپا کسی اور چیز سے اس سے زیادہ خوش ہو سکتی ہے۔ گڑیاں اور کھلونے ان کی نظروں میں بیکار تھے۔ اس لیے جالپا زیوروں ہی سے کھیلتی تھی۔ یہی اس کے کھلونے تھے۔ وہ بلّور کا ہار جو اس نے بساطی سے لیا تھا اب اس کا سب سے پیارا کھلونا تھا۔ اصلی ہار کی تمنا اس کے دل میں طلوع نہ ہوئی تھی۔ گاؤں میں کوئی

تقریب ہوتی یا کوئی تیوہار آتا تو وہ وہی ہار پہنتی۔ کوئی دوسرا گہنا اس کی آنکھوں میں جچتا ہی نہ تھا۔

ایک دن منشی جی لوٹے تو مانکی کے لیے ایک چندن ہار لائے۔ مانکی کو یہ ارمان بہت دنوں سے تھا۔ جالپا کو اپنا ہار ہیچ معلوم ہونے لگا۔ باپ سے بولی۔ مجھے بھی ایسا ہی ہار لا دیجیے۔

منشی جی نے مسکرا کر کہا۔ لادوں گا بیٹی!

"کب لا دیجیے گا؟"

"بہت جلد"

"باپ کی باتوں سے جالپا کا من نہ بھرا۔ اس نے ماں سے جاکر کہا۔ "مجھے بھی ایسا ہی ہار بنوا دو۔"

"اس میں تو بہت روپے لگیں گے۔"

"تم نے اپنے لیے بنوایا ہے تو میرے لیے کیوں نہیں بنواتیں؟"

"تیرے لیے سسرال سے آئے گا۔"

جالپا شرما کر بھاگ گئی۔ پر یہ الفاظ اس کے دل میں پتھر کی لکیر ہوگئے سسرال اب اس کے لیے اتنی خوفناک چیز نہ تھی۔ سسرال سے چندن ہار آئے گا۔ شاید وہ لوگ اُسے ماں باپ سے زیادہ پیار کریں گے۔

اس طرح ہنستے کھیلتے سات سال گزر گئے۔

(۳)

منشی دین دیال کے شناساؤں میں ایک بابو دیاناتھ تھا۔ بہت ہی وضع دار اور خلیق کچہری میں پچاس روپے کے نوکر تھے۔ دین دیال عدالت کے کیڑے تھے۔ آئے دن دیا ناتھ سے سابقہ پڑتا رہتا۔ چاہتے تو دین دیال سے ہزاروں وصول کرتے پر کبھی ایک پیسے کے بھی روادار نہ ہوئے تھے اور ان کا یہ برتاؤ کچھ دین دیال ہی کے ساتھ نہ تھا۔ یہ ان کی عادت تھی۔ یہ بات بھی نہ تھی کہ بڑے پرہیزگار ہوں۔ مگر رشوت کو حرام سمجھتے تھے۔ شاید اس لیے کہ وہ اپنی آنکھوں اس کے نتائج دیکھ چکے تھے۔ کسی کو جیل جاتے دیکھا تھا۔ کسی کو اولاد سے ہاتھ دھوتے دیکھا تھا۔ کسی کو مکروہات میں پھنستے۔ ایسی اُنھیں کوئی مثال نہ

ملتی تھی۔ جس نے رشوت لے کر چین کیا ہو۔ ان کے دل میں یہ خیال راسخ ہو گیا تھا کہ حرام کی کمائی حرام میں جاتی ہے۔

اس زمانے میں پچاس روپے کی بھگت ہی کیا؟ پانچ آدمیوں کو پرورش بڑی مشکل سے ہوتی تھی۔ لڑکے اچھے اچھے کپڑوں کو ترستے۔ بیوی گہنوں کو ترستی۔ مگر دیا ناتھ نیت کو برگشتہ نہ ہونے دیتے۔ بڑا لڑکا دو مہینے کالج میں رہنے کے بعد پڑھنا چھوڑ بیٹھا۔ بابو صاحب نے صاف کہہ دیا۔ میں تمھاری ڈگری کے لیے سارے گھر کو بھوکا اور ننگا نہیں رکھ سکتا۔ پڑھنا چاہتے ہو تو اپنی قوت بازو سے پڑھو لیکن دیا ناتھ میں اتنا استقلال نہ تھا۔ ادھر دو سال سے وہ بالکل بیکار تھا۔ شطرنج کھیلتا۔ سیر سپاٹے کرتا۔ ماں باپ اور چھوٹے بھائیوں پر رعب جماتا۔ دوستوں کی بدولت امارت کے شوق پورے ہوتے رہتے تھے۔ کسی کا چسٹر مانگ لیا اور شام کو ہوا کھانے نکل گئے۔ کسی کا پمپ شو پہن لیا۔ کسی کی گھڑی کلائی پر باندھ لی۔ کبھی بنارسی فیشن میں نکلے۔ کبھی لکھنوی فیشن میں۔ دس دوستوں نے ایک ایک سوٹ بنوا لیا۔ تو دس سوٹ بدلنے کے سامان ہوگئے۔ باہمی امداد کا یہ نیا استعمال تھا۔ اسی نوجوان کو منشی دین دیال نے جالپا کے لیے انتخاب کیا۔ دیا ناتھ لڑکے کی شادی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ان کے پاس روپے نہ تھے اور نہ نئے خاندان کے بوجھ اُٹھانے کی ہمت۔ مگر باگیشری کی تریاہٹ کے سامنے ان کی ایک بھی پیش نہ گئی۔ باگیشری برسوں سے بہو کے لیے تڑپ رہی تھی جو اس کے سامنے بہویں بن کر آئیں وہ آج پوتے کھلا رہی ہیں۔ پھر اس غریب کو کیسے صبر ہوتا۔ وہ کچھ کچھ مایوس ہو چلی تھی۔ ایشور سے مناتی تھی کہ کہیں سے پیغام آئے۔ دین دیال نے پیغام بھیجا تو اس کو آنکھیں سی مل گئیں اگر کہیں یہ شکار ہاتھ سے نکل گیا تو پھر نہ جانے اور کتنے دن راہ دیکھنی پڑے گی۔ کوئی یہاں کیوں آنے لگا؟ گھر میں نہ دولت ہے نہ اثاثہ۔ اس لیے اس نے اس موقع پر سارا زور لگا دیا۔ اور بالآخر اس کی فتح ہوئی۔

دیا ناتھ نے کہا۔ بھئی تم جانو۔ تمھارا کام جانے۔ مجھ میں اتنی مقدرت نہیں ہے۔ جو آدمی اپنے پیٹ کی فکر نہیں کر سکتا۔ اس کی شادی کرنا مجھے تو گناہ معلوم ہوتا ہے۔ علاوہ بریں نقد روپے بھی تو چاہئیں۔ ایک ہزار سے کم تو نمائش میں نہ صرف ہوں گے۔ جوڑے اور زیورات کے لیے الگ، (کانوں پر ہاتھ رکھ کر) نا بابا۔ یہ بوجھ میرے بوتے کا نہیں!

باگیشری پر ان دلیلوں کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ بولی۔ وہ بھی تو کچھ دے گا۔

"تو کیا میں اس سے مانگنے جاؤں گا؟"

"تمھارے مانگنے کی ضرورت ہی نہ پڑے گی۔ لڑکی کی شادی میں کوئی پیسے کا منہ نہیں دیکھتا پھر دین دیال کے یہی ایک لڑکی ہے بچا کر رکھیں گے تو بھی کس لیے؟"

دیا ناتھ کو اب کوئی بات نہ سُوجھی۔ صرف اتنا بولے۔ "چاہے لاکھ دے دیں اور چاہے ایک نہ دیں۔ میں نہ کہوں گا کہ دو۔ نہ کہوں گا کہ مت دو۔ قرض میں لینا چاہتا ہوں اور لوں تو دوں کِس کے گھر سے۔"

باگیشری نے اس مشکل کو یوں آسان کیا۔ "مجھے تو یقین ہے کہ وہ ٹیکے میں ایک ہزار سے کم نہ دیں گے۔ نمائش کے لیے اتنا بہت ہے۔ گہنوں کا انتظام کسی صرّاف سے کرلینا۔ دروازے پر بھی تو کچھ ملے گا ہی۔ وہ صرّاف کو دے دینا۔ دو چار سو رہ جائیں گے۔ تھوڑا تھوڑا کر کے وہ بھی چکا دینا۔ پھر بچے کے لیے بھی تو کوئی نہ کوئی دروازہ کھلے گا۔"

دیا ناتھ نے بے رُخی سے کہا۔ "کھل چکا۔ جسے شطرنج اور سَیر سپاٹے سے فرصت نہ ملے اس کے لیے سبھی دروازے بند رہیں گے۔"

باگیشری کو اپنی شادی کے حالات یاد آئے۔ اس وقت دیا ناتھ بھی تو گُل چھرّے اُڑاتے تھے۔ لیکن اس کے گھر میں آتے ہی انھیں چار پیسے کمانے کی فکر کیسی سر پر سوار ہوگئی تھی؟ سال بھر کے اندر ہی پندرہ روپے کی جگہ پا گئے۔ بولی۔ "بہو کو آنے دو۔ یہ سَیر سپاٹے بھول جائیں گے۔ دیکھ لینا۔ اپنی بات یاد کرو۔ جب تک گلے میں جوا نہیں پڑتا۔ سبھی کو کلیلیں سُوجھتی ہیں۔ جوا پڑا اور سارا نشہ ہرن ہوا۔ نکموں کو راہ پر لانے کی اس سے بڑھ کر دوسری ترکیب ہی نہیں۔"

دیا ناتھ اخبار پڑھنے لگے۔ جب وہ ہار جاتے تھے تو اخبار پڑھنے لگتے تھے۔ اپنی شکست کو چھپانے کا ان کے پاس یہی ایک ذریعہ تھا۔

(۴)

منشی دین دیال ان آدمیوں میں سے تھے جو سیدھوں کے ساتھ سیدھے ہوتے ہیں۔ مگر ٹیڑھوں کے ساتھ ٹیڑھے ہی نہیں، شیطان ہوجاتے ہیں۔ دیا ناتھ نے بے پَر کی اُڑائی ہوتی تو دین دیال انھیں ایسا چکمہ دیتے کہ وہ عمر بھر یاد رکھتے۔ دیا ناتھ کی شرافت نے

انھیں فریفتہ کرلیا۔ ان کا ارادہ تھا کہ ایک ہزار میں شادی کی ساری رسمیں پوری کردیں۔ مگر ایک ہزار ٹیکے ہی میں لے آئے۔

دیا ناتھ ایک ہزار کی تھیلی پاکر خوش تو ہوئے مگر اس نے اُن کے سر کا بوجھ ہلکا کرنے کے بدلے اور بھاری کردیا۔ شادی کی تیاریاں بھی اب وسیع پیمانے پر کرنی پڑیں گی۔ اس شادی میں انھوں نے کم سے کم خرچ کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ لیکن دین دیا کی فیاضی نے انھیں بھی فیاض بننے پر مجبور کردیا۔ وہ سارے ٹیم ٹام۔ ناچ تماشے جنھیں وہ لغو سمجھتے تھے اب فرض کی صورت میں ان کے رُوبرو آکھڑے ہوئے۔ بندھا ہوا گھوڑا تھان سے کھل گیا۔ کون روک سکتا ہے۔ پہلے چڑھاوے کو انھوں نے محض رسم سمجھا تھا۔ اب ایسا چڑھاوا لے جانے کی تجویز ہوئی جسے دیکھ کر سب کی آنکھیں کھل جائیں۔ کوئی تین ہزار کا سامان بنوا ڈالا۔ صرّاف کو ایک ہزار نقد مل گیا۔ ایک ہزار کے لیے ایک ہفتے کا وعدہ ہوا۔ تو اس نے کوئی عذر نہ کیا۔ بیوپاری کی لاگت نکل آتی ہے تو نفع کے متعلق اسے زیادہ اندیشہ نہیں ہوتا۔ پھر بھی چندن ہار کی کسر رہ گئی۔ جڑاؤ چندن ہار ایک ہزار سے کم میں اچھا نہیں مل سکتا تھا۔ دیا ناتھ کا جی تو لہرایا کہ لگے ہاتھ اسے بھی لے لو۔ مگر باگیشری اس پر راضی نہ ہوئی۔ بازی پلٹ چکی تھی۔

دیا ناتھ نے گرم ہوکر کہا۔ تمھیں کیا تم گھر میں بیٹھی رہوگی۔ ندامت تو مجھے ہوگی جب اُدھر والے مین میکھ نکالنے لگیں گے۔

"دوگے کہاں سے۔ کچھ سوچا ہے؟"

کم ازکم ایک ہزار تو وہاں مل جائیں گے۔

"خون منہ لگ گیا شاید؟"

دیا ناتھ نے شرما کر کہا۔ "نہیں نہیں۔ مگر آخر وہاں بھی تو کچھ ملے گا۔"

باگیشری بولی۔ وہاں ملے گا تو وہاں خرچ بھی ہوگا۔ نام چڑھاوے سے نہیں ہوتا۔ دان دکشنا سے ہوتا ہے۔

اس طرح چندن ہار کی تجویز فسخ ہوگئی۔

مگر دیا ناتھ نمائش کو کتنا ہی غیر ضروری سمجھیں۔ رما ناتھ اور اس کے احباب اسے مقدم سمجھتے تھے۔ بارات ایسی دھوم دھام سے جانی چاہیے کہ سارے علاقہ میں دھوم مچ

جائے۔ پہلے نوشہ کے لیے پالکی کی تجویز تھی۔ رما ناتھ اور اس کے دوستوں نے موٹر پر زور دیا۔ دیا ناتھ تنہائی پسند آدمی تھے۔ نہ کسی سے دوستی تھی اور نہ ربط ضبط۔ رما ناتھ ملنسار تھا۔ اس کے احباب بھی اس وقت ساری تیاریوں میں پیش پیش تھے۔ وہ جو کام کرتے دل کھول کر۔ آتش بازیاں بنوائیں تو اوّل درجے کی۔ طائفہ کیا تو اوّل درجے کا۔ باجے گاجے بھی اول درجے کے۔ دوم سوم کا وہاں ذکر ہی نہ تھا۔ دیا ناتھ ان کی فضول خرچیاں دیکھ کر فکرمند تو ہوجاتے تھے۔ مگر کرتے کیا؟

(۵)

ناٹک اس وقت پاس ہوتا ہے۔ جب اہلِ ذوق اسے پسند کرلیتے ہیں۔ برات کا ناٹک اس وقت پاس ہوتا ہے۔ جب ہرخاص و عام اسے پسند کرلیتا ہے۔ ناٹک کا امتحان چار پانچ گھنٹے ہوتا رہتا ہے۔ برات کے امتحان کے لیے صرف اتنے منٹوں کا موقعہ ہوتا ہے۔ ساری دوا دوش کاوش و جانفشانی کا فیصلہ پانچ منٹوں میں ہوجاتا ہے۔ اگر ہر ایک کے منہ سے واہ واہ نکل گئی تو تماشہ پاس۔ نہیں تو فیل۔ منشی دیا ناتھ کا تماشہ پاس ہوگیا۔ شہر میں اُسے تیسرا درجہ ملتا۔ گاؤں میں اوّل درجہ مل گیا۔ کوئی باجوں کی دھوں دھوں پوں پوں سُن کر مست ہو رہا تھا۔ تو کوئی موٹروں کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔ لیکن کچھ لوگ پھلواڑیوں کے تختے دیکھ کر لوٹے جاتے تھے۔ اور آتش بازی تو دلچسپی کا خاص مرکز تھی۔ ہوائیاں جب سن سے اُوپر جاتیں اور آسمان میں سرخ سبز۔ زرد۔ نیلے قمقمے سے بکھر جاتے۔ جب چرخیاں چھوٹتیں اور ان میں سے ناچتے ہوئے مور نکل آتے تو لوگوں پر جادو کا اثر ہوتا تھا۔

جالپا کے لیے ان نمائشوں میں ذرا بھی کشش نہ تھی۔ ہاں وہ نوشہ کو ایک نظر دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ سب سے چُھپ کر۔ مگر اس بھیڑ بھاڑ میں یہ موقعہ کہاں؟ دروازہ چار کے وقت اس کی سہیلیاں اسے چھت پر سے نیچے لے گئیں۔ مگر وہاں بھی وہ رما ناتھ کا صرف سہرا دیکھ سکی۔ چہرہ نظر نہ آیا۔

دروازہ چار کے بعد کھانے پینے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ تھوڑے سے آدمیوں نے پوریاں کھائیں۔ زیادہ آدمیوں نے اپلوں پر باٹیاں پکائیں۔ چاروں طرف دھواں ہی دھواں نظر آنے لگا۔ تماشائیوں کی تفریح کے لیے محفل آراستہ ہوئی۔

آدھی رات کو پھر یکایک باجے بجنے لگے۔ معلوم ہوا کہ چڑھاوا آرہا ہے۔ شادی کی ہر ایک رسم ڈنکے کی چوٹ ادا ہوتی ہے۔ نوشہ ناشتہ کرنے آرہا ہے۔ باجے بجنے لگے۔ سمدی ملنے آرہا ہے۔ باجے بجنے لگے۔ خیر، چڑھاوا جوں ہی پہنچا۔ گھر میں ہل چل مچ گئی۔ مرد۔ بوڑھے۔ جوان چھوٹے بڑے سب چڑھاوا دیکھنے کے لیے ٹوٹ پڑے۔ آپس میں دھکم دھکا ہونے لگا۔ مانکی پیاس سے بے حال ہو رہی تھی۔ حلق سوکھا جاتا تھا۔ چڑھاوا آتے ہی اس کی پیاس بھاگ گئی۔ دین دیال ایک کوٹھڑی میں نیم جان سے پڑے تھے۔ یہ خبر سنتے ہی بے تحاشا دوڑے۔ مانکی ایک ایک چیز نکال کر دیکھنے اور دکھانے لگی۔ وہاں سبھی اس فن کے ماہر تھے۔ مردوں نے گہنے بنوائے تھے۔ عورتوں نے پہنے تھے۔ سبھی تبصرے کرنے لگے۔ یہ چوہے دنتی کتنی خوبصورت ہے۔ کوئی دس تولے کی ہوگی۔ یہ شیر دہان تو دیکھو۔ کیا ہاتھ کی صفائی ہے کوئی بارہ تولے کا ہوگا۔ واہ! کبھی دیکھا بھی ہے! سولہ تولے سے کم نکل جائے تو منہ نہ دکھاؤں۔ ہاں مال اتنا چوکھا نہیں ہے۔ یہ کنگن تو دیکھو۔ کچی جڑائی ہے۔ کتنا باریک کام ہے کہ آنکھ نہیں ٹھہرتی۔ کچے نگینے ہیں۔ اصلی چیز تو یہ گلوبند ہے۔ کتنے خوبصورت پھول ہیں اور ان کے بیچ کے ہیرے کیسے چمک رہے ہیں۔ بنگالی سونار نے بنایا ہوگا۔ کیا بنگالیوں نے کاریگری کا ٹھیکہ لے لیا ہے۔ ہمارے یہاں ایک سے ایک کاریگر پڑے ہوئے ہیں۔ بنگالی سونار بے چارے ان کی کیا برابری کریں گے۔

اسی طرح ہر ایک چیز کی تنقید ہوتی رہی۔ دفعتاً کسی نے کہا۔ کیا چندن ہار نہیں ہے؟

مانکی نے رونی صورت بنا کر کہا۔ نہیں۔ چندن ہار تو نہیں آیا۔

ایک بوڑھی عورت نے حیرت کا اظہار کیا۔ ارے چندن ہار نہیں آیا۔

دین دیال نے اپنی خفت کو چھپاتے ہوئے کہا۔ اور سب چیزیں تو ہیں ایک چندن ہار ہی تو نہیں ہے۔

بوڑھی عورت نے منہ بنا کر کہا۔ "چندن ہار کی بات ہی اور ہے۔"

مانکی نے چڑھاؤ کو سامنے سے ہٹا کر کہا۔ بے چاری کی تقدیر میں چندن ہار لکھا ہی نہیں ہے۔

تماشائیوں کے اس حلقے کے پیچھے جالپا اُمید و بیم کی تصویر سی بنی کھڑی تھی اور سب زیوروں کے نام کان میں آتے تھے۔ چندن ہار کا نام نہ آتا تھا۔ اس کا سینہ دھک

دھک کر رہا تھا۔ چندن ہار شاید سب زیوروں کے نیچے ہو۔ ممکن ہے کسی کی نگاہ نہ پڑی ہو۔ یا پیچھے سے کسی اور رسم میں ملے۔ اس طرح وہ دل کو سمجھاتی رہی۔ جب یقین ہوگیا کہ چندن ہار نہیں ہے تو اس کے جگر پر چوٹ سی لگی۔ معلوم ہوا جسم میں ایک قطرہ بھی خون نہیں ہے۔ وہ ایک بے خودی کی حالت میں اپنے کمرہ میں آئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ تمنا جو سات برس پہلے اُس کے دل میں اُگی تھی جو اس وقت پھول اور پتوں سے لدی کھڑی تھی۔ اس پر بجلی گر پڑی۔ اس مایوسی کے عالم میں اُسے ایسا غصہ آرہا تھا کہ چڑھاوے کو اُٹھا کر پھینک دے۔ کمرے میں ایک طاق پر شیو کی مورت رکھی ہوئی تھی۔ اس نے اسے اُٹھا کر اتنے زور سے پٹکا کہ اس کی تمنا ہی کی طرح وہ بھی چور چور ہوگئی۔ اس نے دل میں عہد کیا۔ اب کوئی زیور نہ پہنوں گی۔ زیور پہننے سے ہوتا ہی کیا ہے۔ مفت کی زحمت، جانے کہاں سے کوڑا کرکٹ اُٹھا لائے۔ جس چیز کے روپے ہونے تھے۔ اس کا نام ہی نہ لیا۔

وہ اسی غصہ میں بھری بیٹھی تھی کہ اس تین سہیلیاں آکر کھڑی ہوگئیں۔ جالپا نے انہیں دیکھتے ہی آنکھیں پونچھ ڈالیں اور مسکرانے لگی۔

رادھا بولی۔ بہن تم نے بڑی تپسیا کی تھی۔ ایسا چڑھاوا میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اب تو تیرا کوئی ارمان باقی نہیں رہا۔

جالپا نے لمبی لمبی پلکیں اُٹھاکر اس کی طرف ایسی بے کسانہ نظروں سے دیکھا۔ گویا زندگی میں اب اس کے لیے کوئی امید نہیں ہے۔ ہاں بہن سارے ارمان پورے ہوگئے۔ تینوں سہیلیاں حیرت سے اس کا منہ تاکنے لگیں۔ گویا اس جُملے کا مطلب ان کی سمجھ میں نہ آیا ہو۔

بسنتی نے کہا۔ تمھاری ساس بڑی عقل مند معلوم ہوتی ہے۔ کوئی چیز نہیں چھوڑی۔ ایسا جی چاہتا ہے کہ کاریگر کے ہاتھ چوم لوں۔

رادھا۔ اور تو سب کچھ ہے۔ صرف چندن ہار نہیں ہے۔

شہزادی۔ ایک چندن ہار کے نہ ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ اس کے عوض گلوبند تو ہے۔

جالپا نے طنز سے کہا۔ ”ہاں! آنکھ نہ ہونے سے کیا ہوتا ہے؟ جسم کے اور سب اعضا تو ہوتے ہی ہیں۔ آنکھیں ہوئیں تو کیا، نہ ہوئیں تو کیا۔“

بچوں کے منہ سے دانشمندی کی باتیں سن کر جیسے تمھیں ہنسی آجاتی ہے۔ اسی طرح جالپا کے منہ سے یہ مایوسانہ الفاظ سن کر رادھا اور بسنتی اپنے تیئں نہ روک سکیں۔ ہاں شہزادی کو ہنسی نہ آئی۔ ایسی زیور کی ہوس اس کے نزدیک ہنسنے کی بات نہیں رونے کی بات تھی۔ مصنوعی ہمدردی ظاہر کرتے ہوئے بولی۔ ''سب کے سب نہ جانے کہاں کے دہقان ہیں کہ سب چیزیں تو لائے لیکن چندن ہار نہ لائے جو سب گہنوں کا راجا ہے۔ ابھی نوشہ صاحب آتے ہیں تو پوچھتی ہوں۔ تم نے یہ کہاں کی ریت نکالی ہے۔ کوئی ایسا ظلم بھی کرتا ہے؟

رادھا اور بسنتی سہم رہی تھیں کہ جالپا کہیں تاڑ نہ جائے۔ان کا بس ہوتا تو شہزادی کا منہ بند کردیتیں۔ مگر جالپا کو شہزادی کے تصنع میں خلوص کا رنگ نظر آرہا تھا۔ آبدیدہ ہوکر بولی۔ ان سے پوچھ کر کیا کروگی۔ جو ہونا تھا سو ہوگیا۔

شہزادی۔ تم پوچھنے کو کہتی ہو۔ میں رولا کر چھوڑوں گی۔ میرے چڑھاؤ میں کنگن نہ آئے تھے۔ اس وقت طبیعت ایسی کھٹی ہوئی کہ سارے زیوروں پر لات مار دوں۔ جب تک کنگن نہ بن گئے میں نیند بھر سوئی نہیں۔

رادھا۔ تو کیا تم سمجھتی ہو۔ چندن ہار ملے گا ہی نہیں؟

شہزادی۔ ملے گا جب ملے گا۔ اس موقعہ پر تو نہیں ملا۔ دس پانچ کی چیز تو ہے نہیں کہ جب چاہا بنوا لیا۔ سینکڑوں کا خرچ ہے۔ پھر کاریگر بھی تو ہمیشہ نہیں ملتے۔

جالپا۔ یہی تو میں بھی سوچتی ہوں، جب آج نہ ملا تو پھر کیا ملے گا۔

..ھا اور بسنتی دونوں شہزادی کو دل میں کوس رہی تھیں۔ اور تھپڑ دکھا رہی تھیں۔ مگر ش.. ی کو اس وقت تماشے کا مزا آرہا تھا۔ بولی نہیں یہ بات نہیں ہے۔ بہن! ضد . سے سب کچھ ہوجاتا ہے۔ ساس سسُر کو باربار یاد دلاتی رہنا۔ دولہا صاحب سے بھی دو چا.. ن روٹھ کر بیٹھنے سے کچھ کام نکل سکتا ہے۔ بس یہی سمجھ لو کہ گھر والے چین نہ لینے پا.. انھیں یقین ہوجائے کہ بغیر چندن ہار بنوائے خیریت نہیں۔ تم ذرا بھی نرم پڑیں اور ک.. بگڑا۔

رادھا نے ہنسی کو روکتے ہوئے کہا۔ ان سے نہ بنے تو تمھیں بلا لیں۔ کیوں؟ اب اٹھوگی یا ساری رات سبق ہی دیتی رہوگی۔

شہزادی چلتی ہوں۔ ایسی کیا بھاگڑ پڑی ہے۔ ہاں! خوب یاد آئی۔ کیوں بہن! تیری اماں جی کے پاس تو بڑا اچھا چندن ہار ہے۔ تجھے نہ دیں گی۔

جالپا نے ایک لمبا سانس لے کر کہا۔ مجھے تو ان سے کوئی امید نہیں ہے بہن!

شہزادی۔ ایک بار کہہ کر دیکھ لو۔ اب کون ان کے پہننے اوڑھنے کے دن بیٹھے ہیں۔

جالپا۔ مجھ سے تو کہا نہ جائے گا۔

شہزادی۔ میں کہہ دوں گی۔

جالپا۔ نہیں نہیں۔ تمھارے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ میں ذرا ان کی ممتا کا امتحان لینا چاہتی ہوں۔

بسنتی نے شہزادی کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ معلوم ہوتا ہے تو ساری رات کا بیڑا لے کر آئی ہے۔ چل مجھے پہنچا کر لوٹ آنا۔

شہزادی اُٹھی۔ مگر جالپا نے راستہ روک لیا۔ اور بولی۔ نہیں ابھی بیٹھو بہن! تمھارے پیروں پڑتی ہوں۔

شہزادی۔ جب یہ دونوں چڑیلیں بیٹھنے بھی دیں۔ میں تو تمھیں گر سکھاتی ہوں اور یہ دونوں جھلاتی ہیں۔

بسنتی۔ تو بِش کی گانٹھ ہے۔

شہزادی۔ تم بھی تو سسرال سے سال بھر بعد آئی ہو۔ کون کون سے نئی چیزیں بنوا لائیں؟

بسنتی۔ اور تم نے تین سال میں کیا بنوا لیا۔

شہزادی۔ میری بات چھوڑو۔ میرا خصم تو میری بات ہی نہیں پوچھتا۔

رادھا۔ محبت کے سامنے زیوروں کی کوئی حقیقت نہیں۔

شہزادی۔ تو وہ سوکھی محبت تمھیں مبارک رہے۔

اِتنے میں مانکی نے آن کر کہا۔ تم تینوں یہاں بیٹھی کیا کر رہی ہو۔ چلو وہاں لوگ کھانا کھانے آرہے ہیں۔ تینوں سہیلیاں چلی گئیں۔ جالپا ماں کے گلے میں چندن ہار کی رونق دیکھ کر سوچنے لگی۔ ان زیوروں سے ان کی طبیعت اب تک سیر نہیں ہوئی۔

(۲)

بابو دیا ناتھ جتنے حوصلے سے شادی کرنے گئے تھے۔ اتنے ہی خاطر شکستہ ہوکر لوٹے دین دیال کی فیاضی میں شبہ نہیں۔ لیکن وہاں سے جو کچھ ملا۔ وہ سب وہیں خرچ ہوگیا۔

بار بار اپنی غلطی پر پچھتاتے۔ کیوں نمود نمائش میں اتنے روپے خرچ کردیئے۔ زیادہ سے زیادہ لوگ یہی کہتے کہ یہ حضرت بڑے بخیل ہیں۔ اتنا سُن لینے میں کیا نقصان تھا اور سبھی تقاضے تو پانچ دس دن میں ٹل سکتے تھے۔ مگر صرّاف کسی طرح نہ مانتا تھا۔ اس سے شادی کے ساتویں دن ایک ہزار روپے دینے کا وعدہ تھا۔ ساتویں دی صرّاف آیا۔ مگر یہاں روپے کہاں تھے دیا ناتھ میں للّو چپو کی عادت نہ تھی۔ مگر ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ انھوں نے اسے چکمہ دینے کی خوب کوشش کی۔ چھ مہینے میں باقساط روپیہ ادا کرنے کا وعدہ کیا۔ پھر تین مہینے پر آئے۔ مگر صرّاف بھی ایک گھٹا ہوا تھا۔ اسی وقت ٹلا۔ جب دیا ناتھ نے تیسرے دن باقی رقم کے زیور واپس کردینے کا وعدہ کیا۔ آخر وہ تیسرا دن بھی آگیا اور اب دیا ناتھ کو اپنی لاج رکھنے کی کوئی ترکیب نہ سُوجھتی تھی۔ کوئی چلتا ہوا آدمی شاید اتنا پریشان نہ ہوتا۔ حیلے حوالے کرکے مہاجن کو مہینوں ٹالتا رہتا۔ لیکن دیا ناتھ اس معاملے میں اناڑی تھے۔

باگیشری نے آکر کہا۔ کھانا کب سے پکا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ کھا کیوں نہیں لیتے۔

دیا ناتھ نے اس طرح گردن اُٹھائی۔ گویا سر پر سینکڑوں من کا بوجھ لدا ہوا ہے۔ اور بولے تم جاکر کھالو۔ مجھے بھوک نہیں ہے۔

باگیشری۔ بھوک کیوں نہیں ہے۔ رات بھی تو کچھ نہیں کھایا تھا۔ یوں دانہ پانی چھوڑ دینے سے مہاجن کے روپے تھوڑے ہی ادا ہوجائیں گے۔

دیا ناتھ۔ میں سوچتا ہوں۔ اسے آج کیا جواب دوں گا۔ میں تو یہ شادی کرکے بُرا پھنسا۔ بہو کچھ زیور لوٹا تو دے گی۔

باگیشری۔ بہو کا حال تو سُن چکے۔ پھر بھی اس سے ایسی اُمید رکھتے ہو۔ اس کی ٹیک ہے کہ جب تک چندن ہار نہ بن جائے گا کوئی گہنا نہ پہنوں گی۔ ساری چیزیں صندوق میں بند رکھی ہیں۔ بس ایک وہی بلوریں ہار گلے میں ڈالے ہوئے ہے۔ بہوئیں بہت دیکھی ہیں۔ مگر ایسی بہو نہ دیکھی تھی۔ پھر کتنا بُرا معلوم ہوتا ہے کہ کل کی آئی بہو اس سے گہنے مانگ لیے جائیں۔

دیا ناتھ نے چڑ کر کہا۔ تم تو جلے پر نمک چھڑکتی ہو۔ بُرا معلوم ہوتا ہے تو لاؤ روپے نکال کر دے دو۔ دیتی ہو۔ بُرا مجھے خود معلوم ہوتا ہے۔ مگر تدبیر کیا ہے۔ گلا کیسے

چھوٹے۔

باگیشری۔ بیٹے کا بیاہ کیا ہے یا مذاق ہے۔ شادی بیاہ میں سبھی قرض لیتے ہیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں۔ پارسا بننے کا کچھ سبق ملنا چاہیے یا نہیں۔ تمھارے ہی دوست لالہ ستیہ دیو ہیں۔ پکا مکان کھڑا کر لیا۔ زمینداری خریدی۔ بیٹی کی شادی میں کچھ نہیں تو پانچ ہزار تو خرچ کیے ہوں گے اور تم اپنی پارسائی لیے پھرتے ہو۔

دیا ناتھ۔ جبھی دونوں لڑکے بھی تو چل دیے۔

باگیشری۔ مرنا جینا تو دُنیا کا طریق ہے۔ جو لیتے ہیں وہ بھی مرتے ہیں جو نہیں لیتے وہ بھی مرتے ہیں۔ اگر تم چاہو۔ تو چھ مہینے میں سب روپے چکا سکتے ہو۔

دیا ناتھ نے تیوری چڑھا کر کہا۔ جو بات زندگی بھر نہیں کی۔ وہ اب آخری وقت نہیں کر سکتا۔ بہو سے گھر کا حال صاف صاف کہہ دو۔ اس سے پردہ رکھنے کی ضرورت نہیں۔ اور پردہ رہ ہی کتنے دن سکتا ہے۔ بس تین چار چیزیں لوٹا دے۔ تم اسے ایک بار کہو تو۔

باگیشری۔ جھنجھلا کر بولی۔ اس سے تمھیں کہو۔ مجھ سے نہ کہا جائے گا۔

اسی وقت رما ناتھ ٹینس ریکٹ لیے باہر سے آیا۔ جسم پر سفید ٹینس شرٹ تھا۔ سفید پتلون۔ کیفوس کا جوتا۔ خوش رو آدمی تھا۔ اس لباس نے رئیس زادوں کی شان پیدا کر دی تھی۔ رومال میں بیلے کے گجرے لیے ہوئے تھا۔ اس سے خوشبو اُڑ رہی تھی۔ ماں باپ کی آنکھیں بچا کر زینہ پر جانا چاہتا تھا کہ باگیشری نے ٹوکا۔ کہاں جاتے ہو۔ تم نے ناچ تماشے میں بارہ تیرہ سو روپے اُڑا دیے۔ بتلاؤ صرّاف کو کیا جواب دیا جائے۔

رما ناتھ نے اس الزام کی تردید کرتے ہوئے کہا۔ میں نے روپے اُڑا دیے۔ میں نے بابو جی کے حکم بغیر ایک پیسہ بھی خرچ نہیں کیا۔

حقیقت بھی یہی تھی۔ اگر دیا ناتھ کی مرضی نہ ہوتی۔ تو رما کیا کر سکتا تھا۔ جو کچھ ہوا۔ ان کی رضامندی سے ہوا۔

دیا ناتھ نے اس قول کی تائید کی۔ میں تمھیں الزام نہیں دیتا بھائی۔ کیا تو میں نے ہی۔ مگر یہ بلا تو کسی طرح سر سے ٹالنی چاہیے۔ صرّاف کا تقاضا ہے۔ میرے سمجھ میں یہی ایک تدبیر ہے کہ باقی روپیوں کے زیور واپس کر دیے جائیں۔ تمھاری کیا صلاح ہے؟

رما نے شرماتے ہوئے کہا۔ میں اس معاملہ میں کیا صلاح دے سکتا ہوں۔ ہاں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ اس تجویز کو وہ خوشی سے منظور نہ کریں گی۔

باگیشری نے خوش ہوکر کہا۔ یہی تو میں ان سے کہہ رہی ہوں۔

رما۔ رونا دھونا شروع ہوجائے گا۔ اس کے ساتھ ہی گھر کا پردہ بھی کھل جائے گا۔

دیا ناتھ نے آزردہ خاطر ہوکر کہا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ اس سے پردہ رکھنے کی ضرورت کیا ہے۔ اپنی اصلی حالت کا اسے جتنی جلدی علم ہوجائے۔ اتنا ہی اچھا ہے۔

رما ناتھ نے عام نوجوانوں کی طرح جالپا سے خوب زیٹ اُڑائی تھی۔ خوب بڑھ بڑھ کر باتیں بنائی تھیں۔ زمینداری ہے۔ اس سے کئی ہزار کا نفع ہے۔ بینک میں روپے ہیں سُود آتا ہے۔ بولا۔ آپ کا فرمانا درست ہے۔ پر اتنی جلدی بھرم کھل جانے کا نتیجہ یہی ہوگا کہ وہ ہمیں ذلیل سمجھنے لگے گی۔

دیا ناتھ۔ ہم نے دین دیال سے یہ کبھی نہیں کہا تھا کہ ہم لکھ پتی ہیں۔

رما ناتھ۔ تو آپ نے یہی کب کہا تھا کہ ہم جاکر پر زیور لائیں گے اور دو چار دن میں لوٹا دیں گے۔ آخر یہ سارا سوانگ اپنی دھاک بٹھانے کے لیے ہی تو کیا تھا یا کچھ اور۔

دیا۔ تو پھر کوئی دوسرا بہانہ کرنا پڑے گا۔ دوسری کوئی تدبیر نہیں۔ کل یا تو روپے دینے پڑیں گے یا زیور واپس کرنے پڑیں گے۔

باگیشری۔ اور کون سا بہانہ کیا جائے گا۔ اگر کہا جائے کسی کو مانگے دینا ہے۔ تو شاید وہ دے ہی نہیں۔ دیا ناتھ کو ایک حکمت سُوجھی۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ ان زیوروں کے بدلے ملمع کی چیزیں دے دی جائیں۔ مگر فوراً ہی خیال آگیا کہ یہ لچر بات ہے۔ خود ہی اس کی تردید کی اور بولے۔ کیوں نہ ساری حالت اسے سمجھا دی جائے۔ ذرا کے لیے اسے رنج تو ہوگا۔ لیکن ہمیشہ کے لیے راستہ صاف ہوجائے گا۔

لیکن اس میں رما ناتھ کی کرکری ہوتی تھی۔ پھر تو اسے منہ دکھانے کی بھی جگہ نہ رہے گی۔ جب وہ پوچھے گی۔ تمھاری زمینداری کیا ہوئی۔ بینک کے روپے کیا ہوئے۔ تو وہ کیا جواب دے گا؟ رنجیدہ ہوکر بولا۔ اس میں سراسر بے عزتی ہے۔ کیا آپ صرّاف کو دو چار مہینے بھی نہیں ٹال سکتے؟

دیا ناتھ۔ غیر ممکن۔

تینوں کچھ دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔ دیا نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ چونکہ ماں اور بیٹے کو یہ فیصلہ منظور نہ تھا۔ اس لیے اب اس گتھی کو سلجھانے کا بار بھی انھیں دونوں پر تھا۔ باگیشری نے تو ایک طرح سے طے کرلیا تھا کہ دیا ناتھ کو جھک مار کر اپنی پارسائی کو رخصت کرنا پڑے گا۔ یہ کہاں کی دانشمندی ہے کہ ہمارے اوپر بوجھ لدا ہوا ہو اور ہم دھرم کا راگ الاپتے جائیں۔ مگر رما ناتھ جانتا تھا کہ والد نے جو کام اپنی زندگی میں کبھی نہیں کیا وہ آج نہ کریں گے۔ وہ بغیر پس و پیش کے جالّپا سے زیور مانگ بیٹھیں گے اور وہ یہ نہ چاہتا تھا۔ وہ اب پچھتا رہا تھا کہ کیوں جالّپا سے ڈینگیں ماریں۔ اس وقت اسے ذرا بھی فکر نہ تھی کہ ایک دن سارا بھانڈا پھوٹ جائے گا۔ دروغ دور اندیش نہیں ہوتا لیکن وہ دن اتنے جلد آئے گا۔ یہ کون جانتا تھا۔ اگر اس نے جھوٹا وقار نہ جمایا ہوتا تو باگیشری کی طرح وہ بھی سارا بار دیا ناتھ پر چھوڑ کر بے فکر ہوجاتا۔ لیکن اس وقت وہ اپنے ہی بنائے ہوئے جال میں پھنس گیا تھا۔ کیسے نکلے؟

اس نے کتنی ہی تدبیریں سوچیں۔ لیکن ایسی کوئی نہ تھی۔ جو آگے چل کر اسے اُلجھن میں نہ ڈال دیتی۔ یکایک اسے ایک چال سُوجھ گئی۔ اس کا دل اچھل پڑا۔ لیکن جالّپا کے ساتھ دغا یا فریب کرنے کا خیال بھی اسے ذلت آمیز معلوم ہوا۔

دیا ناتھ نے پوچھا۔ کوئی تدبیر سُوجھی؟

"مجھے تو کچھ نہیں سُوجھتا۔"

"مگر کوئی تدبیر تو سوچنی ہی پڑے گی۔ کیوں اس سے دو چار عدد مانگ نہیں لیتے۔ یہ تو ایسا مشکل کام نہیں۔"

"مجھے شرم آتی ہے۔"

"تم بھی عجیب آدمی ہو۔ نہ خود مانگوگے نہ مجھے مانگنے دوگے۔ تو آخر یہ ڈرے گا کیسے پار لگے گا؟ میں تم سے ہزار بار کہہ چکا ہوں کہ مجھ سے کوئی اُمیدمت رکھو۔ اپنی زندگی کے آخری دن جیل میں نہیں کاٹنا چاہتا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ اس میں شرم کی کیا بات ہے۔ کس کی زندگی میں ایسے موقعے نہیں آتے۔ تمھیں اپنی ماں سے پُوچھو۔"

باگیشری نے اس کی تائید کی۔ مجھ سے تو یہ نہیں دیکھا جاتا تھا کہ گھر کے لوگ پریشان ہوں اور میں زیور پہنے بیٹھی رہوں۔ نہیں تو آج میرے پاس گہنے ہوتے۔ شادی

میں پانچ ہزار سے کم کا چڑھاؤ نہیں گیا تھا۔ مگر پانچ ہی سال میں سب صاف ہوگیا۔

دیا ناتھ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "شرم کرنے کا یہ موقع نہیں ہے۔"

رما ناتھ نے جھینپتے ہوئے کہا۔ مانگ تو میں بھی نہیں سکتا۔ ہاں! کہیے اُٹھا لوں؟"

دیا ناتھ نے حیرت میں آکر پوچھا۔ "اُٹھا لاؤ گے اس سے چھپا کر!"

رما نے ترش ہوکر کہا۔ "اور آپ کیا سمجھ رہے ہیں۔"

دیا ناتھ نے پیشانی پر ہاتھ رکھ لیا اور ایک لمحے کے بعد بولے۔ نہیں میں نے جال کبھی نہیں کیا اور نہ کبھی کروں گا۔ جال کروں۔ اپنی بہو کے ساتھ۔ چھی، چھی۔ جو کام آسانی سے ہوسکتا ہے اس کے لیے فریب! کہیں اس کی نگاہ پڑگئی۔ تو تمھیں دل میں کیا سمجھے گی۔ مانگ لینا اس سے کہیں بہتر ہے۔

رما نے کہا۔ آپ کو اس سے کیا مطلب! مجھ سے چیزیں لے لے لیجیے گا۔ مگر جب آپ جانتے تھے کہ ایک دن یہ نوبت آئے گی۔ تو اتنے زیور لے جانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ مفت کا دردسر مول لیا۔ اُس کھانے سے فائدہ کہ پیٹ میں درد ہونے لگے۔ میں تو سمجھ رہا تھا کہ آپ نے کوئی راستہ نکال لیا ہوگا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ آپ زحمت میرے سر ڈال دیں گے۔ ورنہ میں ان تمام چیزوں کو کبھی نہ لے جانے دیتا۔ یہی تو ہوتا کہ اُدھر والوں کو شکایت ہوتی۔ مگر شکایتوں سے ہمارا کیا نقصان تھا۔ یہ تو گناہ بے لذت ہوا۔ بدنامی الگ ہوئی۔ پریشانی الگ۔ میں یہ نہیں دکھانا چاہتا کہ ہم سب اتنے پھٹے حال میں ہیں۔ چوری ہوجانے پر تو صبر کرنا ہی پڑے گا۔"

دیا ناتھ چپ ہوگئے۔ اس جوش میں رما نے انھیں خوب کھری کھری سنائیں اور وہ چپ چاپ سنتے رہے۔ آخر جب نہ سنا گیا تو اُٹھ کر پھر کتب خانے میں چلے گئے۔ یہ ان کا روز کا دستور تھا۔ جب تک دو چار رسالے نہ پڑھ لیں۔ ان کا کھانا ہضم نہ ہوتا تھا۔ اسی گوشۂ عافیت میں پہنچ کر وہ گھر کی فکروں سے آزاد ہوجاتے تھے۔

آخر رما بھی وہاں سے اُٹھا پر جالپا کے پاس نہ جاکر اپنے کمرے میں گیا۔ اس کا کوئی کمرہ الگ تو تھا نہیں۔ ایک ہی مردانہ کمرہ تھا۔ اسی میں دیا ناتھ اپنے دستوں سے گپ شپ کرتے۔ دونوں لڑکے پڑھتے اور رما احباب کے ساتھ شطرنج کھیلتا۔ رما کمرے میں پہنچا۔ تو دیکھا۔ دونوں لڑکے تاش کھیل رہے ہیں۔ گوپی کا تیرھواں سال تھا۔ بشمبھر کا نواں۔ دونوں

رما سے تھر تھر کانپتے تھے۔ رما خود خوب تاش اور شطرنج کھیلتا۔ مگر بھائیوں کو کھیلتے دیکھ کر اس کے ہاتھ میں کھجلی ہونے لگتی تھی۔ خود چاہے دن بھر سیر سپاٹے کیا کرے۔ مگر کیا مجال کہ دونوں بھائیوں میں سے کوئی باہر نکلے۔ دیا ناتھ خود لڑکوں کو کبھی نہ مارتے تھے۔ موقع ملتا تو ان کے ساتھ کھیلتے تھے۔ انھیں کنکوئے اُڑاتے دیکھ کر ان کی بچپن کی یاد تازہ ہوجاتی تھی۔ دو چار پیچ لڑا دیتے۔ اس لیے لڑکے رما سے جتنا ڈرتے تھے اتنا ہی باپ سے محبت کرتے تھے۔

رما کو دیکھتے ہی لڑکوں نے تاش کو ٹاٹ کے نیچے چھپا دیا اور پڑھنے لگے۔ مگر کن انکھیوں سے سر پر پڑنے والی چپت کا انتظار کر رہے تھے۔

رما نے مونڈھے پر بیٹھ کر گوپی ناتھ سے کہا۔ تم نے جھنک کی دُکان دیکھی ہے نہ کٹھ پر۔

گوپی ناتھ خوش ہوکر بولا۔ ہاں! دیکھی کیوں نہیں۔

جاکر چار پیسے کا معجون لے لو اور آدھ سیر مٹھائی بھی لیتے آنا۔

گوپی روپیہ لے کر بازار چلا گیا۔

(۷)

رات کے دس بج گئے تھے۔ جالپا کھلی چھت پر لیٹی ہوئی تھی۔ جیٹھ کی مدھم چاندنی رات میں سامنے گنبد۔ مینار اور درخت۔ خواب کی تصویروں سے معلوم ہوتے تھے۔ جالپا کی آنکھیں چاند کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں چاند کی طرف اُڑی جا رہی ہوں۔ اُسے اپنی ناک میں کھجلی۔ آنکھوں میں جلن اور سر میں چکر کا احساس ہو رہا تھا۔ کوئی بات ذہن میں آتے ہی بھول جاتی اور بہت یاد کرنے پر بھی یاد نہ آتی۔ ایک بار گھر کی یاد آئی۔ رونے لگی۔ ایک ہی لمحہ میں سہیلیوں کی یاد آگئی۔ ہنسنے لگی۔

دفعتاً رما ناتھ ایک پوٹلی لیے مسکراتا ہوا آیا اور چارپائی پر بیٹھ گیا۔

جالپا نے اُٹھ کر پوچھا۔ پوٹلی میں کیا ہے؟

بوجھ جاؤ تو جانوں۔

ہنسی کا گول گپا ہے۔ یہ کہہ کر ہنسنے لگی۔

"غلط"

"تو پریم کی پٹاری ہوگی۔"

رما نے کہا۔ ٹھیک آج میں تمھیں پھولوں کی دیوی بناؤں گا۔

جالپا کھل اُٹھی۔ رما نے بڑے شوق سے اُسے پھولوں کے زیور پہنانے شروع کیے پھولوں کے نازک اور طراوت آمیز احساس نے جالپا کی تنِ نازک میں گُدگُدی سی ہونے لگی۔ انھیں پھولوں کی طرح اس کے جسم کا ایک ایک ذرہ کھل اُٹھا۔

رما نے مسکراکر کہا۔ کیا انعام دیتی ہو؟

جالپا نے کچھ جواب نہ دیا۔ سامنے کمرے میں لیمپ جل رہا تھا۔ وہ اُٹھ کر کمرے میں گئی اور آئینہ کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ نشہ کے ترنگ میں کچھ ایسا ہوا کہ میں سچ مچ پھولوں کی دیوی ہوں۔ وہ زور سے قہقہہ مار کر ہنسنے لگی۔

رما کو اس وقت اپنی دغابازی پر ندامت ہو رہی تھی۔ جالپا نے کمرے سے لوٹ کر اس کی طرف مخمور نگاہوں سے دیکھا۔ تو اس نے منہ پھیر لیا۔ ان بے لوث اور پُر اعتقاد آنکھوں کے سامنے وہ آنکھیں نہ اُٹھا سکا۔

جالپا نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔ میرے بابو جی تمھیں دیکھ کر گئے۔ اور اماں سے تمھاری تعریف کرنے لگے۔ تو میں سوچتی تھی۔ تم کیسے ہوگے۔ دل میں طرح طرح کی تصویریں آتی تھیں۔

رما ناتھ نے ایک لمبی سانس کھینچی اور کچھ جواب نہ دیا۔

جالپا نے اسی سادگی کے انداز سے کہا۔ میری سہیلیاں تمھیں دیکھ کر لبھائیں۔ شہزادی تو کھڑکی کے سامنے سے ہٹتی ہی نہ تھی۔ جب تم اندر گئے تھے۔ تو اسی نے تمھیں پان کے بیڑے دیے تھے۔ یاد ہے؟

رما نے کوئی جواب نہ دیا۔ جالپا پھر بولی۔ اجی وہی جو رنگ روپ میں سب سے اچھی تھی۔ جب تم نے اس کی طرف رسیلی آنکھوں سے دیکھا تو بے چاری شرم کے مارے گڑ گئی۔ مجھ سے کہنے لگی۔ جیجا تو بڑے رنگین مزاج معلوم ہوتے ہیں۔ سہیلیوں نے اسے خوب چڑایا۔ یاد ہے؟

رما ناتھ نے گویا ندی میں ڈوبتے ہوئے کہا۔ "مجھے یاد نہیں آتا۔"

"اچھا اب کے چلوگے تو دکھا دوں گی۔ آج تم بازار گئے تھے کہ نہیں۔"

رما نے سر جھکا کر کہا۔ "آج تو فرصت نہیں ملی۔"

"جاؤ۔ میں تم سے نہ بولوں گی۔ روز حیلے حوالے کرتے ہو۔ اچھا کل تو لادو گے؟"

رما ناتھ کا دل مسوس اُٹھا۔ یہ غریب چندن ہار کے لیے اس قدر بے تاب ہو رہی ہے۔ اسے کیا خبر؟ بخت نارسا اُسے تباہ کرنے کا سامان کر رہا ہے۔

آدھی رات گذر چکی تھی۔ چاند کسی چور کی طرح ایک درخت کی آڑ سے جھانک رہا تھا۔ جالپا شوہر کے گلے میں ہاتھ ڈالے ہوئے محوِ خواب تھی۔ رما آہستہ سے اُٹھا۔ مگر نیند کی گود میں سوئی ہوئی نازنین نے اسے متلون کردیا۔ وہ ایک لمحہ تک کھڑا نظروں سے جالپا کی طرف دیکھتا رہا۔ نیند میں وہ پھول کتنا شگفتہ ہوگیا تھا۔ کمرے کے اندر قدم نہ رکھ سکا۔ پھر لیٹ گیا۔

جالپا نے چونک کر پوچھا۔ کہاں جاتے ہو۔ کیا سویرا ہوگیا؟

"ابھی تو بڑی رات ہے۔"

"تو تم بیٹھے کیوں ہو؟"

"کچھ نہیں۔ ذرا پانی پینے گیا تھا۔"

جالپا نے اس کے گلے میں ہاتھ ڈال دیے اور اُسے سُلا کر کہا۔ تم اس طرح مجھ پر ٹونا کروگے تو میں بھاگ جاؤں گی۔ بسنتی سچ کہتی تھی۔ مردوں کی آنکھوں میں جادو ہوتا ہے۔

رما ناتھ نے روتے ہوئے دل کو سمجھا کر کہا۔ "کیا کروں۔ آنکھوں کی پیاس نہیں بجھتی۔"

دونوں پھر لیٹے۔ ایک نشۂ الفت میں متوالی۔ دوسرا فکر کے سمندر میں ڈوبا ہوا۔ تین گھنٹے اور گزر گئے۔ دوادشی کے چاند نے اپنا چراغ بجھا دیا۔ آدھی رات تک جاگنے والا بازار بھی سوگیا۔ صرف رما ابھی تک جاگ رہا تھا۔ دل میں طرح طرح کے وسوسے پیدا ہونے کے باعث وہ بار بار اٹھتا تھا اور پھر لیٹ جاتا تھا۔ آخر جب چار بجے کی آواز کان میں آئی۔ تو گھبرا کر اُٹھا اور کمرے میں جا پہنچا۔ زیوروں کا صندوقچہ المار ی میں رکھا ہوا تھا۔ رما نے اسے اُٹھا لیا اور تھر تھر کانپتا ہوا اسے لے کر نیچے اُتر گیا۔ اس عجلت میں اسے اتنی فرصت نہ ملی کہ وہ چار چیزیں چھانٹ کر نکال لے۔

دیا ناتھ نیچے برآمدے میں سو رہے تھے۔ رما نے انھیں آہستہ سے جگایا۔ انھوں نے ہکا بکا ہو کر پوچھا۔ کون؟

رما نے ہونٹ پر انگلی رکھ کر کہا۔ میں ہوں۔ یہ صندوقچی اُٹھا لایا۔ رکھ لیجیے۔

دیا ناتھ صورت حال سمجھ گئے۔ رما ناتھ نے جس وقت ان سے زیوروں کے اُٹھا لانے کا ذکر کیا تھا۔ انھوں نے سمجھا تھا کہ یہ محض حیلے کر رہا ہے۔ انھیں اس کا یقین نہ آیا تھا کہ یہ ارادے کو پورا کر دکھائے گا۔ ایسی کمینہ حرکتوں سے وہ علاحدہ رہنا چاہتے تھے۔ پوچھا اسے کیوں اُٹھا لائے؟

"آپ نے ہی تو فرمایا تھا۔"

"جھوٹ کہتے ہو۔"

"تو کیا پھر رکھ آؤں۔"

رما ناتھ کے اس سوال نے منشی جی کو مخمصہ میں ڈال دیا۔ جھینپتے ہوئے بولے۔ اب کیا رکھ آؤ گے۔ کہیں دیکھ لے تو غضب ہی ہوجائے۔ وہی کام کرو گے جس میں رسوائی ہو اب کھڑے کیا ہو۔ صندوقچی میرے بڑے صندوق میں رکھ آؤ اور جاکر لیٹ رہو۔

برآمدے کے پیچھے دیا ناتھ کا کمرہ تھا۔ اس میں دیودار کا ایک پُرانا صندوق رکھا ہوا تھا۔ رما نے صندوقچی اس کے اندر رکھ دی اور بڑی تیزی سے اوپر چلا گیا۔ چھت پر پہنچ کر اس نے آہٹ لی۔ جالپا ابھی پچھلے پہر کے خواب نوشیں کے مزے لے رہی تھی۔

رما جوں ہی چارپائی پر بیٹھا۔ جالپا چونک کر اس سے چمٹ گئی۔

رما نے پوچھا کیا ہے۔ تم چونک کیوں پڑیں۔

جالپا نے ادھر ادھر شبہ آمیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ کچھ نہیں ایک خواب دیکھ رہی تھی۔ کتنی رات ہے ابھی۔

رما نے لیٹتے ہوئے کہا۔ سویرا ہو رہا ہے۔ کیا خواب دیکھتی تھیں۔

جالپا نے شرماتے ہوئے کہا۔ جیسے کوئی چور میرے گہنوں کی صندوقچی اُٹھائے لیے جاتا ہو۔

رما کا دل اتنے زور سے دھک دھک کرنے لگا کہ گویا اس پر ہتھوڑے پڑ رہے ہوں۔ خون سرد ہوگیا۔ وہ زور سے چلا اُٹھا۔ چور، چور!

نیچے برآمدے میں منشی جی بھی چلا اُٹھے۔ چور، چور!

جالپا گھبرا کر اُٹھی۔ دوڑی ہوئی کمرے میں گئی۔ ایک جھٹکے میں الماری کھولی۔ صندوقچی وہاں موجود نہ تھی۔ بے ہوش ہوکر گر پڑی۔

(۸)

صبح ہوتے ہی دیا ناتھ گہنے لے کر صرّاف کے پاس پہنچے اور حساب ہونے لگا۔ صرّاف کے پندرہ سو روپے آتے تھے۔ مگر وہ صرف پندرہ سو روپیہ کے زیور لے کر راضی نہ ہوا۔ بکے ہوئے زیوروں کو وہ بٹے پر ہی لے سکتا تھا۔ بکی ہوئی چیز کون واپس لیتا ہے۔ جاکڑ پر دیئے ہوتے تو دوسری بات تھی۔ ان چیزوں کا تو سودا ہوچکا تھا۔ اس نے کچھ ایسے تاجرانہ اصول کی باتیں کیں اور دیا ناتھ کو کچھ ایسا شکنجہ میں کسا کہ بے چارے کو ہاں ہا کرنے کے سوا اور کچھ نہ سوجھی۔ دفتر کا بابو شاطر دُکاندار سے کیا پیش پاتا۔ پندرہ سو میں ڈھائی ہزار کے گہنے بھی چلے گئے۔ اوپر سے پچاس روپے اور باقی رہ گئے۔ اس مسئلے پر باپ بیٹے میں کئی دن خوب مباحثے ہوئے۔ دونوں ایک دوسرے کو الزام دیتے۔ کئی دن آپس میں بول چال بند رہی۔ مگر اس چوری کا حال پوشیدہ رکھا گیا۔ پولیس کو خبر ہوجاتی تو بھانڈا پھوٹ جاتا۔ جالپا سے یہی کہا گیا کہ مال تو دستیاب نہ ہوگا۔ مفت کی زحمت ہوگی۔

جالپا کو زیوروں سے جتنی الفت تھی۔ اتنی شاید دُنیا کی اور کسی چیز سے نہ تھی۔ اور اس میں تعجب کی کون سی بات تھی۔ جب وہ تین سال کی نادان بچی تھی۔ اس وقت اس کے لیے سونے کے چوڑے بنوائے گئے تھے۔ دادی جب اس کو گود میں کھلانے لگتی۔ تو زیوروں ہی کی چرچا کرتی۔ تیرا دولہا تیرے لیے اچھے گہنے لائے گا۔ تو ٹھمک ٹھمک کر چلے گی۔

جالپا پوچھتی۔ چاندی کے ہوں گے یا سونے کے دادی۔

دادی کہتی سونے کے ہوں گے بیٹی۔ چاندی کے کیوں لائے گا؟ چاندی کے لائے تو تم اُٹھا کر اس کے منہ پر پٹک دینا۔

مانکی چھیڑ کر کہتی۔ چاندی کے تو لائے گا ہی! سونے کے اسے کہاں ملے جاتے ہیں۔

جالپا رونے لگتی۔ اس پر بوڑھی دادی۔ مانکی۔ گھر کی مہریاں۔ پڑوسنیں اور دین دیال سب ہنس پڑتے۔ ان لوگوں کی تفریح کا یہ زوال سرچشمہ تھا۔

"تو پریم کی پٹاری ہو گی۔"

رما نے کہا۔ ٹھیک آج میں تمھیں پھولوں کی دیوی بناؤں گا۔

جالپا کھل اُٹھی۔ رما نے بڑے شوق سے اُسے پُھولوں کے زیور پہنانے شروع کیے پھولوں کے نازک اور طراوت آمیز احساس نے جالپا کی تنِ نازک میں گُدگُدی سی ہونے لگی۔ انھیں پھولوں کی طرح اس کے جسم کا ایک ایک ذرہ کھل اُٹھا۔

رما نے مسکراکر کہا۔ کیا انعام دیتی ہو؟

جالپا نے کچھ جواب نہ دیا۔ سامنے کمرے میں لیمپ جل رہا تھا۔ وہ اُٹھ کر کمرے میں گئی اور آئینہ کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ نشہ کے ترنگ میں کچھ ایسا ہوا کہ میں سچ مچ پھولوں کی دیوی ہوں۔ وہ زور سے قہقہہ مار کر ہنسنے لگی۔

رما کو اس وقت اپنی دغابازی پر ندامت ہو رہی تھی۔ جالپا نے کمرے سے لوٹ کر اس کی طرف مخمور نگاہوں سے دیکھا۔ تو اس نے منہ پھیر لیا۔ ان بے لوث اور پُر اعتقاد آنکھوں کے سامنے وہ آنکھیں نہ اُٹھا سکا۔

جالپا نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔ میرے بابو جی تمھیں دیکھ کر گئے۔ اور اماں سے تمھاری تعریف کرنے لگے۔ تو میں سوچتی تھی۔ تم کیسے ہوگے۔ دل میں طرح طرح کی تصویریں آتی تھیں۔

رما ناتھ نے ایک لمبی سانس کھینچی اور کچھ جواب نہ دیا۔

جالپا نے اسی سادگی کے انداز سے کہا۔ میری سہیلیاں تمھیں دیکھ کر لبھائیں۔ شہزادی تو کھڑکی کے سامنے سے ہٹتی ہی نہ تھی۔ جب تم اندر گئے تھے۔ تو اسی نے تمھیں پان کے بیڑے دیے تھے۔ یاد ہے؟

رما نے کوئی جواب نہ دیا۔ جالپا پھر بولی۔ اجی وہی جو رنگ روپ میں سب سے اچھی تھی۔ جب تم نے اس کی طرف رسیلی آنکھوں سے دیکھا تو بے چاری شرم کے مارے گڑ گئی۔ مجھ سے کہنے لگی۔ جیجا تو بڑے رنگین مزاج معلوم ہوتے ہیں۔ سہیلیوں نے اسے خوب چڑایا۔ یاد ہے؟

رما ناتھ نے گویا ندی میں ڈوبتے ہوئے کہا۔ "مجھے یاد نہیں آتا۔"

"اچھا اب کے چلوگے تو دکھا دوں گی۔ آج تم بازار گئے تھے کہ نہیں۔"

رما نے سر جھکا کر کہا۔ "آج تو فرصت نہیں ملی۔"

"جاؤ۔ میں تم سے نہ بولوں گی۔ روز حیلے حوالے کرتے ہو۔ اچھا کل تو لادو گے؟"

رما ناتھ کا دل مسوس اُٹھا۔ یہ غریب چندن ہار کے لیے اس قدر بے تاب ہو رہی ہے۔ اسے کیا خبر؟ بخت نارسا اُسے تباہ کرنے کا سامان کر رہا ہے۔

آدھی رات گذر چکی تھی۔ چاند کسی چور کی طرح ایک درخت کی آڑ سے جھانک رہا تھا۔ جالپا شوہر کے گلے میں ہاتھ ڈالے ہوئے محوِ خواب تھی۔ رما آہستہ سے اُٹھا۔ مگر نیند کی گود میں سوئی ہوئی نازنین نے اسے متلون کردیا۔ وہ ایک لمحہ تک کھڑا نظروں سے جالپا کی طرف دیکھتا رہا۔ نیند میں وہ پھول کتنا شگفتہ ہوگیا تھا۔ کمرے کے اندر قدم نہ رکھ سکا۔ پھر لیٹ گیا۔

جالپا نے چونک کر پوچھا۔ کہاں جاتے ہو۔ کیا سویرا ہوگیا؟

"ابھی تو بڑی رات ہے۔"

"تو تم بیٹھے کیوں ہو؟"

"کچھ نہیں۔ ذرا پانی پینے گیا تھا۔"

جالپا نے اس کے گلے میں ہاتھ ڈال دیے اور اُسے سلا کر کہا۔ تم اس طرح مجھ پر ٹونا کروگے تو میں بھاگ جاؤں گی۔ بنتی سچ کہتی تھی۔ مردوں کی آنکھوں میں جادو ہوتا ہے۔

رما ناتھ نے روتے ہوئے دل کو سمجھا کر کہا۔ "کیا کروں۔ آنکھوں کی پیاس نہیں بجھتی۔"

دونوں پھر لیٹے۔ ایک نشہ الفت میں متوالی۔ دوسرا فکر کے سمندر میں ڈوبا ہوا۔

تین گھنٹے اور گزر گئے۔ دوادشی کے چاند نے اپنا چراغ بجھا دیا۔ آدھی رات تک جاگنے والا بازار بھی سوگیا۔ صرف رما ابھی تک جاگ رہا تھا۔ دل میں طرح طرح کے وسوسے پیدا ہونے کے باعث وہ بار بار اٹھتا تھا اور پھر لیٹ جاتا تھا۔ آخر جب چار بجے کی آواز کان میں آئی۔ تو گھبرا کر اُٹھا اور کمرے میں جا پہنچا۔ زیوروں کا صندوقچہ الماری میں رکھا ہوا تھا۔ رما نے اسے اُٹھا لیا اور تھر تھر کانپتا ہوا اسے لے کر نیچے اُتر گیا۔ اس عجلت میں اسے اتنی فرصت نہ ملی کہ وہ چار چیزیں چھانٹ کر نکال لے۔

دیا ناتھ نیچے برآمدے میں سو رہے تھے۔ رما نے انھیں آہستہ سے جگایا۔ انھوں نے ہکا بکا ہوکر پوچھا۔ کون؟

رما نے ہونٹ پر انگلی رکھ کر کہا۔ میں ہوں۔ یہ صندوقچی اُٹھا لایا۔ رکھ لیجیے۔

دیا ناتھ صورت حال سمجھ گئے۔ رما ناتھ نے جس وقت ان سے زیوروں کے اُٹھا لانے کا ذکر کیا تھا۔ انھوں نے سمجھا تھا کہ یہ محض حیلے کر رہا ہے۔ انھیں اس کا یقین نہ آیا تھا کہ یہ ارادے کو پورا کر دکھائے گا۔ ایسی کمینہ حرکتوں سے وہ علاحدہ رہنا چاہتے تھے۔ پوچھا اسے کیوں اُٹھا لائے؟

"آپ نے ہی تو فرمایا تھا۔"

"جھوٹ کہتے ہو۔"

"تو کیا پھر رکھ آؤں۔"

رما ناتھ کے اس سوال نے منشی جی کو مخمصہ میں ڈال دیا۔ جھینپتے ہوئے بولے۔ اب کیا رکھ آؤگے۔ کہیں دیکھ لے تو غضب ہی ہوجائے۔ وہی کام کروگے جس میں رسوائی ہو اب کھڑے کیا ہو۔ صندوقچی میرے بڑے صندوق میں رکھ آؤ اور جاکر لیٹ رہو۔

برآمدے کے پیچھے دیا ناتھ کا کمرہ تھا۔ اس میں دیودار کا ایک پُرانا صندوق رکھا ہوا تھا۔ رما نے صندوقچی اس کے اندر رکھ دی اور بڑی تیزی سے اوپر چلا گیا۔ چھت پر پہنچ کر اس نے آہٹ لی۔ جالپا ابھی پچھلے پہر کے خواب نوشیں کے مزے لے رہی تھی۔

رما جوں ہی چارپائی پر بیٹھا۔ جالپا چونک کر اس سے چمٹ گئی۔

رما نے پوچھا کیا ہے۔ تم چونک کیوں پڑیں۔

جالپا نے ادھر ادھر شبہ آمیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ کچھ نہیں ایک خواب دیکھ رہی تھی۔ کتنی رات ہے ابھی۔

رما نے لیٹتے ہوئے کہا۔ سویرا ہو رہا ہے۔ کیا خواب دیکھتی تھیں۔

جالپا نے شرماتے ہوئے کہا۔ جیسے کوئی چور میرے گہنوں کی صندوقچی اُٹھائے لیے جاتا ہو۔

رما کا دل اتنے زور سے دھک دھک کرنے لگا کہ گویا اس پر ہتھوڑے پڑ رہے ہوں۔ خون سرد ہوگیا۔ وہ زور سے چلا اُٹھا۔ چور، چور!

نیچے برآمدے میں منشی جی بھی چلا اُٹھے۔ چور، چور!
جالپا گھبرا کر اُٹھی۔ دوڑی ہوئی کمرے میں گئی۔ ایک جھٹکے میں الماری کھولی۔ صندوقچی وہاں موجود نہ تھی۔ بے ہوش ہوکر گر پڑی۔

(۸)

صبح ہوتے ہی دیا ناتھ گہنے لے کر صرّاف کے پاس پہنچے اور حساب ہونے لگا۔ صرّاف کے پندرہ سو روپے آتے تھے۔ مگر وہ صرف پندرہ سو روپیہ کے زیور لے کر راضی نہ ہوا۔ بکے ہوئے زیوروں کو وہ بٹے پر ہی لے سکتا تھا۔ بکی ہوئی چیز کون واپس لیتا ہے۔ جاکڑ پر دیے ہوتے تو دوسری بات تھی۔ ان چیزوں کا تو سودا ہوچکا تھا۔ اس نے کچھ ایسے تاجرانہ اصول کی باتیں کیں اور دیا ناتھ کو کچھ ایسا شکنجہ میں کسا کہ بے چارے کو ہاں ہا کرنے کے سوا اور کچھ نہ سوجھی۔ دفتر کا بابو شاطر دُکاندار سے کیا پیش پاتا۔ پندرہ سو میں ڈھائی ہزار کے گہنے بھی چلے گئے۔ اوپر سے پچاس روپے اور باقی رہ گئے۔ اس مسئلے پر باپ بیٹے میں کئی دن خوب مباحثے ہوئے۔ دونوں ایک دوسرے کو الزام دیتے۔ کئی دن آپس میں بول چال بند رہی۔ مگر اس چوری کا حال پوشیدہ رکھا گیا۔ پولیس کو خبر ہوجاتی تو بھانڈا پھوٹ جاتا۔ جالپا سے یہی کہا گیا کہ مال تو دستیاب نہ ہوگا۔ مفت کی زحمت ہوگی۔
جالپا کو زیوروں سے جتنی الفت تھی۔ اتنی شاید دُنیا کی اور کسی چیز سے نہ تھی۔ اور اس میں تعجب کی کون سی بات تھی۔ جب وہ تین سال کی نادان بچی تھی۔ اس وقت اس کے لیے سونے کے چوڑے بنوائے گئے تھے۔ دادی جب اس کو گود میں کھلانے لگتی۔ تو زیوروں ہی کی چرچا کرتی۔ تیرا دولہا تیرے لیے اچھے گہنے لائے گا۔ تو ٹھمک ٹھمک کر چلے گی۔
جالپا پوچھتی۔ چاندی کے ہوں گے یا سونے کے دادی۔
دادی کہتی سونے کے ہوں گے بیٹی۔ چاندی کے کیوں لائے گا؟ چاندی کے لائے تو تم اُٹھا کر اس کے منہ پر پٹک دینا۔
مانکی چھیڑ کر کہتی۔ چاندی کے تو لائے گا ہی! سونے کے اسے کہاں ملے جاتے ہیں۔
جالپا رونے لگتی۔ اس پر بوڑھی دادی۔ مانکی۔ گھر کی مہریاں۔ پڑوسنیں اور دین دیال سب ہنس پڑتے۔ ان لوگوں کی تفریح کا یہ زوال سرچشمہ تھا۔

لڑکی جب ذرا اور سیانی ہوئی۔ تو گڑیوں کے بیاہ رچانے لگی۔ لڑکے کی طرف سے چڑھاوے آتے۔ وہ دلہن کو گہنے پہناتی اور ڈولی میں بٹھاکر رخصت کرتی۔ کبھی کبھی دلہن گڑیا اپنے دولہا گڈے سے زیوروں کے لیے روٹھ جاتی۔ گڈا بے چارہ کہیں نہ کہیں سے زیور لاکر دلہن کو خوش کرتا تھا۔ انھیں دنوں بساطی نے اسے وہ چندن ہار دیا۔ جو اب تک اس کے پاس محفوظ تھا۔

جب ذرا بڑی ہوئی۔ تو بڑی بوڑھیوں میں بیٹھ کر زیوروں کے چرچے سننے لگی۔ عورتوں کی اس چھوٹی سی دنیا میں اس کے سوا اور کوئی مشغلہ ہی نہ تھا۔ کس نے کون کون سے زیور بنوائے؟ کتنا صرف ہوا؟ ٹھوس ہیں یا پوے؟ جڑاؤ ہیں یا سادے؟ سونے کے ہیں یا چاندی کے۔ انھیں اہم مسائل پر ہمیشہ تنقید و تبصرے ہوتے رہتے تھے۔ کوئی دوسرا تذکرہ اتنا دلچسپ اتنا مزے دار ہو ہی نہ سکتا تھا۔

اس مرصّع دنیا میں پلی ہوئی جالپا کی یہ زیور پسندی بالکل فطری تھی مہینہ بھر سے زیادہ ہوگیا۔ پر ابھی اس کا زخم تازہ ہے۔ برائے نام کچھ کھا پی لیتی ہے۔ برائے نام ہنس بول لیتی ہے۔ دن بھر چار پائی پر پڑی ہوئی آسمان کی طرف تاکتی رہتی ہے۔ سارا گھر سمجھا کر ہار گیا۔ پڑوسنیں سمجھا کر ہار گئیں۔ دین دیال آکر سمجھا گئے۔ پر جالپا کے درد میں کوئی افاقہ نہ ہوا۔ اسے اب گھر میں کسی پر اعتبار نہیں ہے۔ یہاں تک کہ وہ رما سے بھی کھچی ہوئی رہتی ہے۔ وہ سمجھتی ہے سارا گھر اس سے بے اعتنائی کر رہا ہے۔ سب کے سب اس کی جان کے گاہک ہو رہے ہیں۔ جب ان کے پاس اتنی دولت ہے تو پھر اس کے گہنوں کو کیوں نہیں بنوا دیتے۔ جس سے ہم زیادہ پیار کرتے ہیں۔ اسی پر سب سے زیادہ ناراض بھی ہوتے ہیں۔ جالپا کو سب سے زیادہ غصہ رما ناتھ پر تھا۔ اگر یہ اپنے ماں باپ سے زور دے کر کہتے۔ تو کوئی ان کی بات نہ ٹال سکتا۔ مگر یہ کچھ کہیں بھی! ان کے منہ میں تو دہی جمایا ہوا ہے۔ مجھ سے محبت ہوتی تو یوں بے فکر نہ بیٹھے رہتے۔ جب تک ساری چیزیں نہ بنوا لیتے۔ رات کو نیند نہ آتی۔ آخر جائیں گے تو اپنی ہی طرف! میں کون ہوں۔

وہ رما سے صرف کبیدہ خاطر ہی نہ رہتی۔ وہ اس کی دل جوئی کرتا تو دو چار جل کٹی سنا دیتی۔ بے چارہ اپنا سا منہ لے کر رہ جاتا۔ غریب اپنی ہی لگائی ہوئی آگ میں جلا جاتا تھا۔ اگر وہ جانتا کہ اس کی ڈینگوں کا یہ نتیجہ ہوگا۔ تو زبان پر مہر لگا لیتا۔ یہ غم اس کے

لیے سوہانِ روح ہو رہا تھا۔ کہاں صبح سے شام تک ہنسی۔ قہقہہ۔ سیر سپاٹے میں کٹتے تھے۔ کہاں اب نوکری کی تلاش میں ٹھوکریں کھاتا پھرتا تھا۔ ساری مستی غائب ہوگئی تین ہزار کے زیور کیسے بنیں گے؟ اگر نوکر بھی ہوا تو ایسا کون سا بڑا عہدہ مل جائے گا۔ تین ہزار تو شاید تین پشتوں میں بھی نہ جمع ہوں۔ وہ کوئی ایسی تدبیر سوچ نکالنا چاہتا تھا۔ جس سے وہ جلد سے جلد بے حساب دولت کا مالک ہوجائے۔ کہیں اس کے نام کوئی لاٹری نکل آتی۔ تو پھر تو وہ جالپا کو زیوروں سے مڑھ دیتا۔ سب سے پہلے چندن ہار بنواتا۔ اس میں ہیرے جڑوا دیتا۔ مگر آج اُسے جعلی نوٹ بنانا آجاتا۔ تو ضرور بناکر چلا جاتا۔

ایک دن وہ شام تک نوکری کی تلاش میں مارا مارا پھرتا رہا۔ شطرنج کی بدولت اس کے کتنے ہی اچھے اچھے۔ آدمیوں سے یارانہ ہوگیا تھا۔ لیکن وہ شرم و لحاظ کے مارے کسی سے اظہارِ حال نہ کرتا۔ یہ بھی جانتا تھا کہ یہ خاطرداریاں اسی وقت تک ہیں جب تک وہ کسی کے سامنے مدد کے لیے ہاتھ نہیں پھیلاتا۔ یہ آن ٹوٹی تو پھر کوئی بات نہ پوچھے گا۔ کوئی ایسا نکتہ رس آدمی نہ نظر آتا تھا۔ جو ساری کیفیت قیافے سے تاڑ جائے اور اُسے کوئی معقول جگہ دلوا دے۔ آج وہ بہت رنجیدہ تھا۔ دوستوں پر ایسا غصہ آرہا تھا کہ ایک ایک کو پھٹکارے، اور آئیں تو دروازے ہی سے دھتکار دے۔ مگر وہ ذرا غور کرتا تو اسے معلوم ہوجاتا کہ اس معاملے میں دوستوں کا اتنا قصور نہ تھا۔ جتنا کہ خود اس کا۔ اس کا کوئی ایسا دوست نہ تھا۔ جس سے اس نے بڑھ بڑھ کر باتیں نہ بنائی ہوں۔ یہ اس کی عادت تھی۔ گھر کی اصلی کیفیت کو وہ بدنامی کے داغ کی طرح چھپاتا رہا۔ اور اب وہ کسی سے اپنا دردِ دل نہیں کہہ سکتا۔ گھر میں آکر منہ لٹکائے ہوئے بیٹھ گیا۔

باگیشری نے پانی لاکر رکھ دیا اور پوچھا۔ آج تم دن بھر کہاں رہے بیٹا؟ ہاتھ منہ دھو ڈالو۔

رما نے لوٹا اُٹھایا ہی تھا کہ جالپا نے آکر تند لہجہ میں کہا۔ "مجھے میرے گھر پہنچا دو۔ اسی وقت۔"

رما نے لوٹا رکھ دیا اور اس کی طرف اس طرح تاکنے لگا۔ گویا اس کی بات سمجھ میں نہ آئی ہو۔

باگیشری بولی۔ کیسی بات کہتی ہو بہو۔ بھلا اس طرح کہیں بہو بیٹیاں بدا ہوتی ہیں۔

جالپا نے جھلاہٹ کے ساتھ کہا۔ میں ان بہو بیٹیوں میں نہیں ہوں۔ میرا جس وقت جی چاہے گا جاؤں گی۔ جس وقت جی چاہے گا آؤں گی۔ جب یہاں کوئی میری بات نہیں پوچھتا تو میں بھی کسی کو اپنا نہیں سمجھتی۔ میں چڑیا نہیں ہوں جس کا پنجرا اور دانہ پانی رکھ کر بند کر دیا جائے۔ میں بھی آدمی ہوں۔ اب اس گھر میں ایک لمحہ بھر نہ رہوں گی۔ اگر کوئی میرے ساتھ نہ جائے گا۔ تو میں اکیلی ہی چلی جاؤں گی۔ راہ میں کوئی بھیڑیا نہیں بیٹھا ہے جو مجھے اُٹھا لے جائے گا۔

رما نے پوچھا۔ آخر کچھ معلوم بھی تو ہو کیا بات ہے؟

بات کچھ نہیں ہوئی۔ اپنا جی ہے۔ یہاں نہیں رہنا چاہتی۔

بھلا اس طرح جاؤگی تو تمھارے گھر والے کیا کہیں گے۔ یہ تو سوچو۔

یہ سب سوچ چکی ہوں اور زیادہ نہیں سوچنا چاہتی۔ میں جاکر اپنا اسباب باندھتی ہوں اور اسی گاڑی سے جاؤں گی۔

یہ کہہ کر جالپا اوپر چلی گئی۔ رما بھی پیچھے پیچھے یہ سوچتا ہوا چلا کہ اس کا غصہ کیسے ٹھنڈا کروں۔

جالپا اپنے کمرے میں جاکر بستر باندھ رہی تھی کہ رما نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا تمھیں میری قسم جو اس وقت جانے کا نام لو۔

جالپا نے تیوری چڑھاکر کہا۔ تمھاری قسم کی مجھے کچھ پرواہ نہیں ہے۔

اس نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور پھر بستر لپیٹنے لگی۔ رما کھسیانا سا ہوکر ایک کنارے کھڑا ہوگیا۔ جالپا نے بستر بند سے بستر کو باندھا۔ اور اپنا صندوق صاف کرنے لگی۔ مگر اس میں اب وہ پہلے کی سی تیزی نہ تھی۔ صندوق کو بار بار بند کرتی اور کھولتی تھی۔ بارش بند ہوچکی تھی۔ صرف چھت پر رُکا ہوا پانی ٹپک رہا تھا۔

آخر وہ بستر کے بنڈل پر بیٹھ گئی اور بولی۔ تم نے مجھے قسم کیوں دلائی؟

رما کے دل میں امید کی گدگدی پیدا ہوئی۔ بولا۔ اس کے سوا تمھیں روکنے کا میرے پاس اور کون ذریعہ تھا۔

کیا تم چاہتے ہو۔ میں یہیں گھٹ گھٹ کر مرجاؤں؟

تم ایسے منحوس الفاظ کیوں منہ سے نکالتی ہو۔ میں تو چلنے کے لیے تیار ہوں۔ مگر کم

سے کم ان لوگوں سے تو پوچھ لوں۔

بجھتی ہوئی آگ میں تیل پڑ گیا۔ جالپا تُرش ہو کر بولی۔ وہ میرے کون ہوتے ہیں کہ میں ان سے پوچھوں۔

رما نے پوچھا۔ کوئی نہیں ہوتے؟

جالپا نے بے اعتنائی سے جواب دیا۔ کوئی نہیں۔ اگر کوئی ہوتے تو میری طرف سے یوں دل نہ موٹا کرتے۔ اس قید میں تو میں پاگل ہو جاؤں گی۔ نہ کہیں آنا نہ جانا۔ نہ کسی سے بات چیت۔ یہ صورت تو مجھ سے نہیں دکھائی جاتی۔ آخر دو لڑکے اور بھی تو ہیں۔ ان کے لیے بھی تو کچھ جوڑیں گے۔

رما کو بڑی بڑی باتیں کرنے کا پھر موقع ملا۔ بولا۔ شاید تمھارا خیال ٹھیک ہے۔ نہیں تو ڈھائی تین ہزار ان کے لیے کیا بڑی بات تھی؟

"مگر ہیں مکھی چوس پرلے درجے کے۔"

"مکھی چوس نہ ہوتے تو اتنی دولت کہاں سے آتی۔"

"مجھے تو کسی کی پرواہ نہیں ہے جی۔ ہمارے گھر کس بات کی کمی ہے۔ جب تمھاری نوکری لگ جائے تو مجھے بلا لینا۔"

"تلاش کر رہا ہوں۔ کتنے ہی بڑے آدمیوں سے ملاقات ہے۔ یہی ... ذرا اچھی جگہ چاہتا ہوں۔"

"میں ان لوگوں کا رُخ سمجھتی ہوں۔ میں بھی یہاں اب دعوے ... رہوں گی۔ کسی سے ذکر کیا؟"

"شرم آتی ہے کسی سے کہتے ہوئے۔"

"اس میں شرم کی کون سی بات ہے۔ کہتے شرم آتی ہو تو رقعہ لکھ دو۔"

رما اُچھل پڑا۔ کتنی آسان تدبیر تھی۔ اور ابھی تک یہ سیدھی بات اسے نہ سوجھتی تھی۔ بولا۔ ہاں! یہ تم نے اچھی ترکیب بتائی۔ کل ضرور لکھوں گا۔

جالپا بولی۔ "واہ! تم آج ہی تھوڑی لوٹ آؤ گے۔"

رما بولا۔ "کیا تم سچ مچ جاؤ گی؟ تو مجھے نوکری مل چکی اور میں خط لکھ چکا۔ تمھارے فراق میں بیٹھ کر روؤں گا کہ نوکری ڈھونڈوں گا۔ نہیں اس وقت جانے کا خیال چھوڑو۔

نہیں سچ کہتا ہوں میں، کہیں بھاگ جاؤں گا۔ گھر کا حال دیکھ چکا تھا۔ تمھارے سوا اب اور کون بیٹھا ہوا ہے کہ جس کے لیے یہاں پڑا رہوں۔ ہٹو تو ذرا میں بستر کھول دوں۔"

جالپا نے بستر پر سے ذرا کھسک کر کہا۔ "میں بہت جلد چلی آؤں گی۔ تم گئے اور میں آئی۔"

رما بستر کھولتا ہوا بولا۔ "جی نہیں۔ معاف کیجیے۔ اس دھوکے میں میں نہیں آتا۔"

جالپا نے احسان جتاتے ہوئے کہا۔ "تم نے میرا بندھا بندھایا بستر کھول دیا۔ نہیں تو آج کتنے مزے سے گھر پہنچ جاتی۔ میں نے آج پکا ارادہ کرلیا تھا۔

رما نے پان کھایا اور اپنے کمرے میں آکر دوستوں کو خط لکھنے لگا۔

(۹)

رما ناتھ کے شناساؤں میں ایک رمیش بابو میونسپل بورڈ کے ہیڈ کلرک تھے۔ عمر تو چالیس سے اوپر تھی۔ مگر تھے بڑے شوقین! شطرنج کھیلنے بیٹھ جاتے تو سویرا کر دیتے۔ دفتر کی بھی یاد نہ رہتی۔ نہ کوئی آگے نہ پیچھے۔ جوانی میں بیوی مر گئی تھی۔ دوسری شادی نہیں کی۔ اس تجرد کی زندگی میں تفریحی مشاغل کے سوا دلچسپی کا اور کیا سامان تھا۔ رما سے ان کی بڑی بے تکلفی تھی۔ وہاں اور کون ایسا نٹھلا تھا۔ جو رات رات بھر ان سے شطرنج کھیلتا۔ کئی دن سے بچارے بہت بے قرار ہو رہے تھے۔ نہ رما آیا اور نہ شطرنج کی کوئی بازی ہوئی۔ اخبار کہاں تک پڑھتے۔ سوچا اب رما میرے پاس کیوں آنے لگا۔ کئی بار جی میں آیا کہ اسے بلوائیں۔ مگر یہ سوچ کر کہ وہ کیوں آنے لگا۔ رہ گئے کہاں جائیں۔ سوچا سینما ہی دیکھ آئیں۔ کسی طرح دن تو کٹے سینما سے انھیں بہت رغبت نہ تھی۔ مگر اس وقت انھیں سینما کے سوا اور کچھ نہ سوجھا۔ کپڑے پہنے اور جانا ہی چاہتے تھے کہ رما نے کمرے میں قدم رکھا۔

رمیش اُسے دیکھتے ہی گیند کی طرح لڑھک کر دروازے پر جا پہنچے اور اس کا ہاتھ پکڑ کر بولے۔ آؤ جی آؤ۔ تم اس بڈھے کو بھول ہی گئے۔ ہاں! بھائی اب کیوں آوگے! معشوق کی رسیلی باتوں کا مزا یہاں کہاں۔ چوری کا کچھ پتہ چلا؟

رما نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔ "کچھ بھی نہیں۔"

رمیش بابو نے چھوٹی میز اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ بہت اچھا ہوا تھانے میں

رپٹ نہیں لکھائی۔ نہیں سو دو سو کے ماتھے اور جاتی۔ دلہن کو تو بہت رنج ہوا ہوگا۔
"کچھ پوچھیے مت۔ میں تو تنگ آگیا۔ بابو جی سنتے ہی نہیں۔"
بابو جی کے پاس کیا قارون کا خزانہ رکھا ہوا ہے۔ دس بیس ہزار روپے ہوں گے۔ تو ابھی دو بچے بھی تو سامنے ہیں۔ نوکری کا بھروسہ ہی کیا۔
میں تو مصیبت میں پھنس گیا۔ اب معلوم ہوتا ہے کہ کہیں نوکری کرنی پڑے گی۔ چین سے زندگی کٹتی تھی۔ نہیں تو بیٹھے بٹھائے اس جنجال میں پھنس گئے۔ بتایئے ہے کہیں نوکری چاکری کا سہارا؟
رمیش نے طاق پر سے مہرے اور بساط اتارتے ہوئے کہا۔ آؤ ایک بازی ہوجائے۔ پھر اس مسئلے پر غور کریں۔ اسے جتنا آسان سمجھ رہے ہو۔ اتنا آسان نہیں۔
رما نے منہ پھیر کر کہا۔ میرا تو اس وقت کھیلنے کو جی نہیں چاہتا۔ اس وقت تو یہی فکر سر پر سوار ہے۔
رمیش! لو شطرنج کے مہرے بچھاتے ہوئے بولے۔ آؤ بیٹھو۔ ایک بازی تو کھیل لو۔ پھر سوچیں کیا ہوسکتا ہے۔
ذرا بھی جی نہیں چاہتا کہ سر منڈاتے ہی اولے پڑیں گے۔ تو شادی کے قریب ہی نہ جاتا۔
"دو چار چالیں چلو۔ تو آپ ہی جی لگ جائے گا۔ ذرا عقل کی گانٹھ کھلے۔"
بازی شروع ہوئی۔ کئی معمولی چالوں کے بعد رمیش نے رما کا رخ پلٹ لیا۔ رما نے میز پر ہاتھ ٹیک کر کہا۔ "اف کیا غلطی ہوئی ہے؟"
رمیش بابو کی آنکھوں میں نشہ کی سی سرخی پیدا ہونے لگی۔ شطرنج ان کے لیے شراب سے کم سرور انگیز نہ تھا۔ بولے۔ بہنی تو اچھی ہوئی۔ تمھارے لیے میں ایک تدبیر سوچ رہا ہوں۔ میرے ہی دفتر میں ایک جگہ خالی ہے۔ مگر مشاہرہ بہت کم ہے۔ محض تیس روپے۔ وہ خضابی ڈاڑھی والے خان صاحب نہیں ہیں۔ ان سے کام نہیں چلتا۔ سوچتا تھا۔ جب تک کسی طرح کام چلا چلے۔ پڑا رہنے دوں۔ بال بچے والے آدمی ہیں۔ اس بیکاری کے زمانے میں کہاں مارے مارے پھریں گے۔ مگر وہ خود ہی نوکری سے بیزار ہو رہے ہیں۔ تمھارے لائق وہ جگہ نہیں ہے۔ مگر چاہو تو فی الحال کرلو۔

یہ کہتے کہتے رما کا فیلا مار لیا۔

رما نے فیلے کو پھر اُٹھانے کی کوشش کرکے کہا۔ آپ مجھے باتوں میں لگا کر میرے مہرے اُڑاتے جاتے ہیں۔ اس کی سند نہیں لایئے میرا فیلا۔

"دیکھو بھائی بے ایمانی مت کرو۔ میں نے تمھارا فیلا زبردستی تو نہیں اُٹھایا۔ ہاں تو تمھیں وہ جگہ منظور ہے؟"

"تنخواہ تو تیس ہی ہیں۔"

"ہاں تنخواہ تو کم ہے۔ مگر شاید کچھ دنوں کے بعد ترقی ہوجائے۔ میری تو رائے ہے کر لو۔ جگہ آمدنی کی ہے۔ خان صاحب نے تو اسی جگہ رہتے ہوئے لڑکوں کو ایم۔ اے، ایل۔ ایل۔ بی کرا لیا۔ لڑکیوں کی شادیاں اچھے گھروں میں کیں۔ ہاں ذرا سمجھ بوجھ سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔

"رما نے بے غرضی جتلا کر کہا۔ "آمدنی کی مجھے پرواہ نہیں۔ رشوت کوئی اچھی چیز تو نہیں۔"

رمیش بابو نے رما کی آنکھ بچا کر ایک مہرے کو آگے بڑھا کر کہا۔ بہت خراب۔ مگر عیال دار آدمی کیا کرے۔ میں اکیلا آدمی ہوں۔ میرے لیے ڈیڑھ سو کافی ہیں۔ لیکن جس گھر میں بہت سے آدمی ہوں۔ لڑکوں کی تعلیم ہو۔ لڑکیوں کی شادیاں ہو۔ اس کے لیے رشوت کے سوا اور کیا چارہ ہے۔ جب تک چھوٹے چھوٹے آدمیوں کی تنخواہ اتنی نہ ہوجائے گی کہ وہ بھل منسی کے ساتھ نباہ کرسکیں۔ تب تک رشوت بند نہیں ہوسکتی۔

رما کا فرزیں پٹ گیا۔ رمیش بابو نے زور سے قہقہہ مارا۔

رما نے جھلا کر کہا۔ اگر آپ چپ چاپ کھیلیے تو کھیلیے۔ ورنہ میں تو جاتا ہوں۔ مجھے باتوں میں لگا کر سارے مہرے اڑا لیے۔"

رمیش نے دب کر کہا۔ "اچھا صاحب اب بولوں تو زبان پکڑ لیجیے۔ یہ لیجیے شہ۔ تو تم کل عرضی پیش کردو۔ مگر جس دن جگہ ملے گی میرے ساتھ رات بھر کھیلنا پڑے گا۔

"آپ تو دو ہی ماتوں میں رونے لگتے ہیں۔"

"اجی وہ دن گئے۔ جب آپ مجھے مات کردیا کرتے تھے۔ ادھر میں نے ایک منتر جگایا ہے۔ کیا مجال کوئی مات دے سکے۔ پھر شہ۔"

"جی تو چاہتا ہے کہ دوسری مات دے کر جاؤں۔ مگر دیر ہو گئی۔"

"دیر کیا ہو گی؟ ابھی تو کل نو بجے ہیں۔ کھیل لو۔ دل کا ارمان نکل جائے۔ یہ شہ۔ اور مات۔"

"اچھا کل ہی رہی، کل للکار کر پانچ ماتیں نہ دی ہوں تو کہیے گا۔"

"اجی جاؤ بھی۔ تم مجھے کیا مات دوگے۔ ہمت ہو تو ابھی سہی۔"

"اچھا آیئے آپ بھی کیا کہیں گے۔ مگر پانچ بازیوں سے کم نہ کھیلوں گا۔"

"پانچ نہیں تو دس کھیلو جی۔ رات تو اپنی ہے تو چلو پھر کھانا کھا لیں۔ تب اطمینان سے بیٹھیں۔ تمھارے گھر کہلائے دیتا ہوں کہ آج یہیں سوئیں گے۔ انتظار نہ کریں۔"

دونوں نے کھانا کھایا۔ اور شطرنج پر بیٹھے۔ پہلی بازی میں گیارہ بج گئے۔ رمیش کی جیت رہی۔ دوسری بازی بھی انھیں کے ہاتھ رہی۔ تیسری بازی ختم ہوئی تو دو بج گئے تھے۔ رما نے آنکھیں مل کر کہا۔ اب تو مجھے نیند آرہی ہے۔

رمیش نے کہا۔ تو منہ دھو ڈالو۔ برف رکھی ہوئی ہے۔ پانچ بازیاں کھیلے بغیر سونے نہ دوں گا۔

رمیش بابو کو یقین ہو رہا تھا کہ آج میرا نیر اقبال اوج پر ہے۔ نہیں تو رما کو متواتر تین ماتیں دینا آسان نہ تھا۔ مگر جب چوتھی ہار گئے تو یقین جاتا رہا۔ اندیشہ ہوا کہ کہیں متواتر ہارتا جاؤں۔ بولے اب تو سونا چاہیے۔

"کیوں پانچ بازیاں پوری نہ کر لیجیے؟"

"کیا فائدہ کل دفتر بھی تو جانا ہے۔"

رما نے زیادہ اصرار نہ کیا۔ دونوں آدمی سوئے۔

رما یوں بھی آٹھ بجے سے پہلے نہ اُٹھتا تھا۔ پھر آج تو تین بجے سویا تھا۔ آج تو اسے دس بجے تک سونے کا حق تھا۔ مگر رمیش بابو حسبِ معمول پانچ بجے اُٹھے۔ نہایا سندھیا کی گھومنے گئے۔ اور آٹھ بجے لوٹ آئے۔ رما اس وقت تک سوتا ہی رہا۔ آخر جب ساڑھے نو بج گئے۔ تو انھوں نے اسے جگایا۔

رما نے بگڑ کر کہا۔ ناحق جگایا۔ کیسے مزے کی نیند آرہی تھی۔

"ابھی تو عرضی دینی ہے تم کو یا نہیں؟"

"آپ دے دیجیے گا۔"

"اور جو کہیں صاحب نے بلایا تو میں ہی چلا جاؤں گا؟"

"اونہہ! جو چاہے کیجیے گا۔ میں تو سوتا ہوں۔"

رما پھر لیٹ گیا۔ رمیش نے کھانا کھایا۔ کپڑے پہنے اور دفتر چلنے کو تیار ہوئے۔ اس وقت رما یک بیک اُٹھا اور بولا۔ میں بھی چلوں گا۔

"ارے منہ تو دھو لو۔ بھلے آدمی۔"

"آپ تو چلے جارہے ہیں!"

"نہیں۔ نہیں پندرہ بیس منٹ تک رُک سکتا ہوں۔ تیار ہوجاؤ۔"

رما نے ایک منٹ میں منہ دھویا۔ پانچ منٹ میں کھانا کھایا اور چٹ پٹ رمیش کے ساتھ دفتر چلا۔

راستے میں رمیش نے مسکراکر کہا۔ گھر کیا بہانہ کروگے۔ کچھ سوچ رکھا ہے۔

"کہہ دوں گا۔ رمیش بابو نے آنے نہیں دیا۔"

"مجھے گالیاں دلواؤ گے اور کیا۔"

"مجھے عرضی لے کر صاحب کے پاس تو نہ جانا پڑے گا۔"

"اور کیا تم سمجھتے ہو گھر بیٹھے جگہ مل جائے گی؟ مہینوں دوڑنا پڑے گا۔"

"تو میں ایسی نوکری سے باز آیا۔ مجھے تو عرضی لے کر جاتے شرم آتی ہے۔ پہلے میں کلرکوں کو ذلیل سمجھتا تھا۔ مگر وہی بلا میرے سر پڑی۔"

"ابھی پہلے سب یوں ہی گھبراتے ہیں۔ جب میں نوکر ہوا۔ تو تمھاری عمر تھی۔ جس دن میری پیشی ہونے والی تھی۔ میں ایسا گھبرایا ہوا تھا۔ جیسے پھانسی پانے جارہا ہوں۔"

"آپ کو تو بیس بائیس سال نوکری کرتے ہوئے ہوں گے۔"

"پورے پچیس سال ہوگئے صاحب! بیس سال تو بیوی کے انتقال کو ہوگئے۔"

"آپ نے دوسری شادی کیوں نہیں کی۔ تب تو آپ کی عمر پچاس سے زیادہ نہ ہوگی۔"

رمیش نے حسرت ناک تبسم کے ساتھ کہا۔ محلوں کا سکھ بھوگنے کے بعد جھونپڑا کیسے اچھا لگتا ہے بھائی۔ محبت سے رُوح کو دائمی سکون ہوجاتا ہے۔ تم میری حالت سے

واقف ہو۔ اب تو بوڑھا ہوا۔ لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں۔
اس فرقت نصیب زندگی میں کبھی میری آنکھوں نے کسی حسینہ کی طرف نگاہ نہیں ڈالی۔ کئی بار شادی کے لیے لوگوں نے گھیرا بھی۔ لیکن کبھی خواہش ہی نہ ہوئی۔ اس محبت کی شیریں یادگاروں میں میرے لیے مسرت کے سارے سامان موجود ہیں۔
یوں باتیں کرتے ہوئے دونوں آدمی دفتر پہنچ گئے۔

(۱۰)

رما دفتر سے گھر پہنچا۔ تو چار بج گئے تھے۔ وہ دفتر ہی میں تھا کہ آسمان پر بادل گھر آئے۔ پانی آیا ہی چاہتا تھا، پر رما کو گھر پہنچنے کی ایسی جلدی تھی کہ وہاں رُک نہ سکا۔ احاطہ کے باہر بھی نکلنے نہ پایا تھا کہ زور کی بارش ہونے لگی۔ اساڑھ کا پہلا پانی تھا۔ ایک لمحہ میں وہ لت پت ہوگیا۔ پھر بھی وہ کہیں ٹھہرا نہیں۔ کامیابی کی خوشخبری کی مسرت میں اس ڈونگرے کی کیا پرواہ کرسکتا تھا۔ اس نے دل میں حساب لگا لیا تھا کہ کتنی ماہوار بچت ہوجانے سے وہ جالپا کے لیے جلد سے جلد چندن ہار بنوا سکے گا۔ اگر پچاس ساٹھ روپے مہینہ بھی بچ جائیں تو پانچ سال میں جالپا زیوروں سے لد جائے گی۔ گھر پہنچ کر اس نے کپڑے بھی نہ اُتارے۔ لت پت جالپا کے کمرے میں پہنچ گیا۔
جالپا نے پوچھا۔ "یہ بھیگ کہاں گئے۔ اور رات کہاں غائب تھے؟"
رما ناتھ نے کپڑے اُتارتے ہوئے کہا۔ "نوکری کی فکر میں پڑا ہوا تھا۔ اس وقت دفتر سے چلا آتا ہوں۔ مجھے ایک جگہ مل گئی ہے۔
جالپا نے کھل کر پوچھا۔ "سچ! کتنے کی جگہ ہے؟"
رما کو صحیح تعداد بتلانے میں تامل ہوا۔ تیس کی نوکری بتلانا کسر شان تھی۔ بولا۔ ابھی تو چالیس ملیں گے۔ مگر ترقی جلد ہوگی۔ جگہ آمدنی کی ہے۔
جالپا نے کسی بڑے عہدے کی اُمید کر رکھی تھی۔ بولی۔ "چالیس میں کیا ہوگا؟ بھلا ساٹھ ستر تو ہوتے۔"
رما۔ مل تو سکتی تھی سو روپیہ کی بھی۔ مگر یہاں رعب ہے اور بالائی آمدنی کی گنجائش بھی کافی ہے۔
جالپا نے سادگی سے پوچھا۔ تو تم رشوت لوگے۔ غریبوں کا گلا کاٹو گے۔

رما نے ہنس کر کہا۔ نہیں جی۔ وہ جگہ ایسی نہیں ہے کہ غریبوں کا گلا کاٹنا پڑے بڑے بڑے مہاجنوں سے سابقہ ہوگا اور وہ خوشی سے دیں گے۔

جالپا کو اطمینان ہوگیا۔ بولی۔ تب ٹھیک ہے۔ غریبوں کا کام یوں ہی کر دینا۔

"ہاں! ایسا تو کروں گا ہی۔"

جاکر اماں جی سے تو کہہ آؤ نہ مجھے تو سب سے بڑی خوشی یہی ہے کہ اب معلوم ہوگا۔ یہاں میں بھی کچھ ہوں۔"

"ہاں جاتا ہوں۔ مگر ان سے تو میں ہیں ہی بتلاؤں گا۔

جالپا خوش ہوکر بولی۔ اور کیا۔ اور اوپر کی آمدنی کا تو ذکر کرنا فضول ہے۔

اتنے میں ڈاکیے نے پکارا۔ رما نے دروازے پر جاکر دیکھا تو ان کے نام کا ایک پارسل تھا۔ منشی دین دیال نے بھیجا تھا۔ لے کر خوش خوش گھر میں آئے اور چٹ پٹ قینچی نکال کر پارسل کھولا۔ اس کے اندر ایک چھوٹی سی ڈبیا میں ایک چندن ہار رکھا ہوا تھا۔ رما نے خوش ہوکر کہا۔ یہ تو اچھا شگون ہے۔

جالپا نے کچھ رنجیدہ ہوکر کہا۔ اماں جی کو یہ کیا سوجھی۔ یہ تو انھیں کا ہار ہے۔ ابھی ڈاک کا وقت ہو تو اسے لوٹا دو۔

رما نے تعجب سے پوچھا۔ کیوں لوٹانے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ ناراض نہ ہوں گے۔

جالپا نے ناک سکوڑ کر کہا۔ میری بلا سے! میں ان کی عنایت کے بغیر بھی زندہ رہ سکتی ہوں۔ آج اتنے دنوں کے بعد انھیں یہ خیال آیا ہے۔ ان کی چیز انھیں مبارک ہو۔ میں کسی کا احسان لینا نہیں چاہتی۔ تم خیریت سے رہوگے تو مجھے بہت زیور ملیں گے۔

رما نے تسکین دے کر کہا۔ میری رائے تو یہ ہے کہ اس وقت ہار رکھ لو۔ سوچو انھیں کتنا رنج ہوگا۔ اگر رخصتی کے وقت نہ دیا۔ تو اچھا ہی ہوا۔ ورنہ یہ بھی غائب ہو جاتا۔

"میں اسے لوں گی نہیں۔ یہ طے ہے۔"

"آخر کیوں؟"

جالپا نے حسرت ناک لہجہ میں کہا۔ اسی لیے کہ اماں نے اسے خوشی سے نہیں دیا تھا۔ بہت ممکن ہے کہ اسے بھیجتے وقت وہ روئی ہوں اور اس میں تو کوئی شک ہی نہیں کہ اسے واپس پاکر انھیں سچی خوشی ہوگی۔ دینے والے کا دل دیکھا جاتا ہے۔ خوشی سے اگر وہ

مجھے ایک چھلا بھی دیں تو دونوں ہاتھ بڑھا کر لے لوں۔ جب دل پر جبر کرکے دُنیا کی لاج سے دیا تو کیا دیا۔ میں کسی خیرات نہ لوں گی۔ چاہے وہ اپنی ماں ہی کیوں نہ ہو۔

جالپا کو ماں کی طرف سے اتنا بدظن دیکھ کر رما اور کچھ نہ کہہ سکا۔ بدگمانی دلیل اور ثبوت کی پرواہ نہیں کرتی۔ اس نے ہار اُٹھا لیا اور بولا۔ ذرا لوگوں کو تو دکھا دوں۔ کم سے کم ان سے پُوچھ تو لینا چاہیے۔

جالپا نے ہار اس کے ہاتھ سے چھین لیا اور بولی میں کسی سے کچھ نہیں پُوچھنا چاہتی۔ میری مرضی ہے۔ لوں یا واپس کروں۔ کسی سے پوچھنے کی ضرورت؟"

س نے ہار کو اسی ڈبیا میں رکھ دیا۔ اور اس پر کپڑا لپیٹ کر سینے لگی۔ رما نے ایک بار پھر ڈرتے ڈرتے کہا۔ ایسی جلدی کیا ہے؟ دس پانچ دن میں لوٹا دینا۔ ان لوگوں کی بھی خاطر ہوجائے گی۔

جالپا نے بے رُخی کے ساتھ کہا۔ جب تک میں اسے لوٹا نہ دوں گی۔ مجھے چین نہ آئے گا۔

ایک لمحہ میں پارسل تیار ہوگیا۔ اور رما اسے لیے متفکرانہ انداز سے نیچے اُترا۔ گھڑی میں چار بجے تھے۔

(۱۱)

منشی دیا ناتھ کو جب رما کے نوکر ہونے کی خبر ملی۔ تو بہت خوش ہوئے۔ شادی ہوتے ہی وہ اتنی جلدی سنبھل جائے گا۔ اس کی انھیں اُمید نہ تھی۔ بولے جگہ تو اچھی ہے۔ ایمان داری سے کام کروگے تو اچھی جگہ پر پہنچ جاؤگے۔ میری یہی نصیحت ہے کہ پرائے پیسے کو حرام سمجھنا۔

رما کے جی میں تو آیا کہ صاف کہہ دے کہ آپ اپنی نصیحت اپنے ہی لیے رکھیں۔ یہ میرے موافق نہیں ہے۔ مگر اتنا بے حیا نہ تھا۔

دیا ناتھ نے پھر پوچھا۔ "یہ جگہ تو تیس روپے کی تھی۔ تمھیں بیس ہی کیوں ملے؟"

رما ناتھ نے بات بنائی۔ نئے آدمی کو پوری تنخواہ کیسے دیتے۔ شاید سال چھ مہینے میں ترقی ہوجائے۔

رما نے دوسرے دن نیا سوٹ بنوایا اور فیشن کی کتنی ہی چیزیں خریدیں۔

سسرال سے ملے ہوئے روپے کچھ بچ رہے تھے۔ کچھ دوستوں سے قرض لیے۔ وہ صاحبی ٹھاٹھ بناکر سارے دفتر پر رعب جما دینا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا۔ اچھی آمدنی جبھی ہوسکتی ہے جب اچھا ٹھاٹھ ہو۔ سڑک کے چوکیدار کو یکے والے ایک پیسہ دے کر ٹال دیتے ہیں۔ اس کی جگہ سارجنٹ ہو تو کسی کی ہمت نہ پڑے گی کہ اسے ایک پیسہ دکھائے۔ پھٹے حال بھکاری کے لیے ایک چٹکی کافی ہے۔ لیکن گیروے ریشم پہنے ہوئے بابا جی کو شرماتے شرماتے بھی ایک روپیہ دینا ہی پڑتا ہے۔

تیسرے دن رما کوٹ پتلون پہن کر نکلا۔ تو اس کی شان ہی کچھ اور ہوگئی۔ چپراسیوں نے جھک جھک کر سلام کیے۔ رمیش بابو سے مل کر جب وہ اپنے کام کا چارج لینے آیا۔ تو دیکھا۔ ایک برآمدے میں پھٹی ہوئی میلی دری پر ایک میاں صاحب صندوق پر رجسٹر پھیلائے بیٹھے تھے اور بیوپاری لوگ انھیں چاروں طرف سے گھیرے کھڑے ہیں۔ سامنے ٹھیلے اور گاڑیوں کے بازار لگے ہوئے ہیں۔ سبھی اپنے اپنے کام کی جلدی مچا رہے ہیں۔ سارا کام انتہا درجہ کی بے قاعدگی کے ساتھ ہو رہا ہے۔ اس پھٹی ہوئی دری پر بیٹھنا رما کو اپنی شان کے خلاف معلوم ہوا۔ وہ سیدھا رمیش کے پاس جاکر بولا۔ کیا آپ مجھے بھی اسی میلی دری پر بٹھانا چاہتے ہیں۔ ایک اچھی سی میز اور کئی کرسیاں بھجوایئے۔ رمیش بابو نے مسکرا کر میز اور کرسیاں بھجوا دیں۔ رما ناتھ شان سے کرسی پر بیٹھا۔ بوڑھے منشی جی اس کی رعونت پر دل میں ہنس رہے تھے۔ سمجھ گئے ابھی نیا جوش ہے۔ نئی امنگ ہے۔ چارج دے دیا۔ چارج میں تھا ہی کیا۔ صرف ایک رجسٹر اور آج کی آمدنی کا حساب! محصول کے نرخ کا گوشوارہ موجود تھا۔ بوڑھے منشی جی نے اگرچہ خود استعفیٰ دیا تھا۔ پر اس وقت یہاں سے جاتے ہوئے انھیں رنج ہو رہا تھا۔ اس جگہ وہ تیس سال سے برابر چلے آرہے تھے۔ اسی جگہ کی بدولت انھوں نے دولت اور نام دونوں ہی کمایا۔ اسے چھوڑتے ہوئے کیوں نہ رنج ہوتا۔ چارج دے کر جب وہ رخصت ہونے لگے تو رما ناتھ ان کے ساتھ زینہ کے نیچے تک گیا۔ خان صاحب اس کے اخلاق سے خوش ہوگئے اور بولے ہر ایک بلٹی پر ایک آنہ بندھا ہوا ہے۔ کھلا ہوا راز ہے۔ لوگ شوق سے دیتے ہیں۔ آپ کو خدا نے توفیق دی ہے۔ مگر رسم نہ بگاڑیئے گا۔ ایک بار کوئی رسم ٹوٹ جاتی ہے۔ تو اس کا بندھنا مشکل ہوجاتا ہے۔ اس ایک آنہ میں آدھا چپراسیوں کا حق ہے آدھا آپ کا۔ جو بڑے بابو

پہلے تھے وہ پچیس روپے ماہوار لیتے تھے۔ مگر یہ تو بالکل بے لوث ہیں۔

رما نے بے دلی کے ساتھ کہا۔ مجھے تو یہ گندہ معلوم ہوتا ہے۔ میں صفائی کے ساتھ کام کرنا چاہتا ہوں۔

بوڑھے میاں نے ہنس کر کہا۔ ابھی گندہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن پھر اسی میں لطف آئے گا۔

خان صاحب کو رخصت کرکے رما اپنی کرسی پر آبیٹھا۔ اور ایک چپڑاسی سے بولا۔ ان لوگوں سے کہو کہ برآمدے کے نیچے چلے جائیں اور ایک ایک کرکے نمبروار آویں۔ ایک کاغذ پر سب کے نام نمبروار لکھ لیا کرو۔ جو پہلے آئے اس کا کام پہلے ہونا چاہیے۔ مجھے یہ لڑدھوں دھوں پسند نہیں کہ سب سے پیچھے والے شور مچا کر پہلے آجائیں اور پہلے والے کھڑے منہ تاکتے رہیں۔

کئی بیوپاریوں نے کہا۔ ہاں بابو جی یہ انتظام ہوجائے تو بہت اچھا ہو۔

یہ حکم رما کا رعب جمانے کے لیے کافی تھا۔ روزگاریوں کے حلقے میں آج ہی اس باقاعدگی اور ضابطہ کی تعریف ہونے لگی ہے۔ کسی بڑے کالج کے پروفیسر کو اتنی شہرت عمر بھر میں نہ ملتی۔

دو چار دن کے تجربے سے رما کو سارے داؤ گھات معلوم ہوگئے۔ ایسی ایسی گھاتیں سُوجھ گئیں جو خان صاحب کو خواب میں بھی نہ سوجھی تھیں۔ مال کے وزن شمار اور تشخیص میں اتنی دھاندلی تھی جس کی کوئی حد نہیں۔ جب اس دھاندلی سے بیوپاریوں کو سینکڑوں کی بچت ہوجاتی ہے تو رما بلٹی پر ایک ایک آنہ لے کر کیوں قناعت کرے۔ ذرا سختی کا برتاؤ کرکے وہ دولت اور نیک نامی دونوں ہی حاصل کرسکتا ہے۔ پھر وہ اس سنہرے موقع کو کیوں چھوڑ دے۔

رما کی آمدنی تیزی سے بڑھنے لگی۔ آمدنی کے ساتھ وقار بھی بڑھا کہ سوکھی قلم گھسنے والے دفتر کے بابوؤں کو جب سگرٹ۔ پان۔ چائے یا چاٹ کی خواہش ہوتی۔ تو رما کے پاس چلے آتے۔ بہتی گنگا تھی۔ جس میں سبھی ہاتھ دھوسکتے تھے۔ سارے دفتر میں رما کی تعریف ہونے لگی۔ پیسے کو تو وہ کچھ سمجھتا ہی نہیں۔ کیا دل ہے کہ واہ! اور جیسا دل ہے ویسی زبان بھی ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔ رگ رگ میں شرافت بھری ہوئی ہے۔ بابوؤں کا

جب یہ حال تھا۔ تو چپراسیوں اور چوکیداروں کا پوچھنا کیا؟ سب کے سب رما کے بن داموں غلام تھے۔ ان غریبوں کا وقار بھی بڑھا۔ جہاں گاڑیبان تک پھٹکار دیا کرتے تھے۔ وہاں اب لپھے اچھوں کی گردن پکڑ کر نیچے دھکیل دیتے تھے۔ رما ناتھ کا سکہ بیٹھ گیا۔

مگر جالپا کی آرزوئیں ابھی ایک بھی پوری نہ ہوئیں۔ ناگ پنچمی کے دن محلے کی کئی لڑکیاں جالپا کے ساتھ کجلی کھیلنے آئیں۔ مگر جالپا اپنے کمرے کے باہر نہیں نکلی۔ بھادوں میں جنم اشٹمی کی تقریب آئی۔ پڑوس ہی میں ایک سیٹھ جی رہتے تھے۔ ان کے یہاں بڑے دھوم دھام سے جشن منایا جاتا تھا۔ وہاں سے ساس اور بہو کا بلاوا آیا۔ جاگیشری گئی۔ جالپا نے جانے سے انکار کردیا۔ ان تین مہینوں میں اس نے رما سے ایک بار بھی زیوروں کا چرچا نہ کیا۔ اس گوشہ تنہائی میں وہ اس فہرست کو دیکھا کرتی۔ جو رما ایک دن کہیں سے اُٹھا لایا تھا۔ اس میں طرح طرح کے نفیس زیوروں کے نمونے بنے ہوئے تھے۔ رما کو دیکھتے ہی وہ فہرست چھپا لیتی تھی۔ اپنی گرویدگی کا پردہ ڈھکا رکھنا چاہتی تھی۔

رما آدھی رات کے بعد لوٹا تو دیکھا جالپا کمرے کے دروازے پر کھڑی ہے۔ ہمدردانہ انداز سے بولا۔ تم گئی کیوں نہیں۔ لوگ انتظار کر رہے تھے۔ بڑا اچھا گانا ہو رہا تھا۔

جالپا نے بے اعتنائی سے کہا۔ "تم تو سُن آئے۔ میں نہ گئی۔ تو کیا ہوا۔ وہاں جاتی تو کس کے منہ میں کالک لگتی؟"

رما شرمندہ ہوکر بولا۔ کالک لگنے کی کوئی بات نہ تھی۔ سبھی جانتے ہیں کہ چوری ہو گئی ہے اور اس زمانے میں دو چار ہزار روپیہ کی چیزیں بنوا لینا منہ کا نوالہ نہیں ہے۔

چوری کا لفظ زبان پر لاتے ہی رما کا کلیجہ دھڑک اُٹھا۔ جالپا شوہر کی طرف تیز نگاہوں سے دیکھ کر رہ گئی۔ بولنے سے بات بڑھ جانے کا اندیشہ تھا۔ لیکن رما کو اس کی نگاہ سے ایسا مترشح ہوا۔ گویا اسے چوری کا راز معلوم ہے اور محض حجاب کے باعث اسے زبان پر نہیں لاتی۔ انھیں اس خواب کی بھی یاد آئی۔ جو جالپا نے اس رات کو دیکھا تھا۔ وہ نگاہ تیر کی طرح اس کے دل میں چبھنے لگی۔ اسے پھر خیال آیا شاید مجھے دھوکا ہوا۔ اس کی نگاہ میں غصہ کے سوائے اور کچھ نہیں ہے۔ مگر یہ چپ کیوں ہے؟ کچھ بولتی کیوں نہیں۔ اس کی خاموشی غضب تھی۔ اپنا شبہ رفع کرنے اور جالپا کے دل کی تھاہ لینے کے لیے گویا اس نے ڈبکی ماری۔ یہ کون جانتا تھا کہ اس کے گھر میں قدم رکھتے ہی یہ مصیبت تمھاری پیشوائی

کرے گی۔

جالپا آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔ تو میں تم سے زیوروں کا تقاضا تو نہیں کرتی۔ تقدیر کے نوشتے کو انسان ٹال سکتا۔ تو رونا ہی کس بات کا تھا۔ جن عورتوں کو زیور میسّر نہیں ہوتے کیا ان کے دن نہیں کٹتے؟

اس جواب نے رما کا شبہ تو رفع کر دیا تھا۔ مگر اس میں جو نالے درد چھپا ہوا تھا۔ اس سے چھپا نہ رہا۔ ان تین مہینوں میں بہت احتیاط کرنے پر بھی وہ سو روپیہ سے زیادہ جمع نہ کرسکا تھا۔ بابوؤں کی خاطر اور تواضع میں اسے بہت بل کھانا پڑتا تھا۔ مگر بغیر کھلائے پلائے کام بھی تو نہ چل سکتا تھا۔ سبھی اس کے دشمن ہوجاتے اور اسے اکھاڑنے کی گھاتیں سوچنے لگتے۔ مفت کی دولت تنہا ہضم نہیں ہوتی۔ یہ وہ خوب جانتا تھا۔ ہاں وہ خود ایک پیسہ بھی فضول خرچ نہ کرتا۔ ہوشیار بیوپاری کی طرح وہ جو کچھ خرچ کرتا تھا وہ صرف کمانے کے لیے اسے تسلی دے کر بولا۔ ایشور نے چاہا۔ ایک آدھ چیز بن ہی جائے گی۔

جالپا نے صابرانہ انداز سے کہا۔ میں ان عورتوں میں نہیں ہوں جو زیوروں پر جان دیتی ہوں۔ اسی طرح کسی کے گھر آتے جاتے شرم آتی ہی ہے۔

جالپا کے ایک ایک لفظ سے حسرت اور مایوسی ٹپک رہی تھی۔ اس کی روحانی خلش کا باعث کون تھا۔ جالپا نے اگر لحاظ کے مارے زیوروں کا ذکر نہ کیا تو رما اس کے آنسو پونچھنے کے اس کی دل جوئی کرنے کے لیے کیا خاموشی کے رائے کوئی تدبیر نہ تھی۔ محلے میں روز ہی ایک نہ ایک تقریب آتی رہتی ہے۔ روز ہی پاس پڑوس کی عورتیں ملنے آتی ہیں۔ بے چاری جالپا کب تک اس طرح اپنے دل پر جبر کرتی رہے گی۔ ہنسنے بولنے کو کس کا جی نہیں چاہتا۔ کون قیدیوں کی طرح اکیلے پڑا رہنا پسند کرتا ہے۔

اس نے سوچا۔ کیا کسی تدبیر سے زیور اُدھار نہیں لیے جاسکتے۔ کئی بڑے بڑے صرافوں سے اس کا دوستانہ ہوگیا تھا۔ لیکن مشکل یہی تھی کہ ان سے کہے کون۔ ممکن ہے کہ وہ انکار ہی کردیں یا کوئی بہانہ کرکے ٹال دیں۔ تو مفت کی خفت ہو۔ اس نے طے کیا کہ ابھی اُدھار لینا مناسب نہ ہوگا۔ کہیں وعدے پر روپے نہ ادا ہوئے تو شرمندہ ہونا پڑے گا۔ ابھی کچھ دن اور صبر کرنا چاہیے۔

دفعتاً اسے خیال آیا۔ دیکھو اس معاملے میں جالپا کی کیا رائے ہے۔ اگر جالپا کو خواہش

ہو تو وہ کسی صراف سے سلسلہ جنبائی کرے گا اور ذلت اور شرمندگی کو خوشی سے برداشت کرے گا۔ بولا۔ تم سے ایک صلاح کرنا چاہتا ہوں۔

جالپا کو نیند آرہی تھی۔ آنکھیں بند کیے ہوئے بولی۔ اب سونے دو۔ بھائی! سویرے اُٹھنا ہے۔

رما نے پوچھا۔ اگر تمھاری رائے ہو تو کسی صراف سے وعدے پر چیزیں بنوا لاؤں۔ اس میں تو کوئی ہرج نہیں ہے۔

جالپا کی آنکھیں کھل گئیں۔ کتنا بے رحمانہ سوال تھا۔ کسی مہمان سے پوچھنا کہ کہیے تو آپ کے لیے کھانا لاؤں۔ اس کا تو یہی مطلب ہے کہ ہم مہمان کو کھلانا نہیں چاہتے۔ رما کو لازم تھا کہ چیزیں لاکر جالپا کے سامنے رکھ دیتا۔ اس کے بار بار پوچھنے پر بھی اسے یہی کہنا چاہیے تھا کہ نقد لایا ہوں۔ تب وہ البتہ خوش ہوتی۔ اس معاملے میں اس کی صلاح لینا اس کے زخم پر نمک چھڑکنا تھا۔ جالپا نے رما کی طرف نا ہمدردانہ نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ میں تو زیوروں کے لیے اتنی بے قرار نہیں ہوں۔

رما نے کہا۔ نہیں یہ بات نہیں۔ آخر اس میں کیا ہرج ہے کہ کسی صراف سے سودا کر لیا جائے۔ روپے رفتہ رفتہ چکا دیے جائیں گے۔

جالپا نے بغیر کسی توقف کے جواب دیا۔ نہیں میرے لیے قرض لینے کی ضرورت نہیں۔ میں بیسوا نہیں ہوں کہ تمھیں نوچ کھسوٹ کر اپنا راستہ لوں۔ مجھے تمھارے ساتھ جینا اور مرنا ہے۔ اگر مجھے ساری عمر زیوروں کے بغیر رہنا پڑے۔ تو بھی میں قرض لینے کو نہ کہوں گی۔ عورتوں کو گہنوں کی اتنی ہوس نہیں ہوتی۔ گھر کے آدمیوں کو مصیبت میں ڈال کر زیور پہننے والیاں دوسری ہوں گی۔ لیکن تم نے تو پہلے کہا تھا۔ جگہ بڑی آمدنی کی ہے۔ مجھے تو کوئی خاص بچت نہیں دکھائی دیتی۔

رما نے صفائی دی۔ بچت تو ضرور ہوتی اور اچھی ہوتی۔ لیکن جب اہل کاروں کے مارے بچنے بھی پائے۔ سب کے سب شیطان کی طرح سر پر سوار رہتے ہیں۔

تو ابھی کون سی جلدی ہے۔ بنتے رہیں گے آہستہ آہستہ!

خیر تمھاری صلاح ہے تو ابھی خاموش رہتا ہوں۔ میں سب سے پہلے کنگن بنواؤں گا۔ تمھارے پاس ابھی اتنے روپے کہاں ہوں گے؟

اس کی فکر میں کرلوں گا۔ تمھیں کیسا کنگن پسند ہے؟

جالپا اپنے مصنوعی استغنا کو نہ نبھا سکی۔ الماری میں سے زیوروں کی فہرست نکال کر رما کو دکھانے لگی۔ اس وقت وہ اتنی سرگرم تھی۔ گویا سونا آکر رکھا ہوا ہے۔ سنار بیٹھا ہوا ہے صرف وضع کا پسند کرنا باقی ہے۔ اس نے فہرست کے دو ڈیزائن پسند کیے اور دونوں نہایت خوش نما۔ مگر رما ان کی قیمت دیکھ کر سکتے میں آگیا۔ ایک ایک ہزار کا تھا۔ دوسرا آٹھ سو کا۔

رما نے ٹال کر کہا۔ ایسی چیزیں تو یہاں بن بھی نہ سکیں۔ مگر کل میں ذرا صرافے کی سیر کروں گا۔

جالپا نے فہرست کو بند کر کے حسرت ناک لہجہ میں کہا۔ تمھارے پاس نہ جانے کبھی روپے ہوں گے یا نہیں۔ اونہہ! بنیں گے۔ نہیں کون کوئی گہنے کے بغیر مرا جاتا ہے۔

رما کو آج اس اُدھیڑ بُن میں بڑی دیر تک نیند نہ آئی۔ یہ جڑاؤ کنگن اس گوری گوری کلائیوں پر کتنے بھلے معلوم ہوں گے۔ یہ دل آویز خواب دیکھتے دیکھتے نہ جانے کب نیند آگئی۔

(۱۲)

دوسرے دن سویرے ہی رما نے رمیش بابو کے گھر کا راستہ لیا۔ ان کے یہاں جنم اشٹمی کی جھانکی ہوتی تھی۔ انھیں خود تو اس سے کوئی شوق نہ تھا۔ مگر ان کی بیوی یہ جشن مناتی تھیں۔ اس کی یادگار میں وہ اب تک رسم ادا کرتے جاتے تھے۔ رما کو دیکھ کر بولے آؤ جی رات کیوں نہیں آئے۔ مگر یہاں غریبوں کے گھر کیوں نہیں آتے۔ سیٹھ جی کے یہاں تو خوب بہار ہوگی۔

رما۔ ایسی سجاوٹ تو نہ تھی۔ ہاں گانے کا اچھا انتظام تھا۔ کئی کتھک اور کئی طوائفیں بھی تھیں۔

رمیش۔ سیٹھ جی نے تو وعدہ کیا تھا کہ طوائفیں نہ آنے پائیں گی۔ مگر اس کی پرواہ نہ کی۔ ایک تو طوائفوں کا ناچ یوں ہی بُرا۔ اس پر ٹھاکر دوارے میں۔ نہ جانے ان گدھوں کو کب عقل آئے گی۔

رما۔ طوائفیں نہ ہوں تو جھانکی کو دیکھنے جائے ہی کون۔ سبھی تو آپ کی طرح زاہد نہیں ہیں۔

رمیش۔ خیر! فرصت ہو تو آؤ۔ ایک آدھ بازی ہوجائے؟

رما۔ اور آیا کس لیے ہوں۔ مگر آج آپ کو میرے ساتھ صرافے تک چلنا پڑے گا۔

رمیش۔ چلنے کو چلا چلوں گا۔ مگر اس معاملے میں میں بالکل کورا ہوں۔ نہ کوئی چیز بنوائی نہ خریدی۔ تمھیں کچھ لینا ہے؟

رما۔ لینا دینا کیا ہے۔ ذرا بھاؤ تاؤ دیکھنا ہے؟

رمیش۔ معلوم ہوتا ہے۔ گھر میں پھٹکار پڑی ہے؟

رما۔ وہ تو زیوروں کا نام تک نہیں لیتی۔ لیکن اپنا فرض تو کچھ ہے؟

رمیش۔ شاید کچھ روپے جمع کرلیے۔

رما۔ روپے کس کے پاس ہیں۔ وعدے پر لوں گا۔

رمیش۔ بھائی اس خبط میں نہ پڑو۔ جب تک روپے ہاتھ میں نہ ہوں۔ بازار کی طرف جاؤ ہی مت۔ زیوروں سے تو بڈھے نئی بیبیوں کا دل خوش کیا کرتے ہیں۔ جوانوں کے لیے بہت سے لٹکے ہیں۔

رما۔ میں دو تین مہینے میں سب روپے ادا کردوں گا۔ اگر اس کا یقین نہ ہوتا۔ تو میں ذکر ہی نہ کرتا۔

رمیش۔ تو دو تین مہینے اور کیوں صبر نہیں کرجاتے۔ یہ میں جانتا ہوں کہ تمھاری آمدنی اچھی ہے۔ لیکن آئندہ کے بھروسے پر اور جو کام چاہے کرو۔ قرض کبھی مت لو۔ زیوروں کا قرض اس غریب ملک میں نہ جانے کیسے پھیل گیا۔ جنھیں روٹیوں کا بھی ٹھکانا نہیں۔ وہ بھی زیوروں کے پیچھے جان دیتے ہیں۔ ہر سال اربوں روپے سونا چاندی خریدنے میں صرف ہوجاتے ہیں۔ دنیا کے اور کسی ملک میں زیوروں کا اتنا رواج نہیں۔ ترقی یافتہ ملکوں میں دولت تجارت میں صرف ہوتی ہے جس سے لوگوں کی پرورش ہوتی ہے۔ اور دولت میں اضافہ ہوتا ہے۔ یہاں دولت آرائش میں خرچ ہوتی ہے۔ بس یہی سمجھ لو کہ جس ملک میں جتنی ہی زیادہ جہالت پیدا ہوتی ہے۔ اُتنا ہی زیوروں کا رواج ہوتا ہے۔ یہاں تو خیر ناک کان چھدا کر ہی رہ جاتے ہیں۔ مگر بعض ایسے ملک بھی ہیں جہاں ہونٹ چھدوائے جاتے ہیں اور اس میں زیور پہنتے ہیں۔

رما۔ وہ کون سا ملک ہے؟

رمیش۔ اس وقت تو ٹھیک یاد نہیں آتا۔ شاید افریقہ ہو۔ تمھیں یہ سن کر تعجب ہوتا ہے۔
لیکن دوسرے ملک والوں کے لیے ناک کان کا چھیدنا کچھ کم تعجب کی بات نہ ہوگی۔
بُرا مرض ہے! وہ دولت جو کھانے پینے میں صرف ہونی چاہیے۔ بال بچوں کا پیٹ
کاٹ کر زیوروں کی نذر کردی جاتی ہے۔ بچوں کو دودھ نہ ملے نہ سہی۔ گھی کی بو
تک ان کی ناک میں نہ پہنچے نہ سہی۔ میوؤں اور پھلوں کے درشن انھیں نہ ہوں۔
کوئی مضایقہ نہیں۔ مگر بیوی گہنے ضرور پہنے گی۔ اور میاں گہنے ضرور بنوائیں گے۔

رما۔ میں تو سمجھتا ہوں۔ ایسا کوئی بھی ملک نہیں۔ جہاں عورتیں زیور نہ پہنتی ہوں۔

رمیش بابو اس بحث میں شطرنج بھول گئے۔ چھٹی کا دن تھا ہی۔ دو چار ملنے والے اور آگئے۔ رما چپکے سے کھسک آیا۔ اِس بحث میں ایک بات ایسی تھی جو اس کے دل میں بیٹھ گئی۔ اب وہ قرض لے کر گہنے نہ لے گا۔ صرافے تک گیا ضرور۔ مگر کسی دُکان پر جانے کی ہمت نہ پڑی۔

وہ گھر پہنچا۔ تو نو بج گئے تھے۔ دیا ناتھ نے اس کو دیکھا تو پوچھا۔ آج سویرے سویرے کہاں چلے گئے تھے۔

رما۔ ذرا بڑے بابو سے ملنے گیا تھا۔

دیا ناتھ گھنٹے آدھ گھنٹے کے لیے کتب خانے کیوں نہیں چلے جایا کرتے! ابھی تمھارے پڑھنے لکھنے کی عمر ہے۔ امتحان نہ سہی۔ اپنی لیاقت تو بڑھا سکتے ہو۔ ایک سیدھا سا خط لکھنا پڑجاتا ہے تو بغلیں جھانکنے لگتے ہو۔ اصلی تعلیم مدرسہ چھوڑنے کے بعد ہی شروع ہوتی ہے اور وہی زندگی میں ہمارے کام آتی ہے۔ میں نے تمھارے بارے میں کچھ ایسی باتیں سنی ہیں۔ جن سے مجھے رنج ہوا اور تمھیں میں سمجھا دینا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ میں ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ میرے گھر میں حرام ایک کوڑی بھی آئے۔

رما نے مصنوعی غصہ دکھا کر کہا۔ آپ سے کس نے یہ بات کہی۔ میں اس کی موچھیں اکھاڑ لوں گا۔

دیا ناتھ۔ کسی نے بھی کہی ہو۔ اس سے تمھیں کوئی مطلب نہیں۔ لیکن بات سچ ہے۔ یا جھوٹ۔ میں اتنا ہی پوچھنا چاہتا ہوں۔

"بالکل جھوٹ"

"بالکل جُھوٹ"

"جی ہاں بالکل جھوٹ"

"تم دستوری نہیں لیتے"

"دستوری رشوت نہیں ہے۔ سبھی لیتے ہیں اور علانیہ لیتے ہیں۔ لوگ بغیر مانگے دیتے ہیں۔ میں کسی سے مانگنے نہیں جاتا۔"

"سبھی علانیہ لیتے ہیں اور لوگ بغیر مانگے دیتے ہیں۔ اس سے تو یہ ثابت نہیں ہوتا کہ رشوت اچھی چیز ہے۔"

"دستوری بند کر دینا میرے قابو کی بات نہیں۔ میں خود نہ لوں۔ مگر چپراسی اور محرر کا ہاتھ نہیں پکڑ سکتا۔ آٹھ آٹھ نو نو روپیہ پانے والے نوکر اگر نہ لیں۔ تو ان کا کام ہی نہیں چل سکتا۔"

دیا ناتھ۔ میں نے تمھیں سمجھا دیا۔ ماننے نہ ماننے کا تمھیں اختیار ہے۔

یہ کہتے ہوئے دیا ناتھ دفتر چلے گئے۔ رما کے جی میں آیا۔ صاف کہہ دے۔ آپ نے بے لوث بن کر زندگی میں کیا کرلیا کہ مجھے تعلیم دے رہے ہیں۔ ہمیشہ پیسے پیسے کو محتاج رہے۔ لڑکوں کو پڑھا تک نہیں سکے۔ یہ دیانتداری اس وقت اچھی معلوم ہوتی جب کی نیت بھی صاف رہتی۔ اور زندگی بھی آرام سے گزرتی۔

رما گھر میں گیا تو ماں نے پوچھا۔ تمھارے بابو جی کس بات پر بگڑ رہے تھے؟

رما۔ مجھے تعلیم دے رہے تھے کہ دستوری مت لیا کرو۔

جاگیشری۔ تم نے کہا۔ نہیں۔ آپ نے بڑی ایمانداری کی تو کون سے جھنڈے گاڑ دیئے۔ ساری زندگی پیٹ پالتے رہے۔

رما۔ کہنا تو چاہتا تھا مگر چڑھ جاتے۔ آپ کو لینے کا شعور تو ہے نہیں جب دیکھا کہ یہاں دال نہیں گلتی تو بھگت بن گئے۔ بیوپاریوں سے روپے نکالنے کے لیے عقل چاہیے جہاں کسی نے بھگت پن کی لی اور میں سمجھ گیا کہ بدھو ہے لینے کی تمیز نہیں۔ کیا کرے بے چارہ۔ کسی طرح آنسو تو پونچھے۔

جاگیشری۔ بس بس یہی بات ہے بیٹا جسے لینا آئے گا۔ وہ ضرور دے گا۔ انھیں تو بس گھر

میں قانون بگھارنا آتا ہے۔

رما دفتر جاتے وقت اوپر کپڑے پہننے گیا۔ تو جالپا نے اسے تین لفافے ڈاک میں چھوڑنے کے لیے دیے۔ اس وقت اس نے تینوں لفافے جیب میں ڈال لیے۔ لیکن راستے میں انھیں کھول کر چٹھیاں پڑھنے لگا۔ خط کیا تھے؟ مصیبت اور درد کی داستان تھی۔ جو اس نے اپنی سہیلیوں کو سنائی تھی۔

رما نے تینوں چٹھیاں جیب میں رکھ لیں۔ ڈاک خانہ سامنے سے گزر گیا۔ پر اس نے انھیں چھوڑا نہیں۔ جالپا ابھی تک یہی سمجھتی ہے کہ میں اسے دھوکا دے رہا ہوں۔ اسے کیسے یقین دلاؤں۔ اگر اپنا بس ہوتا تو اسی وقت زیوروں کے ٹوکرے بھر بھر جالپا کے سامنے رکھ دیتا۔ یا اسے کسی بڑے صراف کی دُکان پر لے جاکر کہتا۔ تمھیں جو جو چیز لینی ہوں لے لو۔ رما کو آج اس درد کا صحیح اندازہ ہوا۔ جو جالپا کے دل کو بے چین کر رہا تھا۔ ایسی حالت میں رما کو وعدے پر زیور لانے میں تامل کرنے کا مطلق گنجایش نہ تھی۔

دفتر پہنچا۔ تو برآمدے میں مال تولا جارہا تھا۔ میز پر روپے پیسے رکھے جا رہے تھے اور رما فکر میں ڈوبا بیٹھا تھا۔ کس سے صلاح لے۔ اسے آج اپنے اوپر غصہ آرہا تھا کہ اس نے شادی ہی کیوں کی۔

جب وہ گھر کی حالت سے واقف تھا تو اس نے شادی سے انکار کیوں نہ کردیا۔ آج اس کا جی مطلق کام نہ لگا۔ معین وقت سے پہلے اُٹھ کر گھر چلا گیا۔

جالپا نے اسے دیکھتے ہی پُوچھا۔ میری چٹھیاں چھوڑ تو نہیں دیں؟

رما نے بہانہ کیا۔ مطلق یاد نہ آئی۔ جیب میں پڑی رہ گئیں۔

جالپا۔ یہ بہت اچھا ہوا۔ لاؤ مجھے دے دو۔ اب نہ بھیجوں گی۔

رما۔ کیوں کل بھیج دوں گا۔

جالپا۔ نہیں اب مجھے بھیجنا ہی نہیں ہے۔ میں کچھ ایسی باتیں لکھ گئی تھی جو نازیبا تھیں۔ اگر تم نے خط چھوڑ دیے ہوتے تو مجھے بڑا رنج ہوتا۔ میں نے ان میں تمھاری شکایت کی تھی۔

یہ کہہ کر وہ مسکرائی۔

رما۔ شوہر بدنیت ہے۔ دغاباز ہے۔ حیلہ ساز ہے۔ اس کی اگر تم نے شکایت کی تو کیا

بے جا کیا؟

جالپا نے گھبرا کر پوچھا۔ تم نے خط پڑھ لیے تھے کیا؟ تب تو تم مجھ سے بہت ناراض ہو گے۔

رقت سے جالپا کی آواز رُک گئی۔ اس کا سر جھک گیا۔ اور جھکی ہوئی آنکھوں سے آنسوؤں کی بوندیں آنچل پر گرنے لگیں۔ ایک لمحہ میں اس نے دل کو سنبھال کر کہا۔ مجھ سے بہت بڑی خطا ہوئی ہے۔ جو سزا چاہے دو۔ پر ہم سے ناراض مت ہو۔ ایشور جانتے ہیں تمھارے جانے کے بعد مجھے کتنا افسوس ہوا۔ میری قلم سے نہ جانے کیسے وہ باتیں نکل گئیں۔

جالپا جانتی تھی کہ رما ناتھ کو زیوروں کی فکر مجھ سے ذرہ بھر بھی کم نہیں ہے۔ لیکن ہمدردوں سے اپنی داستانِ غم کہتے وقت ہم اکثر مبالغہ کر جایا کرتے ہیں۔ جو باتیں پردے کی سمجھی جاتی ہیں۔ ان کا ذکر کردینے سے قربت اور یگانگت کا اظہار ہوتا ہے۔ دوستوں کی ہمدردی حاصل کرنے کا یہ عام طریقہ ہے۔

رما جالپا کے آنسو پونچھتا ہوا بولا۔ میں تم سے ناخوش نہیں ہوں۔ ناخوش ہونے کی تو کوئی بات ہی نہیں ہے۔ امید کی تاخیر ہی مایوسی ہے۔ کیا میں اتنا نہیں جانتا۔ اگر تم نے مجھے منع نہ کردیا ہوتا۔ تو اب تک میں نے کسی نہ کسی طرح دو ایک چیزیں بنوا دی ہوتیں۔ مجھ سے غلطی یہ ہوئی کہ میں نے تم سے صلاح لی۔ اس وقت مجھے یہ خیال نہ رہا کہ ایسی حالتوں میں آدمی خواہش رہنے پر بھی نہیں نہیں کرنے پر مجبور ہے۔ اب میں وہ غلطی نہ کروں گا۔

جالپا۔ نے متفکرانہ انداز سے پوچھا۔ تو کیا قرض لاؤ گے؟

رما۔ کیا ہرج ہے؟ جب سود نہیں دینا ہے تو جیسے نقد ویسے اُدھار۔ قرض سے دنیا کا کام چلتا ہے۔ کون قرض نہیں لیتا۔ یوں روپے ملتے بھی ہیں۔ تو الٹے تلٹے خرچ ہوجاتے ہیں۔ قرض سر پر سوار ہوگا۔ تو اس کی فکر ہاتھ کو روکے رہے گی۔

جالپا۔ میں تمھیں فکر میں ڈالنا نہیں چاہتی۔ اب میں بھول کر بھی زیوروں کا نام نہ لوں گی۔

رما۔ نام تو تم نے کبھی نہیں لیا۔ لیکن تمھارے نام نہ لینے سے میرا فرض تو پورا نہیں

ہوجاتا۔ تم قرض سے ناحق ڈرتی ہو۔ روپے جمع ہوجانے کے انتظار میں بیٹھا رہوں گا۔ تو شاید کبھی بھی جمع نہ ہوں گے۔

جالپا۔ مگر پہلے کوئی چھوٹی سی چیز لانا۔

رما۔ ہاں ہاں۔ ایسا تو کروں گا ہی۔

رما بازار چلا تو خوب اندھیرا ہو چلا تھا۔ دن رہتے جاتا تو یہ خوف تھا کہ اس کے دوستوں کی نگاہ پڑجاتی۔ منشی دیا ناتھ ہی دیکھ لیتے۔ وہ اس معاملہ کو پوشیدہ ہی رکھنا چاہتا تھا۔

(۱۳)

صرافے میں گنگو کی دُکان مشہور تھی۔ گنگو تھا تو برہمن۔ مگر تھا پکا بنیا۔ اس کی دُکان پر ہمیشہ گاہکوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔ اس کا تقدس گاہکوں میں یقین پیدا کرتا تھا۔ دوسری دُکانوں پر لوگوں کو ٹھگے جانے کا خوف ہوتا تھا۔ اس دُکان پر دغابازی کا اندیشہ نہ تھا۔ گنگو ن رما کو دیکھتے ہی مسکرا کر کہا۔ آیئے بابو صاحب اوپر آیئے۔ منیم جی آپ کے واسطے پان منگواؤ۔ کیا حکم ہے بابو جی؟ آپ تو کبھی آتے ہی نہیں۔ غریبوں پر بھی کبھی کبھی کرم کیا کیجیے۔

گنگو کے اخلاق نے رما کی ہمت کھول دی۔ اگر اس نے اصرار نہ کیا ہوتا تو شاید رما کبھی دُکان پر جاہی نہ سکتا۔ دُکان پر جاکر بولا۔ یہاں ہم جیسے مزدوروں کا کہاں گزر ہے۔ مہاراج! گرہ میں کچھ ہوتو؟

گنگو نے ان کے بیٹھنے کے لیے ایک کرسی منگوائی اور بولا۔ یہ آپ کیا فرماتے ہیں۔ بابو صاحب آپ کی دُکان ہے۔ جو چیز چاہیے لے جایئے۔ دام آگے پیچھے ملتے رہیں گے۔ ہم لوگ آدمی کو پہچانتے ہیں۔ ایسی بات نہیں ہے۔ دکھاؤں کوئی جڑاؤ چیز؟ کوئی کنگن۔ کوئی ہار! ابھی حال ہی میں دلی سے مال آیا ہے۔

"کوئی ہلکے داموں کا ہار دکھایئے؟"

"یہی کوئی سات آٹھ سو کا؟"

"اجی نہیں کوئی چار سو تک حد ہے۔"

گنگو نے زیوروں کا صندوقچہ منگا کر کہا۔ میں آپ کو دونوں دکھائے دیتا ہوں۔ جو

پسند آئے رکھ لیجیے گا۔ ہمارے یہاں کسی طرح کا دگل بھسل نہیں ہے۔ بابو صاحب اس کی آپ ذرا بھی فکر مت کریں۔ پانچ برس کا لڑکا ہو یا سو برس کا بوڑھا۔ سب کے ساتھ ایک بات رکھتے ہیں۔ مالک کو بھی ایک دن منہ دکھانا ہے۔

گنگو نے ہار نکال کر دکھانے شروع کیے۔ رما کی آنکھیں کھل گئیں۔ طبیعت لوٹ پوٹ ہوگئی۔ کیا صفائی تھی۔ رنگینیوں کی خوبصورت سجاوٹ۔ کتنی آب و تاب آنکھیں جھپکی جاتی تھیں۔ رما نے سوچ رکھا تھا۔ سو روپیہ سے زیادہ اُدھار نہ رکھوں گا۔ لیکن چار سو والا ہار آنکھوں میں کچھ نہ جچتا تھا اور جیب میں تھے کل تین سو روپے۔ سوچا یہ ہار لے گیا اور جالپا نے پسند نہ کیا تو فائدہ ہی کیا۔ ایسی چیز لے جانی چاہیے کہ وہ دیکھتے ہی پھڑک اُٹھے۔ یہ جڑاؤ ہار اس کی گردن میں کتنا خوش نما معلوم ہوگا۔ وہ ہار ایک ہزار مرصع آنکھوں سے گویا رما کے دل کو کھینچنے لگا۔ وہ ایک سکوت کے عالم میں اس کی طرف دیکھتا رہا۔ لیکن منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلتا تھا۔ کہیں گنگو نے تین سو روپے اُدھار ماننے سے انکار کردیا تو اسے کتنا شرمندہ ہونا پڑے گا۔ گنگو بشرے سے اس کے دل کی بات تاڑ کر بولا۔ آپا کے لائق تو بابو جی یہی چیز ہے۔ اندھیرے گھر میں رکھ دیجیے تو اُجالا ہوجائے۔

رما نے شرماتے ہوئے کہا۔ پسند تو مجھے بھی یہی ہے۔ لیکن میرے پاس کل تین سو روپے ہیں۔ یہ سمجھ لیجیے۔

گنگو نے خلوص کے ساتھ کہا۔ بابو صاحب روپیہ کا ذکر ہی نہ کیجیے۔ حکم ہو تو دس ہزار کا مال ساتھ بھیج دوں۔ مرضی ہو تو ایک آدھ چیز اور دکھاؤں۔ ایک شیش پھول بن کر آیا ہے۔ بس یہی معلوم ہوتا ہے کہ گلاب کا پھول کھلا ہوا ہے۔ دیکھ کر جی خوش ہوجائے گا اور دام بھی کچھ ایسا بھاری نہیں ہے۔ آپ کو ایک ڈھائی سو میں مل جائے گا۔

رما نے مسکرا کر کہا۔ مہرج بہت باتیں بناکر اُلٹے چھرے سے نہ مونڈ لیجیے گا۔ اس معاملے میں میں بالکل اناڑی ہوں۔

گنگو۔ ایسا نہ کہو بابو جی! آپ چیز لے جایئے بازار میں دکھا لیجیے۔ اگر کوئی ڈھائی سو سے کوڑی کم میں دے تو میں مفت دے دوں گا۔

شیش پھول آیا۔ سچ مچ گلاب کا پھول تھا۔ جس پر ہیرے کی کنیاں اوس کی بوندوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ رما کی ٹکٹکی بندھ گئی۔

گنگو۔ ڈھائی سو تو کاریگر کی صفائی کا انعام ہے بابو جی یہ وہ چیز ہے؟
رما۔ ہاں ہے تو بہت خوبصورت! مگر ایسا نہ ہو۔ کل ہی دام کا تقاضا کرنے لگو۔ میں خود ہی جہاں تک ہو سکے گا جلد دے دوں گا۔

گنگو نے دونوں چیزیں دو خوبصورت مخملی کیسوں میں رکھ کر رما کو دے دیں۔ رما کی مسرت کا اس وقت اندازہ نہ تھا۔ مگر یہ خالص مسرت نہ تھی۔ اس میں ایک اندیشہ کی آمیزش بھی تھی۔ یہ اس بچے کی خوشی نہ تھی جس نے ماں سے پیسے مانگ کر مٹھائی لی ہو۔ بلکہ اس بچے کی خوشی تھی جس نے پیسے چُرا کر لی ہو۔ اسے مٹھائیاں میٹھی تو لگتی ہیں لیکن دل کانپتا رہتا ہے کہ کہیں گھر چلنے پر مار نہ پڑنے لگے۔ ساڑھے چھ سو روپیہ ادا کرنے کی تو اسے زیادہ فکر نہ تھی اگر زمانہ موافق ہو۔ تو چھ مہینے میں بے باق کر سکتا ہے۔ خوف یہی تھا کہ بابو جی سنیں گے تو ضرور ناراض ہوں گے۔ لیکن جوں جوں آگے بڑھتا گیا۔ جالپا کو ان زیوروں سے آراستہ دیکھنے کا اشتیاق اس خوف پر غالب آتا جاتا تھا۔ گھر پہنچنے کی عجلت میں اس نے سڑک چھوڑ دی اور ایک گلی میں گھس گیا۔ گھنا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ بادل تو اسی وقت آگئے تھے۔ جب وہ گھر سے چلا تھا۔ وہ گلی میں گھسا ہی تھا کہ پانی کی بوندیں چھروں کی طرح اُوپر پڑیں۔ جب تک چھتری کھولے وہ لت پت ہو چکا تھا۔ اسے دہشت ہوئی۔ اس اندھیرے میں کوئی آکر دونوں چیزیں نہ چھین لے۔ اندھیری گلیوں میں خون تک ہو جاتے ہیں۔ پچھتانے لگا۔ اس طرف سے ناحق آیا۔ دو چار منٹ دیر ہی میں پہنچتا۔ تو ایسی کون سی آفت آجاتی۔ بارے کسی طرح گلی کا خاتمہ ہوا۔ اور سڑک ملی۔ لالٹین نظر آئی۔ روشنی کتنی اعتقاد انگیز چیز ہے اس کا آج اسے عملی تجربہ ہوا۔

وہ گھر پہنچا۔ تو دیا ناتھ بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ ان کی آنکھ بچاکر وہ اندر جانا چاہتا تھا کہ انھوں نے ٹوکا۔ اس وقت کہاں گئے تھے۔

رما نے انھیں کچھ جواب نہ دیا۔ کہیں وہ اخبار سنانے لگیں تو گھنٹوں کی خبریں لیں سیدھا اندر جا پہنچا۔ جالپا دروازے پر کھڑی اس کی راہ دیکھ رہی تھی۔ فوراً اس کے ہاتھ سے چھتری لے لی اور بولی۔ تم تو بالکل بھیگ گئے۔ کہیں ٹھہر نہ گئے؟

رما۔ پانی کا کیا ٹھکانہ۔ رات بھر برستا رہے۔

یہ کہتا ہوا وہ اوپر چلا گیا۔ اس نے سمجھا تھا۔ جالپا بھی پیچھے پیچھے آتی ہو گی۔ پر وہ

نیچے بیٹھی اپنے دیوروں سے باتیں کر رہی تھی۔ گویا اسے زیوروں کی یاد ہی نہیں ہے جیسے وہ بالکل بھول گئی ہے کہ رما صرافے سے آیا ہے۔

رما نے کپڑے بدلے اور دل میں جھنجھلاتا ہوا نیچے آیا۔ اسی وقت دیا ناتھ کھانا کھانے آگئے۔ سب لوگ کھانا کھانے بیٹھ گئے۔ جالپا نے ضبط تو کیا۔ پر اس اضطراب کی حالت میں آج اس سے کچھ کھایا نہ گیا۔ جب وہ اوپر پہنچی۔ تو رما چارپائی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اسے دیکھتے ہی مذاق کر کے بولا۔ آج تو صرافے کا جانا بیکار ہوگیا۔ ہار کہیں تیار ہی نہ تھا۔ بنانے کو کہہ آیا ہوں۔

جالپا کا اشتیاق سے چمکتا ہوا چہرہ ماند پڑگیا۔ بولی۔ وہ تو میں پہلے ہی جانتی تھی۔ بنتے بنتے پانچ مہینے تو لگ بھی جائیں گے۔

رما۔ نہیں جی بہت جلد بنا دے گا۔ قسم کھا رہا ہوں۔

جالپا۔ اونہہ۔ جب چاہے دے۔

جالپا منہ پھیر کر لیٹنے جا رہی تھی کہ رما نے زور سے قہقہہ مارا۔ جالپا چونک پڑی سمجھ گئی۔ رما نے شرارت کی تھی۔ مسکراتی ہوئی بولی۔ تم بھی بڑے نٹ کھٹ ہو۔ کیا لائے؟

رما۔ کیسا چکمہ دیا۔

جالپا۔ یہ تو مردوں کی عادت ہی ہے۔ تم نے نئی بات کیا کی؟

جالپا دونوں زیوروں کو دیکھ کر باغ باغ ہوگئی۔ اس کے دل میں مسرت کی موجیں سی اُٹھنے لگیں۔ وہ اپنے جذبات کو چھپانا چاہتی تھی کہ رما اسے اوچھی نہ سمجھنے لگے۔ مگر ایک ایک عضو کھلا جاتا تھا۔ مسکراتی ہوئی آنکھیں دہکتے ہوئے رخسار اور کھلے ہوئے ہونٹ انشائے راز کیے دیتے تھے۔ اس نے ہار گلے میں پہنا۔ شیش پھول سجایا اور خوشی سے متوالی ہوکر تمھیں دعا دیتی ہوں۔ ایشور تمھاری ساری آرزوئیں پوری کرے۔

آج جالپا کی وہ تمنا پوری ہوئی۔ جو بچپن ہی سے اس کے تخیل کا ایک زریں خواب اس کی امیدوں کا مرکز بنے ہوئے تھے۔ آج اس کی وہ سادھ پوری ہوئی۔ اگر ماں کے یہاں ہوتی تو وہ سب سے پہلے یہ ہار اُسے دکھاتی۔ اور کہتی۔ تمھارا ہار تمھیں مبارک ہو۔

رما پر گھڑوں نشہ چڑھا تھا۔ آج اسے پہلی بار زندگی کا مزا حاصل ہوا۔

جالپا نے پوچھا۔ جاکر اماں کو دکھا آؤں؟

رما نے جو انکسار دکھا کر کہا۔ اماں کو کیا دکھانے جاؤگی۔ ایسی کون سی بڑی چیزیں ہیں۔

جالپا۔ اب تم سے سال بھر تک اور کسی چیز کے لیے نہ کہوں گی۔ یہ روپے ادا کروں گی۔ میرے دل کا بوجھ ہلکا ہوگا۔

رما نے پُردرد انداز سے کہا۔ روپوں کی کیا فکر؟ ہیں ہی کتنے؟

جالپا۔ ذرا ان کو دکھا آؤں۔ دیکھوں کیا کہتی ہیں۔

رما۔ مگر یہ کہنا ادھار لائے ہیں۔

جالپا اس طرح دوڑی ہوئی نیچے گئی۔ گویا اُسے وہاں کوئی خزانہ مل جائے گا۔

آدھی رات گزر چکی تھی۔ رما خوشی کی نیند سو رہا تھا۔ جالپا نے چھت پر آکر ایک بار آسمان کی طرف دیکھا۔ شفاف چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ وہ کاتک کی چاندنی جس میں نغمے کا سکون ہے اور شعر کی روحانیت! اس نے کمرے میں آکر اپنی صندوقچی کھولی اور اس میں سے وہ کانچ کا چندن ہار نکالا۔ جسے پہن کر وہ ایک دن پھولی نہ سمائی تھی۔ مگر اب اس نئے ہار کے سامنے اس کی چمک اس طرح ماند پڑگئی تھی۔ جیسے اس شفاف چاندنی کے سامنے تاروں کی روشنی۔ اس نے اس نقلی ہار کو توڑ ڈالا اور اس کے دانوں کو نیچے گلی میں پھینک دیا۔ اسی طرح جیسے پوجا ختم ہونے کے بعد کوئی بھگت مٹی کی مورتوں کو پانی میں فنا کردیتا ہے۔

(۱۴)

اس دن سے جالپا کی زندگی میں ایک نیا پہلو رونما ہوا۔ رما نہانے جاتا تو اسے اپنی دھوتی چُنی ہوئی ملتی۔ طاق پر تیل اور صابون بھی رکھا ہوا پاتا۔ جب وہ دفتر جانے لگتا تو جالپا اس کے کپڑے لاکر سامنے رکھ دیتی۔ پہلے پان مانگنے پر ملتے تھے۔ اب تو زبردستی کھلائے جاتے تھے۔ جالپا اس کا رخ دیکھا کرتی۔ اسے کچھ کہنے کی ضرورت نہ تھی۔ یہاں تک کہ جب وہ کھانے بیٹھتا۔ تو وہ پنکھا کرتی۔ پہلے وہ بڑے جبر سے کھانا پکانے جایا کرتی تھی اور اس پر بھی بیگار ہی ٹالتی تھی۔ اب وہ بڑی خوشی سے رسوئی میں جاتی۔ چیزیں وہی پکائی جاتی تھیں۔ مگر ان میں کچھ زیادہ مٹھاس آگئی تھی۔ رما کو ان الفت آمیز دل جوئیوں

کے سامنے وہ زیور بہت ہی حقیر معلوم ہوتے تھے۔

ادھر جس دن رما نے گنگو کی دُکان سے زیور خریدے اسی دن دوسرے صرافوں کو بھی اس کی قدردانی کی خبر ملی۔ رما جب ادھر سے نکلتا تو دونوں طرف کے دکاندار اُٹھ اُٹھ کر سلام کرتے۔ آیئے بابو جی۔ پان تو کھاتے جایئے۔ دو ایک چیزیں ہماری دُکان سے بھی تو دیکھیے۔ رما کا حزم و احتیاط اس کی ساکھ کو اور بڑھاتا تھا۔ یہاں تک کہ ایک دن ایک دلال رما کے گھر آپہنچا۔ اور اس کے نہیں نہیں کرنے پر بھی اپنا صندوقچہ کھول کر اس کے سامنے رکھ ہی دیا۔

رما نے اس سے پیچھا چھڑانے کے لیے کہا۔ بھائی اس وقت مجھے کچھ نہیں لینا ہے کیوں اپنا اور میرا وقت برباد کروگے؟

دلال نے بڑی خوشامد سے کہا۔ بابو جی دیکھ تو لیجیے۔ پسند آئے تو لیجیے گا۔ دیکھ لینے میں تو کوئی ہرج نہیں ہے۔ آخر رئیسوں کے پاس نہ جائیں تو کس کے پاس جائیں اوروں نے آپ سے گہری رقمیں ماریں۔ ہمارے بھاگ میں بدا ہوگا تو ہمیں بھی آپ سے چار پیسے مل جائیں گے۔ بہو جی اور مائی جی کو دکھا لیجیے۔ میرا دل تو گواہی دیتا ہے کہ آپ کے ہاتھوں بِکنی ہوگی۔

رما۔ عورتوں کی پسند کی نہ کہو۔ چیزیں اچھی ہوں گی ہی۔ پسند آتے کیا دیر لگی ہے لیکن بھائی اس وقت ہاتھ خالی ہے۔

دلال ہنس کر بولا۔ بابو جی بس ایسی بات کہہ دیتے ہیں کہ واہ! آپ کا حکم ہو جائے تو ہزار پانچ سو آپ کے اوپر نچھاور کردیں۔ ہم لوگ آپ کا مزاج دیکھتے ہیں بابو جی! بھگوان نے چاہا۔ تو آج میں سودا کرکے اٹھوں گا۔ دلال نے صندوقچی سے دو چیزیں نکالیں۔ ایک تو نئے فیشن کا جڑاؤ کا کنگن تھا اور دوسرا کانوں کا رنگ۔ دونوں ہی چیزیں بے مثل تھیں۔ ایسی آب تھی۔ گویا چراغ جل رہا ہو۔ دس بج چکے تھے۔ منشی دیا ناتھ دفتر جا چکے تھے۔ رما خود کھانا کھانے جارہا تھا۔ لیکن ان دونوں چیزوں کو دیکھ کر اس پر خود فراموشی کی حالت طاری ہوگئی۔ دونوں کیس لیے ہوئے گھر میں آیا۔ اس کے ہاتھ میں کیس دیکھتے ہی دونوں عورتیں ٹوٹ پڑیں اور ان چیزوں کو نکال نکال کر دیکھنے لگیں۔ ان کی چمک دمک نے انھیں ایسا فریفتہ کرلیا کہ ان میں عیب و حسن کا امتیاز ہی نہ رہا۔

جاگیشری۔ آج کل کی چیزوں کے سامنے تو پُرانی چیزیں کچھ جچتی ہی نہیں۔
جالپا۔ نہ جانے وہ عورتیں کیسے ان چیزوں کو پہنتی تھیں۔
رما نے مسکرا کر کہا۔ تو دونوں چیزیں پسند ہیں نہ؟
جالپا۔ پسند کیوں نہیں ہیں۔ اماں جی تم لے لو۔
جاگیشری نے اپنے درد دل کو چھپانے کے لیے سر جھکا لیا۔ جس کی ساری عمر خانگی تفکرات میں کٹ گئی۔ وہ کیا آج خواب میں بھی ان زیوروں کے پہننے کی امید کرسکتی تھی۔ آہ! اس دکھیا کی زندگی کی کوئی بھی مراد تو پوری نہ ہوئی۔ شوہر کی آمدنی کبھی اتنی نہ ہوئی کہ بال بچوں کی پرورش کے بعد کچھ پس انداز ہوتا۔ جب سے گھر کی مالکن ہوئی تب ہی سے گویا اس کی ریاضت شروع ہوئی۔ اور ساری آرزوئیں ایک ایک کرکے خاک میں مل گئیں۔ اس نے ان زیوروں کی طرف سے آنکھیں ہٹا لیں۔ ان میں اتنی کشش تھی کہ ان کی طرف تاکتے ہوئے وہ ڈرتی تھی۔ کہیں اس کے بے نیازی کا پردہ نہ کھل جائے۔ بولی۔ میں لے کر کیا کروں گی بیٹی؟ میرے پہننے اوڑھنے کے دن تو نکل گئے! کون لایا ہے بیٹا؟ کیا دام مانگتا ہے؟
رما۔ ایک صراف دکھانے لایا ہے۔ ابھی میں نے دام وام نہیں پوچھے۔ مگر دام اونچے ہوں گے۔ لینا تو تھا نہیں۔ پوچھ کر کیا کرتا؟
جالپا۔ لینا نہیں تو یہاں لائے کیوں؟
جالپا نے یہ الفاظ کچھ اس تحکم آمیز لہجہ میں کہے کہ رما کھسیا گیا۔ ان میں کچھ ایسی تحریک۔ کچھ ایسی ملامت۔ کچھ ایسا اشتیاق تھا کہ وہ ان چیزوں کو واپس نہ لے جاسکا بولا۔ تو لے آؤں؟
جالپا۔ اماں لینے ہی کو نہیں کہتیں تو لے کر کیا کروگے؟ کیا مفت میں دے رہا ہے۔
رما۔ سمجھ لو۔ مفت ہی ملتے ہیں۔
جالپا۔ سنتی ہو اماں ان کی باتیں۔ آپ جاکر لوٹا آیئے۔ جب ہاتھ میں روپے آجائیں گے تو بہت گہنے ملیں گے۔
جاگیشری نے پُرہوس انداز سے کہا۔ روپے ابھی تو نہیں مانگتا؟
جالپا۔ اُدھار بھی دے گا، تو سُود تو لگا ہی لے گا۔

رما۔ تو لوٹا دوں؟ ایک بات چٹ پٹ طے کر ڈالو۔ لینا ہو لے لو۔ نہ لینا ہو۔ لوٹا دو۔ پس و پیش میں نہ پڑو۔

جالپا کو یہ بے لاگ انداز گفتگو اس وقت بہت ناگوار معلوم ہوا۔ انکار کرنا اس کا کام تھا۔ رما کو تو لینے کے لیے اصرار کرنا چاہیے تھا۔ اسے ایسا معلوم ہوا کہ رما کے دل میں ذرا بھی احساس ذرا بھی درد نہیں ہے۔ جاگیشری کی طرف ہوسناک نگاہوں سے دیکھ کر بولی۔ لوٹا دو۔ رات دن کے تقاضے کون لے گا؟

وہ کیسوں کو بند کرنے ہی والی تھی۔ جاگیشری نے کنگن اٹھا کر پہن لیا۔ گویا چھن بھر پہن لینے ہی سے اس کی ہوس پوری ہوجائے گی۔ پھر دل میں اس اوچھا پن پر شرمندہ ہوکر وہ اسے اُتارنا ہی چاہتی تھی کہ رما نے کہا۔ اب تم نے پہن لیا ہے۔ اماں تو پہنے رہو۔ میں اسے تمھاری نذر کرتا ہوں۔

جاگیشری کی آنکھیں پُرنم ہوگئیں۔ جو آرزو آج تک نہ پوری ہوئی۔ بیٹے کی سعادت مندی کی بدولت پوری ہورہی تھی۔ لیکن کیا وہ اپنے عزیز بیٹے پر قرض کا اتنا بوجھ رکھ دے گی۔ ابھی اس غریب کی حیثیت ہی کیا ہے۔ نہ جانے روپے جلد ہاتھ آئیں یا دیر میں۔ قیمت بھی تو نہیں معلوم۔ اگر دام اونچے ہوئے تو دے گا کہاں سے؟ اسے کتنے تقاضے سہنے پڑیں گے اور کتنا شرمندہ ہونا پڑے گا۔ پست ہمت ہوکر بولی۔ نہیں بیٹا۔ میں نے یوں ہی پہن لیا تھا۔ لے جاؤ۔ لوٹا دو۔

ماں کا اُداس چہرہ دیکھ کر رما کا دل ہل اُٹھا۔ کیا قرض کے خوف سے وہ اپنی بے نفس ماں کی اتنی خدمت بھی نہ کرسکے۔ ماں کی جانب اس کا کچھ فرض بھی تو ہے۔ بولا روپے بہت مل جائیں گے۔ اماں تم اس کی فکر مت کرو۔

جاگیشری نے بہو کی طرف دیکھا۔ گویا کہہ رہی تھی۔ کہ لڑکا مجھ پر کتنا ظلم کر رہا ہے۔

جالپا بے غرضانہ انداز سے بیٹھی ہوئی تھی۔ شاید اسے خوف ہو رہا تھا کہ رما کنگن نہ لے لیں۔ اس کے بشرے سے جاگیشری کو معلوم ہوگیا۔ اسے میرا کنگن پہننا ناگوار گزرا۔ اس نے فوراً کنگن اُتار ڈالا۔ اور جالپا کی طرف بڑھا کر بولی۔ میں اپنی طرف سے تمھیں دیتی ہوں۔ بہو مجھے جو کچھ پہننا اوڑھنا تھا پہن اوڑھ چکی۔ اب تم ذرا پہنو۔ دیکھوں۔

جالپا کو اس میں مطلق شبہ نہ تھا کہ اماں کے پاس روپے موجود ہیں۔ وہ سمجھتی شاید آج دیوی پسیج گئی ہیں۔ ایک لمحہ پہلے اس نے سمجھا تھا کہ روپے رما کو دینے پڑیں گے۔ اس لیے خواہش رہنے پر بھی وہ اسے واپس کردینا چاہتی تھی۔ جب اماں دام دینے کو تیار تھیں تو انکار کرنے کی کیا ضرورت؟ اوپرے دل سے بولی۔ روپے نہ ہوں تو رہنے دیجیے۔ ابھی کون جلدی ہے؟

رما نے کچھ چڑھ کر کہا۔ تو تم یہ کنگن لے رہی ہو؟

جالپا۔ اماں نہیں مانتیں تو ہم کیا کریں۔

رما۔ تو ان رنگوں کو بھی کیوں نہیں رکھ لیتی؟

جالپا۔ جاکر دام تو پوچھ آؤ!

رما۔ تم ان چیزوں کو لے جاؤ۔

رما نے باہر آکر دلال سے دام پوچھے تو سناٹے میں آگیا۔ کنگن سات سو کے تھے۔ اور رِنگ ڈیڑھ سو کے۔ اس کا انداز تھا کہ کنگن زیادہ سے زیادہ تین سو کے ہوں گے۔ اور رِنگ چالیس پچاس کے۔ پچھتایا کہ ان چیزوں کے دام پہلے ہی کیوں نہ پوچھ لیے۔ نہیں تو اندر جانے کی نوبت ہی کیوں آتی۔ مگر کچھ بھی ہو۔ واپس تو کرنا ہی پڑے گا۔ اتنا بڑا بوجھ وہ سر پر نہیں لے سکتا۔ دلال سے بولا۔ بڑے مہنگے ہیں بھائی۔ میرا اندازہ تو تین چار سو کے اندر ہی تھا۔

دلال کا نام چرن داس تھا۔ بولا۔ دام میں ایک کوڑی کا فرق پڑجائے سرکار تو منہ نہ دکھاؤں۔ لالہ دھنی رام کی کوٹھی کا تو مال ہے۔ آپ چل کر پوچھ لیں۔ چھ دام روپے کی دلالی البتہ میری ہے۔ آپ کی مرضی ہے دیجیے یا نہ دیجیے۔

رما۔ تو بھئی ان داموں کی چیزیں تو اس وقت ہم نہیں لے سکتے۔

چرن داس۔ ایسی بات نہ کہیے بابو جی۔ آپ کے لیے اتنے روپے کون بڑی بات ہے آپ سے بڑھ کر۔ دوسرا کون شوقین ہوگا۔ یہ سب رئیسوں ہی کے پسند کی چیزیں ہیں۔ گنوار ان کی قدر کیا جانے؟

رما۔ ساڑھے آٹھ سو بہت ہوتے ہیں بھائی!

چرن داس روپوں کا منہ نہ دیکھیے بابو جی! جب بہو جی پہن کر بیٹھیں گے تو ایک

نگاہ میں سارے روپے وصول ہو جائیں گے۔

رما کو یقین تھا کہ جالپا زیوروں کی یہ قیمت سن کر آپ ہی بدک جائے گی۔ دلال سے اور زیادہ بات نہ کی۔ اندر جاکر زور سے ہنسا اور بولا۔ آپ نے اس کنگن کا کیا دام سمجھا تھا اماں؟

جاگیشری کوئی جواب دے کر بے وقوف نہ بنا چاہتی تھی۔ بولی۔ ان جڑاؤ چیزوں میں ناپ تول کا تو کوئی حساب ہوتا نہیں۔ جتنے میں طے ہوجائے وہی ٹھیک ہے۔

رما۔ اچھا تم بتاؤ جالپا۔ اس کنگن کا کتنا دام آنکتی ہو؟

جالپا۔ چھ سو سے کم نہیں ہے۔

رما نے قیمت کا خوف دکھا کر ان چیزوں کو واپس کر دینا چاہا تھا۔ مگر اس میں اسے کامیابی نہ ہوئی۔ چھ اور سات میں تھوڑا ہی فرق تھا اور ممکن ہے چرن داس چھ سو ہی میں راضی ہوجائے۔ کچھ جھینپ کر بولا۔ کچے نگینے نہیں ہیں۔

جالپا۔ کچھ بھی ہو۔ چھ سو سے زیادہ کا نہیں ہے۔

"اور رنگ کے؟"

"زیادہ سے زیادہ سو روپے"

"یہاں بھی چوکیں۔ ڈیڑھ سو مانگتا ہے۔"

"جلتو ہے کوئی۔ ہمیں ان داموں لینا ہی نہیں۔"

رما کی چال الٹی پڑی۔ جالپا کو ان چیزوں کی قیمت کے بارے میں بہت غلط فہمی ہوئی تھی۔ لیکن سات سو ہی کوئی چھوٹی رقم ہے۔ آخر جالپا اس کی مالی حالت سے تو واقف تھی۔ پھر بھی سات سو روپے کی چیزوں کے لیے منہ کھولے بیٹھی تھی۔ رما کو کیا معلوم تھا کہ جالپا کچھ اور ہی سمجھ کر کنگن پر لہرائی تھی۔ اب تو گلا چھوٹنے کی ایک ہی تدبیر تھی اور وہ یہ کہ دلال چھ سو پر راضی نہ ہو۔ بولا۔ وہ ساڑھے آٹھ سو سے کوڑی کم نہ لے گا۔

جالپا۔ تو لٹا دو۔ نہیں چلو۔ میں پوچھتی ہوں۔

رما کی روح فنا ہوگئی۔ دلال راضی ہوگیا۔ تو پھر اس کے بنائے کچھ نہ بنے گی۔

جالپا دالان میں آکر بولی۔ ذرا یہاں آنا جی۔ او صراف! لوٹنے آئے ہو یا مال بیچنے آئے ہو سات سو روپے کنگن کے مانگتے ہو۔

چرن داس۔ سات سو تو اس کی کاریگری کے دام ہیں بہو!
جالپا۔ اچھا جو اس پر سات سو نچھاور کرے۔ اس کے پاس لے جاؤ۔ یہاں تو دونوں چیزوں کے سات سو ملیں گے۔
چرن داس۔ بہو جی! آپ تو اندھیر کرتی ہو۔ کہاں ساڑھے آٹھ سو اور کہاں سات سو!
جالپا۔ تمھاری خوشی! اپنی چیز لے جاؤ۔

چرن داس نے خوشامد کرتے ہوئے کہا۔ اتنے بڑے دربار میں آکر چیز لوٹا لے جاؤں۔ آپ یوں ہی پہنیں۔ دس پانچ کی بات ہوتی۔ تو آپ کی زبان۔ پھیرتا۔ آپ سے جھوٹ نہیں کہتا۔ ان چیزوں پر پیسہ روپیہ نفع ہے۔ اسی ایک پیسے میں دکان کا بھاڑا۔ دستوری۔ دلالی سب سمجھیے۔ ایک بات ایسی سمجھ کر کہہ دیجیے کہ ہمیں بھی چار پیسے مل جائیں۔ سویرے سویرے لوٹنا نہ پڑے۔

جالپا نے بے اعتنائی سے کہا۔ کہہ دیئے وہی سات سو۔

چرن داس نے ایسا منہ بنایا۔ گویا اس کی رقم ڈوبی جا رہی ہے۔ اور بولا۔ بہو جی ہے تو گھاٹا ہی۔ مگر آپ کی بات نہیں ٹالتے بنتی۔ روپے کب ملیں گے؟

جالپا نے گھر میں جاتے ہوئے کہا۔ جلدی ہی مل جائیں گے۔

جالپا اندر آکر بولی۔ آخر دیا کہ نہیں! ڈیڑھ سو صاف اُڑائے لیے جاتا تھا۔ مجھے افسوس ہو رہا ہے کہ کچھ اور کم کیوں نہ کہا؟

یہ لوگ اس طرح گاہکوں کو لوٹتے ہیں۔

رما کچھ نہ بولا۔ اس کی چالیں کچھ اُلٹی پڑیں کہ چار و ناچار اس کی گردن پر بوجھ لد ہی گیا۔

جالپا تو خوشی کی اُمنگ میں دونوں چیزیں لیے اوپر چلی گئی۔ مگر رما سر جھکائے خاموش کھڑا تھا۔ جالپا نے اس کی حالت جان کر بھی ان چیزوں سے کیوں انکار نہ کردیا۔ کیوں زور دے کر نہیں کہا۔ میں نہ لوں گی۔ انھیں واپس کردو۔ اسے اس کا رنج تھا۔ آخر اس نے اپنے دل کو سمجھایا۔ یہ اپنی ہی حماقتوں کا کفارہ ہے۔ یہ میری ہی غلطی ہے۔ مجھے دلال کو دروازے ہی سے دھتکار دینا چاہیے تھا۔

کھانا کھاکر جب رما اوپر کپڑے پہننے گیا۔ تو جالپا آئینہ کے سامنے کھڑی کانوں میں

رنگ پہن رہی تھی۔ اسے دیکھ کر بولی۔ آج کسی اچھے کا منہ دیکھ کر اُٹھی تھی۔ دو چیزیں مفت ہاتھ آگئیں۔

رما نے تعجب سے پوچھا۔ مفت کیوں؟ روپے نہ دینے پڑیں گے۔

جالپا۔ روپے تو اماں جی دیں گی۔

رما۔ کیا کچھ کہتی تھیں؟

جالپا۔ انھوں نے میری نذر کیے ہیں تو روپے کون دے گا؟

رما نے اس کے بھولے پن پر مسکرا کر کہا۔ یہ سمجھ کر تم نے یہ چیزیں لے لیں۔ اماں کو دینا ہوتا تو اسی وقت دے دیتیں جب چوری ہوئی تھی۔

جالپا ہیص بیص میں پڑگئی۔ بولی۔ تو مجھے کیا معلوم تھا۔ اب بھی تو لوٹا سکتے ہو کہہ دینا۔ جس کے لیے یہ چیزیں لی تھیں۔ اسے پسند نہیں آئیں۔

یہ کہہ کر اس نے فوراً کانوں سے رنگ نکال لیے۔ کنگن بھی اُتار ڈالے اور دونوں چیزیں کیسوں میں رکھ کر اس کی طرف اس طرح بڑھائے۔ جیسے کوئی بلی چوہے سے کھیل رہی ہو۔ کیا بلی چوہے کو اپنی گرفت سے باہر ہونے دیتی ہے۔ وہ اسے چھوڑکر بھی نہیں چھوڑتی۔ جالپا کا ہاتھ پھیلا ہوا تھا۔ لیکن چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ کیوں وہ رما کی طرف نہ دیکھ کر زمین کی طرف دیکھ رہی تھی۔ کسی مصیبت سے سبکدوش ہوجانے پر جو دلی مسرت ہونی چاہیے۔ وہ کہاں تھی؟ اس کی حالت ٹھیک اسی ماں کی سی تھی۔ جو اپنے بیٹے کو پردیس جانے کی اجازت دے رہی ہو۔ وہی مجبوری۔ وہی کش مکش اس کے چہرے پر جھلک رہی تھی۔

رما اتنا بے درد نہ تھا کہ وہ چیزیں اس کے ہاتھ سے لے لیتا۔ اسے تقاضے سہنا۔ شرمندہ ہونا۔ منہ چھپائے پھرنا۔ فکر کی آگ میں گھلنا سب کچھ منظور تھا۔ مگر جالپا کو مایوس نہ کرسکتا تھا۔

اس نے مسکراکر کہا۔ رہنے دو۔ اب لے لیا ہے تو کیا لوٹائیں؟ اماں بھی ہنسیں گی۔

جالپا نے مصنوعی مآل اندیشی سے کہا۔ اپنی چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانا چاہیے۔ ایک نئی مصیبت مول لینے کی کیا ضرورت ہے؟

رما نے گویا پانی میں ڈوبتے ہوئے کہا۔ ایشور مالک ہے فوراً نیچے چلا گیا۔

ہم عارضی شرم و لحاظ میں پڑ کر اپنی زندگی کے سکون اور عافیت کا کیسے خون کردیتے ہیں۔ اگر جالپا حسن کے اس جھونکے میں اپنے مستقبل کو رکھ سکتی۔ اگر رما جھوٹے لحاظ کے آگے سر نہ جھکا دیتا۔ دونوں کے دلوں میں سچی ہمدردی ہوتی۔ تو وہ گمراہ ہوکر تباہی کی طرف کیوں گامزن ہوتے۔

گیارہ بج گئے تھے۔ دفتر کے لیے دیر ہورہی تھی۔ مگر رما اس طرح جا رہا تھا جیسے اپنے کسی عزیز کو دفن کرکے لوٹ رہا ہو۔

(۱۵)

جالپا اب وہ خلوت پسند نازنین نہ تھی۔ جو دن بھر منہ لپیٹے اُداس پڑی رہتی تھی اسے اب گھر میں بیٹھنا اچھا نہ لگتا تھا۔ اب تک وہ مجبور تھی۔ کہیں آجا نہ سکتی تھی۔ اب خدا کے فضل سے اس کے پاس بھی گہنے ہوگئے تھے۔ پھر وہ گوشۂ تنہائی میں کیوں پڑی رہتی زیور لباس کوئی مٹھائی تو نہیں ہے، جس کی لذت تنہائی میں حاصل کی جاسکے۔ محلے یا برادری میں کہیں سے بلاوا آتا۔ تو وہ ساس کے ساتھ ضرور جاتی۔ کچھ دنوں کے بعد ساس کی ضرورت بھی نہ رہی۔ وہ اکیلی ہی آنے جانے لگی۔ اس کی شکل و صورت، زیور، لباس اور آداب و اخلاق نے تھوڑے ہی دنوں میں اسے محلے کی عورتوں میں اعزاز کے رُتبہ پر پہنچا دیا۔ اس کے بغیر محفل سونی رہتی۔ اس کے گلے میں اتنا لوچ تھا۔ اندازِ گفتگو اتنا دل آویز اور ادائیں اتنی دل کش کہ وہ محفل کی رانی معلوم ہوتی تھی۔ روز ہی کہیں نہ کہیں عورتوں کا جماؤ ہوجاتا۔ گھنٹے دو گھنٹے گا بجا کر یا گپ شپ کرکے عورتیں دل بہلایا کرتیں پھاگن میں پندرہ دن برابر گانا ہوتا رہا۔ کبھی کسی کے گھر، کبھی کسی کے گھر۔ جالپا نے جیسا حسن پایا تھا ویسا ہی فیاض دل ہی پایا تھا۔ مہمان نوازیوں کا خرچ بیشتر اس کے ذمہ آتا۔ کبھی کبھی گانے والیاں بلائی جاتیں۔ ان کی خاطر و مدارات کا بار بھی اسی پر تھا۔ کبھی کبھی وہ مستورات کے ساتھ ندی اشنان کرنے جاتی۔ تانگے کا کرایہ اور ناشتہ کا خرچ اسی کے متھے جاتا۔ اسی طرح سے دو تین روپیہ روز اُڑجاتے تھے۔ رما جان نثار شوہر تھا۔ جالپا کے قدموں پر اپنی جان تک صدقے کردیتا۔ روپیہ کی حقیقت کیا تھی۔ اس کا منہ تاکتا رہتا تھا۔

ایک بار مستورات کو سینما دیکھنے کی دُھن سوار ہوئی۔ اس میں انھیں مزا آیا کہ آئے دن سینما کی سیر ہونے لگی۔ رما کو اب تک سینما کا شوق نہ تھا۔ شوق ہوتا بھی تو کیا کرتا۔

اب ہاتھ میں پیسے آنے لگے۔ اس پر جالپا کا اصرار پھر بھلا وہ کیوں نہ جاتا۔ سینما ہال میں ایسی کتنی ہی عورتیں نظر آتیں جو منہ کھولے بے حجاب ہنستی بولتی رہتی تھیں۔ ان کی آزادی نادانستہ طور پر جالپا پر بھی جادو ڈالتی جاتی تھی۔ وہ گھر سے باہر نکلتے ہی منہ کھول لیتی۔ مگر حجاب کے باعث پردہ نشینوں کے ساتھ ہی بیٹھتی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ رما بھی اس کے ساتھ بیٹھے آخر وہ ان فیشن ایبل عورتوں سے کس بات میں کم ہے۔ روپ رنگ میں کم نہیں۔ سج دھج میں کم نہیں؟ پھر وہ پردے والیوں کے ساتھ کیوں بیٹھے۔ رما بہت تعلیم یافتہ ہونے پر بھی دورِ جدید کے اثر سے آزاد خیال تھا۔ پہلے تو وہ پردے کا ایسا حمایتی تھا کہ ماں کو کبھی گنگا اشنان کرنے لے جاتا تو پنڈوں تک سے نہ بولنے دیتا۔ کبھی ماں کی ہنسی مردانے میں سنائی دیتی تو آکر بگڑتا۔ تم کو ذرا بھی شرم نہیں اماں۔ باہر لوگ بیٹھے ہوئے ہیں اور تم ہنس رہی ہو۔ ماں شرما جاتی تھی۔ مگر عمر کے ساتھ رما کا وہ حجاب غائب ہوجاتا تھا۔ اس پر جالپا کا شگفتہ حسن اسے اور بھی دلیر بنا رہا تھا۔ جالپا بدوضع، بدشکل یا بدتمیز ہوتی تو اسے وہ زبردستی پردے میں بٹھاتا۔ اس کے ساتھ سیر کرنے میں اسے شرم آتی۔ جالپا جیسی بے مثل حسینہ کے ساتھ سیر کرنے میں لطف کے ساتھ ہی کچھ وقار بھی تھا۔ وہاں کے مہذب طبقے میں کوئی نازنین اتنی قبول صورت اتنی خوش ادا اتنی خوش قامت نہ تھی۔ دیہات کی لڑکی ہونے پر بھی وہ شہرت کے رنگ میں ایسی رنگ گئی تھی۔ گویا شہر میں ہی اس کی پرورش ہوئی ہے۔ تھوڑی سی انگریزی تعلیم کی تھی۔ وہ رما پوری کیے دیتا تھا۔

مگر پردے کی یہ بندش ٹوٹے کیسے؟ سینما ہال میں رما کے کتنے ہی دوست کتنے ہی شناسا بیٹھے نظر آتے تھے۔ وہ اسے جالپا کے ساتھ بیٹھے دیکھ کر کتنا مضحکہ اُڑائیں گے۔ کتنے فقرے کسیں گے۔

آخر ایک دن اس نے سب کے سامنے خم ٹھونک کر کھڑے ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ جالپا سے بولا۔ آج ہم تم سینما گھر میں ساتھ بیٹھیں گے۔

جالپا کے دل میں گدگدی ہونے لگی۔ بولی۔ سچ؟ نہیں بھائی ساتھ والیاں زندہ نہ چھوڑیں گی۔

رما۔ اس طرح ڈرنے سے تو کچھ نہ ہوگا۔ یہ کیا مذاق ہے کہ عورتیں منہ چھپائے چق کی

آڑ میں بیٹھی رہیں۔ اس طرح یہ معاملہ بھی طے ہوگیا۔ دو چار دن دونوں کو جھینپتے رہے۔ لیکن پھر ہمت کھل گئی۔ یہاں تک کہ رما اور جالپا شام کے وقت پارک میں ساتھ ساتھ ٹہلتے نظر آنے لگے۔

ایک دن جالپا نے مسکرا کر کہا۔ کہیں بابو جی دیکھ لیں تو؟

"تو کیا؟ کچھ نہیں"

"میں تو مارے شرم کے گر جاؤں!"

"ابھی تو مجھے بھی شرم آئے گی۔ مگر وہ خود ادھر نہ آئیں گے"

"اور کہیں اماں دیکھ لیں تو؟"

"اماں سے کون ڈرتا ہے۔ دو دلیلوں میں ٹھیک کردوں گا۔"

دس پانچ دن سے اس نئی سوسائٹی میں اپنا رنگ جما لیا۔ اس نے اس دائرے میں کچھ اس طرح قدم رکھا جیسے کوئی باکمال مقرر پہلی بار منبر پر آتا ہے اور نقادانِ ناہمدرد ہونے پر بھی اس کے کمال کے آگے سر جھکا دیتے ہیں۔ جالپا کے حسن میں وہ تمکنت، وہ خودداری تھی جو عالی نسبی کی دلیل ہے۔ پہلے ہی دن ایک خاتون نے جالپا کو چائے کی دعوت دی اور جالپا نے خواہش نہ ہونے پر بھی اسے قبول کرلیا۔

جب دونوں آدمی وہاں سے لوٹے تو رما نے متفکرانہ انداز سے کہا۔ تو کل اس کی چائے پارٹی میں جانا پڑے گا؟

"تو کیا کرتی! انکار کرتے بھی تو نہ بنتا تھا۔"

تو سویرے تمھارے لیے ایک اچھی سی ساڑھی لا دوں؟

"میرے پاس تو ساڑھیاں ہیں۔ ذرا دیر کے لیے پچاس ساٹھ روپے خرچ کرنے سے کیا فائدہ؟

"تمھارے پاس اچھی ساڑھی کہاں ہے؟ جیسی اس کی ساڑھی تھی۔ ویسی ہی میں بھی لاؤں گا۔"

"مجھے صاف کہہ دینا چاہیے تھا کہ میں نہیں آسکتی۔"

"پھر اس کی دعوت بھی تو کرنی پڑے گی؟"

"یہ تو بڑی مصیبت گلے پڑی!"

"مصیبت تو کچھ نہیں ہے۔ صرف یہی خیال ہے کہ میرا مکان بے مصرف ہے۔ میز۔ کرسیاں۔ چائے کے سِٹ تو رمیش کے یہاں سے مانگ لاؤں گا۔ لیکن گھر کے لیے کیا کروں؟"

"کیا یہ ضروری ہے کہ ہم بھی اس کی دعوت کریں؟"

رما نے اس جُملے پر کچھ التفات نہ کیا۔ اسے جالپا کے لیے ایک خوبصورت کلائی کی گھڑی اور ایک ساڑھی کی فکر پیدا ہوگئی۔ اس کے پاس ایک کوڑی بھی نہ تھی۔ اس کا خرچ روز بروز بڑھتا جاتا تھا۔ ابھی تک صرافوں کو ایک پیسہ دینے کی بھی نوبت نہ آئی تھی۔ ایک بار گنگو نے اشارے سے تقاضا بھی کیا تھا۔ لیکن یہ بھی تو نہیں ہوسکتا کہ جالپا پھٹے حالوں چائے پارٹی میں جائے۔ رات بھر تو اس نے صبر کیا۔ دوسرے دن دونوں چیزیں لاکر ہی دم لیا۔

جالپا نے جھنجھلا کر کہا۔ میں نے تمھیں منع کیا تھا۔ ڈیڑھ سو سے کم کی نہ ہوں گی۔

"ڈیڑھ سو! اتنا فضول خرچ میں نہیں ہوں۔"

"ڈیڑھ سو سے کم کی یہ چیزیں نہیں ہیں!"

رما نے جالپا کی کلائی پر گھڑی باندھ دی اور فریفتہ ہوکر بولا۔ تمھاری کلائی! یہ کیسی کھل رہی ہے؟ میرے روپے وصول ہوگئے۔

"سچ بتاؤ۔ کتنے خرچ ہوئے؟"

"سچ بتا دوں۔ ایک سو پینتیس روپے۔ پچھتر روپے کی ساڑھی، دس کے جوتے اور پچاس کی گھڑی۔"

جالپا ملول ہوکر بولی۔ وہ ڈیڑھ سو ہی ہوئے۔ مگر یہ سب روپے ادا کیسے ہوں گے۔ اس چڑیل نے ناحق مجھے دعوت دے دی۔ اب میں باہر جانا ہی چھوڑ دوں گی۔

رما بھی اسی فکر میں غرق تھا۔ پر اس کا اظہار کرکے جالپا کی مسرت میں کیسے رخنہ ڈالتا۔ بولا۔ سب ادا ہوجائے گا۔

جالپا نے ترش ہوکر کہا۔ کہاں سے ادا ہوجائے گا۔ ذرا سنوں؟ کوڑی تو بچتی نہیں ادا کہاں سے ہوجائے گا۔ ان چیزوں کو لوٹا آؤ۔"

رما نے منّت آمیز لہجہ میں کہا۔ ان چیزوں کو رکھ لو۔ پھر تم سے بغیر پوچھے نہ لاؤں گا۔

شام کو جالپا نے نئی ساڑھی پہنی۔ گھڑی کلائی پر باندھی اور آئینہ میں اپنی صورت دیکھی تو غرور اور مسرت سے اس کا چہرہ روشن ہوگیا۔ اس نے ان چیزوں کو واپس کرنے کے لیے خواہ سچے دل سے اصرار کیا ہو۔ پر اس وقت وہ اتنی نفس کشی کے لیے تیار نہ تھی۔ شام کو جالپا اور رما چھاؤنی کی طرف چلے۔ اس خاتون کا بنگلہ ملنے پر دیر نہ ہوئی۔ پھاٹک پر سائن بورڈ تھا۔ "اندربھوشن ایڈوکیٹ" اب معلوم ہوا۔ وہ ان وکیل صاحب کی بیوی تھی۔ پنڈت جی یہاں کے نامی وکیل تھے۔ رما نے انھیں کئی بار دیکھا تھا لیکن اتنے بڑے آدمی سے اس کے ذاتی مراسم کیا ہوتے۔ چھ مہینے پہلے وہ اس کا خیال بھی نہ کرسکتا تھا کہ کبھی وہ ان کے یہاں مدعو ہوگا۔ مگر جالپا کی بدولت وہ اعزاز بھی اسے حاصل ہوگیا۔ اس وقت وہ شہر کے سب سے بڑے وکیل کا مہمان تھا۔

رما نے سوچا تھا۔ یہاں بہت سے آدمیوں کی دعوت ہوگی۔ مگر یہاں وکیل صاحب اور ان کی بیوی کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ انھیں دیکھتے ہی باہر نکل آئی اور انھیں اندر لے جاکر اپنے شوہر سے ان کا تعارف کرایا۔ پنڈت جی نے آرام کرسی پر لیٹے لیٹے دونوں مہمانوں سے ہاتھ ملایا اور رما سے بولے۔ معاف کیجیے گا بابو صاحب میری طبیعت اچھی نہیں ہے۔ یہاں آپ کسی دفتر میں ہیں؟

رما نے جھینپتے ہوئے کہا۔ جی ہاں میونسپل آفس میں ہوں۔ ابھی حال ہی میں آیا ہوں۔ قانون کی طرف جانے کا ارادہ تھا۔ لیکن یہاں نئے وکیلوں کی حالت دیکھ کر ہمت نہ پڑی۔

رما نے اپنا وقار بڑھانے کے لیے تھوڑا سا جھوٹ بولنا ضروری سمجھا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کا اثر خاطر خواہ ہوا۔ اگر وہ صاف کہہ دیتا۔ میں پچیس روپے کا کلرک ہوں تو شاید وکیل صاحب اس سے ہم کلام ہونے میں اپنی توہین سمجھتے۔ مسکرا کر بولے۔ آپ نے بہت اچھا کیا جو ادھر نہیں آئے۔ دو چار سال کے بعد آپ کسی اچھے عہدے پر پہنچ جائیں گے۔ یہاں ممکن ہے۔ تب تک آپ کو کوئی مقدمہ ہی نہ ملتا۔

جالپا کو ابھی تک شبہ ہو رہا تھا کہ رتن وکیل صاحب کی لڑکی ہے یا بیوی؟ وکیل صاحب کی عمر ساٹھ سے متجاوز تھی۔ چکنی چاند آس پاس کے سفید بالوں کے بیچ میں وارنش کی ہوئی، لکڑی کی طرح چمک رہی تھی۔ مونچھیں صاف تھیں۔ لیکن ماتھے کے شکن

اور گالوں کی جھریاں بتا رہی تھیں۔ مسافر منزل کے قریب پہنچ گیا ہے۔ مریض آرام کرسی پر لیٹے ہوئے وہ ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے برسوں کا مریض ہو۔ ہاں رنگ گورا تھا جو ساٹھ سال کی گرمی اور سردی کھا کر بھی اڑ نہ سکا تھا۔ اونچی ناک تھی۔ اونچی پیشانی اور بڑی بڑی آنکھیں جن میں غرور لبریز تھا۔ اس کے برعکس رتن سانولی، ملیح اور بھرے ہوئے بدن کی عورت تھی۔ نہایت ملنسار اور خنداں پیشانی جسے غرور چھو تک نہ گیا تھا۔ اس کی شکل میں حسن کی کوئی علامت نہ تھی۔ ناک چپٹی تھی۔ چہرہ گول۔ آنکھیں چھوٹی پھر بھی وہ رانی سی لگتی تھی۔ جالپا اس کے سامنے ایسی معلوم ہوتی تھی جیسے سورج مکھی کے سامنے جوہی کا پھول!

چائے آئی۔ میوے۔ پھل۔ مٹھائی۔ برف کی قلفی سب میزوں پر چُن دی گئی۔ رتن اور جالپا ایک میز پر بیٹھیں۔ دوسری میز رما اور وکیل صاحب کی تھی۔ رما اپنی جگہ پر جا بیٹھا۔ مگر وکیل صاحب ابھی آرام کرسی پر لیٹے ہوئے تھے۔

رما نے مسکرا کر وکیل صاحب سے کہا۔ آپ بھی تو آیئے!

وکیل صاحب نے لیٹے ہی لیٹے جواب دیا۔ آپ شروع کیجیے میں بھی آجاتا ہوں۔

لوگوں نے چائے پی۔ پھل کھائے۔ مگر وکیل صاحب کے سامنے ہنستے بولتے رما اور جالپا دونوں ہی جھجکتے تھے۔ زندہ دل بوڑھوں کے ساتھ تو صحبت کا لطف اُٹھایا جاسکتا تھا۔ لیکن ایسے روکھے، سرکہ جبیں بے جان آدمی جواں بھی ہوں تو دوسرے کو افسردہ دل بنا دیتے ہیں۔ وکیل صاحب نے بہت اصرار کرنے پر دو گھونٹ چائے پی۔ دُور سے بیٹھے تماشہ دیکھتے رہے۔ اس لیے جب رتن نے جالپا سے کہا۔ چلو ہم لوگ ذرا باغیچہ کی سیر کر آویں۔ ان دونوں صاحبوں کو قانون اور اخلاق کی بحث کرنے دیں تو گویا جالپا کے گلے کا پھندا کُھل گیا۔ رما نے پنجرے میں بند طائروں کی طرح ان دونوں کو کمرے سے نکلتے دیکھا اور ایک لمبی سانس لی۔ وہ جانتا کہ یہ مصیبت اس کے سر آئے گی تو یہاں آنے کا نام نہ لیتا۔

وکیل صاحب نے منہ سکوڑ کر پہلو بدلا۔ اور بولے۔ معلوم نہیں کہ پیٹ میں کیا ہوگیا ہے کہ کوئی چیز ہضم ہی نہیں ہوتی۔ دودھ بھی ہضم نہیں ہوتا۔ چائے کو نہ جانے لوگ اتنے شوق سے پیتے ہیں۔ مجھے تو اس کی صورت سے نفرت ہے۔ پیتے ہی جسم میں اینٹھن سی ہونے لگتی ہے اور آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگتی ہیں۔

رما نے پوچھا۔ آپ نے ہاضمہ کی دوا نہیں کی۔

وکیل صاحب نے بے رخانہ انداز سے کہا۔ دوائیوں پر مجھے ذرہ بھر بھی اعتبار نہیں۔ ان ویدوں اور ڈاکٹروں سے زیادہ کج فہم آدمی دنیا میں نہ ملیں گے۔ کسی میں بھی تشخیص کا مادہ نہیں۔ کبھی دو ویدوں یا ڈاکٹروں کی تشخیص ایک ساں نہ ہوگی علامتیں وہی ہیں۔ مگر ایک وید خون کا فساد بتلاتا ہے دوسرا صفرا کا۔ ایک ڈاکٹر پھیپھڑے کا آماس بتلاتا ہے تو دوسرا معدے کا سرطان۔ بس قیاس سے دوا کی جاتی ہے اور بے رحمی سے مریضوں کی گردن پر چھری پھیری جاتی ہے۔ ان ڈاکٹروں نے تو اب تک مجھے جہنم میں پہنچا دیا ہوتا۔ پر کسی طرح ان کے پنجے سے نکل بھاگا۔ یوگ کے علم کی بڑی تعریف سنتا ہوں لیکن ایسا مہاتما نہیں ملتا۔ جس سے کچھ سیکھ سکوں۔

یہاں تو فنِ طب پر اعتراضات ہو رہے تھے۔ اور ادھر دونوں حسینوں میں راز و نیاز کی باتیں ہورہی تھیں۔ رتن نے مسکرا کر کہا۔ وکیل صاحب کو دیکھ کر تمھیں بڑا تعجب ہوا ہوگا۔ میں ان کی دوسری بیوی ہوں۔ پہلی بیوی کو مرے پینتیس سال ہوگئے۔ اس وقت ان کی عمر کل پچیس سال کی تھی۔ لوگوں نے سمجھایا۔ دوسری شادی کرلو۔ لیکن ایک لڑکا موجود تھا۔ شادی کرنے سے انکار کردیا۔ اور تیس سال تک تنہا رہے۔ مگر آج پانچ سال ہوئے جوان بیٹے کا انتقال ہوگیا۔ تب دوسری شادی کی فکر ہوئی۔ میرے ماں باپ نہ تھے۔ ماموں نے میری پرورش کی تھی۔ کہہ نہیں سکتی کہ ان سے کچھ لے لیا یا ان کی شرافت پر ریجھ گئے۔ میں تو سمجھتی ہوں کہ ایشور کی یہی مرضی تھی۔ مجھے کسی سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ بس اگر کوئی شکایت ہے تو یہی کہ میں روز بروز موٹی ہوتی چلی جاتی ہوں۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ تمھیں اولاد نہیں ہوسکتی۔ بہن مجھے تو اولاد کی آرزو نہیں۔ لیکن وکیل صاحب نے اولاد کے لیے شادی ہی کی تھی۔ میری یہ حالت دیکھ کر انھیں بہت رنج ہوتا ہے۔ میں ہی ان کی ساری شکایتوں کی جڑھ ہوں۔ آج ایشور مجھے ایک لڑکا دیدے ان کے سارے روگ بھاگ جائیں۔ کتنا چاہتی ہوں کہ دُبلی ہوجاؤں۔ گرم پانی سے ٹب اشنان کرتی ہوں۔ روز پیدل گھومنے جاتی ہوں۔ گھی دودھ بہت کم کھاتی ہوں۔ خوراک بھی آدھی کردی ہے۔ جتنی محنت کرسکتی ہوں۔ اتنی کرتی ہوں۔ پھر بھی دن بدن موٹی ہوتی جاتی ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا۔ کیا کروں؟

جالپا نے پوچھا۔ وکیل صاحب تم سے ناراض رہتے ہوں گے؟

رتن نے کہا۔ نہیں بہن بالکل نہیں۔ کبھی بھول کر بھی مجھ سے اس کا چرچا نہیں کیا شکایت کا کبھی ایک حرف بھی میں نے ان کی زبان سے نہیں سنا۔ لیکن میں جانتی ہوں کہ یہ فکر انھیں گھلائے ڈالتی ہے۔ اپنا کوئی قابو نہیں ہے۔ کیا کروں؟ میں جتنا چاہوں خرچ کروں۔ جیسے چاہوں رہوں۔ کبھی نہیں بولتے۔ جو کچھ پاتے ہیں لاکر میرے ہاتھ پر رکھ دیتے ہیں۔ سمجھاتی ہوں۔ اب تمھیں وکالت کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ آرام کیوں نہیں کرتے۔ مگر ان سے بیٹھے رہا نہیں جاتا۔ صرف دو چپاتیوں سے ناتا ہے۔ میں نے بہت ضد کی تو دو چار دانے انگور کے کھا لیے۔ مجھے تو ان پر رحم آتا ہے جو خدمت اپنے امکان میں ہے وہ کرتی ہوں۔ آخر وہ میرے ہی لیے تو اپنی جان کھپا رہے ہیں۔

جالپا نے ہمدردانہ لہجہ میں کہا۔ ایسے نیک نفس آدمی کو تو دیوتا سمجھنا چاہیے۔ تیس سال تک تنہا رہنا ہر ایک کا کام نہیں ہے۔

رتن۔ ہاں بہن! ہیں تو دیوتا ہی۔ اب بھی کبھی پہلی بیوی کی یاد آجاتی ہے تو رونے لگتے ہیں۔ دیکھنے میں جتنے روکھے معلوم ہوتے ہیں۔ اندر سے اتنے ہی نرم ہیں۔ یتیموں اور بیواؤں کے وظیفے باندھ رکھے ہیں۔ تمھارا یہ کنگن تو بڑا خوش نما ہے۔

جالپا۔ ہاں! ہوشیار کاریگر نے بنایا ہے۔

رتن۔ میں تو یہاں کسی کو جانتی نہیں۔ وکیل صاحب کو تکلیف دینے کو جی نہیں چاہتا۔ معمولی سناروں سے بنواتے ڈر لگتا ہے۔ نہ جانے کیا ملا دیں۔ تم اپنے بابو جی سے میرے لیے ایسا ہی ایک جوڑا کنگن بنوا دو۔

جالپا نے کنگن بنوانے کا وعدہ کیا۔

رتن۔ آج تمھارے آنے سے طبیعت بہت خوش ہوئی۔ دن بھر اکیلی پڑی رہتی ہوں۔ کس کے پاس جاؤں؟ دو ایک عورتوں سے راہ رسم بڑھائی۔ چاہا کہ ان سے بہناپا جوڑوں۔ لیکن ان کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر ان سے دور رہنا ہی اچھا معلوم ہوا۔ شوق کی چیزوں پر ایسا ٹوٹتی تھیں کہ دیکھ کر شرم آتی تھی۔ تم گھنٹے آدھ گھنٹے کے لیے روز چلی آیا کرو۔

جالپا۔ واہ! یہ تو میرے دل کی بات ہوئی۔

رتن۔ میں موٹر بھیج دیا کروں گی۔

"کیا ضرورت ہے؟ تانگے تو ملتے ہی ہیں۔"

"نہ جانے کیوں تمھیں چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا؟ تمھیں پاکر رما ناتھ اپنی تقدیر کو سراہتے ہوں گے۔"

جالپا مسکرا کر بولی۔ "تقدیر تو نہیں سراہتے۔ گھڑکیاں جمایا کرتے ہیں۔"

اسی اثنا میں رما ناتھ بھی وہاں آ پہنچا۔ جالپا نے اس سے کنگن کا ذکر کیا۔ رما نے سرخرو ہونے کا موقعہ پاکر کہا۔ ہاں بنوا دوں گا۔ اس سے بہت اچھے بنا سکتا ہے۔

رتن نے پوچھا۔ اس جوڑے کے کیا لیے تھے۔

جالپا۔ آٹھ سو کے تھے۔

رتن۔ کوئی ہرج نہیں۔ مگر بالکل ایسے ہی ہوں۔ اسی نمونے کے۔

رما۔ ہاں! بنوا دوں گا۔

رتن۔ مگر بھائی ابھی میرے پاس روپے نہیں ہیں۔

روپے کے معاملے میں عورتوں کے سامنے مردوں کی زبان بند ہوجاتی ہے۔ کیا وہ کہہ سکتا تھا۔ اس وقت میرے پاس بھی روپے نہیں ہیں۔ یہ عذر وہ کسی حالت میں بھی نہیں کرسکتا تھا۔ چاہے اسے دوسروں سے قرض لینا پڑے۔ دوسروں کی خوشامد کرنی پڑے مگر ایک حسینہ کے روبرو اپنی مجبوری کا اظہار نہ کرے گا۔ شاید اس نے کوئی عذر کیا ہوتا تو جالپا کو بھی بُرا معلوم ہوتا۔ وہ ڈر رہی تھی کہ کہیں حضرت عذر نہ کر بیٹھیں۔ اس لیے جب رما نے دلیرانہ انداز سے کہا کہ روپے کی کوئی بات نہیں۔ جب چاہے دے دیجیے تو وہ خوش ہوگئی۔

رتن۔ تو کب تک اُمید کروں؟

رما۔ میں آج ہی صراف سے کہہ دوں گا۔ زیادہ سے زیادہ دو ہفتہ سمجھیے۔

جالپا نے رتن کو اپنے گھر چائے کی دعوت دی۔ اور دونوں گلے مل کر جدا ہوئیں۔ گھر پہنچے تو شام ہوگئی تھی۔ رمیش بابو بیٹھے ہوئے تھے۔ جالپا تو اتر کر اندر چلی گئی۔ رما رمیش کے پاس جاکر بولا۔ آپ کو آنے میں دیر ہوئی۔

رمیش۔ ابھی تو چلا آرہا ہوں۔ وکیل صاحب کے یہاں دعوت تھی؟

رما۔ جی ہاں! تین روپے کی چپت پڑ گئی۔

رمیش۔ کوئی ہرج نہیں۔ یہ روپے وصول ہوجائیں گے۔ بڑے آدمیوں سے راہ و رسم پیدا ہوجائے تو بڑے بڑے کام نکلتے ہیں۔

رما۔ اب کی اتوار کو انھیں بھی چائے کی دعوت دے آیا ہوں۔

رمیش نے ہاتھ بڑھا کر کہا۔ تب تو یہ کہو کہ تم سے یارانہ ہوگیا۔ کہو تو میں بھی آجاؤں۔ سنا وکیل صاحب کے ایک بھائی انجنیر ہیں۔ میرے ایک سالے بہت دنوں سے بیکار بیٹھے ہوئے ہیں۔ اگر وکیل صاحب اس کی سفارش کردیں۔ تو غریب کو جگہ مل جائے۔ تم ذرا انٹروڈکشن کردینا۔ باقی اور سب میں کر لوں گا۔ پارٹی کا انتظام ایشور نے چاہا تو ایسا ہوگا کہ وہ لوگ خوش ہوجائیں گے۔ سارا انتظام میرے اوپر چھوڑ دو۔ نہ قلی کی ضرورت نہ مزدور کی انھیں موسل چند کو پھانسوں گا۔

رما۔ ابھی دو تین مہینے ہوئے۔ آپ نے انھیں ایک جگہ تو دلا دی تھی۔

رمیش۔ اجی ابھی چھ اور باقی ہیں۔ پورے سات آدمیوں کی پلٹن ہے۔ ذرا بیٹھ جاؤ ضروری چیزوں کی فہرست بنا لی جائے کتنے مہمان ہوں گے۔

رما۔ بس وکیل صاحب ہوں گے اور ان کی بیوی۔

رمیش۔ یہ بہت اچھا کیا۔ اس طرح اپنے عرض حال کا اچھا موقعہ رہے گا۔ دونوں آدمیوں نے بیٹھ کر ایک لمبی فہرست تیار کی اور دوسرے ہی دن سے رمیش بابو نے سامان بہم پہنچانا شروع کیا۔ ان کی رسائی اچھے اچھے گھروں میں تھی۔ آرائش کی ایسی نفیس چیزیں فراہم کرکے لائے کہ سارا گھر جگمگا اُٹھا۔ منشی دیا ناتھ بھی ان تیاریوں میں شریک تھے۔ چیزوں کو قرینے سے سجانا ان کا کام تھا۔ کون گملا کہاں رکھا جائے۔ کون تصویر کہاں لٹکائی جائے کون سا قالین کہاں بچھایا جائے۔ ان مسائل پر تینوں آدمیوں میں گھنٹوں مناظرے ہوتے تھے۔ دفتر جانے سے پہلے اور دفتر آنے کے بعد تینوں اسی کام میں لگ جاتے۔ ایک دن اس بات پر بحث چھڑ گئی کہ کمرے میں آئینہ کہاں رکھا جائے۔ دیا ناتھ کہتے تھے کہ اس کمرے میں آئینہ کی ضرورت نہیں۔ آئینہ پیچھے والے کمرے میں رکھنا چاہیے۔ رمیش کو اس سے اختلاف تھا۔ اور

رما دبدھے میں چپ چاپ کھڑا تھا۔ نہ ان کی سی کہہ سکتا تھا نہ ان کی سی۔

دیا ناتھ نے گرم ہو کر کہا۔ میں نے سینکڑوں انگریزوں کے ڈرائینگ روم دیکھے ہیں۔ مگر کہیں آئینہ نہیں دیکھا۔ آئینہ غسل خانے میں رکھنا چاہیے۔ یہاں آئینہ رکھنا بے تکی سی بات ہے۔

رمیش نے اتنی سرگرمی سے جواب دیا۔ مجھے اتنے انگریزوں سے سابقہ تو نہیں پڑا۔ لیکن دو چار بنگلے دیکھے ضرور ہیں۔ اور ان میں آئینہ لگا ہوا دیکھا۔ پھر اس کی ضرورت ہی کیا ہے کہ ہر ایک بات میں انھیں کی نقل کریں؟ ہم انگریز نہیں ہندوستانی ہیں۔ ہندوستانی رؤساء کے کمروں میں بڑے بڑے قدِ آدم آئینے لگے ہوتے ہیں۔ یہ تو آپ نے ہمارے بگڑے ہوئے بابوؤں کی سی بات کہی۔ جو آرائش و لباس میں، رفتار و گفتار میں، چائے و شراب میں غرض نمائش کی سبھی باتوں میں انگریزوں کا منہ چڑھاتے ہیں۔ لیکن جن باتوں نے انگریزوں کو انگریز بنا دیا ہے اور جن کی بدولت وہ دُنیا پر حکومت کرتے ہیں۔ ان کی ہوا تک نہیں لگنے دیتے۔ کیا آپ کو بھی بڑھاپے میں انگریز بننے کا شوق چرایا ہے۔

دیا ناتھ انگریزوں کی نقل کو بہت معیوب سمجھتے تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی میں بھی کوٹ نہیں پہنا تھا۔ چائے پیتے تھے۔ مگر چینی کے سٹ کی قید نہ تھی۔ کٹورا۔ کٹوری۔ گلاس۔ لوٹا۔ تسلا غرض کسی سے بھی اعتراض نہ تھا۔ لیکن اس وقت تو انھیں بحث کی دُھن سوار تھی۔ بولے۔ ہندوستانی رئیسوں کے کمروں میں میز کرسیاں نہیں ہوتیں۔ فرش ہوتا ہے آپ نے کرسی میز لگا کر اسے انگریزی طرز پر تو سجا دیا۔ آپ آئینہ کے دفعے ہندوستان کی مثال لے رہے ہیں۔ یا ہندوستانی رکھیے یا انگریزی! یہ کیا آدھا تیتر، اور آدھا بٹیر۔ کوٹ پتلون پر چوگوشیہ ٹوپی تو اچھی نہیں معلوم ہوتی۔

رمیش بابو نے سمجھا تھا کہ دیا ناتھ لاجواب ہو جائیں گے۔ لیکن یہ جواب سُنا تو چکرائے۔ میدان ہاتھ سے جاتا ہوا دکھائی دیا۔ بولے۔ تو آپ نے کسی انگریز کے کمرے میں آئینہ نہیں دیکھا۔ بھلا ایسے دس پانچ انگریزوں کے نام تو بتائیے۔

ایک آپ کا وہی کرنٹا ہیڈ کلرک ہے۔ اس کے سوا اور کسی انگریز کے کمرے میں تو آپ نے قدم بھی نہ رکھا ہوگا۔ اس کرنٹے کو آپ نے انگریزی مذاق کا نمونہ سمجھ لیا۔ خوب! مانتا ہوں۔

دیا ناتھ کچھ خفیف ہوکر بولے۔ یہ تو آپ کی زبان ہے۔ اُسے کرنٹا چٹریشن۔ پلپلی جو چاہیں کہیں۔ لیکن رنگ کو چھوڑ کر وہ کسی بات میں انگریزوں سے کم نہیں۔

رمیش اس کا جواب دینا ہی چاہتے تھے کہ ایک موٹر کار دروازے پر آکر رُکی۔ اور رتن برآمدے میں آئی۔ تینوں آدمی جھٹ پٹ باہر نکل آئے۔ رما کو اس وقت رتن کا آنا بُرا معلوم ہوا۔ ڈر رہا تھا کہ کہیں کمرے میں نہ چلی جائے۔ نہیں تو ساری قلعی کھل جائے آگے بڑھ کر ہاتھ ملاتا ہوا بولا۔ آیئے۔ یہ میرے والد ہیں اور یہ میرے دوست رمیش بابو ہیں۔ لیکن ان دونوں بھلے آدمیوں نے نہ اس سے ہاتھ ملایا اور نہ اپنی جگہ سے ہلے۔ رتن نے بھی ان سے ہاتھ ملانے کی ضرورت نہ سمجھی۔ دُور ہی سے نمسکار کرکے رما سے بولی میں بیٹھوں گی نہیں۔ اس وقت فرصت نہیں ہے۔ آپ سے کچھ کہنا تھا۔ یہ کہتے ہوئے وہ رما کے ساتھ موٹر تک آئی۔ اور آہستہ سے بولی۔ آپ نے صراف سے کہہ تو دیا ہوگا؟

رما نے برجستہ کہا۔ جی ہاں بنا رہا ہے۔

رتن۔ اس دن میں نے کہا تھا کہ روپے نہ دے سکوں گی۔ پھر خیال آیا آپ کو تکلیف ہو۔ اس لیے روپیہ کا انتظام کرلیا۔ آٹھ سو چاہیے نہ؟

جالپا نے کنگن کے دام آٹھ سو بتائے تھے۔ رما چاہتا تو اتنے روپے لے سکتا تھا۔ لیکن رتن کی سادگی اور بے تکلفی نے جیسے اس کا ہاتھ پکڑ لیا وہ بیوپاریوں سے دو دو چار چار آنے لیتے ذرا بھی نہ جھجکتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ سب بھی گاہکوں کو مونڈھتے ہیں۔ ایسوں کے ساتھ اسے اپنے طرز عمل میں کسی طرح تامل نہ ہوتا تھا۔ لیکن اس شرافت اور اخلاق کی دیوی سے دغا کرنے کے لیے کسی پرانے پاپی کی ضرورت تھی۔ کچھ شرماتا ہوا بولا۔ کیا جالپا نے کنگن کے دام آٹھ سو بتلائے تھے۔ انھیں شاید یاد نہ رہی ہوگی۔ ان کے کنگن چھ سو کے ہیں آپ چاہیں تو آٹھ سو کے بنوا دوں۔

رتن۔ نہیں! مجھے تو وہی پسند ہے آپ چھ سو کا ہی بنوایئے!

اس نے موٹر پر سے اپنی تھیلی اُٹھا کر سو سو روپے کے چھ نوٹ نکالے۔ رما نے کہا۔ ایسی جلدی کیا تھی۔ چیز تیار ہوجاتی تو حساب ہوجاتا۔

رتن نے موٹر پر بیٹھے ہوئے کہا میرے پاس خرچ ہوجاتے۔ اس لیے میں نے سوچا۔ آپ کے سر پر لاد آویں۔ میری عادت ہے کہ جو کام کرتی ہوں۔ جلد سے جلد کر ڈالتی

ہوں تاخیر سے مجھے الجھن ہوتی ہے۔

موٹر چلی گئی۔ رما روپیہ لیے ہوئے اندر چلا گیا۔ تو دونوں بڈھوں میں باتیں ہونے لگیں۔

رمیش۔ دیکھا؟

دیا ناتھ۔ آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ اب میرے گھر میں بھی یہی لہر آ رہی ہے۔

رمیش۔ میں تو اس میں کوئی ہرج نہیں سمجھتا۔ آج کل ایسی ہی عورتوں کا کام ہے۔
ضرورت پڑنے پر کچھ مدد تو کر سکتی ہیں۔ بیمار پڑجاؤ۔ تو ڈاکٹر کو تو بلا سکتی ہے۔
یہاں تو چاہے مر بھی جائیں۔ لیکن مجال کہ عورت گھر سے پاؤں نکالے۔

دیا ناتھ۔ ہم سے تو بھائی یہ انگریزیت نہیں دیکھی جاتی۔ کیا کریں اولاد کی محبت ہے نہیں
تو یہی جی چاہتا ہے کہ رما سے صاف کہہ دوں بھیا۔ اپنا گھر الگ لے کر رہ۔ آنکھ
پھوٹی پیڑ گئی۔ دیکھ ایک دن یہ عورت وکیل صاحب کو دغا دے گی۔

رمیش۔ آپ یہ کیوں مان لیتے ہیں کہ جو عورت باہر آتی جاتی ہے وہ ضرور خراب ہے مگر
رما ناتھ کو مانتی بہت ہے۔ روپے نہ جانے کیوں دیے؟

دیا ناتھ۔ مجھے تو کچھ دال میں کالا کالا نظر آتا ہے۔ رما کہیں اس سے کوئی چال نہ چل رہا
ہو۔

رما اندر سے آرہا تھا۔ یہ آخری جملہ اس کے کان میں پڑگیا۔ ترش ہو کر بولا۔ جی
ہاں ضرور چال چل رہا ہوں۔ اسے دھوکا دے کر روپے اینٹھ رہا ہوں۔ یہی تو میرا پیشہ
ہے۔

دیا ناتھ نے شرماتے ہوئے کہا۔ تو اتنا بگڑتے کیوں ہو۔ میں نے تو کوئی ایسی بات
نہیں کہی۔

رما۔ جعلساز بنا دیا۔ اور زیادہ کیا کہتے۔ آخر آپ کے دل میں ایسا شبہ کیوں آیا آپ نے مجھ
میں کون سی ایسی بُرائی دیکھی۔ جس سے یہ خیال پیدا ہوا۔ میں ذرا صاف ستھرے
کپڑے پہنتا ہوں۔ ذرا نئی تہذیب کا پیرو ہیں۔ اس کے سوا آپ نے مجھ میں کون
سی بُرائی دیکھی۔ جس سے یہ خیال پیدا ہوا۔ میں ذرا صاف ستھرے کپڑے پہنتا
ہوں۔ ذرا نئی تہذیب کا پیرو ہوں۔ اس کے سوا آپ نے مجھ میں کون سی برائی

دیکھی؟ میں جو کچھ خرچ کرتا ہوں ایمانداری کے ساتھ کما کر خرچ کرتا ہوں۔ جس دن دھوکے اور فریب کی نوبت آئے گی زہر کھاکر جان دے دوں گا۔ ہاں یہ بات ہے کہ کسی کو خرچ کرنے کی تمیز ہوتی ہے کسی کو نہیں ہوتی۔ جب آپ کے دل میں میرے متعلق ایسے شبہے پیدا ہونے لگے تو میرے لیے اس کے سوا اور کیا چارہ ہے کہ میں کالکھ لگا کر کہیں نکل جاؤں۔ رمیش بابو یہاں موجود ہیں۔ آپ میری غیبت میں میرے متعلق جو کچھ چاہیں ان سے پوچھ سکتے ہیں۔ یہ میری خاطر جھوٹ نہ بولیں گے۔

رما نے یہ الفاظ کچھ اس صداقت انگیز جوش کے ساتھ کہے کہ منشی دیا ناتھ کے سارے شبہات حرف غلط کی طرح مٹ گئے۔ نادم ہوکر بولے۔ تمھارا بڑھتا ہوا خرچ دیکھ کر میرے دل میں شبہ ہوا تھا۔ میں اسے چھپاتا نہیں۔ لیکن جب تم کہہ رہے ہوکہ تمھاری نیت صاف ہے تو مجھے اطمینان ہے۔ میری صرف یہی منشا ہے کہ میرا لڑکا چاہے غریب رہے۔ مگر نیت درست رکھے۔

رمیش نے مسکرا کر کہا۔ اچھا یہ قصہ تو ہوچکا۔ اب یہ بتاؤ۔ اس نے تمھیں روپے کیوں دیے؟

رما۔ ٹھگ لایا ہوں۔

رمیش۔ مجھ سے شرارت کروگے تو کان پکڑ لوں گا۔ اگر ٹھگ ہی لائے ہو۔ تو بھی میں تمھاری پیٹھ ٹھونکوں گا۔ جیتے رہو۔ خوب ٹھگو۔ لیکن آبرو پر آنچ نہ آنے پائے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ ایشور سے تو میں ڈرتا نہیں۔ وہ جو کچھ پوچھے گا اس کا جواب میرے پاس موجود ہے۔ مگر آدمی سے ڈرتا ہوں۔ سچ بتاؤ۔ کس لیے روپے دیے۔کچھ دلالی ملنے والی ہوتو مجھے بھی شریک کرلینا۔

رما نے اس طرح منہ بنا کر کہا۔ گویا کوئی ناگوار فرض اس کے سر ڈال دیا گیا ہے۔ ایک کنگن بنوانے کو کہہ گئی ہیں۔

رمیش۔ تو چلو میں ایک اچھے صراف سے بنوا دوں۔ مگر یہ جھنجٹ تم نے بُرا مول لیا۔ عورتوں سے ایشور بچائے۔ تم چاہے دس پانچ روپے اپنے پاس سے ہی خرچ کرو۔ وہ یہی سمجھیں گی کہ مجھے لُوٹ لیا۔

ذرا دیر بعد رما اندر جاکر جالپا سے بولا۔ رتن دیوی کنگن کے روپے دے گئیں تم نے شاید آٹھ سو بتائے تھے۔ میں نے چھ سو لے لیے۔

جالپا نے سر جھکا کر کہا۔ میں نے تو دل لگی کی تھی۔

جالپا نے اس طرح اپنی صفائی تو دے دی۔ لیکن بہت دیر تک اس کا دل اسے ملامت کرتا رہا۔ رما نے اگر آٹھ سو روپے لے لیے ہوتے تو شاید وہ اپنی کامیابی پر خوش ہوئی تھی۔ لیکن رما کی حق شناسی نے اس کے ضمیر کو بیدار کردیا تھا۔ وہ پچھتا رہی تھی ناحق جھوٹ بولی مجھے دل میں کتنا حقیر سمجھ رہے ہوں گے اور رتن نے تو دغاباز سمجھ ہی لیا۔

(۱۶)

چائے پارٹی میں کوئی خاص بات نہ ہوئی۔ رتن کے ساتھ ان کی ایک رشتے کی بہن اور تھی۔ وکیل صاحب نہ آئے تھے۔ دیا ناتھ نے اتنی دیر کے لیے وہاں سے ٹل جانا ہی مناسب سمجھا۔ ہاں رمیش بابو برآمدے میں برابر کھڑے رہے۔ جالپا کی موجودگی میں وہ پارٹی میں شریک نہ ہوسکتے تھے۔

جالپا نے دونوں مہمانوں کو اپنی ساس سے ملا دیا۔ جاگیشری کو وہ دونوں ضرورت سے زیادہ بے تکلف معلوم ہوئیں۔ ان کے سارے گھر میں دوڑنا۔ دھم دھم کرکے کوٹھے پر جانا۔ چھت پر ادھر اُدھر اُچکنا قہقہے مارمار کر ہنسنا۔ انھیں ہردنگاپن معلوم ہوتا تھا۔ ان کے آئین اخلاق میں بہو بیٹیوں کو متین اور شرمیلی ہوجانا چاہیے تھا۔ تعجب یہ تھا کہ جالپا بھی آج انھیں میں گئی تھی۔

ابھی تک رما کو پارٹی کی تیاریوں میں سے اتنی فرصت نہیں ملی تھی کہ گنگو کی دکان تک جاتا۔ اس نے سمجھا تھا۔ گنگو کو چھ سو روپے پچھلے حساب میں دے کر نئے کنگن بنوا لوں گا۔ اس طرح میرا وقار جم جائے گا۔

دوسرے دن رما خوش ہوتا ہوا گنگو کی دکان پر پہنچا اور رعب سے بولا۔ کیا رنگ ڈھنگ ہیں مہراج؟ کوئی نئی چیز بنوائی ہے؟ ادھر رما کے ٹال مٹول سے گنگو اتنا بے دل ہو رہا تھا کہ آج کچھ روپے ملنے کی امید بھی اُسے خوش نہ کرسکی۔ شکوہ آمیز انداز سے بولا۔ بابو صاحب چیزیں کتنی بنیں بکیں۔ آپ نے تو دکان پر آنا ہی چھوڑ دیا۔ اس طرح کی دکانداری ہم لوگ نہیں کرتے۔ آٹھ مہینے ہوئے آپ کے یہاں سے ایک پیسہ بھی

نہیں ملا۔

رما۔ بھائی خالی ہاتھ دکان پر آتے شرم آتی تھی۔ ہم ان لوگوں میں نہیں ہیں۔ جن سے تقاضا کرنا پڑے۔ آج یہ چھ سو روپے جمع کرلو۔ اور ایک اچھا کنگن تیار کردو۔

گنگو نے روپے لے صندوق میں رکھے اور بولا۔ بن جائیں گے تو باقی روپے کب ملیں گے؟

رما۔ بہت جلد۔

گنگو۔ ہاں بابو جی۔ پچھلا حساب صاف کردیجیے۔

گنگو نے وعدہ تو کرلیا۔ لیکن ایک بار دھوکا کھا چکا تھا۔ دوبارہ وہ ایسی علت میں پھنستے ہوئے ڈرتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رما روز تقاضے کرتا اور گنگو روز حیلے کرکے ٹالتا۔ کبھی اس کا کاریگر بیمار پڑجاتا۔ کبھی اس کے لڑکے بیمار پڑجاتے۔ ایک مہینہ گزر گیا اور کنگن نہ بنے اس کے تقاضوں کے ڈر سے رما نے پارک جانا چھوڑ دیا۔ مگر رتن نے گھر تو دیکھ ہی لیا تھا۔ اس ایک مہینے میں کئی بار تقاضے کرنے آئی۔ آخر جب ساون کا مہینہ آگیا تو اس نے ایک دن رما سے کہا۔ جب وہ بدمعاش نہیں بنا کر دیتا۔ تو تم کسی دوسرے کاریگر کو کیوں نہیں دیتے؟

رما نے کہا۔ اس پاجی نے ایسا دھوکا دیا کہ کچھ نہ پوچھیے اور آج کل کیا کرتا ہے۔ میں نے بڑی غلطی کی جو اُسے پیشگی روپے دے دیے۔

رتن۔ آپ مجھے اس کی دکان دکھا دیجیے۔ میں اس کے باپ سے وصول کرلوں گی۔ ایسے بے ایمان آدمی کو پولیس میں دینا چاہیے۔ جالپا نے تائید کی۔ ہاں اور کیا۔ حیلے حوالے تو سبھی کرتے ہیں۔ مگر ایسا نہیں کہ روپے ڈکار جائیں اور چیز کے لیے مہینوں دوڑائیں۔ رما نے سر کھجلاتے ہوئے کہا۔ آپ دس دن اور صبر کریں۔ میں آج ہی اس سے روپے لے کر کسی دوسرے صراف کو دے دوں گا۔

رتن۔ آپ مجھے اس بدمعاش کی دکان کیوں نہیں دکھا دیتے۔ میں ہنٹر سے بات کروں گی۔

رما۔ کہتا تو ہوں۔ دس دن کے اندر آپ کو کنگن مل جائیں گے۔

رتن۔ آپ خود ہی ڈھیلے آدمی ہیں اس کے جھانسوں میں آجاتے ہیں۔ آپ ایک بار سخت پڑجاتے تو مجال تھی یوں حیلے حوالے کرتا۔

آج رتن بڑی مشکل سے رخصت ہوئی۔ مگر گنگو نے صاف جواب دے دیا۔ جب تک آدھے روپے پیشگی نہ مل جائیں۔ کنگن نہیں بن سکتے اور پچھلے حساب کا بیباق ہونا لازمی تھا۔

رما کو جیسے گولی لگ گئی۔ بولا۔ مہراج یہ تو شرافت نہیں ہے۔ یہ میرے ایک دوست کی فرمائش ہے۔ میں نے ان سے دس دن کا وعدہ کیا تھا۔ سوچو میں انھیں کیا منہ دکھاؤں گا۔ مجھ سے پرونوٹ لکھا لو۔ سٹامپ لکھا لو۔ اور کیا کروگے؟

گنگو۔ پرونوٹ کو شہد لگا کر چاٹوں گا؟ آٹھ آٹھ مہینے کا اُدھار نہیں ہوتا۔ آپ تو بڑے آدمی ہیں۔ آپ کے لیے پانچ چھ سو روپے کون سی بڑی بات ہے۔ روپے لائیے۔ کنگن لے جائیے!

رما نے دانت پیس کر کہا۔ اگر یہ بات تھی تو تم نے ایک مہینہ پہلے ہی کیوں نہ کہہ دیا۔

گنگو۔ میں کیا جانتا تھا۔ آپ اتنا بھی نہیں سمجھ رہے ہیں؟

رما مایوس ہوکر گھر لوٹ آیا۔ مگر اس وقت بھی اس نے سارا قصہ جالپا سے صاف صاف کہہ دیا ہوتا تو اسے چاہے کتنا ہی صدمہ ہوتا۔ اپنا کنگن اس کے حوالے کردیتی۔ لیکن رما اتنا صاف گو نہ تھا۔ اپنی مالی پریشانیوں کا ذکر کرکے وہ اسے تشویش میں نہ ڈالنا چاہتا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ رما کو سو روپے اوپر سے مل جاتے تھے اور وہ کفایت کرنا جانتا۔ تو ان آٹھ مہینوں میں دونوں صرافوں کے آدھے آدھے روپے ادا کر دیتا۔ لیکن اوپر کی آمدنی تھی تو اوپر کا خرچ بھی۔ کوڑیوں سے روپے بنانا بیوپاریوں ہی کا کام ہے۔ بابو لوگ تو روپے کی کوڑیاں ہی بناتے ہیں۔

شام کو رما نے پھر ایک بار صرافے کا چکر لگایا۔ بہت چاہا کہ کسی صراف کو جھانسا دوں مگر کہیں دال نہ گلی۔ بازار میں تار کی خبریں چلا کرتی ہیں۔

رما کو رات بھر نیند نہیں آئی۔ اگر آج کوئی مہاجن ایک ہزار کا اسٹامپ لکھا کر اسے پانچ سو روپے دے دیتا تو وہ اپنے کو خوش نصیب سمجھتا۔ مگر ایسے کسی مہاجن سے اس کا لین دین نہ تھا۔ اپنے ملنے والوں میں اس نے سبھی سے ہوا باندھ رکھی تھی۔ ان کی تواضع اور تکریم میں بے دریغ روپے خرچ کرتا تھا۔ اب کس منہ سے اپنی داستانِ غم کہے۔ وہ

پچھتا رہا تھا کہ ناحق گنگو کو روپے دیے۔ گنگو نالش کرنے تو جاتا نہ تھا۔ اس وقت اگر رما کو کوئی عارضہ ہوجاتا تو وہ اس کا خیرمقدم کرتا۔ کم سے کم دس پانچ دن کی مہلت تو مل جاتی مگر بلانے سے تو موت بھی نہیں آتی۔ وہ تو اسی وقت آتی ہے جب ہم اس کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ ایسا کوئی دوست بھی نظر نہ آتا تھا۔ جو اس کے نام کوئی فرضی تار بھیج دے اور وہ یہاں سے کچھ دنوں کے لیے چلا جائے۔ وہ انھیں ترددات میں کروٹیں بدل رہا تھا کہ جالپا کی آنکھ کھل گئی۔ رما نے فوراً چادر تان لی۔ گویا بے خبر سو رہا ہے۔ جالپا نے چادر آہستہ سے اُٹھا کر اس کا منہ دیکھا۔ نیند اور بیداری کا فرق اس سے چھپا نہ رہا اسے ہلا کر بولی۔ کیا ابھی تک جاگ رہے ہو؟

رما۔ نیند کا بہانہ نہ کرسکا۔ نہ جانے کیوں نیند نہیں آرہی ہے۔ پڑے پڑے سوچتا تھا۔ کچھ دنوں کے لیے کہیں باہر چلا جاؤں اور کچھ روپے کما لاؤں۔

"مجھے بھی لیتے چلو گے نہ؟"

"تمھیں پردیس میں کہاں کہاں لیے لیے پھروں گا۔"

"تو میں اکیلی یہاں رہ چکی۔ ایک منٹ نہ رہوں گی۔ مگر جاؤ گے کہاں؟"

ابھی کچھ فیصلہ نہیں کرسکا۔

"تو سچ مچ تم مجھے چھوڑکر چلے جاؤ گے؟ مجھ سے تو ایک دن نہ رہا جائے۔ میں سمجھ گئی۔ تمھیں مجھ سے محبت نہیں ہے۔"

"تمھاری محبت کی زنجیر ہی نے مجھے باندھ رکھا ہے۔ نہیں تو اب تک کبھی کا چلا گیا ہوتا۔"

باتیں بنا رہے ہو۔ اگر تمھیں میری محبت ہوتی۔ تو مجھ سے کوئی پردہ نہ رکھتے تمھارے دل میں ضرور کوئی ایسی بات ہے جو تم مجھ سے چھپا رہے ہو۔ میں تمھیں کئی دنوں سے ہمیشہ متفکر دیکھتی ہوں۔ جہاں اعتبار نہیں ہے وہاں محبت کیسے رہ سکتی ہے۔"

"یہ تمھارا شبہ ہے جالپا۔ میں نے تو تم سے کبھی پردہ نہیں کیا۔"

"تو تم مجھے سچ مچ دل سے چاہتے ہو؟"

"یہ کیا جب منہ سے کہوں گا۔ جب ہی"

"اچھا میں ایک سوال کرتی ہوں۔ تم مجھے کیوں چاہتے ہو؟ سچ بتانا۔"

"یہ تو بالکل مہمل سوال ہے۔ اگر میں تم سے یہی سوال پوچھتا تو تم مجھے کیا جواب دیتیں؟"

"میں تو جانتی ہوں"

"بتاؤ"

"پہلے تم بتلا دو۔"

"میں تو جانتا ہی نہیں۔ صرف اتنا جانتا ہوں کہ تم میرے وجود کے ایک ایک ذرّے میں بسی ہوئی ہو۔"

سوچ کر بتاؤ۔ میں اپنے عیبوں سے واقف ہوں۔ میں نے اب تک تمھاری کوئی خدمت نہیں کی۔ خوش قسمتی سے اب تک مجھے تمھارے لیے کوئی قربانی کی ضرورت نہیں پڑی۔ گھر کے کام دھندے مجھے آتے نہیں۔ جو کچھ سیکھا یہاں سیکھا۔ بات چیت کرنے کا مجھے سلیقہ نہیں۔ اتنی حسین بھی نہیں ہوں۔ پھر تمھیں مجھ سے کیوں محبت ہے؟

رما نے سر کھجلاتے ہوئے کہا۔ میں کچھ نہیں جانتا۔ ایمان سے کہتا ہوں۔ تم میں کوئی عیب ہے یا کوئی خامی ہے۔ یہ بات آج تک میرے ذہن میں نہیں آئی۔ لیکن تم نے مجھ میں کون سی بات دیکھی؟ نہ میرے پاس دولت ہے نہ علم ہے۔ نہ صورت ہے۔ بتلاؤ تو پھر؟"

جالپا نے محبت آمیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ بتلا دوں؟ جب میں یہاں آئی۔ تو کوئی بات کہتے یا کرتے وقت مجھے خوف ہوتا تھا کہ تم اسے پسند کروگے یا نہیں۔ اب مجھے اس بات کا یقین رہتا ہے کہ تم مجھ سے ناراض نہ ہوگے۔ اگر تمھارے عوض میری شادی کسی دوسرے آدمی سے ہوئی ہوتی۔ تو میں اس کے ساتھ بھی اسی طرح رہتی۔ یہ تو شوہر اور بیوی کا رواجی رشتہ ہے۔ لیکن کچھ دنوں کے بعد وہ رواجی رشتہ روحانی رشتہ میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ اب تو میں تمھیں گوپیوں کے کرشن سے بھی نہ بدلوں گی۔ لیکن تمھیں اب بھی مجھ پر اعتبار نہیں ہے۔

رما نے سر نیچا کرکے کہا۔ تمھارا الزام بے جا ہے۔ جالپا میں دوستوں سے بھی کوئی پردہ نہیں رکھتا۔ پھر تم سے کیا پردہ رکھوں گا۔ رما کے جی میں ایک بار پھر آیا کہ اپنی پریشانیوں کی سرگزشت کہہ سنائے۔ لیکن جھوٹی خودداری نے پھر اس کی زبان بند کردی۔

جالپا اس سے پوچھتی۔ صرافوں کو روپے دیئے جاتے ہو کہ نہیں۔ تو وہ برابر کہتا ہاں کچھ نہ کچھ ہر مہینے دیتا جاتا ہوں۔ لیکن آج رما کی فکرمندی نے اس کے دل میں ایک شبہ پیدا کر دیا تھا۔ وہ اسی شبہ کو مٹانا چاہتی تھی۔ ذرا دیر بعد اس نے پوچھا۔ صرافوں کے روپے تو ابھی ادا نہ ہوئے ہوں گے۔

"اب تھوڑے ہی باقی ہیں"

"کتنے باقی ہوں گے۔ کچھ حساب کتاب لکھتے ہو۔"

"ہاں لکھتا کیوں نہیں۔۔ سات سو سے کچھ کم ہی ہوں گے۔"

"تم نے کہیں رتن کے روپے تو صرافوں کو نہیں دے دیئے۔"

رما کا دل کانپ رہا تھا۔ کہیں جالپا رتن کے روپوں کا ذکر نہ کر بیٹھے۔ آخر وہ وار اس کے سر پر آہی گیا۔ اس وقت بھی اگر رما ہمت کرکے سارا واقعہ بیان کردیا ہوتا تو اس کی پریشانیوں کا خاتمہ ہوجاتا۔ جالپا ایک منٹ تک ضرور سکتے میں آجاتی۔ ممکن ہے غصہ اور مایوسی کے عالم میں اس کی زبان سے دوچار کڑی باتیں بھی نکل جاتیں۔ لیکن پھر دونوں مل کر کوئی نہ کوئی راستہ نکال لیتے۔ اگر مجبوری کی حالت میں جالپا اپنی سہیلی سے واقعہ بیان کردیتی۔ تو رتن وہ عورت نہ تھی جو غم و غصہ کا اظہار کرتی۔ پر اس جھوٹی خودپروری کا بُرا ہو۔ رما نے اس سوال پر ایسا منہ بنایا گویا جالپا نے اس پر کوئی بے رحمانہ حملہ کیا ہے۔ بولا۔ رتن کے روپے کیوں دیتا۔ آج چاہوں تو دو چار ہزار کا مال لاسکتا ہوں۔ کاریگروں کی عادت دیر کرنے کی ہوتی ہی ہے۔ بس اور کوئی بات نہیں ہے۔ دس دن میں یا تو چیز ہی لادوں گا یا روپیہ واپس کردوں گا۔ مگر تم نے یہ سوال کیوں کیا؟ پرائی رقم بھلا میں اپنے خرچ میں کیسے لاتا؟

جالپا نے معذرت کے لہجہ میں کہا۔ کچھ نہیں۔ میں نے یوں ہی پوچھا تھا۔

جالپا کو تو تھوڑی دیر میں نیند آگئی۔ لیکن رما پھر اسی اُدھیڑ بن میں پڑا رہا۔ اگر وہ رمیش کو اپنا محرم راز بنا لیتا تو وہ کسی مہاجن سے روپوں کا انتظام کرا دیتے۔ لیکن وہ ان پر کسی طرح اپنی پریشانیوں کا اظہار نہیں کرسکتا تھا۔ اس نے صبح کو ناشتہ کرکے دفتر کی راہ لی۔ شاید وہاں کچھ انتظام ہوجائے۔ کیون انتظام کرے گا۔ اس کا اسے مطلق خیال نہ تھا۔ لیکن مایوسی کے عالم میں انسان کو کسی غیبی امداد کا گمان ہونے لگتا ہے۔ دفتر میں چپراسی کے سوا

اور کوئی نہ تھا۔ رما دفتر کا رجسٹر کھول کر رقموں کی جانچ کرنے لگا۔ کئی دنوں سے میزان نہیں دیا گیا تھا۔ لیکن بڑے بابو کے دستخط موجود تھے۔ اب میزان دیا۔ تو ڈھائی ہزار نکلے۔ یکایک اسے ایک تدبیر سُوجھی۔ کیوں نہ ڈھائی ہزار کے عوض میزان میں ڈھائی سو کردے۔ ایک ہی صفر کا تو معاملہ ہے۔ رسید بہی کی جانچ پڑتال کون کرتا ہے۔ اگر چوری پکڑی بھی گئی تو کہہ دوں گا میزان میں غلطی ہوئی۔ مگر اس خیال کو اس نے دل میں جمنے نہ دیا۔

گاڑیوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ مگر بیوپاریوں نے جب دیکھا کہ بابو صاحب آج موجود ہیں تو سوچا۔ جلدی سے چنگی دے کر فراغت پالیں۔ رما نے اس عنایت کے لیے دستوری کی دُگنی رقم وصول کی اور گاڑی والوں نے شوق سے دی۔ کیونکہ یہی بازار کا وقت تھا۔ اور بارہ ایک بجے تک چنگی گھر سے فرصت پانے کی حالت میں چوبیں گھنٹے کا ہرج ہوتا تھا۔ بازار دس گیارہ بجے کے بعد بند ہوجاتا تھا اور دوسرے دن کا انتظار کرنا پڑتا تھا۔ اگر بازار روپے میں آدھ پاؤ بھی گر گیا۔ تو سینکڑوں کے وارے نیارے ہوگئے۔ دس پانچ روپے بل کھاجانے میں انھیں کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ رما کو آج یہ نئی بات معلوم ہوئی۔ سوچا آخر صبح کو میں گھر پر ہی تو بیٹھا رہتا ہوں۔ اگر یہاں آکر بیٹھ جاؤں تو روز دس پانچ ہاتھ آجائیں۔ پھر تو چھ مہینے میں سارا قرضہ صاف ہوجائے۔ مانا روز یہ چاندی نہ ہوگی۔ پندرہ نہ سہی۔ دس ملیں گے۔ اگر صبح کو روز پانچ روپے مل جائیں اور اتنے ہی دن بھر میں اور مل جائیں تو پانچ چھ مہینہ میں قرض سے سبکدوش ہوجاؤں۔ اس نے دروازہ کھول کر پھر رجسٹر نکالا۔ لیکن میزان لگا دینے کے بعد رجسٹر میں کسی قسم کا تغیر یا تبدل کرنا اسے اتنا خوفناک نہ معلوم ہوا۔ نیا رنگ روٹ جو پہلے بندوق کی آواز سے چونک پڑتا ہے۔ مشاق ہوجانے پر گولیوں کی بارش میں نہیں گھبراتا۔

رما دفتر بند کرکے گھر جانے والا ہی تھا کہ ایک بساطی کا ٹھیلہ آپہنچا۔ رما نے کہا۔ لوٹ کر چنگی لوں گا۔ بساطی نے منتیں کرنی شروع کیں۔ اسے کوئی بہت ضروری کام تھا۔ آخر دس روپے پر معاملہ طے ہوا۔ رما نے چنگی لی۔ روپے جیب میں رکھے۔ اور گھر چلا۔ پچیس روپے محض دو گھنٹوں میں آگئے۔ اگر ایک مہینہ بھی یہی اوسط ہے تو بیڑا پار ہے۔ اسے اتنی خوشی ہوئی کہ وہ کھانا کھانے گھر نہ گیا۔ بازار سے بھی کچھ نہ منگوایا۔ روپیہ بھناتے ہوئے اسے ایک روپیہ کم ہوجانے کا اندیشہ ہوا۔ وہ شام تک بیٹھا کام کرتا رہا۔ چا روپے اور

وصول کیے۔ چراغ جلے جب وہ گھر چلا۔ تو اس کے دل پر سے فکر اور مایوسی کا بوجھ بہت کچھ اُتر چکا تھا۔ اگر دس دن یہی تیزی رہی۔ تو رتن سے منہ چُرانے کی نوبت نہ آئے گی۔

(۱۷)

نو دن گزر گئے۔ رما روز علی الصبح دفتر جاتا۔ اور چراغ جلے لوٹتا۔ وہ روز یہی امید کرکے جاتا تھا کہ آج کوئی بڑا شکار پھنسے گا۔ مگر کبھی امید پوری نہ ہوتی۔ اتنا ہی نہیں۔ پہلے دن کی سی شاندار کامیابی پھر نہ ہوئی۔ تاہم اس کے یہ کچھ کم فخر کی بات نہ تھی کہ ان دنوں میں اس نے سو روپے جمع کر لیے تھے۔ جالپا نے کئی بار سیر کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ لیکن رما نے اسے برابر باتوں میں ٹالا۔ بس کل کا دن اور باقی تھا۔ کل رتن آکر کنگن مانگے گی تو وہ اسے کیا جواب دے گا۔ دفتر سے آکر وہ اسی فکر میں بیٹھا ہوا تھا۔ کیا وہ ایک مہینے کی مہلت اور نہ دے گی۔ اتنے دن وہ اور خاموش رہے تو شاید رما اس کے قرض سے سبکدوش ہوجائے۔

ساون کے دن تھے۔ اندھیرا ہو چلا تھا۔ آسمان سیاہ چھتری کی طرح سر پر تنا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ رما سوچ رہا تھا۔ رمیش بابو کے پاس چل کر دو چار بازیاں کھیل آؤں۔ مگر بادلوں کو دیکھ دیکھ کر رُک جاتا تھا۔ دفعتاً رتن آپہنچی۔ اس کا چہرہ تند تھا۔ معلوم ہوتا تھا۔ آج وہ لڑنے کے لیے تیار ہوکر آئی ہے اور ملاحظہ اور مروّت کے خیال کو بھی قریب نہیں آنے دینا چاہتی۔

جالپا نے اس کا خیرمقدم کرتے ہوئے کہا۔ تم خوب آئیں بہن۔ میں ذرا تمھارے ساتھ گھوم آؤں گی۔ انھیں کام کے بوجھ سے آج کل سر اُٹھانے کی بھی فرصت نہیں ہے۔

رتن نے بے اعتنائی سے کہا۔ "مجھے آج بہت جلد گھر واپس جانا ہے۔ بابو جی کو کل کی یاد دلانے آئی ہوں۔

رما اس کا لٹکا ہوا منہ دیکھ دل میں سہم رہا تھا۔ کسی طرح باتوں میں لگا کر خوش کرنا چاہتا تھا۔ بڑے تپاک سے بولا۔ جی ہاں خوب یاد ہے۔ ابھی صراف کی دکان سے چلا آرہا ہوں۔ روز صبح شام گھنٹہ بھر حاضری دیتا ہوں۔ مگر ان چیزوں کی تیاری میں وقت بہت صرف ہوتا ہے۔ دو آدمی لگے ہوئے ہیں۔ مگر ابھی شاید ایک مہینہ سے کم میں چیز تیار نہ

ہو۔ ہاں ہوگی لاجواب! ان چیزوں میں دام تو کاریگری کے ہیں۔ مالیت چاہے کچھ ہو یا نہ ہو۔

رتن ذرا بھی نہ پگھلی۔ تنک کر بولی۔ اچھا ابھی مہینہ بھر اور لگے گا۔ ایسے کیا موتی پرو رہا ہے کہ تین مہینہ میں بھی ایک چیز نہ بنی؟ آپ اس سے کہہ دیجیے۔ میرے روپے واپس کردے۔ امید کے کنگن دیویاں پہنتی ہوں گی۔ مجھے ضرورت نہیں۔

رما۔ ایک مہینہ نہ لگے گا۔ شاید اس سے پہلے ہی بن جائے۔ ایک مہینہ تو میں نے اندازاً کہہ دیا تھا۔ اب تھوڑی ہی کسر اور رہ گئی ہے۔ کئی دن تو نگینے تراش کرنے میں لگ گئے۔

رتن۔ مجھے کنگن پہننا ہی نہیں صاحب! آپ میرے روپے واپس کردیجیے۔ جوہری میں نے بہت دیکھے ہیں۔ آپ کی عنایت سے اس وقت بھی تین جوڑے کنگن میرے پاس ہوں گے۔ مگر ایسی دھاندلی کہیں نہیں دیکھی۔

دھاندلی کے لفظ پر رما تلملا اُٹھا۔ دھاندلی نہیں میری حماقت کہیے۔ مجھے کیا ضرورت تھی کہ مفت کی زحمت سر لیتا۔ میں نے تو پیشگی روپے اس لیے دے دیے کہ صراف خوش ہوکر جلد تیار کردے گا۔ اب آپ روپے واپس مانگ رہی ہیں۔ مجھے امید نہیں کہ صراف روپے لوٹا دے۔

رتن نے خشمگیں آنکھوں سے دیکھ کر کہا۔ روپے کیوں نہ لوٹا دے گا؟

رما۔ اس لیے کہ جو چیز آپ کی فرمائش سے بنائی ہے اسے وہ کہاں بیچتا پھرے گا ممکن ہے اس کے بکنے میں سال دو سال لگ جائیں۔ ہر ایک کی پسند ایک سی نہیں ہوتی۔

رتن نے تیوری چڑھا کر کہا۔ میں کچھ نہیں جانتی۔ اس نے وعدہ خلافی کی ہے اس کا تاوان دے۔ مجھے کل یا تو کنگن لا دیجیے یا روپے۔ اگر صراف سے آپ کا یارانہ ہے اور آپ ملاحظہ اور مروت کے باعث اس سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ تو مجھے اس کی دُکان دکھا دیجیے۔ اس میں بھی آپ کو شرم آتی ہو۔ تو اس کا نام بتا دیجیے۔ میں پتہ لگا لوں گی۔ واہ! اچھی دل لگی ہے۔ وہ ہے کس خیال میں۔ دکان نیلام کرا لوں گی۔ جیل بھجوا دوں گی۔

رما کھسیاکر زمین کی طرف تاکنے لگا۔ وہ کتنی منحوس ساعت تھی۔ جب اس نے رتن سے روپے لیے۔ بیٹھے بٹھائے دردسر خریدا۔

جالپا نے کہا۔ سچ تو ہے۔ انھیں کیوں نہیں صراف دکان پر لے جاتے۔ چیز کو آنکھوں سے دیکھ کر انھیں تسلی ہوجائے گی۔

رتن۔ میں وہ چیز اب پہننا ہی نہیں چاہتی۔

رما۔ اچھی بات ہے۔ آپ کو روپے مل جائیں گے کل۔

رتن۔ کل کس وقت؟

رما۔ دفتر سے لوٹتے وقت لیتا آوں گا۔

رتن۔ روپے پورے لوں گی۔ ایسا نہ ہو سو روپے دے کر ٹال دے۔

رما۔ کل آپ اپنے سب روپے لے جایئے گا۔

یہ کہتا ہوا وہ مردانے کمرے میں آیا۔ اور رمیش بابو کے نام ایک رقعہ لکھ کر گوپی سے بولا۔ اسے رمیش بابو کے لے جاکر فوراً جواب لاؤ۔

پھر اس نے دوسرا رقعہ لکھ کر بشمبھر کو دیا۔ کہ مانک داس کو دکھا کر جواب لاوے۔

بشمبھر نے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا۔ پانی آرہا ہے۔

رما۔ تو کیا ساری دنیا بہہ جائے گی۔ دوڑتے ہوئے جاؤ۔

بشمبھر۔ اور جو وہ گھر پر نہ ملیں؟

"ملیں گے وہ اس وقت کہیں نہیں جاتے۔"

آج زندگی میں پہلا موقعہ تھا کہ اس نے دوستوں سے روپے قرض مانگے۔ منت و سماجت، خوشامد و اصرار کے جتنے الفاظ اسے یاد آئے وہ اس نے سب صرف کردیے جیسے رقعے آج اس نے لکھے۔ ویسے ہی رقعے اس کے پاس کتنی بار آچکے تھے۔ ان رقعوں کو پڑھ کر اس کا دل کتنا بے قرار ہوجاتا تھا۔ پر مجبوری کے باعث اسے بہانے کرنے پڑتے تھے۔ کیا رمیش بھی بہانہ کرجائیں گے؟ وہ تہی دستی کا بہانہ نہیں کرسکتے۔ کیا میرے ساتھ اتنا سلوک بھی نہ کریں گے۔ آدہ گھنٹہ ہوگیا۔ اور اب تک دو میں سے ایک بھی نہیں آیا۔ وہ دروازے پر ٹہلنے لگا۔ اس اضطراب کی حالت میں بیٹھنا مشکل تھا رتن کی موٹر اب تک کھڑی تھی۔ اتنے میں رتن باہر آئی۔ مگر اسے ٹہلتے دیکھ کر بھی کچھ نہ بولی۔ موٹر روانہ ہوگئی۔

رما نے راستہ کی طرف نگاہیں دوڑا کر سوچا۔ دونوں کہاں رہ گئے۔ کہیں کھیلنے لگے

ہوں گے۔ شیطان تو ہیں ہی۔ کہیں رمیش روپے دے دیں۔ تو چاندی ہے۔ میں نے دو سو ناحق مانگے۔ شاید اتنے روپے اس وقت ان کے پاس نہ ہوں۔ مانک چاہے تو ہزار پانچ سو دے سکتا ہے۔ آج دونوں کی آزمائش ہے۔ اگر آج انھوں نے انکار کیا تو دوستی کا خاتمہ ہے۔ کسی کا نوکر نہیں ہوں کہ جب وہ شطرنج کھیلنے کے لیے بلائیں تو دوڑا چلا جائے۔

بشمبھر نے لوٹ کر مانک داس کا رقعہ دیا۔ اس نے لکھا تھا۔ میں آج کل بہت تنگدست ہوں۔ میں تو تمھیں سے مانگنے والا تھا۔

رما نے پرزہ پھاڑ کر پھینک دیا۔ خودغرض کہیں کا۔ اگر کسی سب انسپکٹر نے روپے مانگے ہوتے تو پرزہ دیکھتے ہی لے کر دوڑے جاتے۔ خیر دیکھا جائے گا۔ چنگی کے لیے مال تو آئے گا ہی۔ اس کی کسر نکل جائے گی۔

اتنے میں گوپی بھی لوٹا۔ رمیش نے لکھا تھا۔ میں نے اپنی زندگی کے دوچار اصول بنا لیے ہیں۔ اور ان کی بڑی سختی سے پابندی کرتا ہوں۔ ان میں سے ایک اصول یہ بھی ہے کہ دوستوں سے لین دین کا تعلق نہ پیدا کروں گا۔ ابھی تمھیں تجربہ نہیں ہوا ہے۔ لیکن میں بھوگ چکا ہوں۔ تم میرے پیارے دوست ہو۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے اور تمھارے ارتباط میں خلل پیدا ہو۔ اس لیے مجھے معاف کرو۔

رما نے اس خط کو بھی پڑھ کر پھینک دیا اور کرسی پر بیٹھ کر چراغ کی طرف محویت کے عالم میں دیکھنے لگا۔ اس چراغ کی لو کے اندر رمیش اور مانک اور رتن تینوں بیٹھے نظر آتے تھے۔ پھر وہ چراغ اس کی نظروں سے غائب ہوگیا۔ دل کی حالت وہ بھی ہوتی ہے جب آنکھیں کھلی ہوتی ہیں اور کچھ نظر نہیں آتا۔ جب کان کھلے ہوتے ہیں اور کچھ سنائی نہیں پڑتا۔

(۱۸)

شام ہوگئی تھی۔ میونسپلٹی کے احاطہ میں سناٹا چھا گیا تھا۔ عملے ایک ایک کرکے جا رہے تھے۔ مہتر کمروں میں جھاڑو لگا رہا تھا۔ خوانچہ والے دن بھر کی بکری کے پیسے گن رہے تھے مگر رما ناتھ اپنی کرسی پر بیٹھا ہوا رجسٹر لکھ رہا تھا۔

آج بھی وہ صبح ہی آیا تھا۔ مگر کوئی بڑا شکار نہ پھنسا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ اب اپنی آبرو کیسے بچائے۔ آخر اس نے رتن کو جھانسا دینے کی ٹھانی۔ وہ خوب جانتا تھا کہ رتن کی یہ بے

صبری محض اس لیے ہے کہ وہ سمجھتی ہے کہ میں نے اس کے روپے خرچ کرڈالے اگر اسے معلوم ہوجائے کہ اس کے روپے عند الطلب مل سکتے ہیں تو اسے تسکین ہوجائے گی۔ رما اسے روپیہ سے بھری تھیلی دکھا کر اس کا شبہ مٹا دینا چاہتا تھا۔ وہ خزانچی صاحب کے چلے جانے کی راہ دیکھ رہا تھا۔ اسی لیے آج اس نے دیر کی تھی۔ آج کی آمدنی کے ڈیڑھ سو روپے اس کے پاس تھے۔ اسے وہ اپنے گھر لے جانا چاہتا تھا۔ خزانچی صاحب ٹھیک پانچ بجے اُٹھے۔ انھیں کیا غرض تھی کہ رما سے آج کی آمدنی طلب کرتے روپے گننے ہی سے چھٹی نہ ملی۔ دن بھر روپے گنتے گنتے اور لکھتے لکھتے بے چارے کی کمر دُکھ رہی تھی۔ رما کو جب معلوم ہوگیا کہ خزانچی صاحب دُور نکل گئے۔ تو اس نے رجسٹر بند کیا اور چپراسی سے بولا۔ تھیلی اُٹھاؤ چل کر جمع کراؤ۔

چپراسی نے کہا۔ خزانچی صاحب تو بہت دُور چلے گئے۔

رما نے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ خزانچی صاحب چلے گئے۔ تم نے مجھ سے کہا کیوں نہیں۔ ابھی کتنی دُور گئے ہوں گے۔

"سڑک کی نکڑ تک پہنچے ہوں گے۔"

تو یہ آمدنی کیسے جمع ہوگی۔

"حکم ہو تو بلا لاؤں۔"

رما نے مایوسانہ لہجہ میں کہا۔ اجی جاؤ بھی۔ اب تک تو کہا نہیں۔ اب انھیں آدھے راستے سے بلانے جاؤگے۔ کیا آج زیادہ چھان گئے تھے۔ خیر روپے اسی دراز میں رکھ دو۔ تمھاری نگرانی رہے گی۔

چپراسی نے ہاتھ باندھ کر کہا۔ نہیں بابو صاحب میں یہاں روپے نہیں رکھنے دوں گا۔ سب دن برابر نہیں جاتے۔ کہیں روپے اُٹھ جائیں تو میں بے گناہ مارا جاؤں۔

رما نے پوچھا۔ تو پھر یہ روپے کہاں رکھوں؟

چپراسی۔ حضور! اپنے ساتھ لیتے جائیں۔

رما تو یہ چاہتا ہی تھا۔ ایک یکہ منگوایا۔ اس پر روپوں کی تھیلی رکھی اور گھر چلا۔ سوچتا جاتا تھا اگر رتن بھبکی میں آگئی تو کیا پوچھنا۔

جالپا نے تھیلی دیکھ کر پوچھا۔ کیا کنگن نہ ملا۔

"ابھی تیار نہ تھا۔ میں روپے اُٹھا لایا۔"

"رتن بھی آتی ہوگی۔ اسے چین کہاں!"

جب چراغ جلنے تک رتن نہ آئی۔ تو رما نے سمجھا۔ اب نہ آئے گی۔ روپے الماری میں رکھ دیے اور گھومنے چل دیا۔ مگر ابھی اسے گئے دس منٹ بھی نہ ہوئے ہوں گے کہ رتن آ پہنچی۔ اور آتے ہی آتے بولی۔ کنگن تو آگئے ہوں گے؟

جالپا نے تمسخر کے انداز سے کہا۔ ہاں آگئے ہیں۔ پہن لو۔ بے چارے کئی دفعہ صراف کے پاس گئے۔ ظالم دیتا ہی نہیں۔ حیلے حوالے کرتا ہے۔

رتن بے گمان ہوکر بولی۔ کیسا صراف ہے کہ اتنے دنوں سے حیلے حوالے کر رہا ہے میں جانتی کہ روپے ایسے جھمیلے میں پڑجائیں گے۔ تو دیتی ہی کیوں۔ نہ روپے ملتے ہیں نہ کنگن ملتا ہے۔

رتن نے یہ الفاظ کچھ ایسے دل دوز طریقہ سے کہے کہ جالپا بپھر اُٹھی۔ بولی۔ آپ کے روپے رکھے ہوئے ہیں۔ جب چاہیے لے جائیے۔ اپنے بس کی بات ہے نہیں۔ آخر جب صراف دے گا تبھی تو لائیں گے۔

کچھ وعدہ کرتا ہے۔ کب تک دے گا؟

"اس کے وعدوں کا کیا اعتبار؟ سینکڑوں وعدے تو کرچکا ہے۔"

"تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ کنگن نہ بنائے گا۔"

"جو چاہے سمجھ لو۔"

"تو لاؤ۔ روپے ہی دے دو۔ باز آئی ایسے کنگن سے۔"

جالپا جھمک کر اُٹھی۔ الماری سے تھیلی نکالی۔ اور رتن کے سامنے پٹک کر بولی۔ آپ کے روپے رکھے ہیں لے جائیے۔

فی الواقعہ رتن کی بے صبری کا وہی سبب تھا۔ جو رما نے سمجھا تھا۔ اُسے گمان ہو رہا تھا کہ ان لوگوں نے میرے روپے خرچ کرڈالے۔ روپے سامنے دیکھ کر اس کے شکوک کا ازالہ ہوگیا۔ شرمندہ ہوکر بولی۔ اگر دو چار دن میں دینے کا وعدہ کرتا ہو تو روپے رہنے دو!

جالپا نے بے اعتنائی سے کہا۔ مجھے تو امید نہیں کہ اتنی جلدی دے۔ چیز تیار ہونے پر روپے مانگ لیے جائیں گے۔

رتن نے بہت اصرار کیا کہ جالپا روپے رکھ لے۔ موقع پر روپے نہ مل سکے۔ تو شرمندگی ہو۔ لیکن جالپا راضی نہ ہوئی۔ بولی۔ پرائی رقم گھر میں رکھنا خطرہ کی بات ہے۔ کوئی گول مال ہوجائے تو مفت تاوان دینا پڑے۔ میری شادی کے چوتھے ہی دن میرے سارے گہنے چوری چلے گئے۔ ہم لوگ جاگتے ہی رہے۔ مگر نہ جانے کب آنکھ لگ گئی اور چوروں نے اپنا کام کرلیا۔ دس ہزار کی چپت پڑگئی۔ کہیں وہی حادثہ پھر ہوجائے تو کہیں کے نہ رہیں۔

رتن نے مایوس ہوکر روپے موٹر میں رکھے اور چلی گئی۔ جالپا خوش تھی کہ سر سے بوجھ ٹلا۔ رتن کو افسوس تھا کہ ناحق روپے واپس مانگے۔ کہیں لوگوں نے میری بدگمانی بھانپ نہ لی ہو۔

رما نو بجے گھوم کر لوٹا۔ جالپا اُسے دیکھتے ہی بولی۔ رتن آئی تھی۔ میں نے اس کے سب روپے دے دیے۔

رما کے پیروں کے نیچے سے زمین کھسک گئی۔ آنکھیں پھیل کر پیشانی پر جا پہنچیں۔ گھبرا کر بولا۔ کیا کہا۔ رتن کے روپے دے دیے۔ یہ تم سے کس نے کہا تھا۔

جالپا بولی۔ اسی کے روپے تو تم نے لاکر رکھے تھے۔ تم خود اس کا انتظار کرتے رہے۔ تمھارے جاتے ہی وہ آئی۔ اور کنگن مانگنے لگی۔ میں نے جھلا کر اس کے روپے پھینک دئے۔

رما نے غصہ کو ضبط کرکے کہا۔ اس نے روپے مانگے تو نہ تھے؟

جالپا۔ مانگے کیوں نہیں۔ ہاں جب میں دے دیے تو البتہ کہنے لگی اسے کیوں لوٹاتی ہو۔ میں نے کہہ دیا کہ ایسے شکی مزاج والوں کے روپے میں نہیں رکھتی۔

رما کو ایسا تکان معلوم ہوا کہ اس سے کھڑا نہ رہا گیا۔ توکل کے انداز سے بولا۔ ایشور کے لیے تم مجھ سے بغیر پوچھے ایسے کام مت کیا کرو۔

جالپا یہ معمہ کیا سمجھے۔ بولی۔ تو ابھی کیا ہوا۔ اس کے پاس جاکر روپے مانگ لاؤ۔

رما چارپائی پر بیٹھ کر سر پر ہاتھ رکھے ہوئے صورت حال پر غور کرنے لگا۔ جالپا پر ناراض ہونا بے انصافی تھی۔ جب اس نے صاف کہہ دیا کہ یہ روپے رتن کے ہیں۔ اور یہ اشارہ تک نہ کیا کہ مجھ سے پوچھے بغیر روپے رتن کو مت دینا۔ تو جالپا کی کوئی خطا نہیں۔

رتن سے کسی طرح روپے واپس لینے چاہئیں۔ جس وقت وہ یہاں آئی۔ کاش وہ خود موجود ہوتا تو کتنی خوبصورتی سے ساری مشکل آسان ہوجاتی۔ آخر اس نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ آج رتن آئے گی نہیں۔ ایک دن گھومنے نہ جاتا تو کون مرا جاتا تھا۔ ضرور کوئی غیبی طاقت اس کی تباہی کے سامان جمع کررہی ہے۔ دس منٹ کی غیر حاضری نے بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا۔ وہ کہہ رہی تھی کہ روپے رکھ لیجیے۔ جالپا نے ذرا دانائی سے کام لیا ہوتا۔ نہیں، اس نے کوئی دانائی نہیں کی۔ اس جگہ رما خود وہی کرتا۔ سوال یہ ہے کہ رتن سے روپے واپس کیسے لیے جائیں۔ کیوں نہ جاکر رتن سے کہے کہ میں نے سنا ہے کہ آپ روپے لوٹانے سے ناراض ہوگئی ہیں۔ دراصل میں روپے آپ کو واپس دینے کو نہ لایا تھا۔ اس لیے مانگ لایا تھا کہ صراف خوب تندہی سے کام کرے رما نے سوچا۔ شاید رتن شرمندہ ہوکر خود ہی معافی مانگے اور روپے دے دے۔ اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ ساڑھے آٹھ بجے تھے۔ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ رتن ضرور گھر پر ہوگی رما نے سائیکل اُٹھائی اور اس سے ملنے چلا۔

رتن کے بنگلے پر آج بڑی بہار تھی۔ یہاں ہمیشہ ہی کوئی نہ کوئی دعوت کوئی نہ کوئی جشن ہوتا رہتا۔ رتن کی طبیعت اس خلوت اور تنہائی سے تنگ آکر ان دلچسپیوں کی طرف اسی طرح لپکتی تھی جیسے پیاسا پانی کی طرف لپکتا ہے۔ اس وقت وہاں بچوں کا جمگھٹ تھا۔ ایک آم کے درخت میں جھولا پڑا ہوا تھا۔ بجلی کی بتیاں جل رہی تھیں۔ بچے جھولا جھول رہے تھے اور رتن جُھلا رہی تھی۔ ہوحق مچا ہوا تھا۔ وکیل صاحب اس موسم میں بھی اُونی اورکوٹ پہنے برآمدے میں بیٹھے سگار پی رہے تھے۔

رما کا جی چاہا کہ جھولے کے پاس جاکر رتن سے باتیں کرے۔ مگر وکیل کو کھڑے دیکھ کر مارے لحاظ کے ادھر نہ جاسکا۔

وکیل صاحب نے اسے دیکھتے ہی ہاتھ بڑھا دیا اور بولے۔ آؤ رما بابو کہو۔ تمھارے میونسپل بورڈ کی کیا خبریں ہیں۔

رما نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ کوئی نئی بات تو نہیں ہے۔

وکیل۔ آپ کے بورڈ میں لڑکیوں کی لازمی تعلیم کی قرارداد کب پاس ہوگی؟ اور کئی بورڈوں نے تو پاس کردیا۔ جب تک عورتوں کی تعلیم کا رواج نہ ہوگا ملکی ترقی غیر ممکن ہے۔ آپ تو یورپ نہ گئے ہوں گے۔ واہ! کیا آزادی ہے۔ کیا دولت ہے۔ کیا زندگی

ہے۔ کیا جوش ہے۔ بس معلوم ہوتا ہے کہ یہی جنت ہے اور عورتیں بھی سچ مچ دیویاں ہیں۔ اتنی خوش مزاج اتنی آزاد! یہ سب عورتوں کی تعلیم کی برکت ہے۔

رما نے اخباروں میں ان ملکوں کا تھوڑا بہت حال پڑھا تھا۔ اسی اعتبار سے بولا۔ وہاں عورتوں کے اطوار تو بہت اچھے نہیں ہیں۔

وکیل۔ نانسنس۔ اپنے اپنے ملک کا رواج ہے۔ آپ ایک حسینہ کو کسی کے ساتھ تنہا دیکھ کر دانتوں میں انگلی دباتے ہیں۔ ہم اتنے بدگمان ہوگئے ہیں کہ عورت اور مرد کو یک جا دیکھ کر شبہ کے بغیر رہ ہی نہیں سکتے۔ لیکن جہاں لڑکے اور لڑکیاں ایک ساتھ پڑھتی ہیں۔ وہاں جنسی اختلاف کا وجود ہی نہیں رہتا۔ آپس میں شوق اور دلچسپی کی اتنی باتیں پیدا ہوجاتی ہیں کہ جنسیت کے لیے بہت تھوڑی گنجائش رہ جاتی ہے۔ یہ سمجھ لیجیے کہ جس ملک میں عورتوں کو جتنی ہی آزادی حاصل ہے وہ ملک اتنا ہی مہذب ہے عورتوں کو قید میں پردہ میں یا مردوں سے کوسوں دُور رکھنے کا مطلب یہی نکلتا ہے کہ آپ کے یہاں لوگ اتنے بداطوار ہیں کہ عورتوں کی توہین کرنے میں ذرا بھی پس و پیش نہیں کرتے۔ نوجوانوں کے لیے ملکیات۔ مذہب۔ فنونِ لطیفہ۔ ادبیات۔ فلسفہ۔ تاریخ۔ نظریات اور ہزاروں ہی ایسے مضامین ہیں۔ جن کی بنا پر آپس میں گہرے تعلقات پیدا ہوسکتے ہیں۔ میں سال بھر امریکہ اور یورپ میں رہ چکا ہوں۔ کتنی ہی عورتوں کے ساتھ میرا ربط ضبط تھا۔ ان کے ساتھ سیریں کی ہیں۔ مباحثے کیے ہیں۔ لیکن کسی نوجوان کو ایسے چرچے کرتے نہیں سُنا۔ جس پر کوئی عورت شرم سے سر جھکائے اور پھر اچھے اور بُرے کہاں نہیں ہیں۔

رما کو اس وقت اس موضوع میں کوئی لطف نہ آیا۔ وہ تو دوسری ہی فکر میں پریشان تھا۔

مگر وکیل صاحب کی طبیعت روانی پر تھی۔ پھر بولے۔ جب تک ہم مردوں اور عورتوں کو آزادی کے ساتھ ساتھ اپنا اپنا ذہنی نشو و نما نہ کرنے دیں گے۔ لا ریب ہم زوال کی طرف گرتے جائیں گے۔ بندشوں سے سماج کا پیر نہ باندھیے۔ اس کے گلے میں قیدوں کی زنجیر نہ ڈالیے۔ بیواؤں کی شادی کیجیے۔ خوب زوروں سے۔ لیکن یہ بات میری سمجھ میں آئی کہ جب کوئی ادھیڑ آدمی کسی جوان عورت سے شادی کرلیتا ہے۔ تو کیوں اتنا

کہرام مچ جاتا ہے۔ یورپ میں اسّی اسّی سال کے بوڑھے جوان عورتوں سے شادی کرتے ہیں۔ ستر سال کی بوڑھیاں جوان مردوں سے کرتی ہیں۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔ ہم بوڑھوں کو موت آنے کے پہلے ہی مار ڈالنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ انسان کو اگر کبھی رفیق کی ضرورت ہوتی ہے تو بڑھاپے میں۔ جب اسے ہمیشہ کسی دستگیر کی خواہش ہوتی ہے۔ جب وہ دوسروں کا دست نگر ہوجاتا ہے۔

رما کا دھیان جُھولے کی طرف تھا۔ کسی طرح رتن سے دو دو باتیں کرنے کا موقع ملے۔ اس وقت اسے یہی دُھن لگی ہوئی تھی۔ مگر اس کا وہاں جانا آدابِ مجلس کے خلاف تھا۔ آخر اس نے وکیل صاحب سے پوچھا۔ آج اتنے لڑکے یہاں کیسے آگئے۔

وکیل صاحب نے محبت آمیز لہجہ میں کہا۔ اجی کچھ نہ پوچھیے۔ رتن بائی کو بچوں سے بڑی محبت ہے۔ نہ جانے کہاں سے اتنے لڑکے جمع ہوجاتے ہیں۔ اگر آپ کو جھولے سے کچھ شوق ہے تو جایئے۔

رما تو یہ چاہتا ہی تھا۔ چٹ پٹ جھولے کے پاس جا پہنچا۔ رتن اُسے دیکھ کر مسکرائی اور بولی۔ ان شیطانوں نے میرا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ جُھولے سے ان کا پیٹ ہی نہیں بھرتا۔ آیئے ذرا آپ بھی بیگار کیجیے۔ میں تو تھک گئی۔ یہ کہہ کر وہ پکے چبوترہ پر بیٹھ گئی۔ رما جھونکے دینے لگا۔ بچوں نے نیا آدمی دیکھا تو سب کے سب اپنی باری کے بے قرار ہوگئے۔ رتن کے ہاتھوں دو دو باریاں آچکی تھیں۔ مگر یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ کچھ لڑکے تو تیسری بار جھولیں اور باقی بیٹھے منہ تاکتے رہیں۔ دو اُترے تو چار جا بیٹھے۔ رما کو بچوں سے ذرا بھی دلچسپی نہ تھی۔ مگر اس وقت پھنس گیا تھا۔ کیا کرتا۔

آخر آدھ گھنٹہ کی بیگار کے بعد اس کا جی اُوب گیا۔ گھڑی میں ساڑھے نو بج رہے تھے۔ مطلب کی بات کیسے چھیڑے۔ رتن تو جُھولے میں اتنی مگن تھی۔ گویا اُسے روپوں کی یاد ہی نہیں ہے۔ یکایک اس نے رما سے کہا۔ بابو جی میں جُھولے پر بیٹھتی ہوں۔ آپ مجھے جھلایئے۔ مگر نیچے سے نہیں۔ جھولے پر کھڑے ہوکر پینگ ماریئے۔

رما بچپن ہی سے جھولے پر بیٹھتے ڈرتا تھا۔ ایک بار دوستوں نے زبردستی جھولے پر آنے کے لیے مجبور کردیا۔ مگر اپنی مجبوری کا اظہار کیوں کر کرتا۔ رتن دو بچوں کو لے کر بیٹھ گئی اور یہ گیت گانے لگی۔

کدم کی ڈریاں جھولا پڑگیوری

رادھا رانی جھولن آئی

رما جھولے پر کھڑا ہوکر پینگ مارنے لگا۔ لیکن اس کے پاؤں کانپ رہے تھے۔ اور دل بیٹھا جاتا تھا۔ جب جُھولا اوپر سے گرتا تھا۔ تو اسے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گویا کوئی رقیق شے اس کے سینہ کے اندر چبھتی چلی جارہی ہے۔ اور رتن بچوں کے ساتھ گارہی تھی۔

کدم کی ڈریاں جھولا پڑگیوری

ایک لمحہ کے بعد رتن نے کہا۔ ذرا اوپر بڑھایئے صاحب آپ سے تو جھولا بڑھتا نہیں۔

رما نے شرمندہ ہوکر اور زور لگایا۔ مگر جھولا نہ بڑھا۔ رما کے سر میں چکر آنے لگے۔

رتن۔ آپ کو پینگ مارنا نہیں آتا۔ کبھی جھولا نہیں جھولے۔

رما نے ہچکتے ہوئے کہا۔ ہاں ادھر تو برسوں سے نہیں جُھولا۔

رتن۔ تو آپ بچوں کو سنبھال کر بیٹھیے۔ میں آپ کو جھولاؤں گی۔ اگر جھولا اس ڈال کو نہ چھو لے تو کہیے گا۔

رما کی روح فنا ہوگئی۔ بولا۔ آج بہت دیر ہو رہی ہے۔ پھر کبھی آؤں گا۔

رتن۔ ابھی کیا دیر ہوگئی ہے۔ دس بھی تو نہیں بجے۔ گھبرایئے نہیں۔ ابھی بہت رات پڑی ہے۔ خوب جُھول کر جایئے گا۔ کل جالپا دیوی کو بھی لایئے گا۔ ہم دونوں جھولیں گے۔

رما جھولے پر سے اُتر آیا۔ اس کا چہرہ اُترا ہوا تھا۔ سر میں ایسا چکر آرہا تھا کہ معلوم ہوتا تھا اب گرا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا سائیکل کی طرف چلا۔ اور اس پر بیٹھ کر بھاگا۔

کچھ دور تک اسے ہوش نہ رہا۔ پاؤں آپ ہی آپ پیڈل گھماتے جاتے تھے۔ آدھی دُور جانے کے بعد اسے ہوش آیا۔ اس نے سائیکل گھما دی۔ کچھ دُور چلا۔ پھر اُتر کر سوچنے لگا۔ اب کیا کرے۔ آج ملاحظہ میں پڑا۔ اس نے کتنا چرکا کھایا۔ کیوں اسی کے منہ سے آواز نہیں نکلی۔ رتن کوئی ہوا تو تھی نہیں جو اسے کھا جاتی۔

دفعتاً اسے یاد آیا۔ اس تھیلی میں آٹھ سو روپے تھے۔ شاید رتن نے روپے گنے نہیں۔ ورنہ ضرور ذکر کرتی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ تھیلی کسی کو دے دے یا اُسے اور روپوں

کے ساتھ ملادے۔ پھر تو غضب ہی ہوجائے۔ کہیں کا نہ رہوں۔ کیوں نہ اسی وقت چل کر بیشی روپیہ مانگ لاؤں۔ لیکن اب تو دیر بہت ہوگئی۔ سویرے پھر آنا پڑے گا۔

اس نے پھر سوچا۔ اگر یہ دو سور روپے مل بھی گئے۔ پھر بھی تو پانچ سو روپیوں کی کمی رہے گی۔ اس کا کیا انتظام ہوگا۔ اب تو ایشور ہی بیڑا پار لگائے تو لگے گا۔ صبح تک کوئی انتظام نہ ہوسکا تو مصیبت کا سامنا ہوگا۔

زندگی میں ایسے موقع بھی آتے ہیں۔ جب مایوسی میں بھی ہمارا رشتہ امید نہیں ٹوٹتا۔ رما نے سوچا۔ ایک بار پھر گنگو کے پاس چلوں۔ اس کے ہاتھ پاؤں پڑوں۔ ممکن ہے اسے کچھ رحم آجائے۔ وہ فوراً صرافہ جا پہنچا۔ مگر گنگو کی دکان بند تھی۔ وہ پیچھے پھرا ہی تھا کہ چپر اس آتا ہوا نظر آیا۔ رما کو دیکھتے ہی بولا۔ بابو جی آپ نے تو ادھر کا راستہ ہی چھوڑ دیا۔ کہیے روپے کب تک ملیں گے۔

رما نے عاجزی کے ساتھ کہا۔ اب بہت جلد ملے جاتے ہیں۔ دیر نہیں ہے۔ گنگو کے روپے ادا کرچکا ہوں۔ اب تمھاری باری ہے۔

چپر اس۔ اجی وہ سب قصہ معلوم ہے۔ گنگو نے ہوشیاری سے روپے وصول نہ کر لیے ہوتے تو ہماری طرح بیٹھے ناپتے۔ سال گزر رہا ہے۔ روپیہ سینکڑہ سود بھی لگایئے تو چوراسی روپے ہوتے ہیں۔ کل دکان پر آکر حساب کر جایئے پورا نہیں تو آدھا تہائی کچھ تو دیجیے۔ لین دین جاری رہنے سے مہاجن کی تسلی رہتی ہے۔ کان میں تیل ڈال کر بیٹھے رہنے سے اسے شبہ ہونے لگتا ہے کہ اس کی نیت خراب ہے۔ تو کل کب آیئے گا؟

رما۔ بھائی کل میں روپے لے کر تو نہ آسکوں گا۔ یوں جب کہو تب چلا آؤں۔ کیوں اس وقت اپنے سیٹھ جی سے چار پانچ سو روپے کا بندوبست نہ کرا دوگے۔ تمھاری مٹھی بھی گرم کردوں گا۔

چپر اس۔ کہاں کی بات لیے پھرتے ہو بابو جی۔ انھوں نے یہی بڑا سلوک کیا کہ نالش نہیں کردی۔ آپ کے پیچھے مجھے باتیں سننی پڑتی ہیں۔ کیا بڑے منشی جی سے کہنا پڑے گا نہ؟

رما نے جھلا کر کہا۔ تمھارا دیندار میں ہوں۔ بڑے منشی نہیں ہیں۔ میں مر نہیں گیا

ہوں۔ گھر چھوڑ کر بھاگا نہیں جاتا۔ اتنے بے صبر کیوں ہوجاتے ہو؟

چرنداس۔ سال بھر ہوا ایک کوڑی تک نہیں ملی۔ کہاں تک صبر کریں۔ کل کم سے کم دو سو روپے کی فکر رکھیے گا۔

رما۔ میں نے کہہ دیا۔ میرے پاس ابھی روپے نہیں ہیں۔

چرنداس۔ یہ روز رقمیں مارتے ہو۔ وہ کہاں جاتی ہیں۔ گھر میں کوئی ایسا لمبا خرچ بھی تو نہیں ہے۔

رما نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ سائیکل بڑھا دی۔ ادھر آیا تھا کہ شاید نجات کی کوئی صورت نکلے۔ اُلٹے تقاضا سہنا پڑا۔ کہیں یہ شیطان سچ مچ بابو جی کے پاس تقاضا نہ بھیج دے۔ آگ ہی ہوجائیں گے۔ جالپا بھی سمجھے گی۔ کیسا لباڑیا آدمی ہے۔ اس وقت رما کی آنکھوں سے آنسو تو نہ نکلے تھے۔ مگر اس کا رواں رواں رو رہا تھا۔ جالپا سے اپنی اصلی حالت چھپا کر اس نے کتنی بڑی غلطی کی۔ وہ سمجھ دار عورت ہے۔ اگر اسے معلوم ہوتا کہ میں اتنا تنگ دست ہوں۔ تو وہ مجھے کبھی زیر بار نہ کرتی۔ اس نے تو کبھی اپنی زبان سے کچھ کہا ہی نہیں۔ میں ہی اپنی شان دکھانے کے لیے مرا جا رہا تھا۔ قرض کا اتنا بھاری بوجھ سر پر رکھ کر بھی اس نے کیوں نہ کفایت سے کام لیا۔ اسے ایک ایک پیسہ دانتوں سے پکڑنا چاہیے تھا۔

اس دوران میں اس کی آمدنی ایک ہزار سے کم نہ ہوئی ہوگی۔ اگر اس نے جزرسی کی ہوتی۔ تو ان دونوں مہاجنوں کے آدھے آدھے روپے ضرور ادا ہوجاتے۔ مگر وہاں تو سر پر شیطان سوار تھا۔ اس کی کیا ضرورت تھی کہ جالپا محلّہ بھر کی عورتوں کو جمع کرکے روز سیر کرنے جائے۔ سینکڑوں روپے تو تانگہ والا ہی لے گیا ہوگا۔ پر اسے تو بیوی پر رُعب جمانے کی دُھن سوار تھی۔ سارا بازار جان جائے کہ لالہ نرے لفنگے ہیں لیکن اپنی رفیق بیوی سے پردہ کیا جائے۔

وہ گھر پہنچا تو جالپا نے پوچھا کہا چلے گئے تھے۔ بڑی دیر لگا دی۔

رما۔ تمھارے کارن رتن کے بنگلے تک جانا پڑا۔ تم نے پوری تھیلی اُٹھا کر دیے دی۔ اس میں دو سو روپے میرے بھی تھے۔

جالپا۔ تو مجھے کیا معلوم تھا۔ تم نے کہا بھی تو نہیں۔ لیکن اس کے پاس سے روپے جا نہیں

سکتے۔ آپ ہی بھیج دیں گی۔

رما۔ مانا مگر سرکاری رقم تو کل داخل کرنی پڑے گی۔

جالپا۔ مجھ سے دو سو روپے لے لینا۔ میرے پاس ہیں۔

رما کو یقین نہ آیا۔ بولا۔ کہیں ہوں۔ نہ تمھارے پاس اتنے روپے کہاں سے آئے۔

جالپا۔ تمھیں اس سے کیا مطلب میں تو دو سو دینے کو کہتی ہوں۔

رما کا چہرہ شگفتہ ہوگیا۔ دو سو روپے یہ دیدے۔ دو سو روپے رتن سے مل جائیں۔ سو روپے اس کے پاس ہیں ہی تو کل تین سو روپے کی کمی رہ جائے گی۔ مگر وہ تین سو روپے کہاں سے آئیں گے۔ ایسا کوئی نظر نہ آتا تھا۔ جس سے اتنے روپے ملنے کی اُمید کی جاسکے۔ جب وہ کھانا کھاکر لیٹا۔ تو جالپا نے کہا۔ آج کس سوچ میں پڑے ہو؟

رما۔ سوچ کس بات کا۔ کیا میں متفکر ہوں۔

جالپا۔ ہاں کسی فکر میں پڑے ہوئے ہو۔ مگر مجھ سے چھپا رہے ہو۔

رما۔ میں نے تو تم سے کبھی کوئی بات نہیں چھپائی۔

جالپا۔ واہ تم اپنے دل کی بات مجھ سے کیوں کہنے لگے۔ رشیوں کا حکم نہیں ہے۔

رما۔ میں ان رشیوں کا معتقد نہیں ہوں۔

جالپا۔ وہ تو جب معلوم ہوتا۔ جب میں تمھارے دل میں بیٹھ کر دیکھتی۔

رات کو جالپا نے ایک خوفناک خواب دیکھا اور چلّا پڑی۔ رما نے چونک کر پُوچھا کیا ہے جالپا۔ کیا خواب دیکھ رہی ہو۔ جالپا نے ادھر ادھر سہمی ہوئی آنکھوں سے دیکھ کر کہا۔ بڑے عذاب میں جان پڑی تھی۔ بڑا بُرا خواب دیکھا۔

رما۔ کیا دیکھا۔

جالپا۔ کیا بتاؤں۔ کچھ کہا نہیں جاتا۔ دیکھتی تھی کہ تمھیں کئی سپاہی پکڑے لیے جارہے ہیں۔ کتنی ڈراؤنی صورت تھی ان کی۔

رما کا خون خشک ہوگیا۔ دو چار دن قبل اس خواب کو اس نے ہنسی سے اُڑا دیا ہوتا۔ اس وقت اسے خواہ مخواہ ایک تشویش پیدا ہوگئی۔ مگر باہر سے ہنس کر بولا۔ تم نے سپاہیوں سے پُوچھا نہیں۔ انھیں کیوں پکڑے لیے جاتے ہو؟

جالپا تمھیں ہنسی سُوجھ رہی ہے اور میرا دل کانپ رہا ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد رما نے نیند میں بکنا شروع کیا۔ اماں کہے دیتا ہوں۔ پھر میرا منہ نہ دیکھو گی۔ میں ڈوب مروں گا۔

جالپا کو ابھی نیند نہ آئی تھی۔ وہ ڈر گئی۔ رما کو زور سے ہلا کر بولی۔ مجھے تو ہنستے تھے اور خود بکنے لگے۔ سن کر روئیں کھڑے ہوگئے۔ خواب دیکھتے تھے کیا؟

رما نے شرمندہ ہو کر کہا۔ ہاں جی نہ جانے کیا دیکھ رہا تھا۔ کچھ یاد نہیں۔

جالپا نے پوچھا۔ اماں جی کو کیوں دھمکا رہے تھے۔ سچ بتاؤ کیا دیکھتے تھے۔

رما نے سر کھجلاتے ہوئے کہا۔ کچھ یاد نہیں آتا۔ یوں ہی بکنے لگا ہوں گا۔

جالپا۔ اچھا تو کروٹ سونا۔ چت سونے سے آدمی بکنے لگتا ہے۔

رما کروٹ لیٹ گیا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گویا فکر اور خوف آنکھوں میں بیٹھے ہوئے نیند کے حملوں سے ان کی حفاظت کر رہے ہیں۔ جاگتے جاگتے دو بج گئے۔ دفعتاً جالپا اُٹھ بیٹھی اور صراحی سے پانی انڈیلتی ہوئی بولی۔ بڑی پیاس لگی تھی۔ کیا تم ابھی تک جاگ رہے ہو؟

رما۔ ہاں جی نیند اُچٹ گئی ہے۔ میں سوچ رہا تھا۔ تمھارے پاس دو سو روپے کہاں سے آگئے؟

جالپا۔ یہ روپے میں اپنے گھر سے لائی تھی۔ کچھ بدائی میں ملے تھے کچھ منہ دکھائی۔

رما۔ تب تو تم روپے جمع کرنے میں بڑی ہوشیار ہو۔ یہاں کیوں نہیں کچھ جمع کیا؟

جالپا نے مسکرا کر کہا۔ تمھیں پاکر اب روپے کی پرواہ نہیں رہی۔

رما۔ اپنی تقدیر کو کوستی ہوگی۔

جالپا۔ تقدیر کو کیوں کوسوں۔ تقدیر کو وہ روئے جس کا شوہر نکھٹو ہو۔ شرابی ہو۔ بدچلن ہو۔ مریض ہو۔ طعنوں سے عورت کا دل چھیدتا رہے۔ بات بات پر بگڑے۔ آدمی اپنی مرضی کا ہو تو عورت اس کے ساتھ فاقہ کرکے بھی خوش رہے گی۔

رما نے تمسخر کرکے پوچھا۔ تو میں تمھارے من کا ہوں؟

جالپا نے محبت آمیز غرور سے کہا۔ میری جو اُمید تھی۔ اس سے تم کہیں بڑھ کر نکلے۔ میری تین سہیلیاں ہیں۔ مگر ایک کا شوہر بھی تم جیسا نہیں۔ ایک ایم۔ اے پاس ہے۔ مگر دائم المریض۔ دوسرا تعلیم یافتہ بھی ہے اور مالدار بھی مگر عیاش۔ تیسرا بالکل نکھٹو ہے۔

رما غمگین ہو گیا۔ ایسی وفادار اور خلوص کی دیوی کے ساتھ اس نے کتنا دغا کی۔ جب اتنا پردہ رکھنے پر بھی جالپا کو اس پر اتنا اعتماد رہے۔ تو ان ظاہرداریوں کو مٹاکر اس کی زندگی کتنی پُرعافیت ہوتی۔

(۱۹)

علی الصبح رما نے رتن کے پاس اپنا آدمی بھیجا۔ خط میں لکھا تھا۔ مجھے بڑا افسوس ہے کہ کل جالپا نے آپ کے ساتھ ایسا برتاؤ کیا جو اسے لازم نہ تھا۔ میری منشا ہرگز نہ تھی کہ آپ کو روپے واپس کردوں۔ میں نے صراف کو تنبیہ کرنے کے لیے اس سے روپے لے لیے تھے کنگن دوچار روز میں ضرور مل جائیں گے۔ آپ روپے بھیج دیں۔ اس تھیلی میں دو سو روپے میرے بھی تھے۔ اس کا خیال رکھیے گا۔ غرض اپنی خودداری کا لحاظ رکھتے ہوئے جتنا انکسار ممکن تھا وہ اس نے ظاہر کیا۔ جب تک آدمی لوٹ کر نہ آیا۔ وہ بڑی بے صبری سے اس کا انتظار کرتا رہا۔ سوچ رہا تھا۔ کہیں بہانہ نہ کردے۔ یا گھر پر ملے ہی نہیں۔ یا دو چار دن بعد دینے کا وعدہ کرے۔ سارا دارومدار رتن کے روپوں پر تھا۔ اگر اس نے صاف جواب دے دیا تو پھر خدا ہی حافظ ہے۔ اس کے انکار کا خیال کرکے ہی اس کی روح فنا ہورہی تھی۔ آخر نو بجے آدمی لوٹا۔ رتن نے دو سو روپے تو دے دیئے تھے۔ مگر خط کا جواب نہ دیا تھا۔

رما نے مایوس آنکھوں سے آسمان کی طرف دیکھا۔ سوچنے لگا۔ رتن نے خط کا جواب کیوں نہیں دیا۔ کیا اتنی کج خلق ہے۔ کتنی مکار عورت ہے۔ رات کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شرافت اور اخلاق کی پتلی ہے۔ مگر دل میں یہ غبار بھرا ہوا تھا۔ باقی روپوں کے فکر میں رما کو نہانے کھانے کی بھی یاد نہ رہی۔

کہار اندر گیا۔ تو جالپا نے پوچھا۔ تمھیں کچھ دھندے کی بھی فکر ہے کہ مٹرگشتی ہی کرتے رہوگے۔ دس بج رہے ہیں اور ابھی تک ساگ بھاجی کا کہیں پتہ نہیں۔

کہار نے تیوریاں بدل کر کہا۔ تو کیا چار ہاتھ پیر کرلوں۔ کام ہی سے تو گیا تھا۔ بابو نے میم صاحب کے پاس روپیہ لینے کو بھیجا تھا۔

جالپا۔ میم صاحب کون؟

کہار۔ وہی جو موٹر پر چڑھ کر آتی ہیں۔

جالپا۔ تو لائے روپے؟

کہار۔ لایا کیوں نہیں۔ سو کوس پر تو رہتی ہیں۔ دوڑتے دوڑتے پاؤں ٹوٹ گئے۔

جالپا۔ اچھا چٹ پٹ جاکر ترکاری لاؤ۔

کہار تو ادھر گیا۔ رما روپے لیے ہوئے اندر پہنچا۔ تو جالپا نے پوچھا۔ تم نے اپنے روپے رتن سے منگوا لیے نا؟ اب تو مجھ سے نہ لوگے؟

رما نے مایوسانہ انداز سے کہا۔ مت دو۔

جالپا۔ میں نے تو کہہ دیا تھا کہ روپے دے دوں گی۔ پھر آدمی کیوں دوڑا دیا۔ سمجھی ہوں گی۔ انھیں میرا اتنا اعتبار بھی نہیں۔

رما۔ میں نے روپے نہیں مانگے تھے۔ صرف اتنا لکھ دیا تھا کہ تھیلی میں دو سو روپے زیادہ ہیں۔

جالپا ہنس کر بولی۔ میرے روپے بڑے بھاگوان ہیں۔ دکھاؤں۔ چن چن کر نئے روپے رکھے ہیں۔ سب چماچم۔ دیکھو۔ تو آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں۔

یکایک کسی نے نیچے سے آواز دی۔ بابو جی سیٹھ نے روپے کے لیے بھیجا ہے!

منشی دیا ناتھ کسی کام سے اندر آرہے تھے۔ سیٹھ کے پیادے کو دیکھ کر پوچھا۔ کون سیٹھ؟ کیسے روپے؟ میرے یہاں کسی کے روپے نہیں آتے۔

پیادہ بولا۔ چھوٹے بابو نے کچھ مال لیا تھا۔ سال بھر ہوگیا۔ ابھی تک ایک پیسہ نہیں دیا۔ سیٹھ جی نے کہا ہے۔ بات بگڑنے پر دیے تو کیا دیے۔ آج کچھ ضرور دلوا دیجیے۔

دیا ناتھ نے رما کو پکارا اور بولے۔ دیکھو کس سیٹھ کا آدمی آیا ہے اس کا کچھ حساب باقی ہے۔ صاف کیوں نہیں کردیتے۔ کتنا باقی ہے؟

رما کچھ جواب نہ دے پایا تھا کہ پیادہ بول اُٹھا۔ پورے سات سو بابو جی!

منشی دیا ناتھ کی آنکھیں پھیل کر پیشانی تک جا پہنچیں۔ سات سو۔ کیوں جی یہ تو سات سو کہتا ہے!

رما نے ٹالنے کے ارادے سے کہا۔ مجھے ٹھیک معلوم نہیں۔

پیادہ۔ معلوم نہیں۔ پُرزہ تو میرے پاس ہے۔ تب سے کچھ دیا ہی نہیں۔ کم کہاں سے ہوگئے؟

رما۔ تم چلو دکان پر میں خود آتا ہوں۔

پیادہ۔ ہم بغیر روپے لیے نہ جائیں گے صاحب! آپ یونہی ٹال دیا کرتے ہیں اور باتیں ہم کو سُننی پڑتی ہیں۔

رما کو ساری دُنیا کے سامنے ذلیل ہونا گوارا تھا۔ لیکن باپ کے سامنے اس طرح کی ذلّت اس کے لیے موت سے کم نہ تھی۔ جس آدمی نے اپنی زندگی میں کبھی حرام کا ایک پیسہ نہ چُھوا ہو۔ جس نے قرض لے کر کھانے کے بدلے بھوکوں سو رہنا منظور کیا ہو اس کا لڑکا اتنا بے شرم اور بے غیرت ہو۔ رما اپنے والد کی روح کو اور زیادہ صدمہ نہ پہنچا سکتا تھا۔ تند لہجے میں پیادہ سے بولا۔ تم ابھی یہیں کھڑے ہو۔ ہٹ جاؤ نہیں تو دھکے دے کر نکال دیے جاؤ گے۔

پیادہ۔ ہمارے روپے دلوایئے ہم چلے جائیں۔ ہمیں آپ کے دروازہ پر کیا مٹھائی ملتا ہے۔

رما۔ جاکر لالہ سے کہو دو نالش کردیں۔

منشی دیا ناتھ نے ڈانٹ کر کہا۔ کیا بے شرمی کی باتیں کرتے ہو جی۔ جب گرہ میں روپے نہ تھے۔ تو چیز لائے ہی کیوں؟ اور جب لائے تب ادا کرو۔ کہہ دیا نالش کردو۔ نالش کردے گا۔ تو کیا آبرو رہ جائے گی تمھاری اور تمھیں یہ سوجھی کیا کہ اتنا بڑا بوجھ سر پر لاد لیا۔ کوئی شادی بیاہ کا موقع ہوتا تو ایک بات بھی تھی۔ یہ عورت کیسی ہے جو شوہر کو ایسی بے ہودگی کرتے دیکھتی ہے اور منع نہیں کرتی۔

رما کو یہ تنبیہ بہت ہی بُری معلوم ہو رہی تھی۔ اس کے خیال میں منشی جی کو اس معاملہ میں کچھ بولنے کا حق نہ تھا۔ گستاخی سے بولا۔ آپ ناحق اتنا بگڑ رہے ہو۔ آپ سے روپے مانگنے جاؤں تو کہیے گا۔

اپنے دل میں اس نے کہا۔ ذلت آپ ہی کی بدولت ہو رہی ہے۔ آپ ہی کی کرنی کا پھل بھوگ رہا ہوں۔

پیادہ نے باپ بیٹے میں تکرار ہوتی دیکھی تو چپکے سے راہ لی۔ منشی جی بھی جھنجھناتے ہوئے نہانے چلے گئے۔ رما اُوپر گیا۔ تو چہرہ پر خفت چھائی ہوئی تھی۔ جس بے عزتی سے بچنے کے لیے وہ ڈال ڈال پات پات بھاگتا پھرتا تھا۔ وہ آج ہو ہی گئی۔ اس ذلت کے سامنے سرکاری روپوں کی فکر بھی غائب ہوگئی۔ رما ابھی عام قرض خوروں کی طرح بے غیرت

نہیں ہوا تھا۔ مگر موت کا فرشتہ اس کی جان لینے آتا۔ تو وہ دوڑ کر اس کا خیر مقدم کرتا۔

جالپا نے پوچھا۔ تم نے کہا تھا۔ اس کے اب تھوڑے ہی روپے باقی ہیں۔

رما نے سر جھکا کر کہا۔ بدمعاش جھوٹ بول رہا تھا۔

جالپا۔ دیئے ہوتے تو کیوں روپوں کا تقاضا کرتا۔ جب تمھاری آمدنی اتنی کم تھی۔ تو گہنے لیے ہی کیوں۔ میں نے تو کبھی ضد نہ کی تھی اور مان لو میں ضد بھی کرتی۔ تو تمھیں سمجھ بوجھ کر کام کرنا تھا۔ اپنے ساتھ مجھے بھی چارگالی سنوا دیں۔ آدمی ساری دنیا سے پردہ رکھتا ہے لیکن اپنی بیوی سے تو پردہ نہیں رکھتا۔ اگر میں جانتی تمھاری آمدنی اتنی تھوڑی ہے۔ تو مجھے کیا کتے نے کاٹا تھا کہ سارے محلہ کی عورتوں کو تانگے میں بٹھا بٹھا کر سیر کرانے لے جاتی۔ کہیں نالش کردے تو سات سو کے ایک ہزار ہوجائیں۔ مجھے نہ معلوم تھا کہ تم مجھ سے یہ فریب کر رہے ہو۔ کوئی بازاری عورت تو تھی نہیں کہ تمھیں نوچ کھسوٹ کر اپنا گھر بھر لیتی۔ میں تو بھلے بُروں دونوں ہی کی ساتھن ہوتی۔ بھلے میں تم چاہے میری بات نہ پوچھو۔ لیکن بُرے میں تو تمھارے گلے پڑوں گی ہی۔

رما کے منہ سے ایک لفظ نہ نکلا۔ دفتر کا وقت آگیا تھا۔ کھانا کھانے کی مہلت نہ تھی۔ کپڑے پہنے اور دفتر چلا۔ ابھی گھر سے نکلا ہی چاہتا تھا کہ جالپا لپک کر نیچے آئی اور بولی۔ میرے پاس جو دو سو روپے ہیں۔ وہ کیوں نہیں صراف کو دے دیتے۔ رما نے چلتے وقت عمداً جالپا سے روپے نہ مانگے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ جالپا مانگتے ہی دے دے گی۔ لیکن باتیں سننے کے بعد روپے کے لیے اس کے سامنے ہاتھ پھیلاتے اُسے شرم آتی تھی۔ جالپا کی آواز سن کر ٹھٹک گیا اور بولا۔ اچھی بات ہے۔ لاؤ دے دو۔ وہ باہر کے کمرے میں بیٹھ گیا۔ جالپا دوڑ کر اوپر سے روپے لائی اور گن گن کر اس کی تھیلی میں ڈال دایئے۔ اس نے سمجھا تھا رما روپے پاکر پھولا نہ سمائے گا۔ مگر اس کی یہ تمنا پوری نہ ہوئی۔ اسے ابھی تین سو روپوں کی فکر اور کرنی تھی۔ وہ کہاں سے آئیں گے۔

سڑک پر آکر رما نے ایک تانگہ لیا اور رتن کے بنگلے پر جا پہنچا۔ شاید رتن سے ملاقات ہوجائے۔ وہ چاہے تو تین سو روپوں کا بڑی آسانی سے انتظام کرسکتی ہے۔ راستہ میں وہ سوچتا جاتا تھا۔ آج ذرا بھی تکلیف نہ کروں گا۔ ذرا دیر میں رتن کا بنگلہ آگیا۔ وہ سامنے

ہی برآمدہ میں بیٹھی تھی۔ رما نے اسے دیکھ کر ہاتھ اُٹھا۔ اس نے بھی ہاتھ اُٹھایا۔ تانگہ سامنے سے نکل گیا۔ وہ بنگلہ کے اندر نہ جاسکا۔ رتن بلاتی تو وہ چلا جاتا۔ وہ برآمدے میں نہ بیٹھی ہوتی۔ تب بھی شاید وہ اندر چلا جاتا۔ لیکن اسے بیٹھی دیکھ کر وہ محجوب ہوگیا۔

جب تانگہ اور آگے پہنچا۔ تو رما نے اسے جنگی کے دفتر چلنے کو کہا اور گیارہ بجتے بجتے وہاں جا پہنچا۔ اس کا چہرہ اُترا ہوا تھا۔ چھاتی دھڑک رہی تھی۔ رمیش بابو نے اس کو ضرور پوچھا ہوگا۔ جاتے ہی بلائیں گے۔ دفتر کے کاموں میں وہ ذرا بی رعایت نہیں کرتے تانگہ سے اُترتے ہی اس نے پہلے اپنے کمرے کی طرف نگاہ ڈالی۔ دیکھا۔ کئی آدمی اس کی راہ دیکھ رہے ہیں۔ وہ ادھر نہ جاکر رمیش بابو کے یہاں پہنچا۔ یہ انتشار اب اس کی برداشت سے باہر تھا۔

رمیش بابو نے پوچھا۔ تم اب تک کہاں تھے جی۔ خزانچی صاحب تمھیں تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ چپراسی ملا تھا؟

رما نے اٹک اٹک کر کہا۔ میں گھر پر نہ تھا۔ ذرا وکیل صاحب کی طرف چلا گیا تھا ایک بڑی مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔

رمیش۔ کیسی مصیبت! گھر میں تو خیریت ہے؟

رما۔ جی ہاں خیر و عافیت تو ہے۔ کل شام کو یہاں کام بہت تھا۔ میں اس میں ایسا پھنسا کہ وقت کی یاد نہ رہی۔ جب کام ختم کرکے اُٹھا تو خزانچی صاحب چلے گئے تھے۔ میرے پاس آمدنی کے آٹھ سو روپے تھے۔ سوچنے لگا۔ اسے کہاں رکھوں گا۔ میرے کمرے میں کوئی صندوق تو ہے نہیں۔ یہی فیصلہ کیا کہ ساتھ لیتا جاؤں۔ پانچ سو روپے نقد تھے۔ وہ تو میں تھیلی میں رکھے۔ تین سو روپے کے نوٹ جیب میں رکھ لیے اور گھر چلا۔ چوک میں دو ایک چیزیں لینی تھیں۔ ادھر سے ہوتا ہوا گھر پہنچا تو نوٹ غائب تھے۔

رمیش نے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ تین سو روپے کے نوٹ غائب ہوگئے۔

رما۔ جی ہاں۔ کوٹ کے اوپر کی جیب میں تھے۔ کسی نے نکال لیے۔

رمیش۔ اور تم کو مار کر تھیلی نہیں چھین لی۔

رما۔ کیا بتاؤں بابو جی! تب سے ایسے خلجان میں پڑا ہوا ہوں کہ کچھ کہہ نہیں سکتا صبح سے

اسی فکر میں دوڑ رہا ہوں۔ لیکن کوئی بندوبست نہ ہوسکا۔

رمیش۔ منشی جی سے تو تم نے کہا ہی نہ ہوگا۔

رما۔ ان کی عادت سے تو آپ واقف ہیں۔ روپے تو کیا دیتے اُلٹی ڈانٹ سناتے۔

رمیش۔ تو پھر کیا کروگے؟

رما۔ آج شام تک کی مہلت دیجیے۔ کچھ نہ کچھ کروں گا ہی۔

رمیش نے ترش ہوکر کہا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ تم سے اتنی لاپروائی کیوں کر ہوئی۔ میری جیب سے تو آج تک ایک پیسہ بھی نہ گرا۔ آنکھیں بند کرلی تھیں یا نشہ میں تھے۔ مجھے تمھاری بات پر یقین نہیں آتا۔ سچ سچ بتلا دو۔ کہیں اناپ شناپ تو نہیں خرچ کر ڈالے۔ اس دن تم نے مجھ سے روپے کیوں مانگے تھے۔

رما کا چہرہ زرد پڑگیا۔ رمیش کا قیاس اصلیت کے بہت قریب جا پہنچا تھا۔ بولا۔ کیا سرکاری روپے خرچ کر ڈالوں گا۔ اس دن آپ سے روپے اس لیے مانگے تھے کہ بابو جی کو ایک ضرورت آ پڑی تھی۔ میں نے آپ کا خط انھیں سنا دیا۔ بہت ہنسے۔ نوٹوں کے غائب ہونے کا تو مجھے خود ہی تعجب ہے۔

رمیش۔ تمھیں منشی جی سے مانگتے ہوئے شرم آتی ہوتی میں لکھ کر منگوا لوں۔

رما نے کانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ اس سے تو کہیں بہتر ہے آپ مجھے گولی مادیں۔

رمیش نے ذرا تامل کرکے کہا۔ تمھیں یقین ہے۔ شام تک روپے مل جائیں گے۔

رما۔ جی ہاں امید تو ہے۔

رمیش۔ پھر یہ پانچ سو روپے جمع کردو۔ مگر دیکھو بھائی میں صاف صاف کہہ دیتا ہوں۔ اگر کل دس بجے تک روپیہ نہ لائے تو مجھے الزام نہ دینا۔ قاعدہ تو یہی کہتا ہے کہ میں اسی وقت تمھیں پولیس کے حوالے کردوں۔ لیکن تم ابھی لڑکے ہو۔ اس لیے رعایت کرتا ہوں اور تمھیں معلوم ہے کہ میں سرکاری کاموں میں کسی قسم کی رعایت نہیں کرتا۔ تمھاری جگہ اگر میرا لڑکا یا بھائی ہوتا۔ تو میں اس کے ساتھ بھی یہی برتاؤ کرتا بلکہ شاید اس سے سخت۔ میرے پاس روپے ہوتے تو تمھیں دے دیتا۔ لیکن میری حالت تم جانتے ہو۔ نہ کسی کو قرض دیتا ہوں نہ کسی سے لیتا ہوں۔ کل روپے نہ آئے تو بُرا ہوگا۔ میری دوستی بھی تمھیں پولیس کے پنجہ سے

نہ بچا سکے گی۔ میری دوستی نے تو آج اپنا حق ادا کردیا۔ ورنہ اس وقت تمھارے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ہوتیں۔

ہتھکڑیاں! رما سر سے پیر تک کانپ اُٹھا۔ اس ذلت اور رسوائی کا خیال کرکے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ سر جھکائے آہستہ آہستہ سزا یافتہ قید کی طرح اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ مگر وہ لفظ رہ رہ کر اس کے دل کو مسوس لیتا تھا۔

(۲۰)

رما شام کو دفتر سے چلنے لگا۔ تو رمیش بابو دوڑے ہوئے آئے اور کل روپے لانے کی سخت تاکید کی۔ رما دل میں جھنجھلا اُٹھا۔ آپ بڑے ایماندار کی دم بنے ہیں۔ مکار کہیں کا۔ اگر اپنی ضرورت آپڑے تو دوسروں کے تلوے سہلاتے پھریں گے۔ مگر میرا کام ہے تو آپ اصول پرور بن بیٹھے۔ یہ سب دکھانے کے دانت ہیں۔ مرنے کے وقت اس کی جان بھی جلد نہ نکلے گی۔

کچھ دُور جاکر اس نے سوچا۔ ایک بار پھر رتن کے پاس چلوں۔ وہ جب اس کے بنگلے پر پہنچا۔ تو وہ اپنے باغیچہ میں چبوترے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے پاس ہی ایک گھوتی جوہری بیٹھا ہوا تھا۔ صندوق سے گہنے نکال نکال کر دکھا رہا تھا۔ رما کو دیکھ کر وہ بہت ہی خوش ہوئی۔ بولی۔ آیئے بابو جی۔ دیکھیے سیٹھ جی کیسی اچھی اچھی چیزیں لائے ہیں۔ اس ہار کے دام بارہ سو روپے بتلاتے ہیں۔

رما نے ہار کو ہاتھ میں لے کر دیکھا اور کہا۔ ہاں چیز تو اچھی معلوم ہوتی ہے۔

رتن۔ دام بہت کہتے ہیں۔

جوہری۔ بائی جی ایسا ہار اگر کوئی دو ہزار میں لادے تو جو جرمانہ کہیے دوں۔ میں نے تو لاگت بتلائی ہے۔

رما نے مسکرا کر کہا۔ ایسا نہ کہیے۔ سیٹھ جی جرمانہ دینا پڑے گا۔

جوہری۔ بابو صاحب ہار تو سو روپیہ میں آجائے گا اور بالکل ایسا ہی بلکہ چمک دمک میں اس سے بھی بڑھ کر۔ مگر مال پرکھنا چاہیے۔ میں نے خود ہی آپ سے مول تول کر بات نہیں کی۔ مول تول اناڑیوں سے کیا جاتا ہے۔ آپ سے کیا مول تول۔ ہم لوگ نرے روزگاری نہیں ہیں بابو صاحب۔ آدمی کا مزاج دیکھتے ہیں۔ شریمتی جی

نے کیا امیرانہ مزاج پایا ہے کہ واہ!

رتن نے ہار کو للچائی ہوئی نگاہ سے دیکھ کر کہا۔ کچھ تو کم کیجیے سیٹھ جی۔ آپ نے تو جیسے قسم کھا لی۔

جوہری۔ کمی کا نام نہ لیجیے حضور! یہ چیز آپ کی نذر ہے۔

رتن۔ اچھا تو ایک بات بتلا دیجیے۔ کم سے کم آپ اس کا کیا لیں گے۔

جوہری نے کچھ رنجیدہ ہوکر بارہ سو روپے اور بارہ کوڑیاں ہوں گی۔ حضور اسی شہر میں پندرہ سو کا بیچوں گا اور آپ سے کہہ جاؤں گا۔ کس نے لیا۔

جوہری نے ہار کو رکھنے کے لیے کیس نکالا۔ رتن کو یقین آگیا کہ یہ کچھ کم نہ کرے گا۔ بچوں کی طرح بے صبر ہوکر بولی۔ آپ تو ایسا سمیٹے لیتے ہیں۔ گویا ہار کو نظر لگ جائے گی۔

جوہری۔ کیا کروں صاحب۔ جب ایسے دربار میں چیز کی قدر نہیں ہوتی تو رنج ہوتا ہے۔

رتن نے کمرے میں جاکر رما کو بلایا اور بولی۔ آپ کے خیال میں یہ کچھ اور نیچے اُترے گا۔

رما۔ میرے خیال میں تو چیز ایک ہزار سے زیادہ کی نہیں ہے۔

رتن اونہہ ہوگا۔ میرے پاس تو چھ سو روپے ہیں۔ آپ چار سو روپے کا انتظام کردیں تو لے لوں۔ یہ اسی گاڑی سے کاشی جا رہا ہے۔ اُدھار نہ مانے گا۔ وکیل صاحب کسی جلسے میں گئے ہوئے ہیں۔ نو دس بجے کے پہلے نہ لوٹیں گے۔ میں آپ کو کل روپیہ لوٹا دوں گی۔

رما نے بے بسی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ یقین مانیے۔ میں اس وقت بالکل خالی ہاتھ ہوں۔ میں تو آپ سے روپے مانگنے آیا تھا۔ وہ روپے مجھے دے دیجیے۔ میں آپ کے لیے یہیں سے کوئی اچھا سا ہار لا دوں گا۔ سات آٹھ سو سے زیادہ نہ لگیں گے۔

رتن۔ چلیے میں آپ کی باتوں میں نہیں آتی۔ چھ مہینے میں ایک کنگن تو بنوا نہ سکے اب ہار کیا لائیے گا۔ میں یہاں کئی دوکانیں دیکھ چکی ہوں۔ ایسی چیز شاید ہی کہیں نکلے۔ اور نکلے گی بھی تو اس کے ڈیوڑھے دام دینے پڑیں گے۔

رما۔ تو اسے کل کیوں نہ بلائیے۔ سودا بیچنے کی غرض ہوگی۔ تو آپ ٹھہرے گا۔

رتن۔ اچھا کہیے دیکھیے کیا کہتا ہے۔
دونوں کمرے سے باہر نکلے۔ رما نے جوہری سے کہا۔ تم کل آٹھ بجے کیوں نہیں آتے۔
جوہری۔ نہیں حضور کل کاشی میں دو چار بڑے رئیسوں سے ملنا ہے۔ آج نہ جانے سے بڑا نقصان ہوجائے گا۔
رتن۔ میرے پاس تو اس وقت چھ سے روپے ہیں۔ باقی روپے کل لینے ہوں تو ہار دے دیجیے۔
جوہری۔ روپے کی تو کوئی بات نہیں۔ مہینہ دو مہینہ میں لے لیتا۔ لیکن ہم پردیسیوں کا کیا ٹھکانا۔ کون جانے یہاں پھر کب آنا ہو۔ آپ اس وقت ایک ہزار دے دیں۔ دو سو پھر دے دیجیے گا۔
دفعتاً موٹر کی آواز سن کر رتن نے پھاٹک کی طرف دیکھا۔ وکیل صاحب چلے آ رہے تھے۔ رتن نے آگے بڑھ کر کہا۔ آپ تو نو بجے آنے کو کہہ گئے تھے۔
وکیل۔ وہاں کورم ہی پورا نہ ہوا۔ بیٹھ کر کیا کرتا۔ کوئی دل سے تو کام کرنا نہیں چاہتا۔ سب مفت میں نام کمانا چاہتے ہیں۔ یہ کیا کوئی جوہری ہے۔
جوہری نے اُٹھ کر سلام کیا۔
وکیل صاحب رتن سے بولے۔ کیوں تم نے کوئی چیز پسند کی؟
رتن۔ ہاں ایک ہار پسند کیا ہے۔ بارہ سو مانگتے ہیں۔
وکیل۔ بس، اور کوئی چیز پسند کرو۔
رتن۔ اس وقت تو مجھے اور کسی چیز کی ضرورت نہیں۔
وکیل صاحب کو رتن سے شوہر کی سی محبت نہیں۔ باپ کی سی محبت تھی جیسی کوئی محبتی باپ لڑکیوں سے پوچھ پوچھ کر کھلونے لیتا ہے وہ بھی رتن سے پوچھ پوچھ کر آرائش کے کھلونے لیتے تھے۔ ان کے پاس اُسے خوش کرنے کے لیے دولت کے سوا اور چیز ہی کیا تھی۔ انھیں اپنی زندگی میں ایک سہارے کی ضرورت تھی۔ ایک مجسم سہارے کی۔ جس کی قوت سے وہ اس عالم ضعیفی میں بھی کارزار ہستی میں کھڑے رہ سکیں جیسے کسی بڈھے کو لاٹھی کی ضرورت ہوتی ہے یا کسی اُپاسک کو مورتی کی۔ بغیر مورتی کے وہ کس پر پھول

چڑھائے۔ کیسے گنگا جل سے نہلائے۔ کیسے لذیذ چیزوں کا بھوگ لگائے۔

رتن نے کیس میں سے ہار نکال کر دکھایا اور بولی۔ اس کے بارہ سو مانگتے ہیں۔

وکیل صاحب کی نگاہ میں روپے کی قیمت اس سے پیدا ہونے والی خوشی تھی۔ اگر ہار رتن کو پسند ہے تو انھیں اس کی پرواہ نہیں کہ اس کے کیا دینے پڑیں گے۔ انھوں نے چیک بک نکال کر جوہری کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ سچ سچ بولو۔ کتنا لکھوں اور اگر فرق پڑا تو تو تم جانو گے۔

جوہری نے ہار اُلٹ پلٹ کر دیکھا اور بولا۔ ساڑھے گیارہ سو کر دیجیے۔

وکیل صاحب نے چیک لکھ کر اس کو دیا اور سلام کرکے رخصت ہوا۔

رما کچھ دیر تو بیٹھا وکیل صاحب کے سیاحت یورپ کے تذکرے سنتا رہا۔ آخر مایوس ہو کر چلا آیا۔

(۲۱)

اگر اس وقت کسی کو دنیا میں سب سے زیادہ فکرمند مصیبت زدہ اور زندگی سے بیزار انسان کی صورت دیکھنی ہو تو اس نوجوان کو دیکھیے جو سائیکل پر بیٹھا ہوا الفریڈ پارک کے سامنے چلا آرہا ہے۔ اس وقت اگر کوئی کالا سانپ نظر آئے تو وہ غالبًا دونوں ہاتھ پھیلا کر اسے گلے سے لگائے گا اور اس کے زہر کو امرت کی طرح پیے گا۔ اس کی نجات اب امرت میں نہیں زہر ہی میں ہے۔ موت ہی اب اس کی فکروں کا خاتمہ کرسکتی ہے۔ لیکن کیا موت اسے زندگی سے بھی بچا سکتی ہے۔

اگر رما ناتھ اس وقت بھی جاکر جالپا سے سارا واقعہ بے کم و کاست کہہ سناتا تو وہ اس کے ساتھ ضرور ہمدردی کرتی۔ یقینًا وہ اپنے سارے زیور اس کے سپرد کردیتی۔ ان زیوروں کو گرو رکھ کر سرکاری روپے ادا کردیتا۔

دل میں یہی فیصلہ کرکے رما گھر کی طرف چلا۔ لیکن گھر پہنچ کر اس نے سوچا۔ جب یہی کرنا ہے تو جلدی کیا ہے۔ جب چاہوں گا۔ مانگ لوں گا۔ کچھ دیر گپ شپ کرتا رہا۔ تب کھانا کھا کر لیٹا۔ دفعتًا اس کے جی میں آیا۔ کیوں نہ چپکے سے کوئی چیز اُٹھا لے جاؤں۔ خاندانی وقار کی حفاظت کرنے کے لیے اس نے ایک بار یہ چال چلی تھی۔ اسی نسخہ سے کیا وہ اپنی جان کی حفاظت نہیں کرسکتا۔ اپنی زبان سے تو شاید وہ کبھی اپنا پردہ فاش نہیں

کر سکتا۔ اسی طرح شش و پنج میں پڑے سویرا ہوجائے گا۔ اور تب اسے کچھ کہنے کا موقع ہی نہ ملے گا۔

مگر اندیشہ ہوا کہیں جالپا کی آنکھ نہ کھل جائے۔ پھر تو اس کے لیے تربینی کے سوا اور کوئی جگہ ہی نہ رہے گی۔ جو کچھ بھی ہو ایک بار کوشش کرنا شرط ہے۔ اس نے آہستہ آہستہ جالپا کا ہاتھ اپنے سینہ پر سے ہٹایا اور چارپائی سے اتر کر فرش پر کھڑا ہولیا۔ اسے ایسا شبہ ہوا کہ جالپا ہاتھ اُٹھاتے ہی چونکی۔ لیکن پھر معلوم ہوا یہ محض شبہ تھا۔ اب اسے جالپا کی جیب سے چابیوں کا گچھا نکالنا تھا۔ دیر کرنے کا موقعہ نہ تھا۔ لیکن نیند میں بھی حواس ثانی قائم رہتے ہیں۔ بچہ کتنا ہی غافل سویا ہو۔ ماں کے چارپائی سے اُٹھتے ہی جاگ پڑتا ہے۔ جب وہ چابی نکالنے کے لیے جھکا۔ تو اسے ایسا معلوم ہوا کہ جالپا مسکرا رہی ہے اس نے فوراً ہاتھ کھینچ لیا اور لیمپ کی ہلکی روشنی میں جالپا کے منہ کی طرف تاکنے لگا۔ جالپا کا رہ رہ کر مسکرانا بتلا رہا تھا کہ وہ کوئی دل آویز خواب دیکھ رہی ہے۔ اس تبسم نے گویا رما کے دل کو سوز کردیا۔ اس محبت اور وفا کی دیبی کے ساتھ وہ کتنا کمینہ پن کر رہا ہے جس وقت اسے معلوم ہوگا کہ اس کے گہنے پھر چوری ہوگئے۔ اس کی کیا حالت ہوگی۔ وہ کن آنکھوں سے اُسے چھاتی پیٹتے اور سر کے بال نوچتے دیکھے گا۔

وہ پھر چارپائی پر لیٹ رہا۔ اسی وقت جالپا کی آنکھیں کھل گئیں اس کے منہ کی طرف دیکھ کر بولی۔ تم کہاں گئے تھے؟ میں بڑا اچھا خواب دیکھ رہی تھی۔ ایک سُہاونا باغ ہے۔ ہم تم دونوں اس میں ٹہل رہے ہیں۔ اتنے میں تم نہ جانے کہاں جاتے ہو اور ایک سادھو آکر میرے سامنے کھڑا ہوجاتا ہے۔ اس کی صورت بالکل دیوتاؤں جیسی ہے وہ مجھ سے کہتا ہے۔ بیٹی! میں تم سے بہت خوش ہوں۔ مجھ سے جو چاہے مانگ لے۔ میں تمھیں ادھر ادھر ڈھونڈ رہی ہوں کہ تم سے پوچھ کر کچھ مانگوں۔ پر تم کہیں دکھائی نہیں دیتے۔ میں سارا باغ چھان آئی۔ درختوں کی آڑ میں دیکھا۔ تم نہ جانے کہاں چلے گئے ہو۔ بس اتنے میں نیند کھل گئی۔ کچھ مانگنے نہ پائی۔

رما نے مسکرا کر کہا۔ کیا مانگتیں۔

جالپا۔ مانگتی جو جی میں آتا۔ تمھیں کیوں بتاؤں؟

رما۔ میں سمجھ لیا۔ تم بہت سی دولت مانگتیں!

جالپا۔ دولت کو تو تم بہت بڑی چیز سمجھتے ہوگے۔ میں تو کچھ نہیں سمجھتی۔

رما۔ ہاں میں تو سمجھتا ہوں۔ مفلس رہ کر جینا مرنے سے بھی بدتر ہے۔ میں تو اگر کسی دیوتا کو پکڑ پاؤں تو بغیر کافی روپے لیے نہ چھوڑوں۔ میں نے سونے کی دیوار نہیں کھڑی کرنا چاہتا۔ نہ راک فیلر اور کارنگی بننے کی مجھے ہوس ہے۔ میں صرف اتنی دولت چاہتا ہوں کہ روز مرہ کی ضرورتوں کے لیے ترسنا نہ پڑے۔ بس کوئی دیوتا مجھے پانچ لاکھ روپے دے دے تو میں پھر اس سے کچھ نہ مانگوں گا۔ ہمارے غریب ملک میں ایسے کتنے ہی رئیس ہیں جو پانچ لاکھ سالانہ خرچ کرتے ہیں۔ میں تو اتنے میں ساری عمر کی غلامی لکھنے کو تیار ہوں۔ مگر مجھے کوئی اتنا بھی نہیں دیتا۔

جالپا۔ مجھے تو اتنے روپے ملیں تو میں یہی سوچتی رہوں کہ اسے خرچ کیسے کروں۔

رما۔ تو پھر تم کیا مانگیں۔ اچھے اچھے گہنے۔

جالپا نے ملامت آمیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ کیوں چڑھاتے ہو مجھے کیا میں گہنوں پر اور عورتوں سے زیادہ جان دیتی ہوں۔ میں نے تو کبھی تم سے ضد نہیں کی۔ تمھیں ضرورت ہو آج اُٹھا لے جاؤ۔ مجھے مطلق ملال نہ ہوگا۔

رما نے جھینپ مٹاتے ہوئے کہا تو پھر بتلاتی کیوں نہیں!

جالپا نے شرماتے ہوئے کہا۔ میں یہی مانگتی کہ تم ہمیشہ مجھ سے محبت کرتے رہو تمھارا دل مجھ سے کبھی برگشتہ نہ ہو۔

رما نے ہنس کر کہا۔ اچھا تو کیا تمھیں یہ خوف بھی ہے؟

جالپا۔ اوروں کی حالت دیکھ کر مجھے بھی کبھی یہ خوف ہونے لگتا ہے۔ مجھے تو کوئی ایسی عورت نہ ملی۔ جس نے اپنے شوہر کی بے مہری اور بے التفاتی کا قصہ نہ کہا ہو۔

یہ کہتے ہوئے جالپا نے رما کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور پیار میں ڈوبی ہوئی نگاہوں سے دیکھتی ہوئی بولی۔ سچ بتانا۔ تم اب بھی مجھے اتنا ہی چاہتے ہو۔ جتنا پہلے چاہتے تھے۔

رما نے جالپا کو گلے سے لگا کر کہا۔ اس سے کہیں زیادہ لاکھ گنا۔

جالپا نے ہنس کر کہا بالکل جھوٹ۔ سولہوں آنہ جھوٹ!

رما۔ یہ تمھاری زبردستی ہے۔ آخر یہ تمھیں کیوں کر معلوم ہوا۔

جالپا۔ کیوں میری آنکھیں نہیں ہیں۔ تم نے میرے پاس بیٹھنے کی قسم کھائی ہے۔ جب دیکھو گم سُم بیٹھے رہتے ہو۔ مجھ سے محبت ہوتی تو مجھ پر اعتبار ہوتا۔ جس سے تم اپنے دل کی بُری سے بُری بات نہ کہہ سکو اس سے تمھیں محبت نہیں ہوسکتی۔ تم اس کے ساتھ زندگی کا لطف اُٹھا سکتے ہو۔ عیش کرسکتے ہو۔ اسی طرح جیسے کوئی بازاری عورتوں کے پاس جاتا ہے وہاں آدمی زندگی کا لطف اُٹھانے کے لیے ہی جاتا ہے۔ اپنے دل کا دکھ کہنے نہیں جاتا۔ میرے ساتھ تمھارا یہی سلوک ہے۔ بولو ہے یا نہیں! کیا میں دیکھتی نہیں کہ تم باہر سے کچھ پریشان آتے ہو۔ باتیں کرتے ہو تو ایسا معلوم ہوتا ہے۔ دل کہیں اُڑا ہُوا ہے۔ کھانا بھی اسی طرح کھاتے ہو۔ جیسے بیگار ٹالتے ہو۔ کیا میں یہ ساری باتیں نہیں دیکھتی۔ تمھارے خیال سے مجھے دیکھنا نہ چاہیے۔ تم صرف میرے حُسن کے شیدا ہو۔ میرا کام ہے سیر و تفریح کرنا۔ آرائش میں مصروف رہنا۔ مجھے تمھاری فکروں سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ مگر کیا کروں۔ مجھے ایشور نے وہ دل نہیں دیا ہے۔

وہ سر جھکائے سنتا رہا۔ جالپا نے اس کی فطرت کا اتنا صحیح مطالعہ کیا ہے۔ اس کا اُسے گمان بھی نہ تھا۔ فی الواقعہ وہ اس کے حسن کا شیدائی تھا۔ کبھی اس کا حُسنِ باطن دیکھنے کی کوشش نہ کی۔

اگر اس کی صورت اتنی دلکش نہ ہوتی تو شاید وہ اس سے بولنا پسند نہ کرتا۔ اس کی ساری کشش، اس کی ساری مسرت جالپا کے حُسن میں مرکوز تھی۔ وہ سمجھتا تھا جالپا اسی میں خوش ہے۔ اپنے فکروں کے بوجھ سے وہ اسے دبانا نہیں چاہتا تھا۔ مگر آج اس پر روشن ہوا کہ اس کی حُسن پرستی جالپا کو آسودہ نہیں کرسکتی۔ وہ اس کی شریک درد ہونے کے لیے بے قرار ہے۔ اس وقت اس اپنا دردِ دل کہہ ڈالنے کا اچھا موقعہ تھا لیکن شرم نے پھر اس کی زبان بند کردی۔ جو باتیں وہ اتنے دنوں سے چھپائے ہوئے تھا۔ وہ اب کیسے کہے۔ کیا ایسا کرنا جالپا کے الزاموں کو صحیح تسلیم کرنا نہ ہوگا۔

رما انھیں خیالوں میں پڑا پڑا سوگیا۔ آدھی رات سے زیادہ گزر چکی تھی۔ سویا تو اس ارادہ سے تھا کہ بہت سویرے اُٹھ جاؤں گا۔ لیکن نیند کھلی۔ تو کمرے میں روشنی پھیل چکی تھی۔ وہ گھبرا کر اُٹھا۔ اور بغیر ہاتھ منہ دھوئے کپڑے پہن کر رمیش بابو کے یہاں جانے کو

تیار ہوگیا۔ انھیں اب محرمِ راز بنانے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ جالپا اس وقت کھانا بنانے کی تیاریاں کر رہی تھی۔ رما کو اس طرح جاتے دیکھ کر اس کے چہرہ کی طرف پُرسوال نظروں سے دیکھا۔ رما کے چہرہ پر اضطراب اور کلفت اور خوف کی کیفیت نمایاں تھی۔ ان کی یہ کیا حالت ہے؟ اس سے وہ کچھ کہتے کیوں نہیں۔ وہ اور کچھ نہ کرسکے۔ ہمدردی تو کرہی سکتی ہے۔ تسکین تو دے ہی سکتی ہے۔ اس کے جی میں آیا۔ رما کو پکار کر پُوچھے۔ کیا بات ہے اُٹھ کر دروازے تک آئی تھی۔ لیکن رما ناتھ سڑک پر دور نکل گیا تھا۔ اس نے دیکھا۔ وہ بڑی تیزی سے چلا جا رہا ہے جیسے سنک گیا ہو۔ نہ داہنی طرف تاکتا ہے نہ بائیں طرف صرف سر جھکائے راہ گیروں سے ٹکراتا۔ تانگہ اور موٹر کی پرواہ نہ کرتا ہوا بھاگا ہوا چلا جا رہا تھا۔ وہ ایک محویت کے عالم میں کئی منٹ تک دروازے پر کھڑی رہی۔ پھر اندر آکر کھانا بنانے لگی۔ لیکن اسی فکر میں غلطاں و پیچاں تھی کہ کیا بات ہے۔ وہ اس سے کیوں اتنا چھپاتے ہیں۔

رما رمیش کے گھر پہنچا تو آٹھ بج گئے تھے۔ بابو صاحب چوکی پر بیٹھے سندھیا کر رہے تھے۔ انھیں دیکھ کر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ کوئی آدھ گھنٹہ بعد سندھیا سے فارغ ہو کر بولے۔ کیا ابھی تک ہاتھ منہ نہیں دھویا۔ یہی لیچڑپن مجھے ناپسند ہے اور کچھ نہ کرو۔ جسم کی صفائی کا تو خیال رکھو۔ کیا ہوا روپیہ کا کچھ انتظام ہوا؟

رما نے دل پر جبر کرکے کہا۔ اسی فکر میں تو آپ کے پاس آیا ہو؟

رمیش۔ تم بھی عجیب آدمی ہو۔ آخر منشی جی سے کہتے تمھیں کیوں شرم آتی ہے۔ یہی تو ہوگا۔ کچھ سخت سست کہیں گے۔ لیکن اس بلا سے تو نجات مل جائے گی۔ اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے۔ ایسے حادثے زندگی میں ہوتے رہتے ہیں۔ نہیں چلو میں کہے دیتا ہوں۔

رما۔ ان سے کہنا ہوتا تو کبھی کا کہہ چکا ہوتا۔ کیا آپ کوئی بندوبست نہیں کرسکتے۔

رمیش۔ کرکیوں نہیں سکتا۔ مگر کرنا نہیں چاہتا۔ ایسے آدمی کے ساتھ مجھے کوئی ہمدردی نہیں ہوسکتی۔ جو بات تم مجھ سے کہہ سکتے ہو۔ کیا ان سے نہیں کہہ سکتے۔ پہلے ان سے کہو۔ اگر روپے نہ دیں۔ تب میرے پاس آنا۔ اس بے التفاتی نے رما کے دل کے ٹکڑے ٹکڑے کردیے۔ اِتنی یگانگت کے باوجود یہ بے دردی اس کے منہ سے

کوئی دوسرا لفظ نہ نکلا۔ وہاں سے اُٹھ کر چلا۔ مگر کچھ سود نہ پڑتا تھا۔ چووائی میں آسمان سے گرتے ہوئے پانی کی قطروں کی جو حالت ہوتی ہے۔ وہی حالت اس رما کی تھی۔ دس قدم تیزی سے آگے چلتا تو پھر کچھ سوچ کر رُک جاتا اور دس پانچ قدم پیچھے لوٹ جاتا۔ کبھی اس گلی میں گھُس جاتا۔ کبھی اس گلی میں دفعتاً ایک ترکیب سُوجھی۔ کیوں نہ جالپا کو ایک رقعہ لکھ کر سارا ماجرا کہہ سنائے۔ زبان سے تو وہ کچھ نہ کہہ سکتا تھا۔ مگر قلم سے لکھنے میں اسے کوئی مشکل نہ ہوتی تھی۔ اس نے سوچا رقعہ لکھ کر جالپا کو دے دوں گا۔ اور باہر کے کمرے میں آبیٹھوں گا۔ زبانی گفتگو کا موقعہ ہی نہ آنے دوں گا۔ وہ بھاگا ہوا گھر آیا۔ اور فوراً یہ رقعہ لکھا۔

جانِ من کیا کہوں۔ کس مصیبت میں گرفتار ہوں۔ اگر ایک گھنٹہ کے اندر تیس سو روپے کا انتظام نہ ہوسکا۔ تو ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پڑجائیں گی۔ میں نے بہت ہاتھ پیر مارے کہ کسی سے قرض لے لوں گا۔ مگر کوئی صورت نہ نکلی۔ اگر تم اپنے دو ایک زیور دے دو تو میں گرو رکھ کر کام نکال لوں۔ جیوں ہی روپے ہاتھ آجائیں گے چھڑا دوں گا۔ اگر مجبوری نہ آپڑتی۔ تو تمھیں تکلیف نہ دیتا۔ ایشور کے لیے ناراض نہ ہونا۔ میں نے تم سے اب تک راز کو چھپایا۔ اس کا مجھے افسوس ہے!

ابھی یہ خط پورا نہ ہوا تھا کہ رمیش بابو مسکراتے ہوئے آکر بیٹھ گئے اور بولے۔ کہا ان سے تم نے؟

رما نے سر کھجلا کر کہا۔ ابھی تو موقعہ نہیں ملا۔

رمیش۔ تو کیا دو چار دن میں موقعہ ملے گا؟ میں ڈرتا ہوں کہ آج بھی کہیں خالی ہاتھ نہ چلے جاؤ۔ نہیں تو غضب ہی ہوجائے۔

رما۔ جب ایک بات دل میں طے کرلی۔ تو اب کیا فکر؟

رمیش۔ آج موقعہ ملے تو ذرا رتن کے پاس چلے جانا۔ اس دن میں نے کتنا زور دے کر کہا تھا۔ لیکن شاید تم بھول گئے۔

رما۔ بھول تو نہیں گیا۔ ان سے کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔

رمیش۔ واہ رے آپ کی شرم۔ ذلیل تو وہ مجھے سمجھیں گی۔ تمھیں کاہے کو شرم۔ آج دفتر سے لوٹ کر ضرور چلے جانا۔ ذرا زبان ہلا دینے سے کسی غریب کا کام نکلتا ہو تو

ہمیں دریغ نہ کرنا چاہیے۔

رمیش بابو چلے گئے تو رما نے رقعہ اُٹھا کر جیب میں ڈالا اور اندر داخل ہوا۔ جالپا آج کسی سہیلی کے گھر جانے کو تیار تھی۔ تھوڑی دیر ہوئی بلاوا آیا تھا۔ اپنی بہترین ساڑھی پہنے تھی۔ ہاتھوں میں جڑاؤ کنگن زیب دے رہے تھے۔ گہنے میں چندن ہار کھلا ہوا تھا۔ آئینہ سامنے رکھے۔ کانوں میں جُھومک پہن رہی تھی۔ کچھ روکھے پن سے بولی۔ آج سویرے کہاں چلے گئے تھے۔ ہاتھ منہ تک نہ دھویا۔ دن بھر تو باہر رہتے ہی ہو۔ شام سویرے تو گھر پر رہا کرو۔ تم نہیں رہتے۔ تو گھر سُونا سُونا لگتا ہے۔ میں ابھی سوچ رہی تھی۔ مجھے میکے جانا پڑے تو میں جاؤں یا نہ جاؤں۔ میرا جی تو وہاں بالکل نہ لگے۔

رما۔ تم تو کہیں جانے کو تیار بیٹھی ہو؟

جالپا۔ سیٹھانی جی نے بلا بھیجا ہے۔ دوپہر تک چلی آؤں گی۔

اس وقت رما کی حالت اس شکاری کی سی تھی۔ جو ہرنی کو اپنے بچوں کے ساتھ کلیلیں کرتے دیکھ کر تنی ہوئی بندوق اپنے کندھوں پر رکھ لیتا ہے اور یہ مادرانہ محبت کا نظارہ دیکھنے میں محو ہوجاتا۔

اسے اپنی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھ کر جالپا نے کہا۔ دیکھو مجھے نظر نہ لگا دینا۔ میں تمھاری آنکھوں سے بہت ڈرتی ہوں۔

رما ایک ہی پرواز میں موجودات کی دنیا سے شعر اور تخیل کی دنیا میں جا پہنچا۔ ایسے موقعہ پر جب جالپا کا دل خوشی سے ناچ رہا تھا۔ پیادہ اپنا خط دے کر اس کی مسرت ناک سرگرمیوں کو خاک میں ملائے گا۔ وہ کون سا بے رحم صیاد ہے جو چہکتی ہوئی چڑیا کی گردن پر چھری چلاوے گا۔ وہ کون سا مردہ دل آدمی ہے جو کسی گل نورس کو توڑ کر پیروں میں کچل دے گا۔ رما اتنا بے رحم اور مردہ دل نہیں ہے۔ وہ کتنی ہی بڑی مصیبت میں کیوں نہ گرفتار ہوجائے۔ اس کی کتنی ہی رسوائی ہو۔ اس کی زندگی ہی کیوں نہ تباہ ہوجائے۔ مگر وہ اتنا بے حس نہیں ہوسکتا۔ اس نے مدہوش ہوکر کہا۔ نظر تو نہ لگاؤں گا۔ ہاں سینہ سے لگا لوں گا۔ اسی ایک جملہ میں اس کی ساری پریشانیاں اور ساری مشکلیں نظر ہوگئیں۔ وہ اس نادان بچے کی طرح تھا۔ جو پھوڑے پر نشتر کی عارضی تکلیف کو نہ برداشت کرکے اس کے پھوٹنے ناصور پڑنے مہینوں چارپائی پر پڑے رہنے کی تکلیف منظور کرلیتا ہے۔

جالپا نیچے جانے لگی۔ تو رما نے فرطِ محبت سے اسے گلے لگا لیا اور اس طرح بھینچ بھینچ کر پیار کرنے لگا۔ گویا محبت کے خزانہ کو آج ہی لٹا دے گا۔ کون جانتا ہے یہی اس کی آخری ملاقات ہے۔

دفعتاً جالپا بولی۔ مجھے کچھ روپے تو دے دو۔ شاید وہیں ضرورت پڑے۔

رما نے چونک کر کہا۔ روپے۔ روپے تو اس وقت نہیں ہیں۔

جالپا۔ نہیں ہیں۔ مجھ سے بہانہ کر رہے ہو۔ بس مجھے دو سو روپے دے دو۔ زیادہ نہیں چاہتی!

یہ کہہ کر اس نے رما کی جیب میں ہاتھ ڈال دیا۔ اور کچھ پیسوں کے ساتھ رقعہ بھی نکال لیا۔

رما نے ہاتھ بڑھا کر رقعہ کو جالپا کے ہاتھ سے چھیننے کی کوشش کر کے کہا۔ کاغذ مجھے دے دو سرکاری کاغذ ہے۔

جالپا۔ کس کا خط ہے بتا دو!

پھر اس نے تہ کیے ہوئے پرزے کو کھول کر کہا۔ یہ سرکاری کاغذ ہے۔ جھوٹے کہیں کے۔ تمھارا ہی لکھا ....

رما۔ دے دو!

رما نے پھر کاغذ چھین لینا چاہا۔ مگر جالپا نے ہاتھ پیچھے پھیر کر کہا۔ میں بغیر پڑھے نہ دوں گی۔ زیادہ ضد کروگے تو پھاڑ ڈالوں گی۔

رما۔ اچھا پھاڑ ڈالو!

جالپا۔ تب تو میں ضرور پڑھوں گی۔

اس نے دو قدم پیچھے ہٹ کر پھر پرزہ کو کھولا۔ اور پڑھنے لگی۔

رما نے دوبارہ اس کے ہاتھ سے رقعہ چھیننے کی کوشش نہیں کی۔ اُسے ایسا معلوم ہوا۔ گویا آسمان پھٹ پڑا ہے۔ گویا کوئی خوفناک جانور اسے نگلنے چلا آرہا ہے۔ وہ دھم دھم کرتے ہوئے اوپر سے اُترا اور باہر چلا گیا۔ کہاں اپنا منہ چھپائے۔ کہاں روپوش ہوجائے کہ کوئی اسے دیکھ نہ سکے۔ اس کی حالت کسی برہنہ تن آدمی کی سی تھی۔ افسوس سارا پردہ کھل گیا۔ اس کی ساری دروغ بافیوں کا پردہ فاش ہوگیا۔ جن باتوں کو جالپا سے اس نے اتنے

دن چھپانے کی کوشش کی۔ ایسی ایسی مصیبتیں جھیلیں وہ آج اس کے منہ پر سیاہ داغ بن کر اس کی تشہیر کر رہی تھیں۔ وہ اب یہاں رہ کر اپنی ذلت اپنی آنکھوں نہیں دیکھ سکتا۔ جالپا کی سسکیاں، منشی جی کی جھڑکیاں، ہمساؤں کی چٹکیاں۔ سننے سے مر جانا کہیں آسان تر تھا۔ جب وہ اس دُنیا میں نہ رہے گا تو اسے اس کی کیا پرواہ ہوگی کہ کوئی اسے کیا کہہ رہا ہے۔ ہائے! محض تین سو روپوں کے لیے اس کا ستیاناس ہوا جا رہا ہے!

جالپا اسے کتنا بدنیت۔ کتنا مکار۔ کتنا فتنہ ساز سمجھ رہی ہوگی۔ کیا وہ اسے اپنا منہ دکھا سکتا ہے؟ کیا دنیا میں کوئی ایسی جگہ نہیں ہے جہاں وہ ایک نئی زندگی کا نقشہ ڈالے۔ جہاں وہ دنیا سے الگ تھلگ سب سے منہ موڑ کر اپنی زندگی کے دن کاٹ سکے جہاں وہ اس طرح چھپ جائے کہ پولیس اس کا پتہ نہ پاسکے۔ گنگا کی گود کے سوا ایسی جگہ اور کہاں ہے۔ اگر زندہ رہا تو مہینہ دو مہینہ میں ضرور ہی پکڑ لیا جائے گا۔ اس وقت اس کی کیا حالت ہوگی۔ وہ ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہنتے ہوئے عدالت میں کھڑا ہوگا۔ سپاہیوں کی ایک فوج اسے گھیرے کھڑی ہوگی۔ سارے شہر کے آدمی اس کا تماشہ دیکھ رہے ہوں گے۔ انھیں میں جالپا بھی ہوگی۔ رتن بھی ہوگی۔ اس کے ماں باپ۔ عزیز و اقارب۔ دوست آشنا سبھی مختلف انداز سے اس کی ذلت کا تماشہ دیکھیں گے۔ نہیں وہ اپنی مٹی یوں خراب نہ کرے گا۔ ہرگز نہیں۔ اس سے کہیں بہتر ہے کہ وہ ڈوب مرے۔ مگر پھر خیال آیا کہ جالپا کا کیا حشر ہوگا۔ ماں باپ تو رودھو کر صبر کرلیں گے۔ مگر اس کا دستگیر کون ہوگا کیا وہ چھپ کر کہیں نہیں رہ سکتا۔ کیا شہر سے دُور کسی چھوٹے گاؤں میں وہ روپوش نہیں ہوسکتا۔ ممکن ہے کبھی جالپا کو اس پر رحم آجائے۔ اس کی خطائیں معاف کردے۔ کیا عجب ہے کبھی اس کے دن پھریں۔ لیکن یہ غیر ممکن ہے کہ وہ اس کے سامنے آنکھیں سیدھی کرسکے نہ جانے اس وقت جالپا کیا حالت ہوگی۔ شاید اس رقعہ کا مطلب سمجھ گئی ہو۔ شاید صورت کا اس نے صحیح اندازہ کرلیا ہو۔ شاید اس نے جاگیشری کو وہ رقعہ دکھایا ہو اور دنوں گھبرائی ہوئی اُسے تلاش کر رہی ہوں۔ شاید منشی جی کو بلانے کے لیے لڑکوں کو بھیجا گیا ہو۔ چاروں طرف اس کی تلاش ہو رہی ہوگی۔ اسے اندیشہ ہوا کہ کہیں کوئی ادھر بھی نہ آتا ہو۔ شاید موت کو بھی سامنے دیکھ کر وہ اتنا بدحواس نہ ہوتا جتنا کسی صورت آشنا کو دیکھ کر۔ آگے پیچھے چوکنی نگاہوں سے تاکتا ہوا وہ اس جلتی دھوپ میں چلا جا رہا تھا۔ کچھ خبر نہیں کہاں۔ دفعتاً

ریل کی سیٹی سن کر وہ چونک پڑا۔ ارے میں اتنی دور نکل آیا۔ ریل گاڑی سامنے کھڑی تھی۔ گاڑی نے گویا زبردستی اسے اپنی طرف کھینچ لیا جیسے اس میں بیٹھتے ہی اس کی ساری پریشانیوں کا خاتمہ ہوجائے گا۔ مگر جیب میں روپے نہ تھے۔ صرف انگلی میں ایک انگوٹھی پڑی ہوئی تھی۔ اس نے قلی کو بلا کر کہا۔ کیوں بھائی یہ انگوٹھی بیچ کر لاسکتے ہو؟ ایک روپیہ تمھیں دوں گا۔ مجھے گاڑی میں جانا ہے۔ گھر سے روپے لے کر چلا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہیں گر گئے۔ روپے لینے کے لیے گھر جاؤں تو گاڑی نہ ملے گی اور بہت بڑا نقصان ہوجائے گا۔

قلی نے اُسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ سمجھ گیا کوئی مفرور ملزم ہے۔ انگوٹھی لی اور اسٹیشن کے اندر چلا گیا۔ رما ٹکٹ گھر کے سامنے ٹہلنے لگا۔ آنکھیں اس کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ مگر دس منٹ گزر گئے۔ قلی کا کہیں پتہ نہیں۔ کہاں چلا گیا کم بخت! انگوٹھی لے کر غائب تو نہ ہوجائے گا۔ اسٹیشن کے اندر جاکر اُسے تلاش کرنے لگا۔ گھبراہٹ میں قلی کا نمبر تک نہ دیکھا تھا۔ ادھر گاڑی چھوٹی جا رہی تھی۔ رما سے صبر نہ ہوسکا۔ سمجھ گیا قلی نے چرکا دیا۔ بغیر ٹکٹ لیے ہوئے گاڑی میں جا بیٹھا۔ دل میں طے کرلیا صاف کہہ دوں گا۔ میرے پاس ٹکٹ نہیں ہے۔ اگر اُترنا بھی پڑا تو یہاں سے دس پانچ کوس تو چلا ہی جاؤں گا۔

جب گاڑی روانہ ہوگئی۔ تو رما کو اپنی خستہ حالی پر رونا آگیا۔ نہ جانے اُسے کبھی لوٹنا نصیب بھی ہوگا یا نہیں۔ یہ رنگ رلیوں کے دن گئے۔ ہمیشہ کے لیے اسی طرح دنیا سے منہ چھپائے گوشہ گمنامی میں چھپا ہوا وہ ایک دن مر جائے گا۔ کوئی اس کی میت پر آنسو بہانے والا بھی نہ ہوگا۔ گھر والے بھی رودھو کر خاموش ہوجائیں گے اور اس کی یہ حالت کیوں ہوئی؟ محض اپنی حماقت سے اس نے شروع ہی سے جالپا کو اپنا محرمِ راز بنا لیا ہوتا۔ تو آج اُسے منہ میں کالکھ لگا کر کیوں بھاگنا پڑتا۔

ابھی گاڑی کو چلے دس منٹ بھی نہ گزرے ہوں گے کہ گاڑی کا دروازہ کھلا۔ اور ٹکٹ بابو اندر آیا۔ رما کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ ایک لمحہ میں یہ مردود اس کے پاس آجائے گا۔ اتنے آدمیوں کے سامنے اسے کتنی ندامت ہوگی۔ اس کا کلیجہ دھک دھک کرنے لگا۔ جیوں جیوں ٹکٹ بابو اس کے قریب آتا تھا۔ اس کے نفس کی حرکت تیز ہوتی جاتی تھی۔ آخر بلا سر پر آہی گئی۔ ٹکٹ بابو نے پوچھا۔ آپ کا ٹکٹ؟

رما نے مصنوعی اطمینان سے کہا۔ میرا ٹک تو قلی کے پاس ہی رہ گیا۔ اس کو ٹکٹ لانے کے لیے روپیہ دیا تھا۔ نہ جانے کدھر نکل بھاگا۔

ٹکٹ بابو کو یقین نہ آیا۔ بولا۔ میں کچھ نہیں جانتا۔ آپ کو اگلے اسٹیشن پر اُترنا ہوگا۔ آپ کہاں جا رہے ہیں؟

رما۔ سفر تو بڑی دُور کا ہے۔ کلکتہ تک جانا ہے۔

ٹکٹ بابو۔ اگلے اسٹیشن پر ٹکٹ لے لیجیے گا!

رما۔ یہی تو مشکل ہے۔ میرے پاس ۲۵ روپے کا نوٹ تھا۔ کھڑکی پر بھیڑ تھی۔ میں نے نوٹ ایک قلی کو ٹکٹ لانے کے لیے دے دیا۔ مگر وہ ایسا غائب ہوا کہ لوٹا ہی نہیں۔ شاید آپ اُسے پہچانتے ہوں۔ لمبا لمبا چیچک رو آدمی ہے۔

ٹکٹ بابو۔ اس کے متعلق آپ خط و کتابت کرسکتے ہیں۔ مگر بلا ٹکٹ سفر نہیں کرسکتے۔

رما نے انکسار کے ساتھ کہا۔ بھائی صاحب آپ سے کیا چھپاؤں۔! میرے پاس اور روپے نہیں ہیں۔

ٹکٹ بابو۔ مجھ افسوس ہے بابو صاحب قاعدہ سے مجبور ہیں۔

کمرے کے سارے مسافر آپس میں کانا پھوسی کرنے لگے۔ تیسرے درجے میں زیادہ تر مزدور بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ ایک بابو طبقے کے مخلوق کو ذلیل ہوتے دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔ شاید ٹکٹ بابو رما کو دھکے دے کر نیچے گرا دیتا۔ تو وہ اور خوش ہوتے۔ رما کو کبھی اپنی زندگی میں اتنی ندامت نہ ہوئی تھی۔ چپ چاپ سر جھکائے کھڑا تھا۔ ابھی زندگی کے اس نئے سفر کا آغاز ہوا ہے۔ کون جانے آگے کیا کیا مصیبتیں جھیلنی پڑیں گی۔ کس کس کے ہاتھوں دھوکا کھانا پڑے گا۔ اس کے جی میں آئی۔ گاڑی سے کود پڑوں۔ اس چھیچھا لیدر سے تو مرجانا کہیں اچھا تھا۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ کھڑکی سے باہر سر نکال کر رونے لگا۔

دفعتاً ایک بوڑھے آدمی نے جو اس کے پاس ہی بیٹھا ہوا تھا۔ پُوچھا۔ کلکتہ میں کہاں جاؤگے بابو جی!

رما نے سمجھا یہ گنوار مجھے بنا رہا ہے۔ جھنجھلا کر بولا۔ تم سے مطلب، میں کہاں جاؤں گا بوڑھے نے اس کی بدمزاجی پر کچھ دھیان نہ دیا۔ بولا۔ میں بھی وہیں چلوں گا بابو جی ہمارا

تمھارا ساتھ ہو جائے گا۔ پھر آہستہ سے بولا۔ کرائے کے روپے مجھ سے لے لو۔ پھر وہاں دے دینا۔

اب رما کو اس پر کچھ اعتبار آیا۔ اس کی طرف غور سے دیکھا۔ کوئی ساٹھ ستر سال کا بوڑھا گھلا ہوا آدمی تھا۔ گوشت تو کیا ہڈیاں تک گل گئی تھیں۔ مونچھ اور سر کے بال منڈے ہوئے تھے۔ ایک چھوٹی سے بُغچی کے سوا اس کے پاس اور کوئی اثاثہ بھی نہ تھا۔

رما کو اپنی طرف تاکتے ہوئے دیکھ کر بولا۔ آپ ہوڑے ہی اُتریں گے یا کہیں اور جائیں گے؟

رما نے احسان مندانہ نظروں سے دیکھ کر کہا۔ بابا! میں اگلے اسٹیشن پر اُتر جاؤں گا روپے کا کوئی انتظام کر کے پھر آؤں گا۔

بوڑھا۔ تمھیں کتنے روپے چاہئیں۔ مجھ سے لو۔ میں بھی تو وہیں چل رہا ہوں۔ جب چاہے دے دینا۔ کیا میرے دس پانچ روپے لے کر بھاگ جاؤگے۔ گھر کہاں ہے؟

رما۔ میں الہٰ آباد میں رہتا ہوں۔

بوڑھے نے عقیدت کے جوش سے کہا۔ پراگ راج کی کیا بات ہے۔ میں بھی تربینی کا اشنان کر کے آرہا ہوں۔ سچ مچ دیوتاؤں کی پُوری ہے۔ تو کتنے روپے نکالوں؟

رما نے شرماتے ہوئے کہا۔ میں چلتے ہی چلتے روپے نہ دے سکوں گا۔ یہ سمجھ لو۔

بوڑھا مسکرا کر بولا۔ بھیا میرے دس پانچ روپے لے کر تم بھاگ تھوڑے جاؤگے؟ میں نے تو دیکھا پراگ کے پنڈے جاتریوں کو بنا لکھا پڑھی کے روپے دے دیتے ہیں دس روپے میں تمھارا کام چل جائے گا۔

رما نے سر جھکا کر کہا۔ ہاں اتنے کافی ہیں۔

ٹکٹ بابو کو کرایہ دے کر رما سوچنے لگا۔ یہ بوڑھا کتنا صاف دل۔ کتنا بے لوث کتنا نیک نیت واقع ہوا ہے۔ جو لوگ مہذب کہلاتے ہیں ان میں کتنے آدمی ایسے نکلیں گے جو اتنی فراخ دلی سے کسی مسافر کو مدد کر سکیں!

دورانِ گفتگو میں رما کو معلوم ہوا کہ بوڑھا ذات کا کھٹک ہے۔ کلکتہ میں اس کی سبزی کی دکان ہے۔ اس کا وطن تو بہار ہے۔ مگر چالیس سال سے کلکتے ہی میں دکان کر رہا ہے۔ دیبی دین نام ہے۔ اس وقت بدری ناتھ کی یاترا کر کے لوٹا جا رہا ہے۔

رما نے تعجب سے پوچھا۔ تم بدری ناتھ کی یاترا کر آئے۔ وہاں تو پہاڑوں کی بڑی چڑھائیاں ہیں۔

دیبی۔ بھگوان کی مرضی ہوتی ہے تو سب کچھ ہوجاتا ہے بابو جی۔ ان کی نگاہ چاہیے۔

رما۔ تمھارے بال بچے تو کلکتہ ہی میں ہوں گے۔

دیبی دین نے دردناک تبسم سے کہا۔ بال بچے تو سب بھگوان کے گھر چل دیے۔ چار بیٹے تھے۔ دو لڑکوں کا تو بیاہ ہوچکا تھا۔ سب چل دیے۔ میں بیٹھا ہوا ہوں۔ اتنے بوئے بیج کو کسان ہی تو کاٹتا ہے۔

یہ کہہ کر وہ پھر ہنسا اور بولا۔ بڑھیا ابھی جیتی ہے۔ دیکھیں ہم دونوں میں پہلے کون چلتا ہے۔ وہ کہتی ہے پہلے میں جاؤں گی۔ میں کہتا ہوں پہلے میں جاؤں گا۔ دیکھیں دونوں میں کس کی ٹیک رہتی ہے۔ تم کبھی آنا تو دکھاؤں گا۔ اب بھی اسے گہنوں کا شوق ہے سونے کی بالیاں اور سونے کی ہنسلی پہنے دکان پر بیٹھی رہتی ہے۔ جب کہا تیرتھ کر آویں تو بولی۔ تمھارے تیرتھ کے لیے کیا اپنی دکان مٹی میں ملادوں۔ آدمی کی ہوس ایسی ہوتی ہے۔ ”آج مرے کل دوسرا دن۔“ مگر دکان نہ چھوڑے گی۔ نہ کوئی آگے نہ کوئی پیچھے۔ نہ کوئی رونے والا نہ کوئی ہنسنے والا۔ مگر ہوس نہیں جاتی۔ اب بھی کوئی نہ کوئی گہنا بنواتی رہتی ہے۔ نہ جانے کب اس کا پیٹ بھرے گا۔ گھر گھر یہی حال ہے۔ جہاں دیکھو ہائے گہنے! ہائے گہنے! گہنے کے پیچھے جان دے دیں۔ گھر کے آدمیوں کو بھوکے ماریں۔ گھر کی چیزوں کے کوڑے کردیں اور کہاں تک کہوں۔ اپنی آبرو تک بیچ دیں۔ چھوٹے بڑے امیر و غریب سب کو یہی روگ لگا ہوا ہے۔ کلکتہ میں کہاں کام کرتے ہو بھیا۔

رما۔ ابھی تو جارہا ہوں قسمت آزمانے۔ دیکھوں کوئی نوکری چاکری ملتی ہے یا نہیں!

دیبی۔ تو پھر میرے ہی یہاں ٹھیرنا۔ نیچے دو کوٹھریاں ہیں اور ایک دالان۔ اوپر ایک کوٹھری اور چھت ہے آج بیچ دوں تو دس ہزار ملیں۔ اوپر والی کوٹھری تمھیں دے دوں گا۔ جب کہیں کام مل جائے اپنا گھر لے لینا۔ پچاس سال ہوئے گھر سے بھاگ کر ہوڑے گیا تھا۔ دانے دانے کو محتاج تھا۔ تب سے سکھ بھی دیکھے دُکھ بھی دیکھے۔ اب تو یہی کہتا ہوں۔ بھگوان لے چلو۔ ہاں بڑھیا جیتی رہے۔ نہیں اس کی دُکان کون لے گا۔ گھر کون لے گا اور گہنے کون لے گا۔

یہ کہہ کر دینی دین پھر ہنسا۔ وہ اتنا زندہ دل اتنا خوش مزاج تھا کہ رما کو تعجب ہو رہا تھا۔ بے بات کی بات پر ہنستا تھا۔ جس بات پر اور لوگ روتے ہیں اس پر اُسے ہنسی آتی تھی۔ اتنی ہی دیر میں اس نے اپنی زندگی کی ساری داستان کہہ سنائی۔ کتنے ہی لطیفے یاد تھے۔ بات بات پر لطیفہ کہتا تھا۔ گویا رما سے برسوں کی ملاقات ہے۔ رما کو بھی اپنے متعلق ایک فرضی قصہ کہنا پڑا۔

دینی دین۔ تو یہ کہو تم بھی گھر سے بھاگ کر آئے ہو۔ سمجھ گیا۔ گھر میں جھگڑا ہوا ہوگا۔ بہو کہتی ہوگی۔ میرے پاس گہنے نہیں۔ میرے نصیب جل گئے۔ ساس بہو میں ٹھنی رہتی ہوگی۔ تم نہ اِدھر سے بول سکتے ہوگے نہ اُدھر سے۔ جب نہ برداشت ہوئی بھاگ کھڑے ہوئے۔

رما۔ ہاں بابا! بالکل یہی کیفیت ہے۔ مگر تم نے کیسے تاڑا؟

دینی دین ہنس کر بولا۔ یہ بھی ایک علم ہے بھائی۔ بڑی محنت سے آتا ہے۔ ابھی لڑکے بالے تو نہ ہوں گے؟

رما۔ نہیں ابھی تو نہیں ہیں۔

دینی۔ چھوٹے بھائی ہوں گے۔

رما حیرت میں آکر بولا۔ ہاں دادا ٹھیک کہتے ہو۔ تم نے کیسے جانا؟

دینی دین پھر قہقہہ مار کر بولا۔ یہ سب منتروں کا کھیل ہے۔ سسرال مالدار ہے۔ کیوں؟

رما۔ ہاں ہے تو۔

دینی۔ مگر ہمت نہ ہوگی۔

رما۔ بہت ٹھیک کہتے ہو دادا۔ جب سے شادی ہوئی اپنی لڑکی کو تو بلایا نہیں!

دینی۔ سمجھ گیا بھیا۔ یہی دنیا کا دستور ہے۔ بیٹے کے لیے کہو چوری کریں۔ بھیک مانگیں۔ بیٹی کے نام گھر میں کچھ ہے ہی نہیں۔

تین دن سے رما کو نیند نہ آئی تھی۔ دن بھر روپوں کی فکر میں مارا مارا پھرتا۔ رات بھر تارے گِنا کرتا۔ اس وقت باتیں سنتے سنتے اسے نیند آگئی۔ گردن جھپکی لینے لگا۔ دینی دین نے فوراً اپنی بقچی کھولی۔ اس میں ایک دری نکالی اور تختہ پر بچھاکر بولا۔ اس پر

لیٹ رہو بھیا! میں تمھاری جگہ بیٹھا جاتا ہوں۔

رما لیٹ رہا۔ دیبی دین بار بار محبت آمیز نگاہوں سے دیکھتا تھا گویا اس کا اپنا لڑکا کہیں پردیس سے لوٹا ہو۔

(۲۲)

جب رما ناتھ اوپر سے نیچے اتر رہا تھا۔ اس وقت جالپا کو اس کا ذرا بھی اندیشہ نہ تھا کہ وہ گھر سے بھاگا جا رہا ہے۔ اس نے وہ رقعہ پڑھ لیا تھا۔ اسے ایسا اشتعال ہو رہا تھا کہ جاکر رما کو خوب کھری کھری سنائے۔ مجھ سے یہ دغا۔ مگر ایک ہی لمحہ میں اس کا غصہ فرو ہوگیا۔ خیال آیا۔ کہیں ایسا تو نہیں ہوا ہے کہ سرکاری روپے خرچ کر ڈالے ہوں۔ ضرور یہی بات ہے۔ رتن کے روپے صراف کو دے دیے ہوں گے۔ اس دن رتن کو دکھلانے کے لیے شاید وہ سرکاری روپے اُٹھا لائے تھے۔ اسی کو پورا کرنے کے لیے روپوں کی ضرورت ہوگی یہ سوچ کر اُسے رما پر غصہ آیا۔ یہ مجھ سے کیوں اتنا پردہ کرتے ہیں۔ کیوں مجھ سے بڑھ بڑھ کر باتیں جڑتے تھے۔ کیا میں اتنا بھی نہیں جانتی کہ دُنیا میں امیر و غریب دونوں ہی ہوتے ہیں۔ کیا سبھی عورتیں زیوروں سے لدی ہوئی ہوتی ہیں۔ جب اور ضروری کاموں سے روپے بچتے۔ تب زیور بھی بن جاتے ہیں۔ پیٹ اور تن کاٹ کر چوری یا بے ایمانی کرکے تو زیور نہیں بنوائے جاتے۔ کیا انھوں نے مجھے اتنی خودغرض سمجھ لیا ہے!

اس نے سوچا۔ رما اپنے کمرے میں ہوں گے۔ چل کر پوچھوں کون کون سے زیور چاہتے ہیں۔ صورت حال کتنی خطرناک ہے۔ اس کا خیال کرکے اس کے دل پر غصّے کے بجائے خوف طاری ہوگیا۔ وہ بڑی تیزی سے نیچے اُتری۔ اُسے یقین تھا کہ رما نیچے بیٹھے ہوئے اس کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ مگر کمرے میں آئی تو ان کا پتہ نہ تھا۔ سائیکل رکھی ہوئی تھی۔ فوراً دروازہ سے جھانکا۔ سڑک پر بھی نہیں۔ کہاں چلے گئے۔ دونوں لڑکے اسکول گئے تھے۔ کس کو بھیجے کہ جاکر انھیں بُلا لاوے۔ اس کے دل پر موہوم دہشت کا غلبہ ہوا۔ فوراً اوپر گئی۔ گلے کا ہار اور ہاتھ کے کنگن رومال میں باندھے۔ پھر نیچے اتری۔ سڑک پر آکر ایک تانگا لیا اور کوچوان سے بولی۔ چنگی کچہری چلو۔ اسے افسوس ہو رہا تھا کہ اتنی دیر پس و پیش میں کیوں پڑی رہی کیوں نہ فوراً زیور اُتار کر انھیں دے دیئے۔

راستہ میں وہ دونوں طرف غور سے دیکھتی جاتی تھی۔ کیا اتنی جلدی دُور نکل آئے۔

شاید دیر ہوجانے کے باعث وہ بھی آج تانگے پر ہی گئے ہیں۔ نہیں تو اب تک ضرور مل گئے ہوتے تانگے والے سے بولی۔ کیوں جی تم نے ابھی کسی بابو جی کو تانگے پر جاتے دیکھا ہے۔ تانگے والے نے کہا۔ ہاں بہو جی ابھی ادھر سے تو گئے ہیں۔

جالپا کو کچھ تسکین ہوئی۔ رما کے پہنچتے پہنچتے وہ بھی پہنچ جائے گی۔ کوچوان سے بار بار گھوڑا بڑھانے کو کہتی تھی۔ جب وہ دفتر پہنچی۔ تو گیارہ بج گئے تھے۔ سینکڑوں آدمی ادھر اُدھر دوڑتے نظر آتے تھے۔ کس سے پوچھے۔ کس کے پاس جائے۔ وہ نہ جانے کہاں بیٹھتے ہیں؟

دفتر کا چپراسی دکھائی دیا۔ جالپا نے اس بلا کر کہا۔ سنو جی۔ ذرا رما ناتھ کو تو بلاؤ!

چپراسی بولا۔ انھیں کو تو بلانے جا رہا ہوں۔ بڑے بابو نے بھیجا ہے۔ آپ کیا ان کے گھر ہی سے آ رہی ہیں؟

جالپا۔ ہاں میں تو گھر ہی سے آ رہی ہوں۔ ابھی دس منٹ ہوئے وہ گھر سے چلے گئے ہیں۔

چپراسی۔ یہاں تو نہیں آئے۔

جالپا کو بڑی تشویش ہوئی۔ وہ یہاں بھی نہیں آئے۔ راستہ میں بھی نہیں ملے۔ تو پھر گئے کہاں۔ کسی سانحہ کے خیال سے اس کا سینہ دھک دھک کرنے لگا۔ آنکھیں بھر بھر آنے لگیں۔ وہاں بڑے بابو کے سوا اور کسی کو نہ جانتی تھی۔ ان سے ہمکلام ہونے کا اسے بھی کبھی سابقہ نہ پڑا تھا۔ مگر اس وقت اس کا حجاب رخصت ہوگیا۔ خوف دل کے سارے جذبات پر حاوی ہوجاتا ہے۔

چپراسی سے بولی۔ ذرا بڑے بابو سے کہہ دو .... نہیں چلو میں ہی چلتی ہوں۔

جالپا کی وضع قطع دیکھ کر چپڑاسی رعب میں آگیا۔ اُلٹے پاؤں بڑے بابو کے کمرے کی طرف چلا۔ جالپا اس کے پیچھے پیچھے ہو لی۔ بڑے بابو خبر پاتے ہی باہر نکل آئے۔

جالپا نے بڑے بابو کو سلام کرکے کہا۔ معاف کیجیے گا۔ بابو جی آپ کو تکلیف ہوئی انھیں گھر سے چلے ہوئے پندرہ بیس منٹ ہوئے۔ مگر ابھی یہاں تک نہیں پہنچے۔ آپ سے کچھ کہا تو نہیں؟

رمیش۔ آپ مسز رما ناتھ ہیں؟ مجھ سے تو کچھ نہیں کہا۔ وہ تو وقت کے بڑے پابند ہیں تعجب ہے۔ کہاں رہ گئے۔

جالپا نے چپراسی کی طرف تاکتے ہوئے کہا۔ میں آپ سے کچھ عرض کرنا چاہتی ہوں۔

رمیش۔ ہاں ہاں! میرے کمرے میں آجاؤ۔ کہیں بیٹھے شطرنج کھیل رہے ہوں گے۔

جالپا۔ نہیں بابو جی! مجھے اندیشہ ہی کہ وہ کہیں اور نہ چلے گئے ہوں۔ ابھی آدھ گھنٹہ ہوا۔ انھوں نے میرے نام ایک پرزہ لکھا تھا (جیب سے پرزہ نکال کر) دیکھیے۔ وہ پرزہ موجود ہے۔ آپ ان پر شفقت کی نگاہ رکھتے ہیں۔ آپ سے کیا پردہ۔ ان کے ذمہ کوئی سرکاری رقم تو نہیں آتی؟

رمیش نے متعجب ہوکر کہا۔ کیوں انھوں نے تم سے کچھ ذکر نہیں کیا؟

جالپا۔ بالکل نہیں!

رمیش۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ آج انھیں تین سو روپے جمع کرنے ہیں۔ پرسوں کی آمدنی انھوں نے جمع نہیں کی تھی۔ روپے تھیلی میں رکھے اور نوٹ جیب میں رکھ کر گھر چلے گئے۔ بازار میں کسی نے جیب سے نوٹ نکال لیے (مسکرا کر) چال چلن کے بارے میں تو مجھے کبھی شک کرنے کا موقع نہیں ملا۔ مگر جوانی کے جنون میں اگر طبیعت بہک گئی ہو تو میں نہیں کہہ سکتا۔

جالپا کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ بولی۔ آپ بزرگ ہیں۔ آپ سے کیا عرض کروں مگر جیب سے نوٹوں کا نکل جانا تو کوئی ایسی غیر معمولی بات نہیں۔ ایسے واقعہ آئے دن ہوتے رہتے ہیں کسی نے نکال لیے ہوں گے۔ مارے شرم کے انھوں نے مجھ سے کہا نہ ہوگا۔ ذرا سا بھی اشارہ کرتے تو فوراً روپے نکال کر دے دیتی۔ اس میں بات ہی کیا تھی۔

رمیش۔ کیا گھر میں روپے ہیں۔

جالپا نے بے باکانہ انداز سے کہا۔ تین سو چاہیے نہ۔ میں ابھی لیے آتی ہوں۔

رمیش۔ اگر وہ گھر پر آگئے ہوں تو بھیج دینا۔

جالپا آکر تانگے پر بیٹھی اور کوچوان سے چوک چلنے کو کہا۔ اس نے اپنا ہار بیچ ڈالنے کا فیصلہ کرلیا۔ یوں اس کی کئی سہیلیاں تھیں۔ جن سے اس کو روپے مل سکتے تھے۔ عورتوں میں باہم بڑا خلوص ہوتا ہے۔ مردوں کی طرح ان کی دوستی محض پان پتوں ہی تک ختم نہیں ہوجاتی۔ مگر اس وقت موقع نہ تھا۔ صرافہ میں پہنچ کر وہ سوچنے لگی۔ کس دکان پر

جاؤں۔ خوف ہو رہا تھا۔ ٹھگی نہ جاؤں اس سرے سے اس سرے تک ایک چکر لگا آئی۔ کسی دکان پر جانے کی ہمت نہ پڑی۔ ادھر وقت بھی گزرا جاتا تھا۔ آخر ایک دکان پر ایک بوڑھے صراف کو دیکھ کر اس کا حجاب کچھ کم ہوا۔ صراف بڑا گھاگ تھا۔ جالپا کو جھجھکتے اور ہچکتے دیکھ کر سمجھ گیا۔ اچھا شکار پھنسا۔

جالپا نے ہار دکھا کر کہا۔ میں اسے بیچنا چاہتی ہوں۔

صراف نے ہار کو ہاتھ میں لے کر غور سے دیکھا اور بولا۔ مال تو چوکھا نہیں ہے۔ آپ نے کہاں بنوایا تھا؟

جالپا۔ اس سے تمھیں کیا مطلب؟ تمھیں لینا ہو تو بتلاؤ۔ کیا دوگے؟

صراف نے ساڑھے تین سو دام لگائے اور بڑھتے بڑھتے چار سو تک پہنچا۔ چھ سو کی چیز چار سو میں دیتے قلق تو ہو رہا تھا۔ لیکن مجبوری تھی۔ مارے لالچ کے ہار کو بڑی احتیاط سے پہنا تھا۔ مفت میں دو سو کا نقصان ہو رہا تھا۔ مگر کوئی علاج نہ تھا۔ روپے لیے اور چل کھڑی ہوئی۔ جس ہار کو اس نے اتنے ارمانوں سے خریدا تھا اُسے آج آدھے داموں بیچ کر اُسے ذرا بھی رنج نہ ہوا۔ بلکہ ایک غرور آمیز مسرت ہو رہی تھی۔ جس وقت رما کو معلوم ہوگا کہ اس نے روپے ادا کردیے ہیں۔ انھیں کتنی خوشی ہوگی۔ کہیں دفتر پہنچ گئے ہوں۔ وہ روپے لیے پہنچے تو بڑا لطف آئے۔

رمیش بابو اسے دیکھ کر بولے۔ کیا ہوا۔ گھر پر ملے۔

جالپا۔ کیا ابھی تک یہاں نہیں آئے۔ گھر پر تو نہیں ملے۔ یہ کہہ کر اس نے نوٹوں کا پلندہ رمیش بابو کی طرف بڑھا دیا۔ بڑے بابو نے نوٹوں کو گن کر کہا۔ ٹھیک ہیں۔ مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ اب تک ہیں کہاں۔ اگر نہ آنا تھا تو کم سے کم ایک خط تو لکھ دیتے۔ مجھے تو بڑا تردّد ہو رہا تھا۔ تم بڑے موقعہ سے آگئیں۔ اس وقت تمھاری دُور اندیشی اور ذہانت دیکھ کر جی خوش ہوگیا۔ شریف عورتوں کا یہی وطیرہ ہے۔

جالپا جب گھر چلی تو اسے ایسا معلوم ہورہا تھا کہ وہ قد میں کچھ اونچی ہوگئی ہے اس کے جسم میں خون کی حرکت زیادہ تیز ہوگئی تھی۔ اسے یقین تھا۔ رما اگر مکان پر متفکر بیٹھے ہوں گے۔ وہ جاکر پہلے انھیں خوب آڑے ہاتھوں لے گی۔ اور خوب شرمندہ کرنے کے بعد یہ خبر سنائے گی۔ لیکن جب گھر پہنچی تو رما ناتھ کا کہیں نشان نہ تھا۔

جاگیشوری نے پُوچھا۔ کہاں چلی گئی تھیں دھوپ میں بہو؟

جالپا۔ ایک کام سے چلی گئی تھی۔ آج انھوں نے کھانا بھی نہیں کھایا۔ نہ جانے کہاں چلے گئے تھے۔

جاگیشوری۔ دفتر گئے ہوں گے۔

جالپا۔ نہیں دفتر نہیں گئے۔ وہاں سے ایک چپڑاسی پوچھنے آیا تھا۔

یہ کہتی ہوئی وہ اوپر چلی گئی۔ بچے ہوئے روپے صندوق میں رکھے اور پنکھا جھلنے لگی۔ مگر گرمی سے جسم پھنکا جا رہا تھا۔ اس کے کان دروازہ کی طرف لگے ہوئے تھے۔ ابھی تک اسے اس کا ذرا بھی اندیشہ نہ تھا کہ رما نے پردیس کی راہ لی ہے۔ چار بجے تک تو جالپا کو بہت زیادہ تردد نہ ہوا۔ لیکن جیوں جیوں دن ڈھلنے لگا۔ اس کا انتشار بڑھنے لگا۔ آخر وہ سب سے اُونچی چھت پر چڑھ گئی۔ حالانکہ وہ چھت مخدوش ہونے کے باعث کوئی اوپر نہیں جاتا تھا اور وہاں سے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ لیکن رما کسی طرف سے آتا نہ دکھائی دیا۔

جب شام ہوگئی اور رما گھر نہ آیا۔ تو جالپا کی طبیعت گھبرانے لگی۔ آخر کہاں چلے گئے اگر کسی دوست کے گھر ہوتے تو کیا اب تک نہ لوٹتے۔ معلوم نہیں جیب میں کچھ ہے یا نہیں بے چارے دن بھر سے نہ جانے کہاں کہاں ٹھیک رہے ہوں گے۔ وہ پھر پچھتانے لگی۔ ان کا خط پڑھتے ہی اُس نے کیوں نہ ہار نکال کر دے دیا۔ کیوں پس و پیش میں پڑ گئی۔ وہ بے چارے مارے شرم کے گھر نہ آتے ہوں گے۔

چراغ جل گئے تو اس سے ضبط نہ ہوسکا۔ سوچا شاید رتن سے کچھ پتہ چلے۔ لیکن اس کے بنگلہ پر گئی تو معلوم ہوا۔ آج تو وہ ادھر آئے ہی نہیں۔

تب جالپا نے ان سبھی میدانوں اور پارکوں کو چھان ڈالا۔ جہاں رما کے ساتھ وہ اکثر گھومنے جایا کرتی تھی۔ اور نو بجتے بجتے مایوس گھر واپس آئی۔ اب تک اس نے اپنے آنسوؤں کو روکا تھا۔ شاید کچھ امید تھی کہ گھر پر آگئے ہوں۔ لیکن جب گھر میں قدم رکھتے ہی اُسے معلوم ہوگیا کہ وہ اب تک نہیں آئے تو اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ یہ شبہ اب مضبوط ہوگیا کہ وہ کہیں چلے گئے۔ ایک موہوم سی اُمید تھی کہ شاید میرے پیچھے آئے ہوں اور پھر چلے گئے ہوں۔ جاکر جاگیشوری سے پوچھا۔ کیا وہ آئے ہی نہیں یا آکر کہیں چلے گئے۔

جاگیشوری۔ آئے ہی نہیں۔ یار دوستوں میں بیٹھے غپ شپ کر رہے ہوں گے۔ گھر تو سرائے ہے۔ دس بجے گھر سے نکلے تھے۔ ابھی تک پتہ نہیں۔

جالپا۔ وہ دفتر سے گھر آکر تب کہیں جاتے تھے۔ آج تو آئے ہی نہیں۔ دفتر بھی نہیں گئے۔ کہیے تو گوپی بابو کو بھیج دوں۔ جاکر دیکھیں کہاں رہ گئے۔

جاگیشوری۔ لڑکے اس وقت کہاں جائیں گے۔ ان کا کیا ٹھیک ہے کہیں شطرنج ہو رہی ہو گی۔ تھوڑی دیر اور دیکھ لو۔ پھر کھانا اُٹھا کر رکھ دینا۔ کوئی کہاں تک انتظار کرے۔

جالپا نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ دفتر کی کوئی بات اس سے نہ کہی۔ جاگیشوری سُن کر گھبرا جاتی۔ اور اسی وقت رونا پیٹنا شروع کردیتی۔ وہ اوپر جاکر لیٹ گئی اور پھوٹ پھوٹ رونے لگی۔ رہ رہ کر ایسی بے قرار ہوجاتی تھی کہ اس کا سانس تیز چلنے لگتا تھا۔ بار بار خیال آتا۔ اگر رات بھر نہ آئے تو کیا کرنا ہوگا۔ جب تک کچھ پتہ نہ چلے کہ وہ کدھر گئے۔ تب تک کوئی جائے تو کہاں جائے۔ آج اس کے ضمیر نے پہلی بار تسلیم کیا کہ یہ سب اس کی کرنی کا پھل ہے۔ مانا کہ اس نے زیوروں کے لیے کبھی ضد نہیں کی۔ لیکن اس نے کبھی صاف طور سے منع بھی تو نہیں کیا۔ اگر چوری ہوجانے کے بعد اس نے کہرام نہ مچایا ہوتا تو آج یہ نوبت کیوں آتی۔ مایوسی کی حالت میں جالپا اپنے ہی کو مطعون کرنے لگی۔ وہ جانتی تھی رما رشوت لیتا ہے۔ اس کا خرچ آمدنی سے زیادہ ہے۔ پھر بھی اس نے کبھی منع نہیں کیا۔ اس نے خود کیوں اپنی کملی کے باہر پاؤں پھیلایا۔ کیوں اسے روز سیر و تفریح کی سوجھتی تھی۔ جب رما اسے تحفہ لالا کر دیتا ہے۔ تو کیوں پھولی نہ سماتی تھی۔ اس ذمہ داری کو بھی جالپا اس وقت اپنے اوپر ہی لے رہی تھی۔ کیوں اسے یہ سمجھ نہ آئی کہ آمدنی سے زیادہ خرچ کرنے کی سزا ایک دن بھوگنی پڑے گی۔ اب اسے ایسی کتنی ہی باتیں یاد آرہی تھیں جن سے رما کی پریشانی اور بے اطمینانی کا اظہار ہوتا تھا۔ مگر اس نے کبھی ان معاملات کی طرف دھیان نہ دیا۔

جالپا انھیں افسوسناک خیالات میں ڈوبی نہ جانے کب تک بیٹھی رہی۔ جب چوکیداروں کی سیٹیوں کی آواز اس کے کانوں میں آئی۔ تو وہ نیچے جاکر جاگیشوری سے بولی۔ وہ اب تک نہیں آئے۔ آپ چل کر کھانا کھا لیجیے۔

جاگیشوری بیٹھے بیٹھے جھپکیاں لے رہی تھی۔ چونک کر بولی۔ کہاں چلے گئے تھے۔

جالپا۔ وہ تو اب تک نہیں آئے۔

جاگیشوری۔ اب تک نہیں آئے۔ آدھی رات تو ہوگئی ہوگی۔ جاتے وقت تم سے کچھ کہا بھی نہیں!

جالپا۔ کچھ بھی نہیں۔

جاگیشوری۔ تم نے تو کچھ نہیں کہا۔

جالپا۔ میں بھلا کیا کہتی؟

جاگیشوری۔ تو میں تمھارے دادا جی کو جاکر جگاؤں۔

جالپا۔ اس وقت جگا کر کیا کیجیے گا۔ آپ چل کر کچھ کھا لیجیے۔

جاگیشوری۔ مجھ سے اب کچھ نہ کھایا جائے گا۔ ایسا من موجی لڑکا ہے کہ کچھ کہا نہ سُنا نہ جانے کہاں بیٹھ رہا۔ کم سے کم کہلا تو دیتا کہ میں اس وقت نہ آؤں گا۔

جاگیشوری پھر لیٹ رہی۔ مگر جالپا اسی طرح بیٹھی رہی۔ یہاں تک کہ ساری رات گزر گئی۔ پہاڑ سی رات کا ایک ایک پل ایک ایک برس کی طرح کٹ رہا تھا۔

(۲۳)

ایک ہفتہ گزر گیا۔ رما کا کہیں پتہ نہ تھا۔ کوئی کچھ کہتا ہے کوئی کچھ۔ بے چارے رمیش بابو دن میں کئی کئی بار آکر پوچھ جاتے۔ طرح طرح کی قیاس آرائیاں ہو رہی ہیں۔ صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ رما ناتھ گیارہ بجے اسٹیشن کی طرف گئے تھے۔ منشی دیا ناتھ کا خیال ہے۔ اگرچہ وہ اسے برملا ظاہر نہیں کرتے کہ رما نے خودکشی کرلی۔ ایسی حالتوں میں یہی ہوا کرتا ہے۔ اس کی مثالیں انھوں نے خود آنکھوں دیکھی ہیں۔ ساس اور سُسر دونوں ہی جالپا پر سارا الزام تھوپ رہے ہیں۔ صاف صاف کہہ رہے ہیں کہ یہی اس کی جان کی گاہک ہوئی۔ اس نے ان کا ناک میں دم کر دیا۔ پوچھو تھوڑی سی تو آپ کی آمدنی۔ پھر تمھیں روز سیر سپاٹے، دعوت تماشے کی کیوں سوجھتی تھی۔ جالپا پر کسی کو رحم نہیں آتا۔ کوئی اس کے آنسو نہیں پونچھتا۔ صرف رمیش بابو اس کی دُور اندیشی اور مستعدی کی تعریف کرتے ہیں۔ لیکن منشی دیا ناتھ کی آنکھوں میں ان فعلوں کی کوئی وقعت نہیں۔ آگ لگا کر پانی کے لیے دوڑنے سے کوئی بری الذمہ نہیں ہوجاتا۔

ایک دن دیا ناتھ کتب خانے سے لوٹے تو منہ لٹکا ہوا تھا۔ ایک تو ان کی صورت یونہی محرمی تھی۔ اس پر منہ لٹکا لیتے تھے۔ تو کوئی بچہّ بھی کہہ سکتا تھا کہ ان کا مزاج برہم ہے جاگیشوری نے پوچھا۔ کیا ہے۔ کیا کسی سے بحث ہوگئی کیا؟

دیا ناتھ۔ نہیں جی ان تقاضوں کے مارے حیران ہوگیا۔ جدھر جاؤ۔ ادھر نوچنے دوڑتے ہیں۔ نہ جانے کتنا قرض لے رکھا ہے۔ آج تو میں نے صاف کہہ دیا۔ میں کچھ نہیں جانتا میں کسی کا دیندار نہیں۔ جاکر میم صاحب سے مانگو!

اسی وقت جالپا آپڑی یہ الفاظ اس کے کانوں میں پڑگئے۔ ان سات دنوں میں اس کی صورت ایسی بدل گئی تھی کہ پہچاننا مشکل تھا۔ روتے روتے آنکھیں سوجھ آئی تھیں۔ منشی جی کے یہ بے رحمانہ الفاظ سن کر جیسے زخم پر نمک پڑگیا۔ بولی۔ ہاں آپ انھیں سیدھے میرے پاس بھیج دیجیے۔ میں یا تو انھیں سمجھا دوں گی یا ان کے دام چکا دوں گی۔

دیا ناتھ نے برہم ہوکر کہا۔ کیا دے دوگی تم۔ سات سو تو ایک ہی صراف کے ہیں۔ ابھی کئے پیسے دیئے ہیں تم نے۔

جالپا۔ اس کے گہنے موجود ہیں۔ مشکل سے دو چار بار پہنے گئے ہوں گے۔ وہ آئے تو میرے پاس بھیج دیجیے۔ میں اس کی چیزیں واپس کردوں گی۔ بہت ہوگا دو چار روپے تاوان کے لے لے گا۔

یہ کہتی ہوئی وہ اُوپر جا رہی تھی کہ رتن آگئی۔ اور گلے سے لگاتی ہوئی بولی۔ کیا اب تک کوئی خبر نہیں ملی۔

جالپا پر ان الفاظ میں ہمدردی اور محبت کا تسلی بخش اثر ہوا۔ یہ غیر ہوکر اتنی دلگیر ہے اور یہاں اپنے ہی ساس اور سسُر ہاتھ دھوکر پیچھے پڑے ہیں۔ ان اپنوں سے تو غیر ہی اچھے۔ آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔ ابھی تو کچھ خبر نہیں بہن!

رتن۔ یہ بات کیا ہوئی۔ تم سے کچھ تکرار تو نہیں ہوگئی؟

جالپا۔ ذرا بھی نہیں۔ قسم کھاتی ہوں۔ انھوں نے نوٹوں کے چوری ہونے کا مجھ سے ذکر ہی نہیں کیا۔ اگر اشارہ کردیتے۔ تو میں روپے دے دیتی۔ جب وہ دوپہر تک نہیں آئے اور میں ان کی تلاش میں دفتر گئی۔ تب یہ حقیقت کھلی۔ میں نے اسی وقت روپے جمع کردیے۔

رتن۔ میں تو سمجھتی ہوں کہ کسی سے آنکھیں لڑ گئیں۔ دس پانچ دن میں آپ ہی پتہ لگ جائے گا۔ بات سچ نہ نکلے تو جرمانہ دوں۔

جالپا نے ہک بکا کر پوچھا۔ کیا تم نے کچھ سنا ہے؟

رتن۔ نہیں سنا تو نہیں۔ لیکن میرا قیاس ہے!

جالپا۔ تو تمھارا قیاس بالکل غلط ہے۔ مجھے اس پر رتی بھر بھی اعتبار نہیں۔ ان میں اور چاہے جتنی برائیاں ہوں۔ یہ عیب نہیں۔

رتن نے ہنس کر کہا۔ اس فن میں یہ لوگ بڑے اُستاد ہوتے ہیں۔ تم بے چاری کیا جانو۔

جالپا۔ اگر وہ اس فن میں استاد ہوتے ہیں تو ہم بھی مزاج شناسی کے فن میں کچھ دخل رکھتے ہیں۔ میں اسے نہیں مان سکتی۔

رتن۔ اچھا چلو کہیں گھومنے چلتی ہو؟

جالپا۔ نہیں اس وقت تو مجھے فرصت نہیں ہے۔ پھر گھر والے یونہی درپے ہو رہے ہیں۔ تب تو زندہ ہی نہیں چھوڑیں گے۔ کدھر جانے کا ارادہ ہے؟

رتن۔ کہیں نہیں۔ ذرا بازار تک جانے کا ارادہ ہے!

جالپا۔ کیا لینا ہے؟

رتن۔ جوہریوں کو دکان پر دو ایک چیز دیکھوں گی۔ بس میں تمھارے جیسا کنگن چاہتی ہوں۔ بابو جی نے بھی کئی مہینے کے بعد روپے لوٹا دیے۔ اب خود تلاش کروں گی۔

جالپا۔ میرے کنگن میں ایسے کون سے روپ لگے ہیں۔ بازار میں اس سے بہت اچھے مل سکتے ہیں!

رتن۔ میں تو اسی نمونے کے چاہتی ہوں۔

جالپا۔ اس نمونے کا تو بنا بنایا بہت مشکل سے ملے گا۔ اور بنوانے میں مہینوں کا جھنجھٹ اگر صبر نہ آتا ہو۔ تو میرا ہی کنگن لے لو۔ میں پھر بنوا لوں گی۔

رتن نے اُچھل کر کہا۔ واہ تم اپنا کنگن دے دو۔ تو کیا کہنا ہے۔ مسولوں ڈھول بجاؤں چھ سو کا تھا نہ؟

جالپا۔ ہاں تھا تو چھ سو کا۔ مگر مہینوں صراف کی دکان کی خاک چاننی پڑی تھی۔ جڑائی تو خود

بیٹھ کر کروائی تھی۔ تمھاری خاطر دے دوں گی۔

جالپا نے کنگن نکال کر رتن کے ہاتھ میں پہنا دیے۔ رتن کا چہرہ ایسا شگفتہ ہوگیا۔ گویا کسی کنگلے کو پارس مل گیا ہو۔ احسان مندانہ انداز سے بولی۔ تم جتنا کہو۔ اتنا دے دوں۔ تمھیں دبانا نہیں چاہتی۔ تمھارے لیے یہی کیا کم ہے کہ تم نے میری اتنی خاطر کر رہی ہو۔ مگر ایک بات ہے۔ ابھی میں سب روپے نہ دے سکوں گی۔ اگر دو سو روپے پھر دے دوں تو کچھ ہرج ہے؟

جالپا نے فراخ دلی سے کہا۔ کچھ بھی ہرج نہیں۔ کچھ بھی مت دو!

رتن۔ نہیں اس وقت میرے پاس چار سو روپے ہیں۔ یہ میں دیئے جاتی ہوں۔ میرے پاس رہیں گے تو کسی دوسرے کام میں خرچ ہوجائیں گے۔ میرے ہاتھ میں تو روپے ٹکتے ہی نہیں۔ کیا کروں۔ جب تک خرچ نہ ہوجائیں۔ میرے سر پر ایک بوجھ سوار رہتا ہے۔

جالپا کا دل اس وقت مسوس اُٹھا۔ اس کی کلائی پر یہ کنگن دیکھ کر رما ناتھ کیسے خوش ہوتے تھے۔ آج وہ ہوتے تو کیا یہ چیز اس طرح جالپا کے ہاتھ سے نکل جاتی۔ پھر کون جانے کنگن پہننا اُسے نصیب بھی ہوگا یا نہیں۔ اس نے بہت ضبط کیا مگر آنسو نکل ہی آئے رتن اس کے آنسو دیکھ کر بولی۔ اس وقت رکھ لو بہن! پھر لے لوں گی۔ جلدی ہی کیا ہے؟

جالپا نے کنگن کی ڈبیاں اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ کیوں کیا میرے آنسو دیکھ کر تمھاری خاطر سے دے رہی ہوں۔ نہیں تو یہ چیز جان سے زیادہ مجھے عزیز تھی۔ تمھارے ہاتھ میں دیکھ کر مجھے اتنی ہی خوشی ہوگی جتنی اپنے ہاتھوں میں دیکھ کر۔ ہاں اتنی مہربانی کرنا کہ کسی دوسرے کو مت دے دینا۔

رتن۔ کسی دوسرے کو کیوں دینے لگی۔ میں اسے تمھاری نشانی سمجھوں گی۔ آج بہت دنوں کے بعد میری دلی تمنا پوری ہوئی۔ رنج اتنا ہی ہے کہ بابو جی اس وقت نہیں ہیں۔ میرا دل تو کہتا ہے۔ وہ جلدی آجائیں گے۔ مارے شرم کے کہیں چلے گئے ہیں اور کوئی بات نہیں۔ وکیل صاحب کو بھی بڑا رنج ہوا۔ لوگ کہتے ہیں وکیل بڑے کٹھ کلیجے ہوتے ہیں۔ مگر ان کو تو یہ حالت ہے کہ کوئی دردناک بات سنی اور تڑپ اُٹھے۔

جالپا نے مسکرا کر کہا۔ ایک بات پُوچھوں۔ بُرا تو نہ مانو گی۔ وکیل صاحب سے تمھارا دل تو نہ ملتا ہوگا۔

رتن کا شگفتہ بشاش چہرہ ذرا دیر کے لیے تاریک ہوگیا۔ گویا کسی نے ایک ایسے دوست کی یاد دلا دی ہو۔ جس کے نام کو وہ بہت پہلے رو چکی تھی۔ بولی۔ بہن! مجھے تو کبھی خیال بھی نہیں آیا کہ میں جوان ہوں اور یہ بوڑھے۔ میرے دل میں جتنی محبت۔ جتنا ایثار ہے وہ سب میں نے ان کے اوپر قربان کردیا۔ محبت جوانی یا دولت یا شکل صورت سے نہیں پیدا ہوتی۔ محبت محبت سے پیدا ہوتی ہے۔ میرے ہی لیے وہ اس عمر میں اتنی محنت کرتے ہیں اور دوسرا ہے ہی کون۔ کیا جھوٹی بات ہے۔ کل کہیں گھومنے چلو گی۔ کہو تو شام کو آؤں!

جالپا۔ جاؤں گی تو میں کہیں نہیں۔ مگر تم آنا ضرور۔ دو گھڑی دل بہلے گا۔ کچھ اچھا نہیں لگتا۔ بُرے بُرے خیال آتے رہتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا۔ انھیں مجھ سے اتنا حجاب کیوں تھا۔ شاید یہ بھی میری خطا ہے۔ مجھ میں ضرور انھوں نے کوئی ایسی بُرائی دیکھی ہوگی جس کے باعث وہ مجھ پر اعتبار نہ کرسکتے تھے۔ مجھے اگر رنج ہے تو یہی کہ وہ مجھے غیر سمجھتے رہے جس سے ہمیں محبت ہوتی ہے اس سے پردہ نہیں رکھتے!

رتن اُٹھ کر چلی۔ تو جالپا نے دیکھا۔ کنگن کا بکس میز پر پڑا ہے۔ بولی اسے لیتے جاؤ بہن کیوں چھوڑے جاتی ہو۔

رتن۔ لے جاؤں گی۔ ابھی کیا جلدی پڑی ہے۔ ابھی پورے روپے تو نہیں دیئے۔

جالپا۔ نہیں نہیں لیتی جاؤ۔ میں نہ مانوں گی۔

مگر رتن سیڑھی سے نیچے اُتر گئی۔ جالپا ہاتھ میں کنگن لیے کھڑی رہ گئی۔

تھوڑی دیر بعد جالپا نے صندوق سے پانچ سو روپے نکالے، اور دیا ناتھ کے پاس جاکر بولی۔ یہ روپے چرنداس کے پاس بھجوا دیجیے۔ باقی روپے بھی دوچار دن میں دے دوں گی۔

دیا ناتھ نے خفیف ہوکر کہا۔ روپے کہاں سے مل گئے؟

جالپا بے باکانہ لہجے میں بولی۔ رتن کے ہاتھ اپنا کنگن بیچ دیا۔

دیا ناتھ اس کا منہ تاکنے لگے۔

(۲۴)

ایک مہینہ گزر گیا۔ الہٰ آباد کے سب سے کثیر الاشاعت روزانہ اخبار میں ایک نوٹس نکل رہا ہے۔ جس میں رما ناتھ کو واپس آنے کی تحریک کی گئی ہے اور اس کا سُراغ لگانے والے کو پانچ سو روپے انعام دینے کا وعدہ کیا گیا ہے۔ مگر ابھی کہیں سے کوئی خبر نہیں آئی۔ جالپا فکر اور غم سے گھلتی جاتی ہے۔ اس کی حالت دیکھ کر دیا ناتھ کو بھی اس پر رحم آنے لگا ہے۔ آخر انھوں نے ایک دن اپنے سمدھی دین دیال کو لکھا۔ آپ آکر کچھ دنوں کے لیے بہو کو رخصت کرا لے جائیے۔ دین دیال خط پاتے ہی گھبرائے ہوئے آئے۔ مگر جالپا نے میکے جانے سے انکار کردیا۔

دین دیال نے کچھ ترش رو ہوکر کہا۔ کیا یہاں پڑے پڑے جان دے دینے کا ارادہ کر لیا ہے۔

جالپا نے خوددارانہ انداز سے کہا۔ اگر جان کو اس طرح جانا ہے تو کون روک سکتا ہے۔ لیکن میں ابھی مرنے کی نہیں۔ بچ جایئے۔ غم نصیبوں کو موت بھی نہیں پوچھتی!

دین دیال۔ آخر چلنے میں ہرج ہی کیا ہے۔ شہزادی اور بسنتی۔دونوں آئی ہوئی ہیں۔ ان کے ساتھ ہنسنے بولنے سے جی بہلتا رہے گا۔

جالپا۔ یہاں اماں جی اور لالہ کو چھوڑ کر جانے کو جی نہیں چاہتا۔ جب رونا ہی لکھا ہے تو روؤں گی۔

دین دیال۔ یہ بات کیا ہوگئی۔ سنتے ہیں کچھ قرض ہوگیا تھا۔ کوئی کہتا ہے سرکاری رقم کھا گئے تھے۔

جالپا۔ جس نے آپ سے یہ کہا۔ اس نے سراسر جھوٹ کہا۔

دین دیال۔ تو پھر چلے کیوں گئے؟

جالپا۔ یہ میں بالکل نہیں جانتی۔ مجھے خود تعجب ہوتا ہے۔

دین دیال۔ منشی دیا ناتھ سے تو کھٹ پٹ نہیں ہوگئی۔

جالپا۔ لالہ جی کے سامنے تو وہ سر تک نہیں اُٹھاتے تھے۔ پان تک نہیں کھاتے تھے۔ کھٹ پٹ کیا ہوگی۔ انھیں گھومنے کا شوق تھا۔ سوچا ہوگا۔ یوں تو کوئی جانے نہ دے گا۔

چلو بھاگ چلیں۔

دین دیال۔ شاید ایسا ہی ہو۔ کچھ لوگوں کو دیش بدیش پھرنے ہی کی سنک ہوتی ہے تمھیں یہاں جو تکلیف ہو۔ صاف صاف کہہ دو۔ خرچ کے لیے کچھ بھیج دیا کروں۔

جالپا نے تمکنت سے کہا۔ مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے۔ دادا جی آپ کی دعا سے کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔

دیا ناتھ اور جاگیشوری نے جالپا کو سمجھایا۔ مگر وہ جانے پر راضی نہ ہوئی۔ تب دیا ناتھ جھنجھلا کر بولے۔ یہاں دن بھر پڑے پڑے رونے سے تو اچھا ہے۔

جالپا۔ کیا وہ کوئی دوسری دنیا ہے۔ یا وہاں جاکر میں کچھ اور ہوجاؤں گی۔ جب ہنسنا تھا۔ تب ہنستی تھی۔ جب رونا ہے تو روؤں گی۔ رما کالے کوسوں چلے گئے ہوں لیکن مجھے ہر دم بیٹھے دکھائی دیتے ہیں۔ یہاں ان کا جسم نہیں ہے۔ لیکن گھر کی ایک ایک چیز میں وہ بسے ہوئے ہیں۔ وہاں یہ تسکین بھی نہ رہے گی۔

دین دیال سمجھ گئے۔ یہ غرور کی پتلی اپنی ضد نہ چھوڑے گی۔ اُٹھ کر باہر چلے آئے شام کو چلتے وقت انھوں نے پچاس روپے کا ایک نوٹ جالپا کی طرف بڑھا کر کہا۔ اسے رکھ لو۔ شاید کوئی ضرورت پڑے۔

جالپا نے سر ہلا کر کہا۔ مجھے اس کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔ دادا ہاں آپ کی دعا چاہتی ہوں۔ ممکن ہے آپ کی دعا سے میری مراد برآئے۔

دین دیال کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ نوٹ چارپائی پر رکھ کر باہر چلے آئے۔

کنوار کا مہینہ شروع ہوگیا تھا۔ ابر کے خشک ٹکڑے کبھی کبھی آسمان پر دوڑتے نظر آجاتے تھے۔ جالپا چھت پر لیٹی ہوئی ان آسمانی وجودوں کی خوش فعلیاں دیکھا کرتی تھی۔ وہ طرح طرح کے رنگ بدلتے۔ بھانت بھانت کے روپ بھرتے کبھی محبت سے باہم بغلگیر ہوجاتے۔ کبھی روٹھ کر منہ پھیر لیتے۔ ان بادلوں کے ٹکڑوں میں بھی اسے رما ناتھ ہی کی تصویر پھرتی نظر آتی۔

مصیبت میں ہماری نگاہیں خود شناسی کی جانب مائل ہوجاتی ہیں۔ جالپا کو اب بھی گمان ہوتا تھا کہ ایشور نے اسے اُس کی خطاؤں کی سزا دی ہے۔ آخر رما ناتھ دوسرے کا گلا دبا کر ہی تو روپے لاتے تھے۔ وہ روپے دیکھ کر وہ کتنی خوش ہوتی تھی۔ انھیں روپوں سے تو

ہمیشہ آرائش و نمائش کی چیزیں آتی رہتی تھیں۔ ان چیزوں کو دیکھ کر اب اس کا جی جلتا تھا۔ انھیں کے لیے تو رما ناتھ کو گھر سے بھاگنا پڑا۔ یہ چیزیں اب اس کی آنکھوں میں کانٹوں کی طرح چبھتی تھیں۔

آخر اس نے ایک دن ان سب چیزوں کو جمع کیا۔ مخملی سلیپر۔ ریشمی موزے۔ طرح طرح کی بیلیں فیتے۔ پن۔ کنگھیاں۔ آئینہ۔ کوئی کہاں تک گنائے اچھا خاصہ ایک انبار ہوگیا۔ اس نے ان چیزوں کو گنگا میں ڈبو دینے کا ارادہ کیا۔ اب سے اس کی زندگی کا ایک نیا باب شروع ہوگا۔ انھیں تکلفات کے پیچھے آج اس کی یہ درگت ہو رہی ہے۔ آج وہ اس طلسم کو توڑ ڈالے گی۔ ان میں کتنی ہی چیزیں تو اتنی خوبصورت تھیں کہ ان کو پھینکتے ہوئے قلق ہوتا تھا۔ آدھی رات تک وہ ان چیزوں کو اُٹھا اُٹھا کر رکھتی تھی۔ گویا کسی سفر کی تیاری کر رہی ہے۔ ہاں یہ فی الواقعہ سفر ہی تھا۔ نمائش سے حقیقت کا۔ باطل سے حق کا دل میں سوچ رہی تھی۔ اب اگر ایشور کے فضل و کرم سے وہ پھر لوٹ کر گھر آئے تو وہ نہایت سادہ، بے تکلف زندگی بسر کرے گی۔ حرام کی ایک کوڑی بھی گھر نہ آنے دے گی۔

جیوں ہی رات کے چار بجے سڑک پر لوگوں کے آنے جانے کی آہٹ ملنے لگی۔ جالپا نے بقچہ اُٹھایا اور اشنان کرنے چلی۔ بقچہ بہت وزنی تھا۔ اسے ہاتھ میں لٹکا کر دس قدم چلنا بھی مشکل ہوگیا۔ بار بار ہاتھ بدلتی تھی۔ یہ خوف ہو رہا تھا۔ کوئی اسے دیکھ نہ لے بوجھ لے کر چلنے کی اسے کبھی نوبت نہ آئی تھی۔ آخر جب ہاتھ شل ہوگئے تو اپنے بقچے کو پیٹھ پر رکھ لیا اور قدم بڑھا کر چلنے لگی۔ لمبا گھونگٹ نکال لیا تھا کہ کوئی پہچان نہ سکے۔

وہ گھاٹ کے قریب پہنچی تو روشنی پھیلی چکی تھی۔ یکایک اس نے رتن کو اپنی موٹر پر آتے دیکھا۔ اس نے چاہا کہ سر جھکا کر کترا کر نکل جائے۔ لیکن رتن نے دُور ہی سے پہچان لیا اور موٹر روک کر بولی۔ کہاں جارہی ہو بہن۔ یہ پیٹھ پر بقچہ کیسا ہے؟

جالپا نے بے نقاب ہوکر کہا۔ ذرا گنگا اشنان کرنے جارہی ہوں۔

رتن۔ میں تو اشنان کرکے لوٹ آئی۔ لیکن چلو تمھارے ساتھ چلتی ہوں۔ تمھیں گھر پہنچا دوں گی۔ لاؤ یہ بقچہ رکھ دو۔

جالپا۔ یہ کچھ بھاری نہیں ہے۔ تم جاؤ تمھیں دیر ہوگی۔ میں چلی جاؤں گی۔

مگر رتن نے نہ مانا۔ کار سے اُتر کر اس کے ہاتھ سے بقچی لے ہی لی اور گاڑی میں

رکھتی ہوئی بولی۔ یہ تو بڑا بھاری ہے۔ کیا بھرا ہے تم نے اس میں؟ کھول کر دیکھوں؟
جالپا۔ اس میں تمھارے دیکھنے کے لائق کوئی چیز نہیں ہے۔

رتن نے بقچی کو کھول کر دیکھا تو حیرت میں آکر بولی۔ ان چیزوں کو کہاں لیے جاتی ہو؟

جالپا نے کار میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ انھیں گنگا میں ڈباؤں گی۔

رتن نے اور بھی متعجب ہوکر کہا۔ گنگا میں! کچھ پاگل تو نہیں ہوگئی ہو۔ چلو گھر چلیں ان چیزوں کو رکھ پھر لوٹ آنا۔

جالپا نے قطعی طور پر کہا۔ نہیں رتن میں ان چیزوں کو ڈبا کر ہی جاؤں گی۔

رتن۔ آخر کیوں؟

جالپا۔ پہلے کار کو بڑھاؤ۔ پھر بتاؤں!

رتن۔ نہیں پہلے بتا دو۔

جالپا۔ نہیں یہ غیر ممکن ہے۔ پہلے کار کو بڑھاؤ۔

رتن نے مجبور ہوکر کار بڑھائی اور بولی۔ اچھا اب تو بتاؤ۔

جالپا نے شکوہ آمیز لہجہ میں کہا۔ اتنی بات تو تمھیں پہلے ہی سمجھ لینی چاہیے تھی۔ اب یہ چیزیں میرے کس کام کی ہیں۔ انھیں دیکھ کر خواہ مخواہ جلن ہوتی ہے۔ جب دیکھنے والا ہی نہ رہا تو انھیں رکھ کر کیا کروں گی۔

رتن نے ایک لمبی سانس کھینچی اور بولی۔ تم بابو جی کے ساتھ بڑی بے انصافی کر رہی ہو بہن! ان چیزوں کو وہ کتنی اُمنگوں سے لائے ہوں گے۔ تمھارے جسم پر ان کی زیبائش دیکھ کر وہ کتنے خوش ہوں گے۔ ایک ایک چیز ان کی محبت کی یادگار ہے۔ انھیں گنگا میں مت ڈبونا۔

جالپا اب فکر میں ڈوب گئی۔ دل میں پس و پیش ہونے لگا۔ مگر ایک لمحہ میں اس نے فیصلہ کرلی۔ بولی۔ جب تک یہ چیزیں میری آنکھوں سے دُور نہ ہوجائیں گی۔ میری طبیعت کو سکون نہ ہوگا۔ انھیں تکلفات نے میری یہ درگت کی ہے۔ یہ محبت کی نشانیاں نہیں۔ میری مصیبت کی گٹھڑی ہے۔ محبت کا نقش تو میرے دل پر ہے۔
رتن۔ تمھارا دل بڑا سخت ہے جالپا! میں تو شاید ایسا نہ کرسکتی۔

جالپا۔ ایشور نہ کرے کہ تمھیں ایسا موقعہ آئے۔ سچ پوچھو تو انھوں نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔ جو آدمی اپنی بیوی سے پردہ رکھتا ہے۔ میں سمجھتی ہوں وہ اس سے محبت نہیں کرتا۔ میں بابو جی کی جگہ ہوتی۔ تو یوں ناتا توڑ کر کبھی نہ بھاگتی۔ اپنے دل کا سارا درد دُکھ سناتی۔ اور جو کچھ کرتی۔ ان کے مشورے سے کرتی۔ عورت اور مرد میں پردہ کیسا؟

رتن نے مسکرا کر کہا۔ ایسے مرد تو بہت کم ہوں گے جو عورت سے اپنا دل کھولتے ہوں جب تم خود دل میں چور رکھتی ہو۔ تو ان سے کیوں اُمید رکھتی ہو کہ وہ تم سے پردہ رکھیں تم ایمان سے کہہ سکتی ہو کہ تم نے ان سے کوئی بات نہیں چھپائی۔

جالپا نے جھجکتے ہوئے کہا۔ میں نے تو اپنے دل میں کبھی چور نہیں رکھا۔

رتن نے زور دے کر کہا۔ جھوٹ بولتی ہو۔ بالکل جھوٹ۔ اگر تم نے ان پر اعتبار کیا ہوتا۔ تو وہ بھی ضرور کھلتے۔

جالپا اس الزام کو اپنے سر سے نہ ٹال سکی۔ اسے آج معلوم ہوا کہ پردہ داری کا آغاز پہلے اسی کی جانب سے ہوا تھا۔

گنگا کا کنارا آپہنچا۔ موٹرکار رُک گئی۔ جالپا اُتری اور بُقچی کو اُٹھانے لگی۔ مگر رتن نے اس کا ہاتھ ہٹا کر کہا۔ نہیں میں اسے نہ لے جانے دوں گی۔ سمجھ لو ڈوب گئے۔ مجھ پر اتنا رحم کرو۔ بہن سمجھ کر۔

جالپا۔ بہن کے ناتے تمھارے پیر دھوسکتی ہوں۔ مگر ان کانٹوں کو دل میں نہیں رکھ سکتی۔

رتن نے بھویں سکوڑ کر کہا۔ کسی طرح نہ مانوگی۔

جالپا۔ نہ۔

رتن نے بے اعتنائی سے منہ پھیر لیا۔ جالپا نے بُقچی اُٹھائی اور تیزی سے نیچے اُتر کر اسے پانی میں پھینک دیا۔ اپنے نفس پر فتح پاکر اس کا چہرہ منور ہوگیا۔ آج اسے جتنا غرور اور جتنی مسرت ہوئی۔ اتنی ان چیزوں کو پاکر بھی نہ ہوئی تھی۔ ان صدہا آدمیوں میں جو اس وقت اشنان و دھیان کر رہے ہیں۔ شاید کسی کو بھی اپنے باطن میں نورانیت کا ایسا احساس نہ ہوا ہوگا۔ گویا صبح کو سنہری شعاعیں اس کے جسم کے ایک ایک ذرہ میں ناچ رہی ہوں۔

جب وہ اشنان کرکے اوپر آئی۔ تو رتن نے پوچھا۔ ڈبا دیا۔

جالپا۔ ہاں اور کیا کرتی۔

رتن۔ بڑی سنگ دل ہو۔

جالپا۔ یہی سنگ دلی دل پر فتح پاتی ہے۔ اگر کچھ دن پہلے سنگ دل ہوجاتی تو آج یہ دن کیوں آتا۔

موٹرکار چل پڑی۔

(۲۵)

رما ناتھ کو کلکتے آئے ہوئے دو ماہ سے زیادہ ہوگئے ہیں۔ ابھی تک دیبی دین کے گھر پر پڑا ہوا ہے۔ اُسے ہمیشہ یہی دھن سوار رہتی ہے کہ روپوں کا خزانہ کیسے ہاتھ آجائے۔ طرح طرح کے منصوبے باندھتا ہے۔ طرح طرح کی تدبیریں سوچتا ہے۔ لیکن گھر سے باہر نہیں نکلتا۔ ہاں جب خوب اندھیرا ہوجاتا ہے۔ تو وہ ایک بار محلّہ کے کتب خانہ میں ضرور جاتا ہے۔ اپنے شہر اور صوبے کی خبروں کے لیے اس کی طبیعت بے قرار رہتی ہے۔ اس نے وہ نوٹس دیکھا جو دیا ناتھ نے اخباروں میں چھپوایا تھا۔ لیکن اسے اس پر اعتبار نہ آیا۔ کون جانے پولیس نے اُسے گرفتار کرنے کے لیے یہ جال پھیلایا ہو۔ روپے بھلا کس نے چکائے ہوں گے۔ غیر ممکن۔

ایک دن اسی اخبار میں رما ناتھ کو جالپا کا ایک خط چھپا ہوا ملا۔ جالپا نے دردناک اور عاجزانہ الفاظ میں اس سے گھر لوٹ آنے کی استدعا کی تھی۔ اس نے لکھا تھا۔ تمھارے ذمہ کسی کی رقم نہیں آتی۔ تم کسی طرح کا اندیشہ مت کرو۔ میں نے پائی پائی بے باق کردی ہے۔ رما کا دل للچا اُٹھا۔ لیکن معاً خیال آیا۔ یہ بھی پولیس کی شرارت ہوگی۔ اس کا کیا ثبوت ہے کہ جالپا ہی نے یہ خط لکھا۔ اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ روپے گھر والوں نے ادا ہی کردیئے ہوں گے۔ تو کیا اس حالت میں بھی وہ گھر جاسکتا ہے۔ سارے شہر میں اس کی بدنامی ہو رہی ہوگی۔ پولیس میں اطلاع ہوچکی ہوگی۔ اسے منہ دکھانا مشکل ہوجائے گا۔ اس نے طے کیا۔ میں نہیں جاسکتا۔ جب تک کم سے کم پانچ ہزار روپے ہاتھ نہ آجائیں گے۔ وہ گھر جانے کا نام نہ لے گا۔ اور اگر اب تک روپے نہیں ادا ہوئے اور پولیس اس کی تلاش میں ہے تو وہ کبھی نہیں گھر جاسکتا۔

دیبی دین کے گھر میں دو کوٹھریاں تھیں اور سامنے ایک برآمدہ تھا۔ برآمدہ میں

دکان تھی۔ ایک کوٹھری میں کھانا پکتا تھا۔ دوسری کوٹھری میں برتن بھانڈے رکھے ہوئے تھے۔ اوپر ایک کوٹھری تھی اور چھوٹی سی کھلی ہوئی چھت۔ رما اسی بالاخانہ پر رہتا تھا۔ دیبی دین اور اس کی بُڑھیا کے رہنے بیٹھنے اور سونے کا خاص مقام نہ تھا۔ رات کو دکان بند ہوجانے کے بعد وہی برآمدہ خواب گاہ کا کام دیتا تھا۔ دونوں وہیں پڑے رہتے تھے۔ دیبی دین کا کام چلم پینا اور سارے دن گپیں مارنا تھا۔ دکان کا سارا کام بُڑھیا کرتی تھی۔ منڈی جاکر مال، اسٹیشن سے مال بھیجنا یا لانا یہ بار بھی اسی کے سر تھا۔ دیبی دین گاہکوں کو پہچانتا تک نہ تھا۔ بیٹھا بیٹھا رامائن۔ طوطا مینا۔ راس لیلا یا ماتا مریم کی کہانی پڑھا کرتا تھا۔ جب سے رما آگیا ہے بڈھے کو انگریزی پڑھنے کا شوق چرایا ہے۔ سویرے ہی پرائمر لے کر آبیٹھتا ہے اور نو دس بجے تک حروف پڑھتا رہتا ہے۔ بیچ بیچ میں لطیفے بھی سنایا جاتا ہے۔ جن کا ان کے پاس بہت بڑا ذخیرہ ہے۔ مگر جگو بڑھیا کو رما کا آسن جمانا اچھا نہیں لگتا۔ وہ اسے اپنا منیم تو بنائے ہوئے ہے۔ حساب کتاب اسی سے لکھواتی ہے۔ لیکن اتنے ذرا سے کام کے لیے وہ اتنا بڑا بھار نہیں اُٹھانا چاہتی۔ یہ کام تو وہ گاہکوں سے یونہی کرالیا کرتی تھی۔ اس لیے رما کا رہنا اسے کھلتا تھا۔ لیکن رما اتنا منکسر مزاج اتنا خلیق اور اتنا فرمانبردار ہے کہ وہ علانیہ کچھ کہہ نہیں سکتی۔ ہاں دوسروں پر رکھ کر اشارہ و کنایہ سے اسے سُنا سُنا کر دل کا بخار نکالتی رہتی ہے۔ رما نے اپنے کو برہمن کہہ رکھا ہے اور مذہبیت کا سوانگ رچے ہوئے ہے۔ برہمن اور دھرماتما بن کر وہ ان دونوں کا مخدوم بن سکتا ہے۔ بڑھیا کے مزاج سے وہ واقف ہے۔ لیکن کرے کیا۔ بے حیائی کرنے پر مجبور ہے۔ حالات نے اس کی خود داری کا خاتمہ کردیا ہے۔

ایک دن رما ناتھ کتب خانہ میں بیٹھا ہوا اخبار پڑھ رہا تھا۔ اسے رتن نظر آپڑی۔ رتن کے انداز سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی کی تلاش کر رہی ہے۔ رما کا سینہ دھک دھک کرنے لگا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ رتن کی نگاہ اس پر پڑجائے۔ یہ یہاں نہ جانے کہاں آپہنچی۔ وہ رتن کی آنکھ بچا کر سر کو جھکائے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔ اور پیچھے کے اندھیرے برآمدے میں جہاں پُرانے ٹوٹے پھوٹے صندوق اور کرسیاں پڑی تھیں چُھپا کھڑا رہا۔ رتن سے ملنے اور گھر کے حالات پوچھنے کے لیے اس کا دل تڑپ رہا تھا۔ لیکن مارے شرم کے سامنے نہ آسکتا تھا۔ اس سے پوچھنے کی کتنی ہی باتیں تھیں۔ خاص کر وہ یہ جاننا

چاہتا تھا کہ اس کی نسبت جالپا کے کیا خیالات ہیں۔ اس سے ناراض تو نہیں ہے۔ اُسے مکار اور دغاباز تو نہیں سمجھتی۔ روتی تو نہیں ہے۔ دُبلی تو نہیں ہوگئی ہے۔ محلہ کے اور لوگوں کے کیا خیالات ہیں۔ کیا گھر کی تلاشی ہوئی ہے۔ مقدمہ چلا۔ ایسی ہی ہزاروں باتیں اس کے ذہن میں تھیں۔ مگر منہ کیسے دکھائے۔ وہ جھانک جھانک کر دیکھتا رہا۔ جب موٹر چلی گئی۔ تب اس کے دل کو سکون ہوا۔ اس دن سے ایک ہفتہ تک وہ کتب خانہ نہ گیا۔ گھر سے نکلا تک نہیں۔

کبھی پڑے پڑے رما ناتھ کا جی ایسا گھبراتا تھا کہ تھانہ میں جاکر ساری روئداد کہہ سُنائے جو کچھ ہوتا ہے ہوجائے۔ دو چار سال کی قید اس دائمی حبس سے تو اچھی ہے۔ پھر وہ از سر نو زندگی شروع کرے گا۔ اس کی زندگی میں ایک نئے دور کا آغاز ہوگا۔ لیکن ایک ہی لمحے میں ہمت ٹوٹ جاتی ہے۔

اسی طرح دو مہینے اور گزر گئے۔ پوس کا مہینہ آپہنچا۔ رما کے پاس جاڑوں کا کوئی کپڑا نہ تھا۔ گھر سے تو کوئی چیز لایا ہی نہ تھا۔ یہاں بھی کوئی چیز نہ بنوا سکا اب تک تو اس نے دھوتی اوڑھ کر کسی طرح راتیں کاٹیں۔ مگر پوس کے کڑکڑاتے جاڑے لحاف یا کمبل کے بغیر کیسے کٹتے۔ بے چارہ رات بھر گٹھڑی بنا رہتا۔ جب بہت سردی لگتی تو بچھاون اوڑھ لیتا۔ دیبی دین نے اُسے ایک پُرانی دری بچھانے کو دے دی تھی۔ اس کے گھر میں شاید یہی سب سے اچھا بستر تھا۔ اس طبقہ کے آدمی چاہے دس ہزار کے گہنے پہن لیں۔ شادی بیاہ میں دس ہزار خرچ کردیں۔ لیکن بچھاون گودڑ ہی رکھیں گے۔ اس سڑی ہوئی دری سے جاڑا بھلا کیا جاتا۔ مگر کچھ نہ ہونے سے اچھا ہی تھا۔ رما مارے شرم کے دیبی دین سے کچھ کہہ نہ سکتا تھا اور دیبی دین بھی شاید اتنا صرف کثیر نہ برداشت کرنا چاہتا تھا۔ یا ممکن ہے اس کے ذہن میں یہ ضرورت آئی ہی نہ ہو۔ جب دن ڈھلنے لگا۔ تو رما رات کی تکلیف کا خیال کرکے نیم جان ہوجاتا تھا۔ گویا کالی بلا دوڑی چلی آتی ہو۔ رات کو بار بار کھڑکی کھول کر دیکھتا کہ سویرا ہونے میں کتنی دیر ہے۔

ایک دن شام کو وہ کتب خانہ جا رہا تھا کہ اس نے دیکھا ایک بڑی کوٹھی کے سامنے ہزاروں کنگلے جمع ہیں۔ مجمع کے اندر گھس کر دیکھا تو معلوم ہوا۔ کوئی سیٹھ جی کمبلوں کا دان کر رہے ہیں۔ کمبل بہت گھٹیا تھے۔ پتلے اور ہلکے۔ مگر خلقت ایک پر ایک ٹوٹی پڑتی تھی۔ رما

کے جی میں آیا۔ ایک کمبل لے لوں۔ یہاں مجھے کون جانتا ہے۔ اگر کوئی پہچان بھی لے تو کیا حرج ہے۔ اگر غریب برہمن خیرات کا مستحق نہیں تو اور کون ہوسکتا ہے۔ لیکن ایک لمحہ میں اس کی غیرت بیدار ہو اُٹھی۔ کچھ دیر وہاں کھڑا تاکتا رہا۔ پھر آگے بڑھ گیا۔ اس کے ماتھے پر تلک دیکھ کر منیم نے سمجھ لیا یہ برہمن ہے۔ اتنے سارے کنگلوں میں خال خال ہی برہمن تھے۔ برہمنوں کو خیرات دینے کا ثواب کچھ اور ہی ہے۔ منیم دل میں خوش تھا کہ ایک برہمن دیوتا دکھائی تو دیئے۔ اس لیے جب اس نے رما کو جاتے دیکھا تو بولا۔ پنڈت جی کہاں چلے گئے۔ کمبل تو لیتے جایئے۔ رما پر گھڑوں پانی پڑگیا۔ اس کے منہ سے صرف اتنا نکلا۔ مجھے ضرورت نہیں۔ یہ کہہ کر پھر وہ بڑھا۔ منیم نے سمجھا شاید کمبل گھٹیا دیکھ کر دیوتا جی روٹھے جا رہے ہیں۔ ایسے غیرت مند دیوتا اسے اپنی زندگی میں شاید کبھی ملے ہی نہ تھے۔ کوئی دوسرا برہمن ہوتا تو دوچار چکنی چپڑی باتیں کرتا اور کوئی اچھا سا کمبل مانگتا۔ یہ پنڈت جی بغیر کچھ کہے استغنا کی شان سے چلے جا رہے ہیں تو ضرور کوئی مہاتما ہوں گے۔ اس نے لپک کر رما کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا۔ آیئے! تو مہاراج آپ کے لیے چوکھا کمبل رکھا ہے۔ یہ تو کنگلوں کے لیے ہے۔ رما نے دیکھا کہ بغیر مانگے ایک چیز مل رہی ہے بلکہ زبردستی گلے لگائی جا رہی ہے۔ تو وہ دو چار بار نہیں نہیں کرکے منیم کے ساتھ اندر چلا گیا۔ منیم نے اسے کوٹھی میں لے جاکر تخت پر بیٹھا دیا اور ایک بھاری دبیز کمبل ان کی نذر کیا۔ رما کی بے نیازی کا اس پر اتنا اثر ہوا کہ اس نے پانچ روپے دکچھنا کے دینا چاہا۔ مگر رما نے اُسے لینے سے صاف انکار کردیا۔ کمبل لے کر ہی اس کا خاندانی غرور مجروح ہوچکا تھا۔ دکچھنا کے لیے ہاتھ پھیلانا اس کے لیے غیر ممکن ہوگیا۔

منیم نے حیرت سے کہا۔ آپ دکچھنا نہ لیں گے تو سیٹھ جی کو بڑا رنج ہوگا۔

رما نے خوددارانہ انداز سے کہا۔ آپ کی ضد سے میں نے کمبل لے لیا۔ لیکن دکچھنا نہیں لے سکتا۔ مجھے روپے کی ضرورت نہیں۔ جس بابو جی کے گھر ٹھہرا ہوا ہوں۔ وہ مجھے بھوجن دیتے ہیں اور مجھے لے کر کیا کرنا ہے۔

منیم۔ سیٹھ جی مانیں گے نہیں۔

رما۔ آپ میری طرف سے کہہ دیجیے گا۔

منیم۔ آپ کے تیاگ کا دھنیہ ہے۔ ایسے ہی برہمنوں سے دھرم کی مریادا بنی ہوئی ہے۔ کچھ

دیر اور بیٹھیے۔ سیٹھ جی آتے ہی ہوں گے۔ آپ کے درشنوں سے بہت پرسن ہوں گے۔ برہمنوں کے پرم بھگت ہیں۔ ترکال سندھیا کرتے ہیں۔ مہاراج تین بجے رات کو گنگا تٹ پر پہنچ جاتے ہیں اور وہاں سے آکر پوجن پر بیٹھ جاتے ہیں۔ دس بجے بھگوان کا بھوگ لگاتے ہیں۔ دوپہر کو بھوجن پاتے ہیں۔ تین چار بجے سندھیا کرنے چلے جاتے ہیں۔ آپ کا استھان کہاں ہے؟

رما نے پریاگ نہ بتلا کر کاشی بتلایا۔ اس پر منیم جی کا اصرار اور بھی بڑھا لیکن رما کو یہ خوف ہو رہا تھا کہ کہیں سیٹھ جی نے کوئی مذہبی بحث چھیڑ دی تو ساری قلعی کھل جائے گی۔ کسی دوسرے دن آنے کا وعدہ کرکے گلا چھڑایا۔

نو بجے وہ کتب خانہ سے لوٹا تو ڈر رہا تھا کہ کہیں دیبی دین نے پوچھا کہ کمبل کہاں سے ملا تو کیا جواب دوں گا۔ کوئی بہانہ ضروری تھا۔ اس نے سوچا کہہ دوں گا۔ ایک پہچان والے کی دکان سے اُدھار لایا ہوں۔

دیبی دین نے کمبل دیکھتے ہی پوچھا۔ سیٹھ کروڑی مل کے یہاں پہنچ گئے کیا مہاراج!

رما نے پوچھا۔ کون سیٹھ کروڑی مل؟

دیبی۔ ارے وہی جس کی بڑی لال کوٹھی ہے۔

رما کوئی بہانہ نہ کرسکا۔ بولا۔ ہاں منیم جی نے گلے لگا دیا۔ سیٹھ جی بڑے دھرماتما آدمی ہیں۔

دیبی دین نے مسکرا کر کہا۔ بڑے دھرماتما ہیں۔ انھیں کے تھامے تو دھرتی تھمی ہے۔ نہیں اب تک مِٹ گئی ہوتی۔

رما۔ کام تو دھرماتماؤں کا کرتے ہیں۔ من کا حال ایشور جانے جو سارے دن پوجا پاٹ میں لگا رہے اسے دھرماتما نہیں تو اور کیا کہا جائے۔

دیبی دین اُسے پاپی کہنا چاہیے۔ مہا پاپی۔ دیا تو کسی کے پیچھے پھٹکنے بھی نہیں پاتی مظلوموں کے ساتھ جتنی کڑائی اس کے مِل میں ہوتی ہے اور کہیں نہیں ہوتی۔ آدمیوں کو ہنٹروں سے پٹواتا ہے۔ ہنٹروں سے چربی ملا گھی بیچ کر اس نے لاکھوں کمائے۔ کوئی نوکر ایک منٹ کی بھی دیر کرے تو اس کی مجوری کاٹ لیتا ہے۔ مگر سال میں دو چار ہزار دان نہ کردے تو پاپ کا دھن پچے کیسے۔ میں نے تو جتنے پجاری دیکھے سب کو پتھر ہی پایا۔ پتھر

پوچھتے پوچھتے ان کے دل بھی پتھر ہوجاتے ہیں۔ آدمی کچھ نہ کرے من میں دَیا بنائے رکھے یہی سو دھرم کا ایک دھرم ہے۔

دن کی رکھی ہوئی روٹیاں کھا کر جب رما کمبل اوڑھ کر لیٹا تو اس کا ضمیر اس پر ملامت کرنے لگا۔ رشوت میں اس نے ہزاروں روپے مارے تھے۔ مگر کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی اسے باطنی خلش نہ ہوئی تھی۔ رشوت عقل سے، عیاری سے، رُعب سے ملتی ہے۔ دان نکمے پست ہمت اور رنگے سیاروں کا سہارا ہے۔ وہ سوچ رہا تھا۔ میں اتنا ذلیل ہوگیا ہوں کہ کھانے اور کپڑے کے لیے مجھے خیرات لینا پڑتا ہے۔ وہ دیبی دین کے گھر دو مہینے سے پڑا تھا۔ مگر دیبی دین اسے محتاج نہیں مہمان سمجھتا تھا۔ رما کے دل میں ایسا ہیجان ہوا کہ اسی وقت تھانہ میں جاکر اپنی سرگزشت کہہ سنائے۔ یہی تو ہوگا کہ دو تین سال کی سزا ہوجائے گی۔ پھر تو دل میں یہ خلش ہوگی۔ کہیں ڈوب ہی کیوں نہ مروں۔ اس طرح زندہ رہنے سے فائدہ ہی کیا۔ نہ گھر کا ہوں نہ گھاٹ کا۔ دوسروں کی پرورش تو کیا کروں گا۔ اپنے ہی لیے دوسروں کا محتاج ہوں۔ رما نے فیصلہ کیا۔ کل وہ کام کی تلاش میں نکلے گا۔ جو کچھ ہوتا ہے ہو۔

(۲۶)

ابھی رما منہ ہاتھ دھو رہا تھا کہ دیبی دین پرائمر لے کر آپہنچا اور بولا۔ بھیا یہ تمھاری انگریزی بڑی بکٹ ہے۔ ایس۔ آئی۔ آر سر ہوتا ہے۔ تو پی۔ آئی۔ ٹی پٹ کیوں ہوجاتا ہے۔ بی۔ یو۔ ٹی بٹ ہوتا ہے۔ تو پی۔ یو۔ ٹی پٹ کیوں ہوتا ہے۔ تمھیں بھی بڑی کٹھن لگتی ہوگی۔

رما نے مسکرا کر کہا۔ پہلے تو کٹھن لگتی تھی۔ مگر اب تو آسان معلوم ہوتی ہے۔

دیبی دین جس دن پرائمر ختم ہوگی۔ مہابیر جی کو سوا سیر لڈو چڑھاؤں گا۔ پرائمر کا مطلب ہے پرائی استری مرجائے۔ میں کہتا ہوں۔ ہماری مرے۔ پرائی کے مرنے سے ہمیں کیا سکھ۔ تمھارے بال بچے تو ہیں بھیا۔

رما نے اس انداز سے کہا۔ گویا ہیں۔ لیکن نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ہاں ہیں تو۔

دیبی۔ کوئی چٹھی چپاتی آئی تھی۔

رما۔ نہ۔

دیبی۔ اور تم نے لکھی۔ ارے تین مہینہ سے کوئی چٹھی ہی نہیں بھیجی۔ گھبراتے نہ ہوں گے لوگ۔

رما۔ جب تک یہاں کوئی صورت نہ پیدا ہو جائے کیا خط لکھوں؟

دیبی۔ ارے بھلے آدمی لکھ دو۔ میں یہاں خیریت سے ہوں۔ گھر سے بھاگ آئے ہو۔ ان لوگوں کو کتنی چنتا ہو رہی ہوگی۔ ماں باپ تو ہیں نا۔

رما۔ ہاں ہیں تو۔

دیبی دین۔ تو بھیا آج ہی چٹھی ڈال دو۔ میری بات مانو!

رما نے اب تک اپنی اصلیت کو چھپایا تھا۔ اُسے کئی بار خواہش ہوئی کہ دیبی دین سے سارا حال کہہ دے۔ مگر بات ہونٹوں تک آکر رُک جاتی تھی۔ وہ دیبی دین کے منہ سے اس کا فیصلہ سننا چاہتا تھا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ وہ کیا صلاح دیتا ہے۔ اس وقت دیبی دین کی ہمدردی نے اسے مغلوب کردیا۔ بولا۔ میں گھر سے بھاگ آیا ہوں۔

دیبی دین نے مونچھوں میں مسکراکر کہا۔ میں جانتا ہوں۔ گھر والی سے ٹھن گئی ہوگی۔ وہ کہتی ہوگی۔ میں الگ رہوں گی۔ تم کہتے ہوگے۔ میں ماں باپ سے الگ نہ رہوں گا یا گہنوں کے لیے ضد کرتی ہوگی۔ کیوں؟

رما نے شرماتے ہوئے کہا۔ کچھ ایسی ہی بات تھی۔ دادا ۔ وہ تو گہنوں کے لیے ضد نہ کرتی تھیں۔ لیکن پاجاتی تھیں تو خوش ہوتی تھیں اور میں محبت کے نشہ میں آگا پیچھا کچھ نہ سوچتا تھا۔

دیبی دین کے منہ سے گویا آپ ہی آپ نکل گیا۔ سرکاری رقم تو نہیں اُڑا دی؟

رما کا سینہ دھک سے ہوگیا۔ وہ سرکاری رقم کا معاملہ اس سے چھپانا چاہتا تھا۔ دیبی دین کے اس سوال نے گویا اس کی سوتی ہوئی فوج پر چھاپہ مار دیا۔ اس کے چہرہ کا رنگ اڑ گیا۔ وہ یکایک کچھ فیصلہ نہ کرسکا کہ اس کا جواب کیا دوں؟

دیبی دین اس کے بشرہ سے تاڑ گیا کہ اس نے کوئی دل آزار بات کہہ دی۔ زخم پر مرہم رکھتے ہوئے بولا۔ دل کی لگن بڑی بے ڈھب ہوتی ہے۔ بھیا تم تو ابھی لڑکے ہو۔ غبن کے ہزاروں مقدمے ہر سال ہوتے ہیں۔ تحقیقات کی جائے تو ایک ہی بات نکلے گی۔ گہنا۔ دس بیس وارداتیں تو میں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہوں۔ یہ روگ ہی ایسا ہے۔

عورت منہ سے تو یہی کہتی جاتی ہے کہ یہ کیوں لائے۔ یہ کیوں لائے۔ روپے کہاں سے آئیں گے۔ دل میں پھولی نہیں سماتی۔ یہیں ایک ڈاک بابو رہتے تھے۔ بے چارے نے چھری سے گلا کاٹ لیا۔ ایک دوسرے میاں صاحب کو جانتا ہوں جن کو پانچ سال کی سزا ہوگئی۔ جیل میں مر گئے۔ ایک تیسرے پنڈت جی کو جانتا ہوں جنھوں نے افیم کھا کر جان دے دی۔ بُرا روگ ہے۔ دوسروں کو کیا کہوں۔ میں ہی تین سال کی سزا کاٹ چکا ہوں۔ جب اس بڑھیا پر جوبن تھا۔ تاکتی تھی۔ تو جیسے کلیجہ پر تیر چلا دیتی تھی۔ میں ڈاکیہ تھا۔ منی آرڈر تقسیم کیا کرتا تھا۔ یہ کانوں کی جھومک کے لیے جان کھا رہی تھی۔ کہتی تھی۔ سونے ہی کے لوں گی۔ مجھ پر تو نشہ چھایا ہوا تھا۔ اپنی آمدنی کی ڈینگیں مارتا رہتا تھا۔ کبھی پھولوں کی ہار لاتا۔ کبھی مٹھائی۔ کبھی عطر پھلیل۔ سہر کا ملکہ تھا۔ منی آرڈر بہت آتے تھے۔ ایک دن ایک منی آرڈر پر میں نے جھوٹے دسکت کرکے روپے اُڑا لیے۔ کل تیس روپے تھے۔ جھومک لاکر دے دیے۔ اتنی کھُس ہوئی کہ کچھ نہ پوچھو۔ لیکن ایک ہی مہینہ میں چوری پکڑ لی گئی۔ تین سال کی سجا ہوگئی۔ سجا کاٹ کر نکلا۔ تو یہاں بھاگ آیا۔ پھر کبھی گھر نہیں گیا۔ ہاں گھر چٹھی بھیج دی۔ بڑھیا کھبر پاتے ہی چلی آئی۔ یہ سب کچھ ہوا۔ مگر گہنوں سے اس کا پیٹ نہیں بھرا۔ جب دیکھو کچھ نہ کچھ بنتا ہی رہتا ہے۔ ایک چنج بنوائی۔ کل اسی کو توڑوا کر دوسری چنج بنوا لی۔ میری تو ایک صلاح ہے۔ گھر ایک چٹھی بھیج دو۔ لیکن نہیں پولیس تمھاری ٹوہ میں ہوگی۔ کہیں سُراغ مل گیا۔ تو کام بگڑ جائے گا۔ کہو تو میں کسی سے ایک چٹھی لکھا کر بھیج دوں۔

رما نے سر ہلا کر کہا۔ نہیں دادا غضب ہوجائے گا۔ پولیس سے زیادہ تو مجھے گھر والوں کا خوف ہے!

دیبی۔ ڈر پولیس کا ہے کہ گھر والوں کا۔ گھر والے سن کر کھُس ہوں گے۔ پولیس والے سجا کرا دیں گے۔

رما۔ میں سزا سے بالکل نہیں ڈرتا۔ تم سے کہا نہیں۔ ایک دن مجھے کتب خانہ میں جان پہچان کی ایک عورت نظر پڑی۔ ہمارے گھر بہت آتی جاتی تھی۔ ایک بڑے وکیل کی بیوی ہے۔ اسے دیکھتے ہی میری نانی مر گئی۔ ایسا سپ پٹایا کہ اس کی طرف تاکنے کی بھی ہمت نہ پڑی۔ اگر اس وقت اس سے دوچار باتیں کرلیتا۔ تو گھر کی ساری حالت

معلوم ہوجاتی۔ اور مجھے یہ بھی یقین ہے کہ وہ اس ملاقات کا کسی سے ذکر نہ کرتی۔
میرے گھر میں بھی کسی سے نہ کہتی۔ لیکن میری ہمت نہ پڑی۔

دیبی۔ تو پھر اسی کو کیوں نہیں ایک چٹھی لکھتے؟

رما۔ چٹھی تو مجھ سے نہ لکھی جائے گی۔

دیبی۔ کب تک چھپے بیٹھے رہو گے؟

رما۔ دیکھا چاہیے۔

دیبی۔ پولیس تمھاری ٹوہ میں ہوگی۔

رما۔ یہی تو خوف ہے۔

دیبی دین کو تشویش پیدا ہوگئی۔ رما نے سمجھا۔ شاید پولیس کے خوف نے اسے فکرمند کر رکھا ہے۔ بولا۔ ہاں تم دیکھتے ہو۔ دن کو میں بہت کم گھر سے نکلتا ہوں۔ لیکن میں تمھیں اپنے ساتھ نہیں گھسیٹنا چاہتا۔ میں تو جاؤں گا ہی۔ تمھیں کیوں الجھن میں ڈالوں سوچتا ہوں کسی ایسے گاؤں میں جاکر رہوں۔ جہاں پولیس کی ہوا تک نہ ہو۔

دیبی دین نے غرور سے سر اُٹھا کر کہا۔ میرے بارے میں تم کچھ چنتا نہ کرو۔ بھیا! یہاں پولیس سے ڈرنے والے نہیں ہیں۔ کسی پردیسی کو اپنے گھر ٹھہرانا کوئی جرم نہیں ہے ہمیں کیا معلوم کہ اس کے پیچھے پولیس ہے۔ یہ پولیس کا کام ہے۔ پولیس جانے۔ میں پولیس کا مخبر نہیں۔ گوئندا نہیں۔ جاسوس نہیں۔ ہاں کہیں بُڑھیا سے نہ کہہ دینا۔ نہیں اس کے پیٹ میں پانی نہ پچے گا۔

دونوں ایک لمحہ تک خاموش رہے۔ تب دیبی دین بولا۔ کہو تو میں تمھارے گھر چلا جاؤں۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوگی۔ میں اِدھر اُدھر سے سارا حال پوچھ لوں گا۔ تمھارے باپ سے ملوں گا۔ تمھاری ماں کو سمجھاؤں گا۔ تمھاری گھر والی سے بات چیت کروں گا۔
پھر جیسا مناسب سمجھنا کرنا۔

رما نے اندر خوش ہوکر کہا۔ لیکن کیسے پوچھو گے دادا۔ لوگ کہیں گے۔ تمھیں ان باتوں سے مطلب؟

دیبی دین نے قہقہہ مار کر کہا۔ بھیا اس سے سہل تو اور کوئی کام ہی نہیں۔ ایک جنیو گلے میں ڈالا۔ اور برہمن بن گئے۔ پھر چاہے ہاتھ دیکھو۔ چاہے کنڈلی بانچو۔ چاہے شگون

بچارو۔ سب کچھ کرسکتے ہو۔ تمھاری ماں بھیک لے کر آئے گی۔ اسے دیکھتے ہی کہوں گا۔ ماتا تیرے پتر کو پردیس میں بڑا کشٹ ہے۔ اتنا سنتے ہی گھر بھر کے لوگ آ جائیں گے۔ تمھاری گھر والی بھی آئے گی۔ اس کا ہاتھ دیکھوں گا۔ میں ان باتوں میں پکا ہوں۔ کچھ کما لاؤں گا۔ دیکھ لینا۔

رما اس خیال کے مزے لینے لگا۔ جالپا اس وقت رتن کے پاس دوڑی جائے گی۔ دونوں طرح طرح کے سوالات کریں گی۔ کیوں بابا وہ کہاں گئے ہیں۔ اچھی طرح ہیں نا؟ کب تک آئیں گے؟ کبھی بال بچوں کی بھی سدھ آتی ہے کہ نہیں۔ وہاں کسی حسینہ کے جال میں تو نہیں پھنس گئے؟

دیبی دین بولا۔ تو صلاح ہے؟

رما نے اس کا دل ٹٹولنے کا ارادہ سے کہا۔ کہاں جاؤگے دادا! تکلیف ہوگی۔

دیبی۔ ماگھ کا اشنان بھی تو کروں گا۔ میں تو کہتا ہوں۔ تم بھی چلو۔ کسی دھرم شالا میں ٹھہر جائیں گے۔ میں رنگ ڈھنگ دیکھ کر تم سے کہہ دوں گا۔ اگر دیکھنا کہ کوئی کھٹکا نہیں ہے تو گھر چلے جانا۔ کوئی کھٹکا ہو۔ تو میرے ساتھ ہی لوٹ آنا۔

رما نے ہنس کر کہا۔ کہاں کی بات کرتے ہو دادا۔ اسٹیشن پر اترتے ہی کہیں گرفتار ہوجاؤں تو بس!

دیبی دین نے ذمہ داری کی شان سے کہا۔ گرفتار ہوجانا کیا دل لگی ہے۔ مجھ سے کہو۔ میں تمھیں پراگ راج کے تھانے میں لے جاکر کھڑا کردوں۔ اگر کوئی ترچھی آنکھوں سے بھی دیکھ لے تو مونچھی مُڑا لوں۔ ایسی بات ہے بھلا۔ سینکڑوں خونیوں کو جانتا ہوں۔ جو اسی شہر میں رہتے ہیں۔ پولیس کے افسروں کے ساتھ دعوتیں کھاتے ہو۔ پولیس انھیں جانتی ہے۔ پھر کبھی کچھ نہیں کرسکتی۔ روپیہ بڑی چیز ہے!

رما نے کچھ جواب نہ دیا۔ اس کے سامنے ایک نیا مسئلہ آکھڑا ہوا۔ جن باتوں کو وہ ناتجربہ کاری کے باعث محال سمجھتا تھا۔ انھیں دیبی دین نے بچوں کا کھیل بنا دیا۔ اور بوڑھا شیخی بازوں میں نہیں ہے۔ وہ منہ سے جو کچھ کہتا ہے پورا کردکھاتا ہے۔ اس نے سوچا کہ میں سچ مچ دیبی دین کے ساتھ گھر چلا جاؤں۔ یہاں کچھ روپے مل جاتے تو سوٹ بنوا لیتا۔ پھر شان سے جاتا۔ وہ اس وقت کا تصور کرنے لگا۔ جب وہ نیا سوٹ پہنے ہوئے گھر پہنچے گا۔

اسے دیکھتے ہی گوپی اور بشمر دوڑیں گے۔ بھیا آئے بھیا آئے۔ دادا نکل آئیں گے۔ اماں کو تو پہلے یقین نہ آئے گا۔ مگر جب دادا جاکر کہیں گے۔ ہاں آگیا۔ تب وہ آنسو بہاتی ہوئی دروازہ کی طرف چلیں گی۔ اسی وقت میں پہنچ کر اماں کے پیروں پر گر پڑوں گا جالپا وہاں نہ آئے گی۔ روٹھی ہوئی بیٹھی رہے گی۔ رما نے دل میں وہ باتیں بھی سوچ لیں۔ جو وہ جالپا کو منانے کے لیے کہے گا۔ اس وقت شاید روپے کا ذکر ہی نہ آئے۔ روپوں کا ذکر کرنے میں سبھی کو تکلف ہوگا۔ اپنے عزیزوں سے جب کوئی خطا ہوجاتی ہے تو ہم اس کے روبرو اس کا ذکر کرکے اسے شرمندہ کرنا نہیں چاہتے اور چاہتے ہیں اس بات کا اسے دھیان ہی نہ آئے۔ اس کے ساتھ اس طرح پیش آتے ہیں کہ اسے ہماری طرف سے ذرا بھی شک نہ ہو۔ وہ بھول کر بھی یہ نہ سمجھے کہ ان کے دل میں میری طرف سے کدورت ہے۔

دیبی دین نے پوچھا۔ کیا سوچ رہے ہو۔ چلو گے؟

رما نے دبی زبان سے کہا۔ تمھارا اتنا اصرار ہے تو چلوں گا۔ مگر پہلے تمھیں میرے گھر جاکر پوری پوری خبر لانی پڑے گی۔ اگر میرا من نہ بھرا تو میں لوٹ آؤں گا۔

دیبی دین نے کہا منظور!

رما نے شرم سے آنکھیں نیچی کرکے کہا۔ ایک بات اور ہے مجھے کچھ کپڑوں کی ضرورت پڑے گی۔

دیبی دین۔ بن جائیں گے!

رما۔ گھر پہنچ کر تمھارے روپے دے دوں گا۔

دیبی۔ اور میں تمھاری گورو دکھشنا بھی وہیں دے دوں گا۔

رما۔ گورودکھشنا بھی مجھی کو دینی پڑے گی۔ میں نے تمھیں چار حرف انگریزی پڑھادی اس سے تمھارا کیا بھلا ہوا۔ تم نے مجھے جو تجربہ سکھائے وہ عمر بھر میرے کام آئیں گے۔ منہ پر بڑائی کرنا خوشامد ہے۔ لیکن دادا ماں باپ کے بعد جتنی محبت مجھے تم سے ہے اتنی اور کسی سے نہیں۔ تم نے ایسے گاڑھے وقت میری بانہہ پکڑی۔ جب میں منجدھار میں جارہا تھا۔ ایشور ہی جانے اب تک میری کیا حالت ہوئی ہوتی۔ کس گھاٹ لگا ہوتا!

دیبی دین نے تمسخر سے کہا اور جو کہیں تمھارے دادا مجھے گھر میں گھسنے ہی نہ دیں تو؟

رما۔ دادا تمھاری اتنی خاطر کریں گے کہ تم اوب جاؤ گے۔ جالپا تمھاری اتنی خدمت کرے گی کہ جوان ہو جاؤ گے!

دیبی دین نے ہنس کر کہا۔ تب تو بُڑھیا مارے ڈاہ کے جل مرے گی۔ ھانے گی نہیں! نہیں میرا جی تو چاہتا ہے کہ ہم دونوں یہاں سے اپنا ڈیرا ڈنڈا لے کر چلتے اور وہیں سر کی تانتے تم لوگوں کے ساتھ جندگانی آرام سے کٹ جاتی۔ لیکن اس چڑیل سے کلکتہ نہ چھوڑا جائے گا تو بات پکی ہو گئی!

رما۔ ہاں پکی ہی ہے۔

دیبی۔ دکان کھلے تو چلیں کپڑے لاویں۔ آج ہی سلنے کو دے دیں۔

دیبی دین کے چلے جانے کے بعد رما بڑی دیر تک سنہرے تصورات میں بیٹھا رہا۔ جن جذبات کو اس نے کبھی اپنے دل میں قدم نہ رکھنے دیا تھا۔ جن کی گہرائی۔ وسعت اور شدت سے وہ اتنا ہراساں تھا کہ اس میں پھسل کر ڈوب جانے کے خوف سے وہ اپنے دل بے قرار کو ادھر بھٹکنے بھی نہ دیتا تھا۔ اسی اتھاہ اور ناپید کنار سمندر میں وہ آج پورے لاأبالی پن کے ساتھ تیرنے لگا۔ تصور نے اُسے کشش عطا کردی تھی۔ وہ تربینی کی سیر، وہ الفریڈ کی ہوا خوری وہ خسرو باغ کے مزے۔ وہ احباب کی مجلسیں سب یاد آآکر اس کے دل کو گدگدانے لگے۔ رمیش اسے دیکھتے ہی دوڑ کر گلے لپٹ جائیں گے۔ احباب پوچھیں گے کہاں گئے تھے۔ یار خوب سیر کی رتن اس کی خبر پاتے ہی دوڑی آئے گی اور پوچھے گی۔ تم کہاں ٹھہرے تھے۔ بابو جی میں نے تو سارا کلکتہ چھان مارا۔ پھر جالپا کی غمگین صورت سامنے آکھڑی ہوئی۔

یکایک دیبی دین نے آکر کہا۔ دس بج گئے چلو بازار ہوتے آئیں۔

رما چلنے کو تیار ہوا۔ لیکن دروازہ تک آکر رُک گیا۔

دیبی دین نے پوچھا۔ کیوں رُک گئے؟

رما۔ تمھیں چلے جاؤ۔ میں جاکر کیا کروں گا۔

دیبی۔ کیا ڈر رہے ہو؟

رما۔ ڈر نہیں رہا ہوں۔ مگر کیا فائدہ؟

دیبی۔ میں اکیلا جاکر کیا کروں گا۔ مجھے کیا معلوم تمھیں کون سا کپڑا پسند ہے۔ چل کر اپنی

پسند سے لے لو۔

رما۔ جو کپڑا چاہے لے لینا۔ مجھے سب پسند ہے۔

دیبی۔ تمہیں ڈر کس بات کا ہے۔ میں کہتا ہوں پولیس تمھاری طرف تاکے گی بھی نہیں۔

دیبی دین نے بہت سمجھایا۔ تشفی دی۔ مگر رما جانے پر راضی نہ ہوا، وہ سوچتا تھا۔ اگر کسی سپاہی نے پکڑ لیا تو دیبی دین کیا کرے گا۔ مانا کہ سپاہی سے اس کی جان پہچان بھی ہو۔ تو یہ ضروری نہیں کہ وہ سرکاری معاملہ میں بھی دوستی کا حق نبھائے۔ دیبی دین منت خوشامد کرکے رہ جائے گا۔ جائے گی میرے سر۔ کہیں پکڑا جاؤں تو پریاگ کے بدلے جیل جانا پڑے آخر دیبی دین لاچار ہوکر اکیلا ہی گیا۔

دیبی دین گھنٹے بھر میں لوٹا۔ دیکھا رما چھت پر ٹہل رہا ہے۔ بولا کچھ جانتے ہو کے بج گئے۔ بارہ کا عمل ہے۔ آج روٹی نہ بنے گی کیا؟ گھر جانے کی خوشی میں کھانا پینا چھوڑ دوگے یہ دیکھو کپڑوں کا نموہ لایا ہوں۔ ان میں جو نسا پسند کروگے لے لوں۔

رما نے نمونوں کو الٹ پلٹ دیکھا۔ اور بولا۔ اتنے مہنگے کپڑے کیوں لائے؟

دیبی۔ سستے تھے۔ مگر ولایتی تھے۔

رما۔ تم ولایتی کپڑے نہیں پہنتے؟

دیبی۔ ادھر بیس سال سے تو نہیں پہنتے۔ ادھر کی بات نہیں کہتا۔ کچھ بیسی دام لگ جاتا ہے مگر روپیہ تو دیس میں رہ جاتا ہے۔

رما نے شرماتے ہوئے کہا۔ تم اپنے اصول کے بڑے پکے ہو دادا۔

دیبی دین کے چہرے پر عجیب رونق آگئی۔ اس کی بجھی ہوئی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ اکڑ کر بولا۔ جس دیس میں رہتے ہیں۔ جس کا اَن جل کھاتے پیتے ہیں۔ اس کے لیے اتنا بھی نہ کریں تو جینے پر لعنت ہے۔ دو جوان بیٹے اسی سودیشی کی بھینٹ کرچکا ہوں بھیا اکیلے ایسے پٹھے تھے کہ تم سے کیا کہوں۔ دونوں بدیشی کپڑوں کی دکان پر تعینات تھے۔ مجال تھی کہ کوئی گاہک دکان پر آجائے۔ ہاتھ جوڑ کر گھگیا کر دھمکا کر شرموا کر سب کو پھیر لیتے تھے۔ بجاجوں نے جاکر کمشنر سے فریاد کی۔ سُن کر آگ ہوگیا۔ بیس فوجی گورے بھیجے کہ ابھی جاکر بجار سے پہرے اُٹھا دو۔ گوروں نے دونوں بھائیوں سے آکر کہا۔ یہاں سے چلے جاؤ۔ مگر وہ اپنی جگہ سے ہٹو بھر بھی نہ ہلے۔ بھیڑ لگ گئی۔ گورے ان پر گھوڑے چڑھا لائے

تھے۔ مگر دونوں پہلوان کی طرح ڈٹے کھڑے تھے۔ جب اس طرح کچھ بس نہ چلا۔ تو سبھوں نے ڈنڈے سے پیٹنا شروع کیا۔ دونوں بہادر ڈنڈے کھاتے تھے۔ پر جگہ سے نہ ہلتے تھے۔ جب بڑا بھائی گر پڑا۔ تو چھوٹا اس کی جگہ آکر کھڑا ہوگیا۔ اگر دونوں اپنے ڈنڈے سنبھال لیتے۔ تو ان بیسیوں کو مار بھگاتے۔ لیکن ہاتھ اُٹھانا تو بڑی بات ہے۔ سر تک نہ اُٹھایا۔ آخر چھوٹا بھی وہیں گر پڑا۔ دونوں کو لوگوں نے اُٹھا کر ہسپتال بھیجا۔ اسی رات کو دونوں سدہار گئے تمھارے چرن چھو کر کہتا ہوں بھیا۔ اس وقت مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میری چھاتی گج بھر کی ہوگئی ہے۔ یہی اُمنگ آتی تھی کہ بھگوان نے اوروں کو پہلے نہ اُٹھا لیا ہوتا۔ اس وکھت انھیں بھیج دیتا۔ جب جناجا چلا ہے تو ایک لاکھ آدمی ساتھ تھا۔ بیٹوں کو گنگا کی بھینٹ کر کے میں سیدھا بجاج میں پہنچا اور اسی دکان پر کھڑا ہوا جہاں دونوں بیروں کی لاس گری تھی۔ گاہک کے نام چڑیے کا پوت تک نہ دکھائی دیا۔ آٹھ دن وہاں سے ہلا تک نہیں۔ نہ بھوک تھی نہ پیاس۔ نویں دن دکانداروں نے کسم کھائی کو بلایتی کپڑے نہ منگائیں گے۔ تب بجار سے ہٹا۔ تب سے بدیسی دیا سلائی تک گھر میں نہیں لایا۔

رما نے متاثر ہوکر کہا۔ واہ!! تم سچے ویر ہو۔ اور وہ دونوں لڑکے بھی سچے جودھا تھے۔

دیہی دین نے اس انداز سے دیکھا۔ گویا اپنے کو اس تعریف کا مستحق سمجھتا ہے۔ شہیدوں کی شان سے بولا۔ ان بڑے بڑے آدمیوں کے لیے کچھ نہ ہوگا۔ یہ تو رونا جانتے ہیں۔ بڑے بڑے دیش بھگتوں کو بلائیتی سراب کے بغیر چین نہیں آتا۔ ان کے گھر میں جاکر دیکھو تو ایک بھی دیسی چیج نہ ملے گی۔ دکھانے کو دس بیس کرتے گاڑھے کے بنوا لیے۔ سب کے سب بھوگ بلاس میں اندھے ہو رہے ہیں۔ چھوٹے بھی اور بڑے بھی۔ اس پر دعوئی یہ ہے کہ ہم دیس کے لیے مرتے ہیں۔ ارے تم کیا دیس کا اُدھار کروگے پہلے اپنا اُدھار تو کرلو۔ غریبوں کو لوٹ کر بلایت کا گھر بھرنا تمھارا کام ہے۔ اسی لیے تمھارا اس دیس میں جنم ہوا ہے۔ ہاں روتے جاؤ۔ بلایتی سرابیں اُڑاؤ۔ بلایتی موٹریں دوڑاؤ۔ بلایتی مربے اور اچار چکھو۔ بلایتی برتنوں میں کھاؤ۔ بلایتی دوائیاں پیو۔ بلایتی بھاسا بولو۔ بلایتی ٹھاٹ بناؤ۔ مگر دیس کے نام کو روتے جاؤ۔ اور اس رونے سے کچھ ہوگا۔ رونے سے ماں دودھ پلاتی ہے۔ شیر اپنا شکار نہیں چھوڑتا۔ روؤ اس کے سامنے جس میں دیا اور دھرم ہو ایک بار یہاں

بڑا بھاری جلسہ ہوا۔ ایک صاحب بہادر کھڑے ہوکر خوب اُچھلے کودے۔ جب وہ نیچے آئے تو میں نے پوچھا۔ صاحب تم دیس کا کیا سوراج دوگے۔ تم بھی بڑی طلب لوگے۔ تم بھی بنگلوں میں رہوگے۔ پہاڑوں کی ہوا کھاؤ گے۔ انگریزی ٹھاٹ بنائے گھومو گے اس سوراج سے دیس کا کیا کلیان ہوگا۔ تمھاری اور تمھارے بھائی بندوں کو بھلے آرام اور ٹھاٹ ملے اور دیس کا تو کوئی بھلا نہ ہوگا تب بگلیں جھانکنے لگے۔ تمھیں ہجاروں کی طلب چاہیے۔ گریب کسان کو ایک جوں سوکھا چبینا بھی نہیں ملتا۔ اسی کا لہو چوس کر تو سرکار تمھیں ہدے دیتی ہے۔ کبھی ان غریبوں کا بھی دھیان آتا ہے۔ ابھی تمھارا راج نہیں ہے تب تو تم اتنا اینٹھتے ہو۔ جب تمھارا راج ہوگا۔ تب تو تم غریبوں کو پیس کر پی جاؤ گے۔

رما مہذب جماعت کی یہ فضیحت نہ سُن سکا۔ آخر وہ بھی تو اس جماعت کا ایک فرد تھا بولا۔ یہ بات تو نہیں ہے دادا کہ پڑھے لکھے آدمی کسانوں کا دھیان نہیں کرتے ان میں سے کتنے ہی کسان تھے یا ہیں۔ انھیں اگر یقین ہو کہ ہمارے تکلیف اُٹھانے سے کسانوں کا کوئی فائدہ ہوگا اور جو بچت ہوگی وہ کسانوں کے لیے خرچ کی جائے گی تو وہ خوشی سے تھوڑے مشاہرہ پر کام کریں۔ لیکن وہ دیکھتے ہیں کہ بچت دوسرے ہی ہڑپ کر جاتے ہیں تو وہ سوچتے ہیں کہ جب دوسروں ہی کو کھانا ہے تو ہم کیوں نہ کھائیں۔

دیبی۔ تو سوراج ملنے پر ہجار ہجار دو دو ہجار پانے والے پھر نہیں رہیں گے۔ وکیلوں کی لوٹ نہیں رہے گی۔ پولیس کو لوٹ بند ہوجائے گی۔

رما۔ تب سب کام کثرت رائے سے ہوگا۔ اگر کثرت کہے گی کہ سرکاری ملازموں کی تنخواہ گھٹا دی جائے تو گھٹ جائے گی۔ کسانوں کے فائدہ کے لیے کثرت جتنے روپے مانگے گی مل جائیں گے۔ کنجی کثرت رائے کے ہاتھوں میں رہے گی اور ابھی دس پانچ برس چاہے نہ ہو لیکن اس کے بعد کثرت رائے کسانوں اور مزدوروں ہی کی ہوگی۔

دیبی دین نے مسکرا کر کہا۔ بھیا! تم بھی ان باتوں کو سمجھتے ہو۔ میں نے بھی سوچا تھا۔ بھگوان کرے۔ کچھ دن ہو جیوں۔ اچھا اب کھانا پکاؤ۔ سانجھ کو چل کر کپڑے درجی کو دیے دیں گے!

جب اندھیرا ہوگیا تو دیبی دین نے آکر کہا۔ چلو کپڑے سلوا لیں۔

رما سر پر ہاتھ رکھے بیٹھا تھا۔ چہرہ غمگین تھا۔ بولا۔ دادا میں گھر نہ جاؤں گا۔

دیبی دین نے تعجب سے پوچھا۔ کیوں کیا بات ہوئی۔ رما کی آنکھیں آب گوں ہوگئیں بولا۔ کون سا منہ لے کر جاؤں۔ مجھے تو ڈوب مرنا چاہیے تھا۔

یہ کہتے کہتے یہ کھل کر رو پڑا۔ وہ درد دل جو اب تک بے ہوش پڑا ہوا تھا ٹھنڈے پانی کے یہ چھینٹے پاکر ہوش میں آگیا تھا۔ اور اس کی آہیں تیر کی طرح اس کے سارے وجود کو چھیدے ڈالتی تھیں۔ اسی نالہ و زاری کے خوف سے وہ اسے چھیڑتا تھا۔ گویا کوئی غم نصیب ماں اپنے بچہ کو اس لیے جگاتی ڈرتی ہو کہ وہ فوراً کچھ کھانے کو مانگنے لگے گا۔

(۲۷)

کئی دنوں کے بعد کوئی نو بجے رما کتب خانہ سے لوٹ رہا تھا کہ راستہ میں اسے کئی آدمی کسی شطرنج کے نقشہ کا ذکر کرتے ہوئے بولے۔ یہ نقشہ وہاں کے ایک ہندی روزانہ اخبار میں چھپتا تھا اسے حل کرنے کے لیے پچاس روپے انعام کا وعدہ تھا۔ ان آدمیوں کی زبانی معلوم ہوا کہ نقشہ بہت مشکل ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ وہاں کے کتنے ہی مشاق شطرنج بازوں نے اسے حل کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ مگر کچھ چیں نہ گئی۔ یکایک رما کو یاد آیا کہ کتب خانہ میں ایک اخبار پر بہت سے آدمی جھکے ہوئے تھے۔ اور نقشہ کو نقل کر رہے تھے۔ اب معلوم ہوا یہ بات تھی۔

رما کی ان میں سے کسی سے بھی جان پہچان نہ تھی۔ مگر وہ نقشہ دیکھنے کے لیے اتنا بے قرار ہوا کہ اس سے بغیر پوچھے نہ رہا گیا۔ بولا۔ آپ لوگوں میں کسی کے پاس یہ نقشہ ہے۔

ان جوانوں نے ایک کمبل پوش دہقان کو یہ سوال کرتے سنا تو سمجھے کوئی عطائی ہوگا۔ ایک نے بے اعتنائی سے کہا۔ ہاں ہے تو مگر تم دیکھ کر کیا کروگے۔ یہاں اچھے اچھے غوطے کھا رہے ہیں۔ ایک صاحب نے جو شطرنج میں اپنا ثانی نہیں رکھتے اسے حل کرنے کے لیے اپنے پاس سے سو روپے دینے کا وعدہ کیا ہے۔

دوسرا نوجوان بولا۔ دکھا کیوں نہیں دیتے بھائی۔ کون جانے یہی بے چارے حل کر لیں۔ شاید انھیں کی طبیعت لڑ جائے۔

اس تحریک میں ہمدردی نہیں طنز تھا۔ اس میں یہ خیال چھپا ہوا تھا کہ ہمیں دکھانے

میں تو کوئی عذر نہیں ہے۔ دیکھ کر اپنی آنکھیں ٹھنڈی کرلو۔ مگر تم جیسے اُلو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ حل کیا کریں گے۔

ایک دکان میں جاکر انھوں نے رما کو نقشہ دکھایا۔ رما کو فوراً یاد آیا۔ یہ نقشہ کہیں دیکھا ہے۔ سوچنے لگا۔ کہاں؟

ایک نے چٹکی لی۔ آپ نے تو حل کرلیا ہوگا۔

دوسرا بولا۔ اب کیا ہی چاہتے ہیں۔

تیسرا۔ ذرا دو ایک چال ہمیں بتایئے!

رما نے برانگیختہ ہوکر کہا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ میں اسے حل ہی کرلوں گا۔ مگر ایسا نقشہ میں نے ایک بار حل کیا ہے۔ اور بہت ممکن ہے اسے بھی حل کرلوں۔ ذرا کاغذ پنسل دیجیے نقل کرلوں۔

گھر پہنچ کر رما نے اس نقشہ پر دماغ لڑانا شروع کیا۔ لیکن مہروں کی چالیں سوچنے کے عوض وہ یہی سوچ رہا تھا کہ یہ نقشہ دیکھا کہاں۔ شاید وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ یہ یاد آتے ہی اُسے نقشہ کا حل بھی سُوجھ جائے گا۔ دیگر جانداروں کی طرح دماغ بھی بہانہ تلاش کیا کرتا ہے۔ رما آدھی رات تک نقشہ کھولے بیٹھا رہا۔ شطرنج کی جو بڑی بڑی معرکے کی بازیاں کھیلی تھیں وہ سارے نقشے اُسے یاد تھے۔ مگر یہ نقشہ کہاں دیکھا؟

دفعتاً اس کی آنکھوں کے سامنے بجلی کوند گئی۔ اہا۔ راجا صاحب نے یہ نقشہ دیا تھا۔ لگاتار تین دن دماغ لڑانے کے بعد اس نے اُسے حل کیا تھا۔ پھر تو اسے ایک ایک چال یاد آگئی۔ ایک ہی لمحہ میں نقشہ حل ہوگیا۔ اس نے مسرت کے نشہ میں زمین پر دو تین قلابازیاں کھائیں۔ مونچھوں پر تاؤ دیا۔ آئینہ میں منہ دیکھا اور چارپائی پر لیٹ گیا۔

دیبی دین ابھی آگ سُلگا رہا تھا کہ رما خوش خوش آکر بولا۔ دادا جانتے ہو صداقت اخبار کا دفتر کہاں ہے؟

دیبی۔ جانتا کیوں نہیں ہوں۔ یہاں کون اخبار ہے۔ جس کا پتہ مجھے معلوم نہ ہو۔ صداقت کا اڈیٹر ایک رنگیلا آدمی ہے جو ہردم منہ میں پان بھرے رہتا ہے۔ مگر ہے ہمت کا دھنی۔ دو بار جیل ہو آیا ہے۔

رما۔ آج ذرا وہاں تک جاؤ گے؟

دیبی دین نے عذر کیا۔ مجھے بھیج کر کیا کروگے؟

رما۔ کیا بہت دُور ہے؟

دیبی۔ نہیں دُور تو نہیں ہے۔

رما۔ پھر بات کیا ہے؟

دیبی دین نے خطاوارانہ انداز سے کہا۔ بات کچھ نہیں ہے۔ بڑھیا بگڑتی ہے۔ اسے بچن دے چکا ہوں کہ سودیشی بدیشی کے جھگڑوں میں نہ پڑوں گا۔ نہ کسی اخبار کے دفتر میں جاؤں گا۔ اس کا دیا کھاتا ہوں تو اس کا حکم بھی تو بجانا پڑے گا!

رما نے مسکرا کر کہا۔ دادا تم دل لگی کرتے ہو۔ میرا ایک بڑا ضروری کام ہے۔ اس اخبار میں شطرنج کا ایک نقشہ چھپا ہے۔ جس پر پچاس روپے انعام ہے۔ جواب چھپ جائے۔ تو مجھے وہ انعام مل جائے۔ اخباروں کے دفتر میں اکثر خفیہ پولیس کے آدمی آتے جاتے ہیں۔ یہی ڈر ہے۔ نہیں میں خود چلا جاتا۔

دیبی دین۔ تمھارا وہاں جانا ٹھیک نہیں ہے!

رما۔ تو پھر کیا ڈاک سے بھیج دوں؟

دیبی۔ نہیں ڈاک سے کیا بھیجوگے۔ سادہ لفافہ اِدھر اُدھر ہوجائے تو تمھاری محنت اکارت جائے۔ رجسٹری کراؤ تو کہیں پرسوں پہنچے گا۔ کل اتوار ہے۔ کسی اور نے جواب بھیج دیا۔ تو انعام وہ مارے جائے گا۔ یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ اخبار والے دھاندلی کر بیٹھیں اور تمھارا جواب اپنے نام سے چھاپ کر روپے ہجم کرلیں۔

رما نے شش و پنج میں پڑکر کہا۔ تو میں ہی چلا جاؤں گا۔

دیبی۔ تمھیں میں نہ جانے دوں گا۔ کہیں پھنس جاؤگے بس۔

رما۔ پھنسنا تو ایک دن ہی ہے۔ کب تک چُھپا رہوں گا۔

دیبی۔ تو جب پھنسوگے۔ تب دیکھی جائے گی۔ لاؤ میں چلا جاؤں۔ بڑھیا سے کوئی بہانہ کروں گا۔

یہ کہتے ہوئے دیبی دین نے اپنا کالا کمبل اوڑھا۔ رما سے لفافہ لیا اور چل دیا۔

بڑھیا ساگ بھاجی لینے منڈی گئی تھی۔ آدھ گھنٹے میں سر پر ٹوکری رکھے اور ایک بڑا سا ٹوکرا مزدور کے سر پر رکھوائے آئی۔ پسینہ سے تر تھی۔ آتے ہی بولی کہاں گئے۔ ذرا

بوجھ تو اتارو۔ گردن ٹوٹ گئی۔

رما نے آگے بڑھ کر ٹوکری اتروا لی۔ اتنی بھاری تھی کہ سنبھالے نہ سنبھلتی تھی۔

بڑھیا نے پوچھا وہ کہاں گئے۔

رما نے بہانہ کیا۔ مجھے تو نہیں معلوم ابھی اسی طرف گئے ہیں۔

بڑھیا نے مزدور کے سر سے ٹوکرا اتروایا اور زمین پر بیٹھ کر ایک ٹوٹی ہوئی پنکھیا جھلتی ہوئی بولی۔ چرس کی چاٹ لگی ہوئی گی اور کیا؟ میں مر مر کر کماؤں اور یہ بیٹھے بیٹھے موج اڑاویں۔ چرس پئیں!

رما جانتا تھا۔ دیبی دین چرس پیتا ہے۔ لیکن بڑھیا کو ٹھنڈا کرنے کے لیے بولا۔ کیا چرس پیتے ہیں۔ میں نے تو نہیں دیکھا۔

بڑھیا نے پیٹھ کی ساڑھی ہٹا کر اسے پنکھے کی ڈنڈی سے کھجلاتے ہوئے کہا۔ ان سے کوئی نشہ چھوٹا ہے۔ چرس یہ پئیں۔ گانجہ یہ پئیں۔ سراب انھیں چاہیے۔ بھنگ انھیں چاہیے۔ ہاں ابھی تک اپھیم نہیں کھائی۔ یا رام جانے کھاتے ہوں۔ میں کون ہردم دیکھتی رہتی ہوں۔ میں تو سوچتی ہوں۔ کون جانے آگے کیا ہو۔ ہاتھ میں چار پیسے رہیں گے تو پرائے بھی اپنے ہوجائیں گے۔ مگر اس بھلے آدمی کو رتی بھر پھکر نہیں ہوتی۔ کبھی تیرتھ ہے کبھی کچھ۔ کبھی کچھ۔ میرا تو ناک میں دم آگیا۔ بھگوان اُٹھا لیتے تو گلا چھوٹ جاتا۔ تب یاد کریں گے لالہ۔ تب جگو کہاں ملے گی جو کما کما کے کُل چھرے اُڑانے کو دیا کرے گی۔ تب سر پر ہاتھ رکھ کر نہ روئیں تو کہہ دینا۔ کوئی کہتا تھا (مزدور سے) کئے پیسے ہوئے تیرے۔

مزدور نے بیڑی جلاتے ہوئے کہا۔ بوجھا دیکھ لو دائی۔ گردن ٹوٹ گئی۔

جگو نے بے رحمانہ انداز سے کہا۔ ہاں گردن ٹوٹ گئی۔ بڑے ناجک ہونا۔ یہ لے کل پھر چلے آنا۔

مزدور چلا گیا۔ تو بڑھیا کو حساب کی یاد آئی۔ رما سے بولی۔ بھیا! جرا آج کا کھرچا تو ٹانک لو۔ بجار میں تو جیسے آگ لگ گئی ہے۔

بڑھیا چھبڑیوں میں چیزیں لگا لگا کر رکھتی جاتی تھی اور حساب بھی لکھاتی جاتی تھی آلو۔ ٹماٹر۔ کدو۔ کیلے۔ پالک۔ سیم سب چیزوں کا تول اور دَر اسے یاد تھا۔ رما سے دوبارہ

پڑھواکر سُنا تب اسے اطمینان ہوا۔ ان کاموں سے فرصت پاکر اس نے اپنی چلم بھری اور موڑھے پر بیٹھ کر پینے لگی۔ لیکن اس کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ تمباکو کا مزا لینے کے لیے نہیں دل جلانے کے لیے پی رہی ہے۔ ایک لمحہ کے بعد پھر بولی۔ دوسری عورت ہوتی تو گھڑی بھر ان کے ساتھ تباہ نہ ہوتا۔ گھڑی بھر۔ پہر رات سے چکّی میں جت جاتی ہوں اور دس بجے رات تک دکان پر بیٹھی ستی ہوتی رہتی ہوں۔ کھاتے پیتے بارہ بجتے ہیں تب جاکر چار پیسے دکھائی دیتے ہیں اور میں جو کچھ کماتی ہوں اسے یہ نشے میں اُڑا دیتا ہے۔ سات کوٹھڑی میں چھپا کر رکھوں۔ مگر اس کی نگاہ پہنچ جاتی ہے۔ کبھی ایک آدھ چیز بنوا لیتی ہوں تو وہ آنکھوں میں گڑنے لگتی ہے۔ بھگوان نے لڑکوں کا سکھ بھوگنا نہیں لکھا تھا۔ تو کیا کروں۔ چھاتی پھاڑ کر مرجاؤں۔ مانگنے سے موت بھی تو نہیں ملتی۔ سکھ بھوگنا ہوتا تو جوان بیٹے کیوں چل دیتے۔ اور اس پیکڑ کے ہاتھوں میری یہ سانت ہوتی۔ اسی نے سودیشی کے جھگڑے میں پڑھ کر میرے لالوں کی جان لی۔ آؤ اس کوٹھڑی میں بھیا تمھیں مگدر کی جوڑی دکھاؤں۔ دونوں اس جوڑی کے پانچ پانچ سو ہاتھ پھیرتے تھے۔

اندھیری کوٹھڑی میں جاکر رما نے مگدر کی جوڑی دیکھی۔ ان پر وارنش تھی۔ صاف ستھری گویا کسی نے ابھی پھیر کر رکھ دیا ہو۔ بڑھیا نے غرور آمیز نظروں سے دیکھ کر کہا۔ لوگ کہتے تھے یہ جوڑی مہا باہمن کو دے دے۔ تجھے دیکھ دیکھ کر کلک ہوگا۔ میں نے کہا یہ جوڑی میرے لالوں کی جوڑی ہے۔ یہی میرے دونوں بیٹے ہیں۔

آج رما کے دل میں بڑھیا کی جانب سے بے اندازہ عقیدت پیدا ہوئی کتنا زاہدانہ توکل ہے! کتنی پاکیزہ محبت۔ جس نے لکڑی کے ان دو ٹکڑوں کی زندگی عطا کر رکھی ہے۔ رما نے جگو کو حرص اور طمع میں ڈوبی ہوئی پیسے پر جان دینے والی نازک جذبات سے عاری سمجھ رکھا تھا۔ آج اسے معلوم ہوا کہ ضعیفہ کا دل کتنا نازک، کتنا دلیر، کتنا مہر پرور ہے۔

بڑھیا نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے آج دونوں کے دل رشتہ محبت میں مربوط تھے۔ ایک طرف مادرانہ شفقت تھی دوسری طرف فرزندانہ سعادت مندی۔ وہ کدورت جو اب تک نادانستہ طور پر دونوں کو الگ کیے ہوئے تھی۔ آج یکایک مٹ گئی۔

بڑھیا نے کہا۔ منہ ہاتھ دھو لیا ہے بیٹا! بڑے میٹھے سنترے لائی ہوں۔ ایک لے کر

چکھو تو۔

رما نے سنترہ کھاتے ہوئے کہا۔ آج سے میں تمھیں اماں کہوں گا۔

بڑھیا کے ٹھنڈے، خشک بے نور اور بخیل آنکھوں سے موتی کے سے دو قطرے نکل پڑے۔

اتنے میں دیبی دین دبے پاؤں آکر کھڑا ہوگیا۔ بڑھیا نے تڑپ کر پوچھا۔ اتنے سویرے کدھر سواری گئی تھی سرکار کی؟

دیبی دین نے سادگی سے مسکراکر کہا۔ کہیں نہیں جرا ایک کام سے چلا گیا۔

"کیا کام تھا جرا میں بھی سنوں یا میرے سننے کے لائق نہیں ہے"

"پیٹ میں درد تھا۔ بید جی کے پاس چورن لینے چلا گیا تھا۔"

"جھوٹے ہو تم۔ اڑوس سے جو تمھیں جانتا نہ ہو۔ تم چرس کی ٹوہ میں گئے تھے۔"

"نہیں تیرے سر کی قسم تو جھونٹ مونٹ مجھے بدنام کرتی ہے۔"

تو پھر کہاں گئے تھے تم۔"

"بتا تو دیا۔ رات کو کھانا دو کور جیادہ کھا گیا تھا سو پیٹ پھول گیا اور کھٹی کھٹی"

"جھوٹ ہے سراسر جھوٹ۔ تمھارا منہ صاپھ کہے دیتا ہے کہ یہ بہانہ ہے تم چرس یا گانجے کی ٹوہ میں گئے تھے۔ میں ایک نہ مانوں گی۔ تمھیں اس بڑھاپے میں نسے کی سوجھتی ہے یہاں میری مرن ہوئی جاتی ہے۔ سویرے کے گئے گئے نو بجے لوٹے ہیں۔ جیسے کوئی ان کی یہاں لونڈی ہے۔"

دیبی دین نے ایک جھاڑو لے کر دکان میں جھاڑو لگانا شروع کیا۔ بڑھیا نے اس کے ہاتھ سے جھاڑو چھین لی اور پوچھا۔ تم اب تک تھے کہاں۔ جب تک یہ نہ بتاؤ گے گھر میں گھسنے نہ دوں گی۔

دیبی دین نے سٹ پٹا کر کہا۔ کیا کرے گی۔ پوچھ کر۔ ایک اخبار کے دپھتر میں گیا تھا جو چاہے سجا دے۔

بڑھیا نے ماتھا ٹھونک کر کہا۔ تم نے پھر وہی لت پکڑی۔ تم نے کان نہ پکڑا تھا کہ اب پھر کبھی ادھر نہ جاؤں گا۔ بولو یہی منہ تھا کہ کوئی اور؟

"تو بات تو سمجھتی نہیں بگڑنے لگتی ہے۔"

"کھوب سمجھتی ہوں۔ اکھبار والے دنگا مچاتے ہیں اور گریبوں کو جیل لیجاتے ہیں۔ آج بیس سال سے دیکھ رہی ہوں۔ کیا بڑھاپے میں جیل کی روٹیاں توڑوگے۔"

دیبی دین نے ایک لفافہ رما ناتھ کو دے کر کہا۔ یہ روپے ہیں۔ بھیا گن لو۔ یہ روپے تو وصول کرنے گیا تھا جی نہ مانتا ہو تو آدھے لے لے۔

بڑھیا نے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ اچھا تو تم اپنے ساتھ بھیا کو بھی ڈبانا چاہتے ہو۔ تمھارے روپے میں آگ لگادوں گی۔ تم روپے مت لینا بھیا۔ مصیبت میں پھنس جاؤگے۔ اب سیت میں آدمی نہیں ملتے تو سب لالچ دے کر لوگوں کو پھانستے ہیں۔ باجار میں پہرا دلا دیں گے عدالت میں گواہی کرادیں گے۔ پھینک دو اس کے روپے۔ جتنے روپے چاہو مجھ سے لے جاؤ۔

جب رما ناتھ نے سارا قصہ کہا تو بڑھیا کی تشفی ہوئی۔ چہرہ کی وہ تندی غائب ہوگئی خوش ہوکر بولی۔ اس میں سے میرے لیے کیا لاؤگے بیٹا!

رما نے لفافہ اس کے سامنے رکھ کر کہا۔ تمھارے ہی روپے تو ہیں اماں۔ میں روپے لے کر کیا کروں گا؟

"پھر کیوں نہیں بھیج دیتے؟"

"میرا گھر یہی ہے اماں! کوئی دوسرا گھر نہیں ہے!"

بڑھیا کا حسرت نصیب دل شگفتہ ہوگیا۔ اس فرزندانہ محبت کے لیے کتنے دنوں سے اس کی روح بے قرار تھی۔ اس حسین دل میں محبت کا جو خزانہ جمع ہوگیا۔ وہ سب ماں کے سینے میں جمع ہونے والے دودھ کی طرح بیٹے پر نثار ہونے کے لیے للچا اُٹھا۔

بڑھیا نے نوٹوں کو گن کر کہا۔ پچاس ہیں بیٹا! پچاس مجھ سے اور لے لو۔ چائے کا پتیلا رکھا ہوا ہے۔ چائے کی دکان کھول لو۔ یہیں ایک طرف چار پانچ موڑھے اور ایک میج رکھ لینا۔ دو دو گھنٹہ سانجھ سویرے بیٹھ جاؤگے تو گجر بھر کو مل جائے گا۔

دیبی دین بولا۔ تب چرس کے پیسے میں اس دکان سے لے لیا کروں گا۔

بڑھیا نے مسرور اور مخمور آنکھوں سے دیکھ کر کہا۔ کوڑی کوڑی کا حساب لے لوں گی اس پھیر میں نہ رہنا۔

رما اپنے کمرہ میں گیا تو اس کا دل بہت خوش تھا۔ آج اسے وہی مسرت ہورہی تھی

جو گھر کی یاد دلاتی تھی۔ گھر پر جو پیار ملتا تھا وہ اس کا حق تھا۔ یہاں جو پیار ملا گویا آسمان سے ٹپکا تھا۔

وہ نہا دھوکر پوجا کا سوانگ بھرنے بیٹھا کہ بڑھیا آکر بولی۔ بیٹا تمھیں روٹی بنانے میں بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ میں نے ایک مسرانی ٹھیک کردی ہے۔ وہ تمھارا کھانا پکا دیا کرے گی دھرم کرم سے رہتی ہے۔ بھیا۔ ایسی بات نہیں ہے!

ان ضعیف آنکھوں میں گہری، لازوال مادریت جھلک رہی تھی۔ اونچ نیچ اور اعلیٰ و ادنیٰ کی تمیز خود بخود مٹ گئی۔ بولا۔ جب تم میری ماں ہوگئیں تو پھر کیا فرق۔ میں تمھارے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کھاؤں گا۔

بڑھیا نے زبان دانتوں سے دبا کر کہا۔ ارے نہیں بیٹا۔ میں تمھارا دھرم نہ لوں گی۔ کہاں تم براہمن کہاں ہم کھٹک۔ ایسا بھی کہیں ہوا ہے؟

"میں تمھاری رسوئی میں کھاؤں گا۔ جب ماں باپ کھٹک ہیں تو بیٹا بھی کھٹک ہی ہے۔"

"اور جو تمھارے گھر والے سنیں تو کیا کہیں۔"

"مجھے کسی کے کہنے سننے کی پرواہ نہیں ہے۔ آدمی گناہ سے نیچا ہوتا ہے۔ کھانے پینے سے نیچا نہیں ہوتا۔ پریم سے جو کھانا ملتا ہے وہی پاک ہوتا ہے۔ اس سے تو دیوتا بھی انکار نہیں کرسکتے۔"

بڑھیا کے دل میں بھی اپنے ذات کی امتیاز کا جذبہ بیدار ہوا۔ بولی بیٹا! کھٹک کی کوئی نیچی ذات نہیں ہے۔ ہم لوگ براہمن کے ہاتھ کا بھی بھوجن نہیں کھاتے۔ کہار کے ہاتھ کا پانی تک نہیں پیتے۔ ماس مچھلی ہاتھ سے نہیں چھوتے۔ کوئی کوئی سراب پیتے ہیں۔ لیکن چھپ کر۔ اس نے کسی کو نہیں چھوڑا بیٹا! بڑے بڑے تلک دھاری گٹاگٹ پیتے ہیں لیکن میری روٹیاں تمھیں اچھی لگیں گی۔

رما نے مسکرا کر کہا۔ پریم کی روٹیوں میں امرت رہتا ہے۔ چاہے گیہوں کی ہوں یا باجرے کی۔

بڑھیا یہاں سے چلی تو گویا آنچل میں مسرت کا خزانہ بھرے ہوئے ہو۔

جب سے رما چلا گیا تھا۔ رتن کو جالپا کے بارے میں بہت تشویش ہوگئی۔ وہ کسی بہانہ سے اس کی مدد کرتے رہنا چاہتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی چاہتی تھی کہ جالپا کسی طرح تاڑ نہ جائے۔ اگر کچھ روپے خرچ کرکے بھی وہ رما کا پتہ لگا سکتی۔ تو خوشی سے خرچ کردیتی۔ جالپا کی وہ روتی ہوئی آنکھیں دیکھ کر اس کا دل مسوس اُٹھتا تھا۔ وہ اُسے بشاش دیکھنا چاہتی تھی۔ اپنے اندھیرے رونے گھر سے اوب کر وہ جالپا کے گھر چلی جایا کرتی تھی۔ وہاں گھڑی بھر ہنس بول لینے سے اس کا دل خوش ہوجاتا تھا۔ اب بھی وہاں وہی نحوست چھا گئی۔ یہاں آکر اسے محسوس ہوتا تھا کہ میں بھی دنیا میں ہوں۔ اس دنیا میں جہاں زندگی ہے۔ تمنا ہے محبت ہے اور مسرت ہے۔ اس کی اپنی زندگی تو قرض کو قربان گاہ کی نذر ہوچکی تھی۔

اس میں شبہ نہیں کہ شہر کے معزز اور خوش حال گھروں سے رتن کے مراسم تھے لیکن جہاں اعزاز تھا وہاں تکلف تھا۔ نمائش تھی۔ حسد تھا۔ غیبت تھی۔ کلب کی صحبت سے بھی اسے نفرت ہوگئی تھی۔ وہاں تفریح ضرور تھی۔ لیکن مردوں کی عاشقانہ نگاہیں بھی تھیں۔ بے قرار دل بھی۔ رندانہ بذلہ سنجیاں بھی۔ جالپا کے گھر اگر وہ شان نہ تھی۔ وہ دولت نہ تھی۔ تو وہ نمائش بھی نہ تھی۔ وہ تنگ دل بھی نہ تھی۔ رما جوان تھا۔ خوش رُو تھا۔ ممکن ہے شوقین بھی ہو۔ مگر رتن کو ابھی تک اس کے متعلق کسی قسم کا شبہ کرنے کا موقعہ نہ ملا تھا اور جالپا جیسی نازنین کی موجودگی میں اس کا امکان بھی نہ تھا۔

زندگی کے بازار میں اور سبھی دکانداروں کی دغابازیوں سے تنگ آکر اس نے اس چھوٹی سی دکان میں آکر پناہ لی تھی۔ مگر یہ دکان ٹوٹ گئی۔ اب وہ کس بازار میں زندگی کی جنس خریدے گی سچّا مال پائے گی۔

ایک دن وہ گراموفون لائی اور شام تک بجاتی رہی۔ دوسرے دن تازہ میووں کی ایک ٹوکری لاکر رکھ گئی۔ جب وہ آتی تو کوئی نہ کوئی سوغات لے آتی۔ اب تک وہ جاگیشوری سے بہت کم ملتی تھی۔ مگر اب اکثر اس کے پاس آبیٹھتی اور اِدھر اُدھر کی باتیں بھی کرتی۔ کبھی کبھی اس کے سر میں تیل ڈالتی۔ اور اس کے بال گوندھتی۔ گوپی اور بشمبر سے بھی اب اُسے محبت ہوگئی تھی۔ کبھی کبھی دونوں کو موٹر پر سیر کرانے لے جاتی۔ اسکول سے آتے

ہی دونوں اس کے بنگلے پر پہنچ جاتے اور دوسرے لڑکوں کے ساتھ کھیلتے ان کے شورغل میں رتن کو دلی مسّرت حاصل ہوتی تھی۔

ایک دن رتن آئی تو اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ آنکھیں سرخ تھیں۔ جالپا نے پوچھا کیا آج طبیعت اچھی نہیں ہے؟

رتن نے غم ناک لہجہ میں کہا۔ طبیعت تو اچھی ہے مگر آج رات بھر جاگنا پڑا۔ رات سے وکیل صاحب کو بہت تکلیف ہے۔ جاڑوں میں انھیں دمہ کا دورہ ہوجاتا ہے۔ بے چارے جاڑوں بھر دوائیں کھاتے رہتے ہیں۔ مگر یہ مرض گلا نہیں چھوڑتا۔ کلکتہ میں ایک نامی بید ہیں اب کے انھیں سے علاج کرانے کا ارادہ ہے۔ کل چلی جاؤں گی۔ مجھے ساتھ لے جانے کا ارادہ تو نہیں ہے۔ کہتے ہیں وہاں بڑی تکلیف ہوگی۔ لیکن میرا دل نہیں مانتا۔ کسی کو ساتھ تو رہنا ہی چاہیے۔ وہاں دو بار ہو آئی ہوں اور جب گئی ہوں بیمار ہوگئی ہوں۔ مجھے وہاں ذرا بھی اچھا نہیں لگتا۔ لیکن اپنے آرام کو دیکھوں یا ان کی بیماری کو دیکھوں۔ اگر کوئی میرا سب کچھ لے کر بھی انھیں اچھا کردے تو میں خوشی سے دے دوں!

جالپا نے پوچھا۔ یہاں کسی بید کو نہیں بلایا۔

"یہاں کے بیدوں کو دیکھ چکی۔ بید۔ ڈاکٹر۔ حکیم کوئی تو نہیں بچا۔"

"پھر کب تک آؤگی؟"

"کچھ ٹھیک نہیں۔ ان کی بیماری پر ہے۔ ایک ہفتہ میں آجاؤں یا مہینہ دو مہینے لگ جائیں۔ مگر جب تک بیماری کی جڑ نہ ٹوٹ جائے نہ آؤں گی۔"

تقدیر غیب میں بیٹھی ہوئی ہنس رہی تھی۔ جالپا دل میں مسکرائی۔ جس بیماری کی جڑ جوانی میں نہ ٹوٹی بڑھاپے میں کیا ٹوٹے گی۔

ایک لمحہ کے بعد رتن نے کہا۔ تم بھی چلتیں تو بڑا مزہ آتا۔

جالپا نے دردناک انداز سے کہا۔ کیسے چلوں بہن! جانے بھی پاؤں۔ یہاں دن بھر آس لگی رہتی ہے۔ کوئی خبر آتی ہوگی۔ وہاں میرا جی اور بھی گھبرائے گا۔

"میرا دل تو کہتا ہے بابو جی کلکتے ہی میں ہیں۔"

"تو ذرا اِدھر اُدھر تلاش کرنا۔ اگر کوئی خبر ملے تو مجھے اطلاع دینا۔"

"اس کے لیے تمھیں کہنے کی ضرورت نہیں ہے جالپا۔"

"یہ مجھے معلوم ہے۔ خط برابر بھیجتی رہو گی۔"

"ہاں ضرور۔ روز نہیں تو ایک روز ناغہ دے کر ضرور لکھوں گی۔"

جالپا پان بنانے لگی۔ رتن اس کے چہرہ کی طرف منتظر آنکھوں سے تاکتی رہی گویا کچھ کہنا چاہتی ہے۔ مگر حجاب کے باعث کچھ نہیں کہہ سکتی۔ جالپا نے پان دیتے وقت اس کے دل کی بات بھانپ کر کہا۔ کیا ہے بہن کیا کہہ رہی ہو؟

"میرے پاس کچھ روپے ہیں۔ تم رکھ لو۔ میرے پاس رہیں گے تو خرچ ہو جائیں گے۔"

جالپا نے مسکرا کر کہا۔ اور جو مجھ سے ہی خرچ ہو جائیں۔

رتن خوش ہو کر بولی۔ تمھارے ہی تو ہیں بہن۔ کسی غیر کے تو نہیں ہیں۔

جالپا خیال میں ڈوبی ہوئی زمین کی طرف تاکتی رہی۔ کچھ جواب نہ دیا۔ رتن نے سمجھا اسے اعتراض ہے۔ شکوہ کے انداز سے بولی۔ تم نے کچھ جواب نہ دیا بہن۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ تم مجھ سے کھچی کیوں رہتی ہو۔ میں چاہتی ہوں مجھ میں اور تم میں ذرا بھی مغائرت نہ رہے لیکن تم مجھ سے دُور بھاگتی ہو۔ مان لو۔ میرے سو پچاس روپے تمھیں سے خرچ ہو گئے۔ تو کیا ہوا۔ بہنوں میں تو ایسا کوڑی کوڑی کا حساب نہیں ہوتا۔

جالپا نے متین لہجہ میں کہا۔ کچھ کہوں بُرا تو نہ مانو گی؟

"بُرا ماننے کی بات ہو گی تو ضرور بُرا مانوں گی۔"

ممکن ہے تمھیں بُری لگے۔ لیکن جو تمھارا دل دکھانے کے لیے نہیں کہتی۔ تم اپنے دل میں سوچو۔ تمھارے اس بہناپے میں رحم یا امداد کا خیال شامل ہے یا نہیں۔ تم میری غریبی پر ترس کھاکر۔

رتن نے لپک کر دونوں ہاتھوں سے اس کا منہ بند کر دیا اور بولی۔ بس اب رہنے دو۔ تم چاہے جو سمجھو۔ مگر یہ خیال کبھی میرے دل میں نہ تھا۔ نہ ہو سکتا ہے۔ مجھے تو اگر بھوک لگی ہو تو تم سے بے تکلف کہہ بیٹھوں۔

جالپا نے اسی بیگانہ پن سے کہا۔ تم ایسا کہہ سکتی ہو۔ تم جانتی ہو کہ کسی دوسرے موقعہ پر تم روٹیوں کے عوض میوے کھلا سکتی ہو۔ لیکن ایشور نہ کرے کوئی ایسا موقع آئے جب تمھارے گھر میں روٹی کا ٹکڑا نہ ہو۔ تو شاید تم اتنی بے تکلف نہ ہو سکو۔

رتن نے بے ساختہ پن سے کہا۔ مجھے اس حالت میں بھی تم سے مانگنے میں حجاب نہ ہوگا۔ دوستی حالات کی پرواہ نہیں کرتی۔ ایسی باتیں کرکے تم میرا دروازہ بند کر رہی ہو۔ میں نے سمجھا تھا تمھارے ساتھ زندگی کے دن کاٹ دوں گی۔ لیکن تم ابھی سے دامن چھڑائے لیتی ہو۔ بدنصیبوں کو پریم کی بھیک بھی نہیں ملتی۔

یہ کہتے کہتے رتن کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ جالپا اپنے کو غم نصیب سمجھتی تھی اور غم نصیبوں کی تلخ حق کے اظہار کی آزادی ہوتی ہے۔ لیکن اب اسے معلوم ہوا کہ رتن کی مصیبت اس کی مصیبت سے کہیں زیادہ دل شکن ہے۔ جالپا کو شوہر کے لوٹ آنے کی اب بھی امید تھی۔ اس کے آتے ہی اس کے ایامِ غم بھول جائیں گے۔ اس کی امیدوں کا آفتاب پھر روشن ہوگا۔ اس کی آرزوئیں پھر پھلیں پھولیں گی۔ آنے والا زمانہ اپنی ساری آرزوؤں اور ترغیبوں کے ساتھ اس کے سامنے تھا۔ روشن، دل فریب اور وسیع۔ رتن کا مستقبل کیا تھا، کچھ نہیں، گہری تاریکی۔

رتن آنکھیں پونچھ کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ "خطوں کا جواب دیتی رہنا۔"

جالپا نے کہا۔ روپے دیتی جاؤ!

رتن نے تھیلی سے نوٹوں کا ایک بنڈل نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ لیکن اس کے چہرے پر خوشی نہ تھی۔ جالپا نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ کیا برا مان گئیں؟

رتن نے روٹھ کر کہا۔ بُرا مان کر تمھارا کیا کرلوں گی؟

جالپا نے اس کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ فرطِ الفت سے اس کا دل لہلہا اُٹھا۔ رتن سے اُسے اتنی محبت کبھی نہ ہوئی تھی۔ وہ اب تک اس سے کھنچتی تھی۔ جلتی تھی۔ آج سے رتن کی اصلی صورت نظر آئی۔ اس نے سوچا۔ یہ سچ مچ بدنصیب ہے اور مجھ سے زیادہ۔ ایک لحہ میں رتن آنکھوں میں آنسو اور ہنسی ایک ساتھ بھرے ہوئے رخصت ہوگئی۔

(۲۹)

کلکتہ میں وکیل صاحب کے ٹھہرنے کے لیے پہلے ہی انتظام کرلیا گیا تھا۔ کوئی تکلیف نہ ہوئی۔ رتن نے مہراج اور ٹیمل کہار کو ساتھ لے لیا تھا۔ دونوں وکیل صاحب کے پرانے ملازم تھے اور گھر کے آدمی ہوگئے تھے۔ شہر کے باہر ایک بنگلہ میں تین کمرے لے لیے گئے تھے۔ احاطہ میں طرح طرح کے پھول پودے لگے ہوئے تھے۔ بڑی فرحت کی جگہ

تھی۔ قرب و جوار میں اور کتنے ہی بنگلے تھے۔ شہر کے لوگ ادھر ہوا خوری کو جایا کرتے تھے۔ اور ہرے ہوکر لوٹتے تھے۔ مگر رتن کو یہ جگہ پھاڑے کھاتی تھی۔ بیمار کے تیمار دار بھی بیمار ہوجاتے ہیں۔ افسردہ دلوں کے لیے جنت بھی ویران ہے۔

سفر نے وکیل صاحب کو اور بھی مضمحل کردیا۔ دو تین دن تو ان کی حالت پہلے سے ابتر ہوگئی۔ لیکن معالجہ شروع ہونے کے بعد وہ کچھ سنبھلنے لگے۔ رتن صبح سے آدھی رات تک ان کی چارپائی کے پاس ہی کرسی ڈالے بیٹھی رہتی۔ وکیل صاحب چاہتے تھے کہ وہ یہاں سے ہٹ جائے تو دل کھول کر کراہیں۔ اسے تشفی دینے کے لیے وہ اپنی حالت چھپانے کے لیے کوشش کرتے رہتے تھے۔

وہ پوچھتی آج کیسی طبیعت ہے تو پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہتے۔ آج تو جی بہت ہلکا معلوم ہوتا ہے۔ بے چارے ساری رات کروٹیں بدل کر کاٹتے تھے۔ مگر رتن پوچھتی رات نیند آئی تھی تو کہتے۔ ہاں خوب سویا۔ رتن جب کھانا لے کر جاتی تو رغبت نہ ہونے پر بھی کھا لیتے۔ رتن سمجھتی تھی۔ اب یہ اچھے ہو رہے ہیں۔ کبیراج سے بھی وہ یہی کیفیت بیان کرتی تھی۔ کبیراج بھی اپنے معالجہ کی کامیابی پر خوش تھے۔

ایک دن وکیل صاحب نے رتن سے کہا۔ مجھے خوف ہے کہ اچھا ہونے کے بعد میں مجھے تمھاری دوا نہ کرنی پڑے۔

رتن نے خوش ہوکر کہا اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا۔ میں تو ایشور سے مناتی ہوں کہ وہ تمھاری بیماری مجھے دے دیں۔

"شام کو گھوم آیا کرو۔ اگر بیمار پڑنے کی خواہش ہو تو میرے اچھے ہونے پر پڑنا۔"

"کہاں جاؤں۔ میرا تو کہیں جانے کو جی نہیں چاہتا۔ مجھے یہیں سب سے اچھا لگتا ہے۔

وکیل صاحب کو یکایک رما ناتھ کا خیال آگیا۔ بولے ذرا شہر کے پارکوں میں گھوم گھام کے دیکھو۔ شاید رما ناتھ کا پتہ چل جائے۔

رتن کو اپنا وعدہ یاد آگیا۔ اسے ملاقات ہوجانے کی اُمید نے ایک لمحہ کے لیے اسے بے تاب کردیا۔ کہیں وہ پارک میں بیٹھے مل جائیں تو پوچھوں۔ کہیئے بابو جی اب بھاگ کر کہاں جایئے گا۔ اس خیال سے اس کا چہرہ کھل اُٹھا۔ بولی۔ جالپا سے میں نے وعدہ تو کیا تھا۔

لیکن یہاں آکر بھول گئی۔

وکیل صاحب نے اصرار کر کے کہا۔ آج چلی جاؤ۔ آج کیا شام کو روز گھنٹے بھر ٹہل آیا کرو۔

رتن نے تشویش کے ساتھ کہا۔ لیکن فکر تو نہ لگی رہے گی۔

وکیل صاحب نے مسکرا کر کہا۔ میں تو اچھا ہو رہا ہوں۔

رتن بے دلی کے ساتھ بولی۔ اچھا چلی جاؤں گی۔

مگر رتن کو کل سے وکیل صاحب کی تشفی انگیز باتوں پر کچھ شبہ ہونے لگا تھا۔ ان کی صورت سے اچھے ہونے کی کوئی علامت نہیں نظر آتی تھی۔ اگر وہ اچھے ہو رہے ہیں۔ تو ان کا چہرہ روز بروز کیوں زرد ہوتا جاتا ہے۔ آنکھیں کیوں ہروقت بند رہتی ہیں۔ جسم کیوں گھلتا جاتا ہے۔ مہراج اور خدمت گار سے وہ اپنا شبہ نہ ظاہر کرسکتی تھی۔ کبیراج سے پوچھتے بھی شرم آتی تھی۔

اگر کہیں رما مل جائے تو ان سے پوچھتی۔ ممکن ہے کسی ڈاکٹر سے ان کی ملاقات ہو۔ ان کبیراج سے وہ کچھ کچھ مایوس ہوچلی تھی۔

جب رتن چلی گئی۔ تو وکیل صاحب نے ٹیمل سے کہا۔ مجھے ذرا اُٹھا کر بٹھا دو۔ ٹیمل پڑے پڑے کمر سیدھی ہوگئی۔ ایک پیالی چائے پلا دو۔ کئی دن ہوگئے۔ چائے کی صورت نہیں دیکھی۔ مجھے مارے ڈالتا ہے۔ دودھ کی صورت دیکھ کر بخار چڑھ آتا ہے۔ مگر ان کی خاطر سے پی لیتا ہوں۔ مجھے تو ان کبیراج کی دوا سے کچھ فائدہ نہیں معلوم ہوتا۔ تمھیں کیا خیال ہے۔

ٹیمل نے وکیل صاحب کو تکیہ کے سہارے بٹھا کر کہا۔ بابو جی یہ تو میں پہلے ہی کہنے والا تھا۔ بہو جی کے ڈر کے مارے نہیں کہتا تھا۔

وکیل صاحب ایک منٹ تک خاموش رہ کر بولے۔ میں موت سے نہیں ڈرتا ٹیمل! بالکل نہیں۔ مجھے دوزخ اور بہشت پر بالکل یقین نہیں ہے۔ اگر آدمی کو اپنے اعمال کے مطابق جنم لینا پڑتا ہے تو مجھے یقین ہے کہ میرا جنم کسی اچھے گھر میں ہوگا۔ تاہم مرنے کو جی نہیں چاہتا۔ سوچتا ہوں مرگیا تو کیا ہوگا؟

ٹیمل بولا۔ بابو جی آپ ایسی باتیں نہ کریں۔ بھگوان چاہیں گے تو آپ اچھے ہو

جائیں گے۔ کہیئے تو کل کسی دوسرے ڈاکٹر کو بلا لاؤں۔ آپ لوگ تو انگریجی پڑھے ہیں۔ کچھ مانتے ہی نہیں۔ مجھے تو کوئی دوسرا ہی پھیر معلوم ہوتا ہے۔ کبھی کبھی گنواروں کی بھی سُن لیا کیجیے۔ آپ مانو یا نہ مانو۔ میں تو کل ایک سیانے کو لاؤں گا!

وکیل صاحب نے منہ پھیر لیا۔ جن و آسیب کا وہ مذاق اُڑایا کرتے تھے۔ کئی سیانوں کو پیٹ چکے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ شعبدہ بازی ہے۔ بالکل ریاکاری۔ لیکن اس وقت انھیں اتنی طاقت بھی نہ تھی کہ نیمل کی اس تجویز سے اختلاف کرتے!

مہراج نے چائے لاکر کہا۔ سرکار چائے پی لیجیے!

وکیل صاحب نے چائے کے پیالے کو گرسنہ نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ لے جاؤ۔ اب نہ پیوں گا۔ بہو جی کو معلوم ہوگیا تو ناراض ہوں گی۔ ایک منٹ کے بعد پھر وہ بولے۔ کیوں مہراج جب سے میں آیا ہوں۔ میرا چہرہ کچھ ہرا ہوا ہے۔

مہراج نے نیمل کی طرف دیکھا۔ وہ ہمیشہ رُخ دیکھ کر رائے دیا کرتے تھے۔ خود اپنی رائے قائم کرنے کی صلاحیت ان میں نہ تھی۔ اگر نیمل نے کہا ہے۔ آپ اچھے ہو رہے ہیں تو وہ اس کی تائید کریں گے۔ نیمل نے اس کے خلاف کہا ہے تو انھیں بھی خلاف کہنا چاہیے۔ نیمل نے ان کی پریشانی کو بھانپ کر کہا ہرا کیوں نہیں ہوا ہے۔ ہاں مگر جتنا چاہیے اتنا نہیں ہوا ہے۔

مہراج بولے۔ ہاں کچھ ہرا جرور ہوا ہے مگر بہت کم۔

وکیل صاحب نے کچھ جواب نہ دیا۔ دو چار باتیں کرنے کے بعد انھیں ضعف ہوجاتا تھا اور دس پانچ منٹ خاموش پڑے رہتے تھے۔ شاید انہیں اپنی حالت کا واقعی علم ہوگیا تھا۔ اس کے چہرے پر عقل پر دماغ پر موت کا سایہ پڑنے لگا تھا۔ اگر کچھ امید تھی تو اتنی ہی کہ شاید دل کی کمزوری سے انھیں اپنی حالت سے مایوسی ہو رہی ہو۔ ان کا دم پہلے سے زیادہ پھولنے لگا تھا۔ کبھی کبھی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی سانس نیچے رہ جاتی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اب جان نکل جائے گی۔ نزع کی حالت طاری ہوجاتی تھی۔ کون جانے یہی حبس دم ذرا اور بڑھ کر زندگی کا خاتمہ کردے۔

سامنے باغ میں چاندنی کہرے کی چادر اوڑھے زمین پر پڑی سسک رہی تھی۔ پھول اور پودے سر جھکائے امید اور خوف سے بے قرار ہوکر گویا اس کی چھاتی پر ہاتھ رکھتے تھے

اس کے ٹھنڈے جسم پر ہاتھ پھیرتے تھے اور آنسوؤں کی دو بوندیں گرا کر پھر الم‌ناک آنکھوں سے تاکنے لگتے تھے۔

دفعتاً وکیل صاحب نے آنکھیں کھولیں۔ آنکھوں کے دونوں گوشوں میں آنسو کی دو بوندیں مچل رہی تھیں۔ پھر آہستہ سے بولے۔ ممل کیا سدھو آئے تھے۔ پھر اس سوال پر آپ ہی آپ شرمندہ ہوکر مسکراتے ہوئے بولے۔ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے سدھو آئے ہوں۔ پھر گہری سانس لے کر خاموش ہوگئے اور آنکھیں بند کرلیں۔

سدھو۔ اس بیٹے کا نام تھا جو جوان موت مرچکا تھا۔ اس وقت وکیل صاحب کو بار بار اسی کی یاد آرہی تھی۔ کبھی اس کا بچپن سامنے آجاتا۔ کبھی اس کی موت آنکھوں میں پھر جاتی۔ ان کا حافظہ کبھی اتنا روشن۔ کبھی اتنا صحیح نہ تھا۔

کئی منٹ کے بعد انھوں نے پھر آنکھیں کھول دیں اور اِدھر اُدھر کھوئی ہوئی آنکھوں سے دیکھا۔ انھیں ایسا معلوم ہوا کہ میری ماں آکر پوچھ رہی ہے۔ بیٹا تمھاری طبیعت کیسی ہے۔

دفعتاً انھوں نے ممل سے کہا۔ جاکر کسی وکیل کو بلا لاؤ۔ جلد آنا ورنہ بہو جی آتی ہوگی۔

اتنے میں موٹر کار کا ہارن سنائی دیا۔ اور ایک لمحہ میں رتن آپہنچی۔ وکیل کو بلانے کی بات ٹل گئی۔

وکیل صاحب نے چہرہ کو بشاش بنا کر پوچھا۔ کہاں کہاں ہو آئیں۔ کچھ رما ناتھ کا پتہ ملا؟

رتن نے ان کی پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ کئی جگہ گئی وہ کہیں نہیں دکھائی دیتے۔ اتنے بڑے شہر میں سڑکوں کا پتہ تو جلدی چلتا نہیں۔ وہ بھلا کیا ملیں گے۔ دوا کھانے کا وقت تو آگیا ہوگا۔

وکیل صاحب نے دبی زبان سے کہا۔ لاؤ کھا لوں۔

رتن نے دوا نکالی اور انھیں اُٹھا کر پلائی۔ اس وقت وہ نہ معلوم کچھ خائف سی ہو رہی تھی۔ ایک نامعلوم دہشت اس کے دل پر غالب تھی۔

یکایک اس نے کہا۔ ان لوگوں میں سے کسی کو تار دے دوں؟

وکیل صاحب نے پُرسوال نظروں سے دیکھا۔ پھر آپ ہی آپ اس کا مطلب سمجھ کر بولے۔ نہیں نہیں۔ کسی کو بلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ پھر ایک لمحہ کے بعد اپنے حواس کو مجمع کرنے کی کوشش کرکے بولے۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنی وصیت لکھا دوں جیسے ایک ٹھنڈی تیز نکیلی چیز رتن کے تلوؤں سے گھس کر سر سے نکل گئی۔ گویا اس کے جسم کی ساری بندشیں کھل گئیں سارے اعضاء بکھر گئے۔ جیسے نیچے سے زمین کھسک گئی۔ اوپر سے آسمان اڑ گیا اور اب وہ بے حس، بے جان۔ معلّق کھڑی ہے۔ روندھے ہوئے گلے سے بولی۔ گھر سے کسی کو بلاؤں۔ یہاں کوئی اپنا نہیں ہے!

اپنوں کے لیے رتن اس وقت بے قرار ہو اٹھی۔ کوئی بھی تو اپنا ہوتا جس پر وہ تکیہ کر سکتی۔ گھر کے لوگ آجاتے تو دوڑ دھوپ کرکے کسی دوسرے ڈاکٹر کو لاتے۔ وہ اکیلی کیا کرے۔ آخر بھائی بند اور کس دن کام آئیں گے۔ مصیبت میں ہی تو اپنے کام آتے ہیں۔ پھر یہ کیوں کہتے ہیں، کسی کو بلانے کی ضرورت نہیں۔

وصیت کی بات اُسے پھر یاد آگئی۔ یہ خیال کیوں ان کے دل میں پیدا ہوا؟ وید جی نے تو کچھ نہیں کہا۔ کیا ہونے والا ہے۔ ایشور یہ خیال اس کے دل کو بے چین کرنے لگا۔ اس کی طبیعت آواز بلند سے رونے کے لیے مائل ہوگئی۔ اپنی ماں یاد آئی۔ اپنی ماں کے آنچل میں منہ چھپا کر رونے کی تمنا دل میں پیدا ہوئی۔

مہراج نے آکر کہا۔ سرکار کھانا تیار ہے۔ تھالی پرسوں۔

رتن نے اُس کی طرف سخت نگاہوں سے دیکھا۔ وہ بغیر انتظار کیے چلا گیا۔

مگر ایک ہی لمحہ میں مہراج پر رتن کو رحم آگیا۔ اس نے کیا خطا کی۔ جو کھانے کے لیے پوچھنے آیا۔ کھانا بھی ایسی چیز ہے جسے کوئی چھوڑ سکے۔ وہ رسوئی میں جاکر بولی۔ تم لوگ کھا لو۔ مہراج مجھے آج بھوک نہیں ہے۔

مہراج نے اصرار کیا۔ دو ہی لقمے کھالو سرکار!

رتن کھٹک گئی۔ مہراج کے اصرار میں اتنا خلوص، اتنی ہمدردی بھری ہوئی تھی کہ رتن کو ایک طرح کی تشفی کا احساس ہوا۔ یہاں کوئی اپنا نہیں ہے۔ یہ کتنا غلط خیال تھا۔ مہراج نے اب تک رتن کو تند مزاج مالکن کی صورت میں دیکھا تھا۔ وہی مالکن آج اس کے سامنے کھڑی گویا ہمدردی کی بھیک مانگ رہی تھی۔

رتن نے پوچھا۔ کیوں مہراج تمھارا کیا خیال ہے۔ بابو جی کو اس کبیراج کی دوا سے کچھ فائدہ ہو رہا ہے۔

مہراج نے ڈرتے ڈرتے وہی الفاظ دوہرا دیے جو آج وکیل صاحب سے کہے تھے۔ کچھ کچھ تو ہو رہا ہے۔ مگر جتنا چاہیے اتنا نہیں۔

رتن نے مشتبہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ تم بھی مجھے دھوکا دیتے ہو مہراج۔

مہراج کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور بولے۔ بھگوان سب اچھا ہی کریں گے۔ بہو جی گھبرانے سے کیا ہوگا۔ اپنا تو کوئی اختیار نہیں ہے۔

رتن نے پوچھا۔ یہاں کوئی جوتشی تو نہ ملے گا۔

مہراج نے سرگرمی کے ساتھ کہا۔ یہ تو میں پہلے ہی کہنے والا تھا بہو جی۔ لیکن بابو جی کا مزاج تو جانتی ہو۔ ان باتوں سے کتنا چڑتے ہیں۔

رتن نے تاکید کرکے کہا۔ سویرے کسی کو ضرور بلا لانا۔

یہ کہتی ہوئی وہ کمرے میں آئی اور جالپا کو یہ خط لکھنے لگی۔

"بہن نہیں کہہ سکتی کہ کیا ہونے والا ہے۔ آج مجھے معلوم ہوا کہ میں کتنے بڑے مغالطہ میں پڑی ہوئی تھی۔ وکیل صاحب اب تک مجھ سے اپنی حالت چھپاتے تھے۔ مگر آج یہ بات ان کے قابو سے باہر ہوگئی۔ تم سے کیا کہوں۔ آج وہ وصیت لکھوانے جا رہے تھے۔ دل بہت گھبرا رہا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ تھوڑی سی سنکھیا کھا کر سو رہوں۔ ایشور کو دنیا رحیم اور کریم اور جانے کیا کیا کہتی ہے۔ میں کہتی ہوں۔ اس سے زیادہ بے رحم اور سنگ دل کوئی دشمن بھی نہیں ہوسکتا۔ پچھلی زندگی کا قصہ محض دل کو سمجھانے کے لیے ہے۔ جس سزا کا سبب ہی ہمیں معلوم نہ ہوا۔ اس سزا کی وقعت ہی کیا۔ وہ تو زبردست کی لاٹھی ہے جو اپنے لیے کوئی حیلہ گھڑ لیتی ہے۔ اس اندھیرے ہولناک۔ پُرخار شاہراہ زندگی میں مجھے صرف ایک ٹمٹماتا ہوا چراغ ملا تھا۔ اُسے آنچل میں چھپائے ایشور کا جس گاتی ہوئی اپنی حالت پر شاکر چلی جا رہی تھی۔ لیکن آج وہ چراغ بھی مجھ سے چھینا جا رہا ہے۔ اس اندھیرے میں میں کہاں جاؤں گی۔ کون میرا رونا سُنے گا۔ کون میری بانہہ پکڑے گا۔

بہن مجھے معاف کرنا۔ مجھے بابو جی کی تلاش کرنے کی فرصت ہی نہیں ملی۔ آج شہر کی سڑکوں کا چکر لگا آئی ہوں۔ کچھ موقع ملا تو پھر جاؤں گی۔

یہ خط لکھ کر رتن برآمدہ میں آئی۔ دیکھا وکیل صاحب کی سانس زوروں سے چل رہی تھی۔

(۳۰)

رات کے تین بج چکے تھے۔ رتن آدھی رات کے بعد آرام کرسی پر لیٹے ہی لیٹے جھپکیاں لے رہی تھی کہ یکایک وکیل صاحب کے گلے کی گھرگھراہٹ سن کر چونک پڑی۔ اُلٹی سانس چل رہی تھی۔ وہ ان کے سرہانے چارپائی پر بیٹھ گئی۔ اور ان کا سر اُٹھا کر اپنی جانگھ پر رکھ لیا۔ ابھی نہ جانے کتنی رات باقی تھی۔ اس نے میز پر رکھی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھا۔ ابھی تین بجے تھے۔ سویرا ہونے میں چار گھنٹے کی دیر تھی۔ کبیراج کہیں نو بجے آئیں گے۔ گھر میں چاروں طرف سوتا پڑا تھا۔ رتن کے دل پر خوف طاری ہوگیا۔ یہ منحوس رات کبھی ختم بھی ہوگی یا نہیں۔

کئی منٹ کے بعد وکیل صاحب کی سانس رُکی۔ سارا جسم پسینے میں تر تھا۔ ہاتھ سے رتن کو ہٹ جانے کا اشارہ کیا اور تکیہ پر سر رکھ کر آنکھیں بند کرلیں۔

ایک لمحہ میں انھوں نے ایک نحیف آواز میں کہا۔ رتن اب جدائی کا وقت آگیا۔ میری خطائیں .... انھوں نے دونوں ہاتھ جوڑ لیے اور رتن کی طرف بے کسانہ نظروں سے دیکھا کچھ لکھنا چاہتے تھے۔ مگر منہ سے آواز نہ نکلی۔ رتن نے چیخ کر پکارا۔ کیا ٹیمل مہراج دونوں مر گئے۔

مہراج نے آکر کہا۔ میں سویا تھوڑے بہو جی۔ بابو جی کی حالت ....

رتن نے ڈانٹ کر کہا۔ بکو مت جاکر کبیراج کو بُلا لاؤ۔ کہنا ابھی چلیے۔

مہراج نے فوراً اپنا پُرانا اوورکوٹ ڈالا۔ سوٹا اُٹھایا اور چل دیے۔ رتن اُٹھ کر آگ جلانے لگی کہ شاید سینک سے کچھ فائدہ ہو۔ خطرے کو سامنے دیکھ کر اس میں یاس کی ہمّت پیدا ہوئی۔ ساری گھبراہٹ سارا ضعف دور ہوگیا۔ اس کی جگہ اعتماد کی قوت پیدا ہوئی۔ فرض کے احساس نے اس کے سارے ادراک کو بیدار کردیا۔ اسٹوو جلا کر اس نے روئی کے گالوں سے وکیل صاحب کی چھاتی کو سینکنا شروع کیا۔ کوئی پندرہ منٹ تک متواتر سینکنے کے بعد وکیل صاحب کی سانس کچھ رُکی۔ رتن کے دونوں ہاتھ اپنے رخساروں پر رکھ کر بولے۔ تمھیں بڑی تکلیف ہو رہی ہے۔ رتن کیا جانتا تھا یہ وقت اتنی جلدی آجائے گا۔ میں

نے تمھارے اوپر بڑا ظلم کیا ہے۔ کتنا وحشیانہ ظلم۔ میں نے تمھاری زندگی غارت کردی۔ میری خطاؤں کو معاف کرنا۔

یہی آخری الفاظ تھے جو ان کے منہ سے نکلے۔ یہی زندگی کا آخری رشتہ تھا۔ یہی بزمِ حیات کا آخری دَور۔ رتن نے مایوس نظروں سے دروازے کی طرف دیکھا۔ ابھی تک مہراج کا پتہ نہ تھا۔ ہاں ٹیمل کھڑا تھا۔

رتن نے کہا۔ ٹیمل ذرا پانی گرم کروگے۔

ٹیمل نے وہیں کھڑے کھڑے کہا۔ پانی گرم کیا کروگی بہو جی۔ گئودان کرا دو۔ دو بوند گنگا جل منہ میں ڈال دو۔ رتن نے مرنے والے کی چھاتی پر ہاتھ رکھا۔ گویا ٹیمل کی باتیں اس کے کانوں تک پہنچی ہی نہیں۔ وکیل صاحب کا سینہ گرم تھا۔ اس نے پھر منتظر آنکھوں سے دروازہ کی طرف دیکھا۔ مہراج نہ نظر آئے۔ وہ اب سوچ رہی تھی۔ کبیراج آجاتے تو شاید ان کی حالت سنبھل جاتی۔ پچھتا رہی تھی کہ ان کو یہاں کیوں لائی۔ شاید راستے کی تھکان اور آب و ہوا کی تبدیلی نے مرض کو لا علاج کردیا۔ یہ پچھتاوا بھی ہو رہا تھا کہ میں شام کو سیر کرنے چلی گئی۔ شاید اتنی ہی دیر میں انھیں سردی لگ گئی ہو۔

لیکن پچھتاوے کی یہی باتیں نہ تھیں۔ اس آٹھ سال کی زندگی میں میں نے انھیں کیا آرام پہنچایا۔ وہ بارہ بجے رات تک قانونی کتابوں کا مطالعہ کیا کرتے تھے۔ میں پڑی سویا کرتی تھی۔ وہ موکلوں سے معاملہ مقدمہ کی باتیں کرتے تھے۔ میں باغیچہ اور بازاروں کی سیر کرتی تھی۔ میں نے انھیں کسبِ دولت کا محض ایک آلہ سمجھ لیا۔ وہ کتنا چاہتے تھے کہ میں ان کے ساتھ بیٹھوں اور باتیں کروں۔ لیکن میں بھاگتی پھرتی تھی۔ میں نے کبھی ان کے دل کے قریب جانے کی کوشش ہی نہیں کی۔ اپنے گھر میں چراغ نہ جلا کر دوسروں کے اُجالے گھر کا لطف اُٹھاتی رہی تفریح کے سوا مجھے اور کچھ سُوجھتا ہی نہ تھا۔ اپنے جلے ہوئے دل کو یوں تسکین دے کر میں خوش تھی۔ کھیر اور ملائی کی تھالی مجھے کیوں نہ ملی۔ اس غم میں میں نے اپنی روٹیوں کو لات مار دیا۔

آج رتن کو اس محبت کا کامل ثبوت ملا۔ جو مرنے والے کے دل میں تڑپتی رہتی تھی۔ رتن کے لیے زندگی میں پھر بھی کچھ دلچسپی تھی۔ ان کے لیے زندگی میں کون سا آرام تھا۔ زندگی کیا ایک مستقل ریاضت تھی۔ جس کا خاص مقصد تکمیل فرض تھا کیا وہ

ایک لمحہ کے لیے بھی ان فکروں سے انھیں آزاد نہ کرسکتی تھی۔ کون کہہ سکتا ہے کہ دلجوئی اور مزاج شناسی سے یہ بجھنے والا چراغ کچھ دن اور روشن رہتا۔ لیکن اس نے شوہر کے ساتھ اپنے فرض کا کبھی خیال ہی نہ کیا۔ اس کا دل ہمیشہ بغاوت پر کمر بستہ رہا۔ محض اس لیے کہ ان سے میرا تعلق کیوں ہوا۔ رتن کا ضمیر اس وقت اپنی خامیوں اور کوتاہیوں کے احساس سے پامال ہو رہا تھا۔ اس نے شوہر کے بے جان قدموں پر سر جھکادیا۔ اور بلک بلک کر رونے لگی۔ وہ سارے باغیانہ جذبات جو اس کے دل میں اُٹھتے رہتے تھے وہ سارے ناہمدردانہ خیالات جنھیں وہ بار بار دبانے کی کوشش کرتی رہتی تھی۔ اس وقت سینکڑوں بچھوؤں کی طرح ڈنک مار رہے تھے۔ ہائے میرا یہ برتاؤ۔ اس آدمی کے ساتھ تھا۔ جس نے اپنے تئیں مجھ پر قربان کردیا۔ ان باتوں کو یاد کرکے اس کا دل پھٹا جاتا تھا۔ ان قدموں پر سر رکھے ہوئے اسے یہی آرزو ہوتی تھی کہ اسی وقت میری جان نکل جائے۔ ان قدموں کو اپنی پیشانی سے سہلاتے ہوئے آج اس کے دل میں کتنا ایثار دوڑا آتا تھا کہ گویا مدتوں کی اندوختہ دولت کو وہ آج ہی اسی وقت لٹا دے گی۔ موت کی نورانی ضیاء کے سامنے اس کے باطن کی ساری کدورتیں مٹ گئیں۔

وکیل صاحب کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ لیکن چہرے پر کسی جذبہ کے آثار نہ تھے۔ رتن کی بے خودی بھی ان کے بجھتے ہوئے ادراک کو روشن نہ کرسکتی تھی۔ شادی اور غم کی بندشوں سے وہ آزاد ہوگئے تھے۔ اور کوئی روئے غم نہیں۔ ہنسے تو خوشی نہیں۔ ٹیمل نے اچمنی میں گنگا جل لے کر ان کے منہ میں ڈال دیا۔ آج انھوں نے کچھ مزاحمت نہ کی۔ وہ جو رسوم اور معتقدات کا دشمن تھا اس وقت خاموش ہوگیا تھا۔ اس لیے نہیں کہ اس میں مذہبی اعتقاد رونما ہوگیا تھا۔ بلکہ اس لیے کہ اس میں اب کوئی حس نہ تھا۔ اتنے ہی توکل سے وہ زہر کا گھونٹ بھی پی جاتا۔

انسانی حیات کا اہم ترین واقعہ کتنی خاموشی کے ساتھ ظہور پذیر ہوجاتا ہے وہ کائنات کا ایک رُکنِ اعظم وہ تمناؤں کا طوفانی سمندر، وہ سعی و عمل کا لافانی مخرج۔ وہ محبت اور حسد، خوشی اور رنج کا جولان گاہ، وہ عقل شعور کی رنگ بھوم نہ جانے کب اور کہاں غائب ہوجاتی ہے۔ کسی کو خبر نہیں ہوتی۔ ایک ہچکی بھی نہیں۔ ایک سانس بھی نہیں۔ ایک آہ بھی نہیں نکلتی۔ سمندر کی موجوں کا کہاں خاتمہ ہوتا ہے۔ کون بتا سکتا ہے۔ آواز فضا میں

کہاں مدغم ہوجاتی ہے۔ کون جانتا ہے۔ حیاتِ انسانی اس موج کے سوا۔ اس آواز کے سوا اور کیا ہے۔ اس کی تحلیل بھی اتنی پُرسکون۔ اتنی ہی غیرمحسوس ہو۔ کیا تعجب ہے، عناصر کے معتقد پوچھتے ہیں کیا چیز نکل گئی۔ طبیعات کا معتقد کہتا ہے۔ ایک خفیف سی چمک نکل جاتی ہے۔ کوئی کہتا ہے۔ آنکھوں سے جان نکلی۔ کوئی منہ سے۔ کوئی ان سے پوچھے موجیں فنا ہوتے وقت کیا چمک اُٹھتی ہیں۔ آواز غائب ہوتے وقت کیا مجسم ہوجاتی ہے۔ وہ فنا اس ابدی سفر کی محض ایک منزل ہے جہاں سفر کا خاتمہ نہیں بلکہ اس کی توسیع ہوتی ہے۔

کتنا حیرت انگیز انقلاب ہے۔ وہ جو مچھر کے ڈنک کو برداشت نہ کرسکتا تھا۔ اب اسے چاہے مٹی میں دبا دو۔ خواہ آگ کی چتا پر رکھ دو۔ اس کی پیشانی پر شکن نہ آئے گی۔

ٹیمل نے وکیل صاحب کے منہ کی طرف دیکھ کر کہا۔ بہو جی آیئے۔ مالک کو کھاٹ سے اُتار دیں وہ چلے گئے۔

یہ کہہ کر وہ زمین پر بیٹھ گیا اور دونوں آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر رونے لگا۔ آج اس کی تیس سال کی رفاقت ختم ہوگئی۔ جس نے کبھی آدھی بات نہیں کہی۔ کبھی تُو کرکے نہیں پکارا۔ وہ مالک اب اُسے چھوڑے چلا جا رہا ہے۔

رتن ابھی تک کبیراج کا انتظار کر رہی تھی۔ ٹیمل کے منہ سے یہ الفاظ سن کر اسے دھکا سا لگا۔ اس نے اُٹھ کر وکیل صاحب کی چھاتی پر ہاتھ رکھا۔ ساٹھ سال کی مسلسل حرکت کے بعد وہ اس وقت خاموش تھی۔ رتن کو پھر پیشانی پر ہاتھ رکھنے کی ہمت نہ پڑی۔ اس جسم کو چھوتے ہوئے اس بے جان چہرہ کی طرف تاکتے ہوئے اسے کچھ احتراز ہو رہا تھا جو اکراہ سے مشابہ تھا۔ ابھی جن قدموں پر سر رکھ کر وہ روتی تھی۔ اُسے چھوتے ہوئے انگلیاں کٹی سی جاتی تھیں۔ رشتہ حیات اتنا نازک ہے۔ اس نے ایسا کبھی نہ سمجھا تھا۔

ایک لمحہ کے بعد ٹیمل نے کہا۔ بہو جی اب کیا دیکھتی ہو۔ کھاٹ کے نیچے اُتار دو۔ جو ہونا تھا ہوگیا۔

اس نے پیر پکڑا۔ رتن نے سر پکڑا اور لاش کو نیچے لٹا دیا۔ تب وہیں زمین پر بیٹھ کر رتن رونے لگی۔ اس لیے نہیں کہ دنیا میں اب کوئی اس کا دستگیر نہ تھا بلکہ اس لیے کہ وہ اس کے ساتھ اپنا فرض پورا نہ کرسکی۔

اسی وقت موٹر کی آواز آئی اور کبیراج نے کمرہ میں قدم رکھا۔

شاید اب بھی رتن کے دل میں اُمید کی کوئی بجھتی ہوئی چنگاری چُھپی پڑی تھی۔ اس نے فوراً آنکھیں پونچھ ڈالیں۔ سر کا آنچل سنبھال لیا۔ اُلجھے ہوئے بال سمیٹ لیے اور کھڑی ہوکر دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔ مگر کیراج سے کچھ پوچھتے ہوئے اس کی روح کانپ رہی تھی۔

نورِ سحر نے آسمان کو اپنی سنہری کرنوں سے رنگین کردیا تھا۔ کیا اس وجود کی خیرمقدم کی تیاریاں ہو رہی تھیں؟

(۳۱)

اسی دن لاش کاشی لائی گئی۔ وکیل صاحب کے ایک بھتیجے مالوہ میں رہتے تھے انھیں تار دے کر بُلایا گیا۔ آخری مراسم انھیں نے ادا کیے۔

جالپا آج کل سارے دن رتن ہی کے پاس بیٹھی رہتی تھی۔ بدنصیب رتن کو نہ گھر بار کی سُدھ تھی نہ کھانے پینے کی۔ روز ہی کوئی نہ کوئی ایسی بات یاد آجاتی جس سے رونے کا ایک بہانہ مل جاتا۔ شوہر کے ساتھ اس کے جو فرائض تھے۔ اس کے ایک حصے کی بھی اس نے تعمیل کی ہوتی۔ تو اسے تسکین ہوتی۔ اپنی بے دردی۔ اپنی نافرض شناسی۔ اپنی آرائش پسندی کے چرچے کرکے ہی وہ اپنے ضمیر کو تشفی دیتی تھی۔ جب تک اس کی زندگی کے دروازہ پر ایک محافظ بیٹھا ہوا تھا۔ اُسے کسی کُتے بلی یا چور کا اندیشہ نہ تھا۔ لیکن اب دروازہ پر کوئی محافظ نہ تھا۔ اس لیے وہ ہشیار رہتی تھی۔ شوہر کا ذکر خیر کرتی رہتی تھی۔ گزر بسر کیسے ہوگی۔ نوکروں چاکروں میں کِس کِس کا جواب دینا ہوگا۔ گھر کے کون کون سے خرچ کم کرنے کی ضرورت ہے۔ ان مسئلوں کے متعلق کوئی گفتگو ہی نہ ہوتی۔ گویا یہ فکر مرنے والے کی روح کے ساتھ بے وفائی ہوگی۔ کھانا صاف کپڑے پہننا اور کچھ پڑھ کر دل بہلانا بھی اُسے غیرمناسب سا معلوم ہوتا تھا۔ شرادھ کے دن اس نے اپنے سارے کپڑے اور زیور مہا براہمن کو دے ڈالے۔ ان چیزوں کی اب اسے کیا ضرورت ہے۔ اس کے برعکس۔شوہر۔کی چھوٹی سے چھوٹی چیز کو ان کی نشانی سمجھ کر وہ دیکھتی بھالتی رہتی تھی۔ اس کا مزاج اتنا متحمل ہوگیا تھا کہ کتنا ہی بڑا نقصان ہوجائے اسے غصہ نہ آتا تھا۔ ٹیمل کے ہاتھ سے چائے کا سِٹ چھوٹ کر گر پڑا۔ لیکن رتن چیں بہ جبیں بھی نہیں ہوئی۔ پہلے ایک دوات ٹوٹ جانے پر اس ٹیمل کو اس نے بُری طرح ڈانٹ بتائی تھی۔ مگر آج اس سے

کئی گنے بڑے نقصان پر اس نے زبان تک نہ کھولی۔

وکیل صاحب کے بھتیجے کا نام تھا منی بھوشن۔ بڑا ہی ملنسار۔ خوش مزاج اور کارگزار اسی ایک مہینہ میں اس نے صدہا دوست بنا لیے۔ شہر میں جن جن وکیلوں اور رئیسوں سے وکیل صاحب کا یارانہ تھا۔ ان سبھی سے ایسا میل جول بڑھایا۔ ایسی بے تکلفی پیدا کی کہ رتن کو خبر تک نہ ہوئی۔ اور اس نے بینک کا لین دین اپنے نام سے شروع کردیا۔ الہٰ آباد بینک میں وکیل صاحب کے پچیس ہزار روپے جمع تھے۔ ان پر تو اس نے قبضہ کر ہی لیا۔ مکانوں کے کرایہ بھی خود ہی وصول کرنے لگا۔ مواضعات کی تحصیل بھی شروع کردی۔ گویا رتن سے کوئی مطلب ہی نہیں۔

ایک دن ٹیمل نے رتن سے آکر کہا۔ بہو جی جانے والا تو چلا گیا اب گھر بار کی بھی کچھ خبر لیجیے۔ میں نے سنا ہے۔ بھیا نے بینک کا سب حساب اپنے نام کرلیا۔

رتن نے اس کی طرف ایسی غضبناک آنکھوں سے دیکھا کہ پھر اُسے کچھ کہنے کی ضرورت نہ ہوئی۔ اسی دن شام کو منی بھوشن نے ٹیمل کو نکال دیا۔ چوری کا الزام لگا کر نکالا۔ جس میں رتن کچھ کہہ بھی نہ سکے۔

اب صرف مہراج رہ گئے۔ انھیں منی بھوشن نے بھنگ پلا پلا کر ایسا ملایا کہ وہ انھیں کا دم بھرنے لگے۔ مہری سے کہتے بابو جی نے بڑا رئیسانہ مزاج پایا ہے۔ کوئی چیز لاؤ۔ کبھی نہیں پُوچھتے کتنے کو لائے۔ بڑوں کے گھروں میں بڑے ہی پیدا ہوتے ہیں۔ بہو جی تو بال کی کھال نکالتی رہتی تھیں۔ مہری کا منہ پہلے ہی سی دیا گیا تھا۔ اس کے ڈھلتے ہوئے حسن پر نئے مالک غیر معمولی طور پر فریفتہ ہوگئے تھے۔ وہ کسی نہ کسی بہانہ سے باہر کے دیوان خانے میں ہی منڈلایا کرتی۔ رتن کو ذرا بھی خبر نہ تھی۔ کس طرح اس کے خلاف قلعہ بندی ہو رہی ہے۔

ایک دن منی بھوشن نے رتن سے کہا۔ کاکی۔ اب تو مجھے یہاں رہنا فضول معلوم ہوتا ہے۔ میں سوچتا ہوں آپ کو لے کر گھر چلا جاؤں۔ وہاں آپ کی بہو آپ کی خدمت کرے گی بال بچوں میں جی بہل جائے گا اور خرچ بھی کم ہوجائے گا۔ آپ کہیں تو یہ بنگلہ بیچ کردوں۔ اچھے دام اُٹھیں گے۔

رتن اس طرح چونکی۔ گویا کسی نے اسے جھنجھوڑ کر جگا دیا ہو۔ بولی۔ کیا مجھ سے کچھ

کہہ رہے ہو؟

منی بھوشن۔ جی ہاں کہہ رہا تھا کہ اب ہم لوگوں کو یہاں رہنا فضول ہے۔ اب تو یہاں سے چلے جانا ہی بہتر ہے۔

رتن نے بے دلی سے کہا۔ ہاں اچھا تو ہوگا۔

منی۔ کاکاجی نے کوئی وصیت لکھی ہو۔ لایئے دیکھوں۔ ان کی مرضی ہمارے لیے مقدم ہے۔

رتن نے اسی طرح آسمان پر بیٹھے ہوئے گویا دنیا کی باتوں سے اُسے کوئی علاقہ نہیں ہے جواب دیا۔ وصیت تو نہیں لکھی اور اس کی ضرورت بھی کیا تھی؟

منی بھوشن نے پھر پوچھا۔ شاید کہیں لکھ کر رکھ گئے۔

منی بھوشن نے دل میں خوش ہوکر کہا۔ میری خواہش ہے کہ ان کی کوئی یادگار بنوا دی جائے۔

رتن نے خوش ہوکر کہا۔ میں بھی چاہتی ہوں۔

منی۔ گاؤں کی آمدنی کوئی تین ہزار روپیہ سال کی ہے۔ یہ آپ کو معلوم ہے اتنا ہی وہ سال بھر میں خیرات کرتے تھے۔ دو ڈھائی سو سے کہیں مہینہ میں کم نہ ہوتا تھا۔ تیسری تجویز ہے کہ وہ ساری مدیں جیوں کی تیوں قائم رہیں۔

رتن نے اسی لہجہ میں کہا۔ ہاں اور کیا؟

منی۔ تو گاؤں کی آمدنی تو خیراتی کاموں کے لیے وقف کردی جائے۔ مکانوں کا کرایہ کوئی دو سو روپے ماہوار ہے۔ اس سے ان کے نام پر ایک چھوٹی سے سنسکرت پاٹھ شالا کھول دی جائے۔

رتن۔ بہت اچھا ہوگا۔

اور یہ بنگلہ بیچ دیا جائے۔ اس روپیہ کو بینک میں رکھ دیا جائے۔

رتن۔ بہت اچھا ہوگا۔ مجھے روپے پیسے کی اب کیا ضرورت ہے؟

منی۔ آپ کی خدمت کے لیے تو ہم سب حاضر ہی ہیں۔ موٹر بھی نکال دی جائے ابھی سے یہ انتظام ہوگا۔ تو جاکر کہیں دو تین مہینے میں فرصت ملے گی۔

رتن نے لاپروائی سے کہا۔ ابھی جلدی کیا ہے۔ کچھ روپیہ بینک میں تو ہے۔

منی۔ بینک میں روپے تھے۔ مگر مہینہ بھر سے خرچ بھی تو ہو رہے ہیں۔ ہزار پانچ سو پڑے

ہوں گے۔ یہاں تو روپے پیسے ہوا میں اڑجاتے ہیں۔ مجھ سے تو یہاں ایک مہینہ بھی نہ رہا جائے۔ موٹر کو بھی جلدی ہی نکال دینا چاہیے۔

رتن نے اس کے جواب میں بھی کہا اچھا تو ہوگا۔ وہ اس دماغی تعطل کی حالت میں تھی۔ جب انسان کو چھوٹے چھوٹے کام بھی بوجھ معلوم ہونے لگتے ہیں۔ منی بھوشن کی کارپردازیوں نے اسے مغلوب کر دیا تھا۔ اس وقت اس کے ساتھ جو شخص تھوڑی سی ہمدردی ظاہر کردیتا۔ اسی کو وہ اپنا خیرخواہ سمجھنے لگتی۔ رنج و محن نے اس کے دل کو اتنا نازک اور نرم بنا دیا تھا کہ اس پر کوئی نقش بھی آسانی سے جم سکتا تھا۔ اس وقت سبھی اسے اپنے نظر آتے تھے۔ اسے کسی پر شبہ نہ تھا۔ کسی سے ضرر کا خوف نہ تھا۔ شاید کوئی چور بھی اس کے سامنے اس کا مال و متاع اُٹھا لے جاتا تو وہ شور نہ مچاتی۔

(۳۲)

تیرھویں کے بعد جالپا نے رتن کے گھر آنا جانا کم کردیا تھا۔ صرف ایک بار گھنٹہ دو گھنٹہ کے لیے چلی جایا کرتی تھی۔ ادھر کئی دنوں سے منشی دیا ناتھ کو بخار آنے لگا تھا۔ انھیں بخار میں چھوڑ کر کیسے جاتی۔ منشی جی کو ذرا بھی بخار آجاتا تو وہ بک جھک کرنے لگتے تھے۔ کبھی گاتے کبھی روتے کبھی موت کے فرشتوں کو اپنے سامنے ناچتے دیکھتے۔ ان کا جی چاہتا کہ سارا گھر میرے پاس بیٹھا رہے۔ بلکہ رشتہ داروں کو بھی بلا لیا جائے تاکہ وہ سب سے آخری ملاقات کرلیں۔ کیونکہ اس بیماری سے بچنے کی انھیں کوئی امید نہ تھی۔ جاگیشوری اور سب کچھ کرسکتی تھی مگر ہرزہ سرائیاں نہ سُن سکتی تھی۔ جیوں ہی وہ رونے لگتے وہ کمرے سے نکل جاتی۔ اسے آسیب کا اندیشہ تھا۔

منشی جی کے کمرے میں کئی اخباروں کے فائل تھے۔ اس کا بھی انھیں ایک شوق تھا۔ جالپا کا جی وہاں بیٹھے گھبرانے لگتا تو ان فائلوں کو اُلٹ پلٹ کر دیکھنے لگتی۔ ایک دن اس نے ایک پُرانے اخبار میں ایک شطرنج کا نقشہ دیکھا جسے حل کردینے کے لیے کسی رئیس نے انعام دے رکھا تھا۔ اسے خیال آیا کہ جس طاق پر رما ناتھ کی بساط اور مہرے رکھے ہوئے ہیں اسی پر ایک کتاب میں نقشے بھی دیے ہوئے ہیں۔ وہ فوراً دوڑتی ہوئی اوپر گئی اور کتاب اُٹھا لائی یہ نقشہ اسی کاپی میں موجود تھا۔ اور نقشہ ہی نہ تھا اس کا حل بھی دیا ہوا تھا۔ معاً جالپا کو یہ خیال پیدا ہوا۔ اس نقشہ کو کسی اخبار میں چھپوا دوں تو کیسا ہو۔ شاید رما

ناتھ کی نگاہ اس پر پڑجائے۔ یہ نقشہ اتنا آسان تو نہیں ہے کہ آسانی سے حل ہوجائے۔ اس نے سوچا اس شہر میں جب ان کا ثانی کوئی نہیں ہے تو ایسے لوگوں کی تعداد بہت نہیں ہوسکتی۔ جو یہ نقشہ حل کرسکیں۔ کچھ بھی ہو جب رما ناتھ نے یہ نقشہ حل کیا ہے تو یقیناً وہ اسے پھر حل کرلیں گے۔ جو لوگ پہلی بار دیکھیں گے انھیں سوچتے دو ایک دن ضرور لگ جائیں گے۔ جالپا نے اس نقشہ کو حل کرنے کے لیے کچھ انعام مقرر کردینے کا فیصلہ کیا۔ بُوا تو ہے ہی۔ انھیں روپے نہ ملیں تاہم اتنا تو ممکن ہے کہ حل کرنے والوں میں ان کا نام بھی ہو۔ اس طرح کچھ پتہ لگ جائے گا۔ کچھ بھی نہ ہو روپے ہی تو جائیں گے۔

اسی اُدھیڑ بُن میں وہ آج رتن سے نہ مل سکی۔ رتن دن بھر تو اس کی راہ دیکھتی رہی۔ جب وہ شام کو بھی نہ گئی تو اس سے رہا نہ گیا آج وہ شوہر کی وفات کے بعد پہلی بار گھر سے نکلی ہے۔ اسے تیز موٹر چلانے کی دھن تھی۔ لیکن آج موٹر کی رفتار تانگے سے بھی سست تھی۔ ایک بُڑھیا کو سڑک کے کنارے بیٹھے دیکھ کر اپنی موٹر کو روک دیا اور اسے چار آنے کے پیسے دے دیے اور آگے بڑھی تو دو کانسٹبل ایک قیدی کو لیے جا رہے تھے۔ اس نے موٹر روک کر ایک کانسٹبل کو بلایا اور اسے ایک روپیہ دے کر کہا۔ اس قیدی کو مٹھائی کھلا دینا۔ کانسٹبل نے سلام کرکے روپیہ لے لیا۔ آج کسی خوش نصیب کا منہ دیکھ کر اُٹھا تھا۔ جالپا نے اسے دیکھتے ہی کہا۔ معاف کرنا بہن! آج میں نہ آسکی۔ دادا کو کئی دن سے بخار آرہا ہے۔

رتن نے منشی جی کے کمرے کی طرف قدم اُٹھایا اور پوچھا۔ وہیں ہیں نا۔ تم نے مجھ سے نہیں کہا۔

منشی جی کا بخار اس وقت کچھ اترا ہوا تھا۔ رتن کو دیکھ کر بولے۔ بہت رنج ہوا دیوی جی۔ مگر یہ تو دنیا ہے۔ آج ایک کی باری ہے۔ کل دوسرے کی باری ہے۔ چل چلاؤ لگا ہوا ہے۔ اب میں بھی چلا۔ اب نہیں بچ سکتا۔ بڑی پیاس ہے۔ جیسے سینے میں کوئی بھٹی جل رہی ہو۔ پُھنکا جاتا ہوں۔ کوئی اپنا نہیں ہوتا۔ دیوی جی! دنیا کے ناتے سب غرض کے ناتے ہیں۔ آدمی ہاتھ پسارے اکیلا ایک دن چلا جاتا ہے۔ رما ہوتا تو آج ایک چلو پانی تو دیتا۔ دو لونڈے ہیں انھیں کوئی فکر ہی نہیں۔ میں مروں یا جیوں یہاں بیٹھتے دونوں کا دم گھٹتا ہے۔ آپ سے یہ آخری ملاقات ہے۔

رتن نے تشفی دی۔ یہ ملیریا ہے۔ لالہ جی! دو چار دن میں آپ اچھے ہوجائیں گے۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔

منشی جی نے بے کسانہ انداز سے کہا۔ بیٹھ جایئے دیوی جی۔ آپ کی دُعا ہے تو شاید بچ جاؤں۔ لیکن مجھے تو امید نہیں ہے۔ میں بھی تال ٹھونک کر جم راج سے لڑنے کو تیار بیٹھا ہوں۔ اسی طرح وہاں بھی کچہریاں ہیں۔ حاکم ہیں۔ راجا ہیں پرجا ہیں۔ تقریریں ہوتی ہیں اخبار نکلتے ہیں۔ پھر کیا فکر ہے۔ وہاں بھی اہلمد ہوجاؤں گا۔

رتن کو ایسی ہنسی چھوٹی کہ وہاں کھڑی نہ رہ سکی۔ منشی جی مذاق میں یہ باتیں نہیں کر رہے تھے۔ ان کا لب و لہجہ نہایت درجہ متین تھا۔ آج ڈیڑھ دو مہینہ کے بعد رتن کو ہنسی آئی۔ اور اس بے موقعہ ہنسی کو چھپانے کے لیے وہ کمرے سے نکل گئی۔ اس کے ساتھ جالپا بھی باہر آگئی۔

رتن نے معذرت آمیز لہجہ میں کہا۔ دادا جی نے دل میں کیا سمجھا ہوگا۔ سوچتے ہوں گے۔ میں تو جان سے مر رہا ہوں اور اسے ہنسی سوجھی ہے۔ اب وہاں نہ جاؤں گی۔ نہیں ایسی بات پھر کہیں تو میری ہنسی نہ رُکے گی۔ دیکھو تو آج کتنی بے موقع ہنسی آئی ہے۔

جالپا نے اس کے دلی جذبات کو تاڑ کر کہا۔ مجھے بھی اکثر ان کی باتوں پر ہنسی آجاتی ہے۔ اس وقت ان کا بخار کچھ ہلکا ہے۔ جب بخار زور پر ہوتا ہے تو یہ اور بھی اول جلول بکتے ہیں۔ اس وقت ہنسی روکنا مشکل ہوجاتا ہے۔ آج سویرے کہنے لگے۔ میرا پیٹ بھک ہوگیا۔ میرا پیٹ بھک ہوگیا۔ اس کی رٹ لگا دی۔ اس کا مطلب کیا تھا۔ نہ میں سمجھ سکی نہ اماں سمجھ سکیں۔ مگر وہ برابر یہی رٹے جاتے تھے۔ آؤ کمرے میں چلیں۔

رتن۔ میرے ساتھ نہ چلوگی؟

"آج تو نہ چل سکوں گی"

"کل آؤں گی۔"

"کہہ نہیں سکتی۔ دادا کی طبیعت اچھی رہی تو آؤں گی"

"نہیں بھائی ضرور آنا۔ تم سے ایک صلاح کرنا ہے۔"

"کیا صلاح ہے۔"

"منی کہتے ہیں۔ یہاں اب رہنا فضول ہے۔ ان کی صلاح ہے۔ بنگلہ بیچ دیا جائے۔ اور ہم لوگ مالوہ چلے جائیں۔

جالپا تعجب سے بولی۔ یہ تو تم نے بُری خبر سنائی۔ بہن مجھے اس حالت میں چھوڑ کر چلی جاؤگی۔ میں نہ جانے دوں گی۔ منی سے کہہ دو۔ بنگلہ بیچ دیں۔ مگر جب تک بابو جی کا پتہ نہ لگ جائے۔ میں تمھیں نہ جانے دوں گی۔ تم کل ایک ہفتہ باہر رہیں۔ مجھے ایک ایک پل پہاڑ ہوگیا۔ اب تو شاید میں ہی مرجاؤں۔ نہیں بہن تمھارے پیروں پڑتی ہوں۔ ابھی جانے کا نام نہ لو۔

رتن بھی آبدیدہ ہوکر بولی۔ مجھ سے بھی وہاں نہ رہا جائے گا۔ سچ کہتی ہوں۔ تو منی سے کہہ دوں گی۔ مجھے نہیں جانا ہے۔ جالپا اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے کمرے میں لے گئی۔ اور اس کے گلے میں ہاتھ ڈال کر طفلانہ انداز سے بولی۔ قسم کھاؤ کہ مجھے چھوڑ کر نہ جاؤگی۔

رتن نے اُسے آغوش میں لے کر کہا۔ لو قسم کھاتی ہوں نہ جاؤں گی۔ چاہے ادھر کی دُنیا اُدھر ہوجائے۔ میرے لیے وہاں کیا رکھا ہے۔ بنگلہ بھی کیوں بیچوں۔ دو ڈھائی سو مکانوں کا کرایہ ہے۔ ہم دونوں کے گزارے کے لیے کافی ہے۔ میں ابھی منی سے کہہ دوں گی نہ جاؤں گی۔

دفعتاً فرش پر مہرے اور شطرنج کے نقشہ کو دیکھ کر پوچھا۔ یہ شطرنج کس کے ساتھ کھیل رہی تھیں۔

جالپا نے شطرنج کے نقشہ پر اپنی تقدیر کا پانسہ پھینکنے کی جو تجویز سوچی تھی۔ وہ اسے کہہ سنائی۔ دل میں ڈر رہی تھی کہ رتن کہیں اس تجویز کو پاگل پن نہ خیال کرے۔ لیکن رتن سنتے ہی باغ باغ ہوگئی۔ بولی۔ دس روپے کا انعام تو بہت کم ہے پچاس روپے کردو۔ روپے میں دیتی ہوں۔

جالپا نے اعتراض کیا۔ تب تو بڑے بڑے شطرنج باز میدان میں آجائیں گے۔

رتن۔ کوئی مضائقہ نہیں۔ بابو جی کی نگاہ پڑگئی تو وہ اسے ضرور حل کرلیں گے اور مجھے امید ہے سب سے پہلے انھیں کا نام آوے گا۔ کچھ نہ ہوگا تو پتہ تو لگ ہی جائے گا۔ تم نے بڑی اچھی تدبیر سوچ نکالی۔

جالپا نے پوچھا۔ تو تمھیں اُمید ہے۔

"پوری۔ میں کل سویرے روپے لے کر آؤں گی۔"

"تو میں آج خط لکھ رکھوں گی۔ کسی مشہور اخبار میں بھیجنا چاہیے۔"

"کلکتہ میں تو زیادہ تر لوگ بشومتر ہی پڑھتے نظر آتے ہیں۔"

اسی وقت منشی جی پکار اُٹھے۔ بہو! بہو!!

جالپا تو لپکی ہوئی ان کے کمرے کی طرف چلی۔ رتن باہر جا رہی تھی کہ جاگیشوری پنکھا جھلتی نظر آئی۔ رتن نے پوچھا۔ تمھیں گرمی لگ رہی ہے۔ اماں جی! میں تو مارے سردی کے کانپ رہی ہوں۔ ارے تمھارے پاؤں میں یہ کیا سفید لگا ہوا ہے؟ کیا آٹا پیس رہی تھیں۔

جاگیشوری نے شرمندہ ہوکر کہا۔ وید جی نے انھیں ہاتھ کے آٹے کی روٹی کھانے کو کہا ہے۔ بازار میں ہاتھ کا آٹا کہاں میسر۔ محلّہ میں کوئی پنسہری نہیں ملتی۔ مزدورنیں تک چکّی میں آٹا پسوا لیتی ہیں۔ کوئی ملتی ہی نہیں۔

رتن نے تعجب سے پوچھا۔ تم سے چکی چل جاتی ہے۔

جاگیشوری مسکرا کر بولی۔ کون بہت سا گیہوں تھا۔ پاؤ بھر تو دونوں وقت کے لیے کافی ہوجاتا ہے۔ ایک لقمہ بھی نہیں کھاتے۔ بہو پیسنے جا رہی تھی۔ مگر پھر مجھے ان کے پاس بیٹھنا پڑتا مجھے رات چکّی پینا منظور ہے۔ ان کے پاس گھنٹے بھر بیٹھنا منظور نہیں۔ رتن جاکر جانت کے پاس ایک منٹ کھڑی رہی۔ پھر مسکرا کر مانچی پر بیٹھ گئی۔ اور بولی۔ تم سے تو یہ جانت نہ چلتا ہوگا۔ ماں لاؤ تھوڑا سا گیہوں مجھے دو۔ دیکھوں تو۔

جاگیشوری نے کانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ارے نہیں بہو۔ تم کیا پیسوگی۔ چلو یہاں سے

رتن نے اپنی قابلیت کا ثبوت دیا۔ میں نے بہت دنوں تک پیسا ہے اماں۔ جب اپنے گھر تھی۔ تو روز پیستی تھی۔ لاؤ تھوڑا سا گیہوں دو۔

"ہاتھ دُکھنے لگے گا۔ چھالے پڑجائیں گے۔"

"کچھ نہیں ہوگا ماں جی! آپ گیہوں تو لائیے!"

جاگیشوری نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اُٹھانے کی کوشش کرکے کہا۔ گیہوں گھر میں نہیں ہے۔ اب اس وقت بازار سے کون لادے۔ رتن کو اعتبار نہ آیا۔ بولی۔ اچھا چلیے۔ میں آپ

کے بھنڈارے میں دیکھوں ہوگا کیسے نہیں۔

رسوئی کی بغل والی کوٹھڑی میں کھانے کا سامان رہتا تھا۔ رتن اندر چلی گئی۔ اور ہانڈیوں میں ٹٹول ٹٹول کر دیکھنے لگی۔ ایک ہانڈی میں گیہوں نکل آئے۔ خوش ہو کر بولی۔ دیکھو اماں نکلے کہ نہیں۔ تم مجھ سے بہانہ کر رہی تھیں۔

اس نے ایک ڈلیا میں تھوڑے سے گیہوں نکال لیے اور خوش خوش جانت پر جاکر پیسنے لگی۔ جاگیشوری نے جاکر جالپا سے کہا۔ بہو وہ جانت پر بیٹھی گیہوں پیس رہی ہے۔ اُٹھاتی ہوں اُٹھتی ہی نہیں۔ کوئی دیکھ لے تو کیا کہے۔

جالپا نے منشی جی کے کمرے سے نکل کر ساس کی پریشانی کا مزہ اُٹھانے کے لیے کہا۔ یہ تم نے کیا غضب کیا۔ اماں سچ مچ کوئی دیکھ لے تو ناک ہی کٹ جائے۔ چلیے دیکھوں۔

جاگیشوری نے مجبوری انداز سے کہا۔ میں تو سمجھا کے ہار گئی۔ مانتی ہی نہیں۔

جالپا نے جاکر دیکھا۔ تو رتن گیہوں پیسنے میں مگن تھی۔ تفریح کی فطری مسرت سے اس کا چہرہ شگفتہ ہو رہا تھا۔ اتنی دیر میں اس کے ماتھے پر پسینہ کی بوندیں آگئی تھیں۔ اس کے مضبوط ہاتھوں میں جانت لٹو کی طرح ناچ رہا تھا۔

جالپا نے ہنس کر کہا۔ اوری آٹا مہین ہو۔ ورنہ پیسے نہ ملیں گے۔

رتن کو سنائی نہ دیا۔ بہروں کی طرح اس کے منہ کی طرف تاک کر مسکرائی۔ جالپا نے اور زور سے کہا۔ آٹا خوب مہین پیسنا۔ نہیں تو پیسے نہ ملیں گے۔

رتن بھی ہنس کر کہا۔ جتنا مہین کہیے اتنا مہین پیس دوں۔ بہو جی۔ پسائی اچھی ملنی چاہیے۔

جالپا۔ دھیلے سیر۔

رتن۔ دھیلی سیر سہی۔

"منہ دھو آؤ۔ دھیلے سیر ملے گی۔"

"میں یہ سب پیس کر اُٹھوں گی۔ تم یہاں کیوں کھڑی ہو۔"

"آجاؤں۔ میں بھی، کچھوا دوں۔"

"جی چاہتا ہے۔ کوئی جانت کا گیت گاؤں۔"

جالپا نے جاگیشوری کو منشی جی کے کمرے میں بھیج دیا۔ اور جانت پر جا بیٹھی۔ دونوں سہیلیاں یہ گیت گانے لگیں۔

موہے جوگن بنا کے کہاں گئے رے جوگیا

دونوں کے گلے میں لوچ تھا۔ جانت کا گھنگر، گھنگر ان کے گیت پر ساز کا کام دے رہا تھا۔ جب دونوں ایک کڑی گاکر خاموش ہوجاتیں تو جانت کی آواز گویا گیت کی آواز سے ہم آہنگ ہوکر اور بھی دلکش ہوجاتی تھی۔ دونوں کے دل اس وقت مسرتِ حیات کے فطری سُرور سے پُر تھے۔ نہ غم کا بوجھ تھا۔ نہ فراق کی خلش۔ گویا دو چڑیاں طلوعِ سحر کی کیفیتوں سے مست ہوکر چہک رہی تھی۔

(۳۳)

رما ناتھ کی چائے کی دکان کھل تو گئی۔ مگر صرف رات کوکھلتی تھی۔ رات کو بھی زیادہ تر دیبی دین ہی دکان پر بیٹھتا۔ لیکن بکری اچھی ہوجاتی تھی۔ پہلے ہی دن تین روپے کے پیسے آئے۔ دوسرے دن چار پانچ روپے کا اوسط پڑنے لگا۔ چائے اتنی لذیذ ہوتی تھی کہ جو ایک بار یہاں چائے پی لیتا۔ پھر دوسری دکان پر نہ جاتا۔ رما نے کچھ تفریح کا سامان بھی جمع کردیا۔ چراغ جلنے کے بعد سبزی کی بکری زیادہ نہ ہوتی تھی۔ وہ ان ٹوکروں کو اُٹھا کر اندر رکھ دیتا اور برآمدے میں میز لگا دیتا۔ اس پر تاش کاسٹ رکھ دیتا۔ دو روزانہ اخبار بھی منگانے لگا۔ دکان چل نکلی۔

ان چار پانچ مہینوں کے افلاس نے رما کے ذوق تن پروری کو اور بھی تیز کردیا تھا۔ جب تک روپے نہ تھے وہ مجبور تھا۔ روپے ہاتھ میں آتے ہی سیر و تفریح کا جنون سر پر سوار ہوگیا۔ سینما کی بھی یاد آئی۔ روزمرہ کی جن ضروریات کو وہ اب تک ٹالتا آتا تھا۔ خریدی جانے لگیں۔ دیبی دین کے لیے ایک خوش نما ریشمی چادر لایا۔ جگو کے سر میں اکثر درد ہوتا رہتا تھا۔ ایک دن تیل کی خوشبودار دو شیشیاں لاکر دے دیں۔ دونوں نہال ہوگئے۔ اب بڑھیا کبھی اپنے سر پر بوجھ لاتی۔ تو اسے ڈانٹتا۔ اب تو میں بھی چار پیسے کمانے لگا ہوں اب تو کیوں جان دیتی ہے۔ اگر پھر کبھی تیرے سر پر ٹوکری دیکھی تو کہے دیتا ہوں۔ دکان اُٹھا کر پھینک دوں گا۔ بڑھیا لڑکے کی یہ ڈانٹ سُن کر باغ باغ ہوجاتی۔ منڈی سے بوجھ لاتی۔ تو پہلے چپکے سے دیکھتی۔ رما دکان پر تو نہیں ہے۔ اگر وہ بیٹھا ہوتا تو کسی قلی کو ایک

دو پیسے دے کر اس کے سر پر رکھ دیتی۔ وہ نہ ہوتا تو لپکی ہوئی آتی اور جلدی سے بوجھ اُتار کر اطمینان سے بیٹھ جاتی۔ تاکہ رما بھانپ نہ سکے۔

ایک دن منورما تھیٹر میں آغاحشر کا کوئی نیا ڈرامہ آنے والا تھا۔ اس ڈرامہ کی بڑی دھوم تھی۔ ایک دن پہلے ہی سے لوگ اپنی اپنی جگہیں ریزرو کرا رہے تھے۔ رما کو بھی اپنی جگہ رزرو کرانے کی دُھن سوار ہوئی۔ سوچا کہیں رات کو ٹکٹ نہ ملا تو ٹاپتے ہی رہ جائیں گے۔ یہ اشتیاق پولیس کے خوف پر بھی غالب آگیا۔ ایسی آفت نہیں آئی ہے کہ گھر سے نکلتے ہی پولیس گرفتار کرلے۔ دن کو نہ سہی۔ رات کو نکلتا ہی ہوں۔ پولیس چاہتی تو کیا رات کو نہ گرفتار کرلیتی۔ پھر میرا وہ حلیہ بھی نہیں رہا۔ تبدیل ہیئت کے لیے پگڑی کافی ہے۔ یوں دل کو سمجھا کر وہ دس بجے گھر سے نکلا۔ دیبی دین کہیں گیا ہوا تھا۔ بڑھیا نے پوچھا۔ کہاں جاتے ہو بیٹا!

رما نے کہا۔ کہیں نہیں۔ ابھی آتا ہوں۔

رما سڑک پر آیا تو اس کی ہمت برف کی طرح پگھلنے لگی۔ قدم قدم پر خوف ہوتا تھا۔ کوئی کانسٹبل نہ آرہا ہو۔ اُسے یقین تھا کہ پولیس کا ایک ایک چوکیدار بھی اس کا حلیہ پہچانتا ہے۔ اس لیے وہ سر نیچے جھکائے چل رہا تھا۔ دفعتاً اسے خیال آیا۔ خفیہ پولیس کے جاسوس سادہ لباس میں اِدھر اُدھر گھوما کرتے ہیں۔ کون جانے جو آدمی میری بغل میں آرہا ہے کوئی جاسوس ہی ہو۔ میری طرف کتنے غور سے دیکھ رہا ہے۔ یوں سر جھکا کر چلنے ہی سے شاید اسے شُبہ ہو رہا ہے۔ یہاں اور سبھی آدمی سامنے دیکھ رہے ہیں۔ کوئی یوں سر جھکا کر نہیں چل رہا ہے۔ موٹروں کی اس ریل پیل میں سر جھکا کر چلنا موت کو دعوت دینا ہے۔ پارک میں کوئی اس طرح چہل قدمی کرے تو کرسکتا ہے۔ یہاں تو نگاہ سامنے ہونا چاہیے۔ لیکن بغل والا آدمی ابھی تک میری ہی طرف تاک رہا ہے۔ ہے کوئی خفیہ ہی۔ رما اس کا ساتھ چھوڑنے کے لیے ایک تمبولی کی دکان پر پان کھانے لگا۔ وہ آدمی آگے نکل گیا۔ رمانے آرام کی لمبی سانس لی۔

اب اس نے سر اُٹھا لیا۔ اور دل مضبوط کر کے چلنے لگا۔ اس وقت ٹرام کا بھی کہیں پتہ نہ تھا۔ نہیں تو اس پر بیٹھ لیتا۔ تھوڑی ہی دور چلا ہوگا کہ اسے تین کانسٹبل پیچھے سے آتے دکھائی دیے۔ اس نے سڑک چھوڑ دی اور پٹڑی پر چلنے لگا۔ خواہ مخواہ سانپ کے بل

میں انگلی ڈالنا کون سی بہادری ہے۔ مگر وائے نصیب تینوں کانسٹبلوں نے بھی سڑک چھوڑ کر وہی پٹڑی لے لی۔ رما کا کلیجہ دھک دھک کرنے لگا۔ دوسری پٹڑی پر جانا اس شبہ کو اور بھی طاقت پہنچائے گا۔ کوئی ایسی گلی بھی نہیں جس میں گھس جائے۔ اب تو سب بہت قریب آگئے۔ کیا بات ہے کہ سب میری ہی طرف دیکھ رہے ہیں۔ میں نے بڑی حماقت کی کہ یہ پگڑی باندھ لیا۔ اور باندھا بھی کتنے بے تکے پن سے ایک ٹیلہ سا اوپر اُٹھ گیا ہے۔ یہ پگڑی آج مجھے پکڑوائے گی۔ باندھی تھی۔ اس سے صورت بدل جائے گی۔ یہ اُلٹے اور تماشہ بن گئی۔ تینوں میری طرف دیکھ دیکھ کر آپس میں کچھ باتیں کر رہے ہیں۔ شاید میرا حلیہ ملا رہے ہیں۔ اب نہیں بچ سکتا۔ گھر والوں کو میری گرفتاری کی خبر ملے گی تو کتنے شرمندہ ہوں گے۔ جالپا تو رو رو کر جان ہی دے گی۔ پانچ سال سے کم سزا نہ ہوگی۔ بس زندگی کا خاتمہ ہی سمجھو۔

اس تخیل کا اس کے دل پر ایسا غلبہ ہوا کہ اس کے اوسان خطا ہوگئے۔ جب کانسٹبلوں کی جماعت قریب آگئی تو اس کا چہرہ خوف سے کچھ ایسا تبدیل ہوگیا۔ آنکھوں میں کچھ ایسا خوف نمودار ہوگیا اور وہ کچھ اس طرح دوسرے آدمیوں کی آڑ تلاش کرنے لگا کہ عام آدمیوں کو اس پر شبہ ہونا قدرتی بات تھی۔ پھر پولیس والوں کی منجی ہوئی آنکھیں کیوں چوکتیں۔ ایک نے رما ناتھ کو للکارا۔ او جی۔ او پگڑی ذرا ادھر آنا۔ تمھارا کیا نام ہے؟

رما ناتھ نے سینہ زوری کے انداز سے کہا۔ ہمارا نام پوچھ کر کیا کروگے۔ کیا میں چور ہوں؟

"چور نہیں۔ تم شاہ سہی۔ نام کیوں نہیں بتاتے؟"

رما نے ایک لمحہ کے بعد سل رنج کے ساتھ کہا۔ ہیرا لال۔

"گھر کہاں ہے؟"

"گھر"

"ہاں گھر ہی پوچھتے ہیں۔"

"شاہجہان پور۔"

"کون محلہ؟"

رما شاہجہان پور نہ گیا تھا۔ نہ اتنی جرأت ہوئی کہ کوئی فرضی ہی نام بتا دے۔ دلیری

سے بولا۔ تم تو گویا میرا حلیہ لکھ رہے ہو۔

کانسٹبل نے بھبکی دی۔ تمھارا حلیہ پہلے ہی لکھا ہوا ہے۔ نام جھوٹ بتایا۔ سکونت جھوٹ بتائی۔ محلّہ پوچھا۔ تو بغلیں جھانکنے لگے۔ مہینوں سے تمھاری تلاش ہو رہی ہے۔ آج جاکر ملے ہو۔ چلو تھانے پر۔

یہ کہتے ہوئے اس نے رما کا ہاتھ پکڑ لیا۔ رما نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ وارنٹ لاؤ۔ تب میں چلوں گا۔ کیا مجھے کوئی دیہاتی سمجھ لیا ہے؟

کانسٹبل نے اپنے ساتھی سے کہا۔ پکڑ لو جی ان کا ہاتھ۔ وہیں تھانے پر وارنٹ دکھایا جائے گا۔

شہروں میں وارداتیں مداری کے تماشہ سے بھی دلچسپ ہوتی ہیں۔ سینکڑوں آدمی جمع ہوگئے۔ شامت کا مارا دیبی دین اسی وقت افیم لے کر لوٹ رہا تھا۔ یہ جماؤ دیکھ کر وہ بھی آگیا۔ دیکھا کہ تین کانسٹبل رما ناتھ کو گھسیٹے ہوئے لیے جا رہے ہیں۔ آگے بڑھ کر بولا۔ ہائیں ہائیں۔ جمعدار یہ کیا کرتے ہو۔ پنڈت جی تو ہمارے مہمان ہیں۔ انھیں کہاں پکڑے لیے جاتے ہو۔

کانسٹبل دیبی کو پہچانتے تھے۔ ایک نے پوچھا۔ تمھارے مہمان ہیں یہ کب سے؟

دیبی دین نے دل میں حساب لگا کر کہا۔ چار مہینے سے کچھ زیادہ ہی ہوئے ہوں گے۔ مجھے پراگ راج میں مل گئے تھے۔ رہنے والے بھی وہیں کے ہیں۔ میرے ساتھ ہی تو آئے تھے۔

کانسٹبل نے دل میں خوش ہوکر کہا۔ ان کا نام کیا ہے؟

دیبی دین نے سٹ پٹا کر کہا۔ نام انھوں نے بتایا نہ ہوگا۔

کانسٹبلوں کا شبہ پختہ ہوگیا۔ ایک کانسٹبل نے آنکھیں نکال کر کہا۔ معلوم ہوتا ہے تم بھی ملے ہوئے ہو۔ ان کا نام کیوں نہیں بتلاتے۔

دیبی دین نے شبہ انگیز جسارت کے ساتھ کہا۔ مجھ سے رُعب نہ جمانا جمعدار سمجھے یہاں دھمکیوں میں نہیں آنے کے۔

دوسرے کانسٹبل نے گویا ثالث بن کر کہا۔ بوڑھے بابا۔ تم خواہ مخواہ بگڑ رہے ہو۔ ان کا نام کیوں نہیں بتا دیتے۔

دیبی دین نے خائف نظروں سے رما کی طرف دیکھ کر کہا۔ ہم لوگ تو رما ناتھ کہتے ہیں اصلی نام کچھ اور ہے یا یہی ہم نہیں جانتے۔ کانسٹبل نے آنکھیں نکال کر کہا۔ بولو پنڈت جی کا کیا نام ہے تمھارا۔ رما ناتھ یا ہیرا لال یا دونوں۔ ایک گھر کا۔ ایک سُسرال کا۔

تیسرے کانسٹبل نے تماشائیوں کو مخاطب کرکے کہا۔ نام ہے رماناتھ۔ بتاتے ہیں ہیرا لال ہے۔ گھر الہٰ آباد۔ بتاتے ہیں شاہجہان پور۔ جُرم ثابت ہوگیا۔

تماشائیوں میں کانا پھوسی ہونے لگی۔

"شبہ کی بات تو ہے۔"

"صاف ہے۔ نام اور پتہ دونوں غلط بتائے۔"

ایک مارواڑی صاحب نے فرمایا۔ "اُچکو سو ہے۔"

ایک مولوی صاحب بولے۔ کوئی اشتہاری ملزم ہے۔

خلقت کو اپنا ہم خیال دیکھ کر سپاہیوں کو اور بھی زور ہوگیا۔ رما کو بھی اب ان کے ساتھ چپ چاپ چلے جانے ہی میں اپنی خیریت نظر آئی۔ اس طرح سر جھکا لیا۔ گویا اُسے اس کی بالکل پرواہ نہیں ہے کہ اس پر لاٹھی پڑتی ہے یا تلوار۔ اتنا ذلیل وہ کبھی نہ ہوا تھا۔ جیل کا عذاب بھی شاید اتنا جاں شکن نہ ہوتا۔

تھوڑی دیر میں تھانہ آگیا۔ تماشائیوں کا ہجوم بہت کم ہوگیا تھا۔ رما نے ایک بار پیچھے کی طرف شرم گیر توقع سے دیکھا۔ دیبی دین کا پتہ نہ تھا۔ رما کے منہ سے ایک لمبی سانس نکل گئی۔

(۳۴)

پولیس اسٹیشن کے دفتر میں اس وقت بڑی میز کے سامنے چار آدمی بیٹھے ہوئے تھے ایک داروغہ تھے۔ گورے رنگ کے شوقین۔ جن کی بڑی بڑی آنکھوں میں ہمدردی کی جھلک تھی۔ ان کی بغل میں نائب داروغہ تھے۔ یہ سکھ تھے۔ بہت ہی ہنس مکھ۔ زندہ دلی کے پُتلے۔ گیہواں رنگ۔ مضبوط اور متناسب اعضاء سر پر کیش تھے۔ ہاتھوں میں کڑے لیکن سگار سے پرہیز نہ کرتے تھے۔ میز کی دوسری طرف انسپکٹر اور ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ بیٹھے تھے۔ انسپکٹر ادھیڑ۔ سانولہ۔ لمبا آدمی تھا۔ کوڑی کی سی آنکھیں۔ پھولے رخسارہ اور ٹھنگنا قد۔ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ لانبا چھریرہ جوان تھا۔ بہت ہی کم سخن اور ذی فہم۔

ڈپٹی نے سگار کا ایک کش لے کر کہا۔ باہری گواہوں سے کام نہیں چل سکے گا ان میں سے کسی کو اپروور (approuer) بنانا ہوگا۔ اور کوئی آلٹرنیٹو (alternative) نہیں ہے۔

انسپکٹر نے داروغہ کی طرف دیکھ کر کہا۔ ہم لوگ نے کوئی بات اُٹھا تو نہیں رکھی۔ ازروئے حلف کہتا ہوں۔ ہر قسم کا لالچ دے کر ہار گئے۔ سبھوں نے ایسا گٹ کر رکھا ہے کہ کوئی ٹوٹتا ہی نہیں۔ ہم نے باہر کے گواہوں کو بھی آزمایا۔ مگر وہ سب کانوں پر ہاتھ رکھتے ہیں۔

ڈپٹی۔ اس مارواڑی کو پھر آزمانا ہوگا۔ اس کو بُلا کر خوب دھمکائیے۔ شاید اس کا کچھ دباؤ پڑے۔

انسپکٹر۔ از روئے حلف کہتا ہوں۔ آج صبح ہی سے ہم لوگ یہی تدبیر کر رہے ہیں۔ بے چارہ باپ لڑکے کے پیروں پر گر پڑا۔ لیکن کسی طرح راضی نہیں ہوتا۔

کچھ دیر تک چاروں آدمی خاموش بیٹھے رہے۔ آخر ڈپٹی نے مایوسانہ انداز سے کہا۔ مکدمہ نہیں چلنے سکتا۔ مکھت کا بدنامی ہوا۔

انسپکٹر۔ ایک ہفتہ کی مہلت اور لیجیے۔ شاید کوئی گواہ نکل آئے۔

یہ فیصلہ کرکے دونوں آدمی وہاں سے روانہ ہوئے۔ نائب داروغہ بھی ان کے ساتھ ہی چلے گئے۔ داروغہ جی حقہ منگوایا کہ دفعتاً ایک مسلمان سپاہی نے آکر کہا۔ حضور لائیے۔ کچھ انعام دلوائیے۔ ایک ملزم کو شبہ پر گرفتار کیا ہے۔ الہٰ آباد کا رہنے والا ہے۔ رماناتھ نام ہے۔ پہلے نام اور سکونت غلط بتلائی تھی۔ دیبی دین کھٹک جو نکڑ پر رہتا نہیں ہے اسی کے یہاں ٹھہرا ہوا ہے۔ ذرا ڈاٹ بتایئے گا تو سب کچھ اُگل دے گا۔

داروغہ۔ دیبی دین وہی ہے نا جس کے دونوں لڑکے......

سپاہی۔ جی ہاں۔ وہی ہے ڈہی۔

اتنے میں رماناتھ بھی داروغہ کے سامنے حاضر کیا گیا۔ داروغہ نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ گویا دل میں اس کا حلیہ ملا رہے ہوں۔ تب تیز نگاہوں سے دیکھ کر بولے۔ اچھا یہ الہٰ آباد کا رماناتھ ہے۔ خوب ملے بھائی۔ خوب ملے۔ چھ مہینہ سے پریشان کر رہے ہو۔ کیسا صاف حلیہ ہے کہ اندھا بھی پہچان لے۔ یہاں کب سے آئے؟

کانسٹبل نے رما کو صلاح دی۔ سارا حال سچ سچ بتادو۔ تو تمھارے ساتھ کوئی سختی نہ کی جائے گی۔

رما نے چہرہ کو بشاش بنا کر کہا۔ جناب اب تو آپ کے ہاتھ میں ہوں۔ رعایت کیجیے یا سختی کیجیے۔ الٰہ آباد کی میونسپلٹی میں ملازم تھا۔ حماقت کہیے یا بدنصیبی۔ چنگی کے چار سو روپے مجھ سے خرچ ہوگئے۔ میں وقت پر روپے جمع نہ کرسکا۔ شرم کے مارے گھر والوں سے بھی کچھ نہ کہہ سکا۔ نہیں تو اتنے روپے کا انتظام ہوجانا کچھ مشکل نہ تھا۔ جب کچھ بس نہ چلا تو وہاں سے بھاگ کر یہاں چلا آیا۔اس میں ایک حرف بھی غلط نہیں ہے۔

داروغہ نے چہرے کو متین بنا کر کہا۔ معاملہ کچھ سنگین ہے۔ کیا جُوا کھیلتے تھے یا بیوی کے زیور بنوائے تھے۔

رما ابھی کچھ جواب نہ دینے پایا تھا کہ دیبی دین آکر کھڑا ہوگیا۔

داروغہ نے تند لہجے میں پوچھا۔ کیا کام ہے یہاں؟

دیبی۔ حجور کو سلام کرنے چلا آیا۔ ان بے چارے پر رحم کی نگاہ رکھیے گا۔ بے چارے بڑے سیدھے آدمی ہیں۔

داروغہ۔ بچّا سرکاری ملزم کو گھر میں چھپاتے ہو۔ اس پر سفارش کرنے آئے ہو۔

دیبی۔ میں کیا سفارش کروں گا۔ حجور دو کوڑی کا آدمی ہوں۔

داروغہ۔ جانتا ہے۔ ان پر وارنٹ ہے۔ سرکاری روپے غبن کر گئے ہیں۔

دیبی۔ حجور بھول چوک آدمی ہی سے تو ہوتی ہے۔ جوانی کی عمر ہے ہی۔ خرچ ہوگئے ہوں گے۔

یہ کہتے ہوئے اس نے پانچ گِنیاں نکال کر میز پر رکھ دیں۔

داروغہ نے تڑپ کر کہا۔ یہ کیا ہے۔

دیبی۔ کچھ نہیں۔ حجور کو پان کھانے کو۔

داروغہ۔ رشوت دینا چاہتا ہے۔ کہو تو بچّا اسی الزام میں بھیج دوں۔

دیبی۔ بھیج دیجیے۔ گھر والی نکڑی کفن کی پھکر سے چھوٹ جائے گی۔ وہیں بیٹھا آپ کو دعا دوں گا۔

داروغہ۔ اگر انھیں چھڑانا ہے تو پچاس گِنیاں لاکر سامنے رکھو۔ جانتے ہو۔ ان کی گرفتاری پر

پانچ سو روپے کا انعام ہے۔

دینی۔ آپ کے لیے اتنا انعام کیا ہے۔ یہ سب بے چارے پردیسی آدمی ہیں۔ جب تک جئیں گے آپ کو یاد کریں گے۔

داروغہ۔ بک بک مت کرو۔ یہاں دھرم کمانے نہیں آئے ہیں۔

دینی۔ بہت تنگ ہوں حضور۔ دوری دُکان تو نام کی ہے۔

کانسٹبل۔ بڑھیا سے مانگ جاکے۔

دینی۔ کمانے والا تو میں ہی ہوں۔ لڑکوں کا حال جانتے ہی ہو۔ پیٹ کاٹ کر کچھ روپے جمع کر رکھے تھے۔ سو ابھی ساتوں دھام کیے چلا آتا ہوں۔

داروغہ۔ تو اپنی گنیاں اُٹھا لے۔ اسے باہر نکال دو جی۔

دینی۔ آپ کا حکم ہے تو لیجیے جاتا ہوں۔ دھکے کیوں دلوایئے گا۔

داروغہ (کانسٹبل سے) انھیں حراست میں رکھو۔ منشی سے کہو۔ ان کا بیان لکھ لیں۔

رما ناتھ نے دینی دین کے چہرہ پر اتنی حسرت ناک معذوری کبھی نہ دیکھی تھی۔ جیسے کوئی چڑیا اپنے گھونسلے میں بلّی کو گھستے دیکھ کر بے قرار ہوگئی ہو۔ وہ ایک لمحہ تھانے کے دروازہ پر کھڑا رہا۔ پھر پیچھے پھرا اور سپاہی سے کچھ کہہ کر لپکا ہوا سڑک تک چلا گیا۔ مگر ایک ہی لمحہ میں پھر لوٹا اور داروغہ سے بولا۔ حضور دو گھنٹہ کی مہلت نہ دیجیے گا۔

رما ابھی تک وہیں کھڑا تھا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر رو پڑا۔ بولا۔ دادا اب تم حیران نہ ہو میری تقدیر میں جو کچھ لکھا ہے وہ ہونے دو۔ میرے باپ بھی ہوتے۔ تو اس سے زیادہ اور کیا کرتے۔ میں مرتے دم تک تمھارا احسان مانوں گا۔

دینی دین نے آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا۔ کیسی بات کرتے ہو بھیا۔ جب روپوں پر آگئی تو دینی دین پیچھے ہٹنے والا نہیں ہے۔ اتنے روپے تو ایک دن کے جوئے میں ہار گیا ہوں۔ ابھی گھر بیچ دوں تو دس ہزار کی مالیت ہے۔ کیا سر پر لاد کر لے جاؤں گا۔ (داروغہ سے) ابھی نہیں حراست میں بھیجیے میں روپے کی فکر کرکے تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔

دینی دین چلا گیا۔ تو داروغہ نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ ہے تو خرانٹ مگر بڑا نیک تم نے اسے کون سی جڑی سنگھا دی۔

رما۔ غریبوں پر سبھی کو رحم آتا ہے۔

داروغہ نے مسکرا کر کہا۔ پولیس کو چھوڑ کر اتنا اور کہیے۔ مجھے تو یقین نہیں پچاس گنیاں لائے۔

رما۔ اگر لائے بھی تو میں اتنا بڑا تاوان نہیں دلانا چاہتا۔ آپ مجھے شوق سے حراست میں لے لیں۔

داروغہ مجھے پانچ سو کی جگہ ساڑھے چھ سو مل رہے ہیں تو کیوں چھوڑوں تمھاری گرفتاری کا انعام میرے کسی دوسرے بھائی کو مل جائے تو کیا بُرائی ہے؟

یکایک داروغہ کو جیسے کوئی بھولی ہوئی بات یاد آگئی۔۔ میز کی دراز سے ایک مسل نکالی۔ اس کے ورق اِدھر اُدھر اُلٹے۔ تب شفقت آمیز لہجے میں بولے۔ اگر میں کوئی ایسی ترکیب بتلا دوں کہ دیبی دین کے روپے بھی بچ جائیں اور تمھارے اُوپر کوئی حرف بھی نہ آئے تو کیسا؟

رما کو یقین نہ آیا۔ بولا۔ کیا ایسی بھی کوئی ترکیب ہے؟

داروغہ۔ اجی سائیں کے سو کھیل ہیں۔ آپ کو صرف ایک مقدمے میں شہادت دینی پڑے گی۔

رما۔ جھوٹی شہادت ہوگی۔

داروغہ۔ نہیں بالکل سچّی۔ بس یہی سمجھ لو کہ آدمی بن جاؤگے۔ میونسپلٹی کے پنجہ سے تو چھوٹ ہی جاؤگے۔ شاید سرکار پرورش بھی کر لے۔ بولو۔ اگر چالان ہوگیا تو پانچ سال سے کم سزا نہ ہوگی۔ مان لو۔ اس وقت دیبی دین تمھیں بچا بھی لے۔ تو بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔ مگر میں مجبور نہیں کرتا۔ تم اپنا نفع نقصان خود سوچ سکتے ہو۔

داروغہ نے ڈکیتی کی داستان کہہ سنائی۔ رما ایسے کئی مقدمے اخباروں میں پڑھ چکا تھا۔ بدگمان ہوکر بولا۔ تو مجھے مخبر بننا پڑے گا اور یہ کہنا پڑے گا کہ میں بھی ان ڈکیتوں میں شریک تھا۔ یہ تو جھوٹی شہادت ہے۔

داروغہ۔ معاملہ بالکل سچّا ہے۔ کسی بے گناہ کی جان خطرہ میں نہ آئے گی۔ وہی لوگ سزا پائیں گے۔ جو سزا کے مستحق ہیں۔ تب جھوٹ کہاں رہا۔ ڈاکوؤں کے خوف سے یہاں کے لوگ شہادت دینے سے گریز کرتے ہیں۔ بس اور کوئی ایسی بات نہیں

ہے۔ سوچ لیجیے۔ شام تک جواب دیجیے گا۔ یہ میں مانتا ہوں کہ آپ کو کچھ جھوٹ بولنا پڑے گا۔ لیکن نتائج کے اعتقاد حقیقت ہیں۔

رما کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی۔ اگر ایک بار جھوٹ بول کر وہ اپنی پچھلی حماقتوں کی تلافی کر سکے تو پوچھنا ہی کیا۔ اس میں بہت آگ پیچھ کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ وہ جانتا تھا کہ پولیس اس وقت غرض مند ہے اور وہ میری کوئی واجب شرط نامنظور نہ کرے گی۔ اس انداز سے بولا۔ گویا اس کا دل حق و باطل کے مخمسہ میں پڑا ہوا ہے۔ مجھے یہی خوف ہے کہ کہیں میری شہادت سے بے گناہ نہ پھنس جائیں۔

داروغہ۔ اس کا میں آپ کو اطمینان دلاتا ہوں۔

رما۔ اور اگر میونسپلٹی میری گردن ناپے تو میں کسے پکاروں گا۔

داروغہ۔ مجال ہے۔ میونسپلٹی چوں کر سکے۔ فوجداری کے مقدمہ میں مدعی تو سرکار ہوگی۔ سرکار کی جانب سے آپ کو تحریری معافی نامہ دے دیا جائے گا۔ بس اتنا سمجھ لیجیے کہ اگر آپ کی شہادت اچھی ہوئی اور فریق ثانی کے جرحوں کے جال سے آپ نکل گئے۔ تو آپ پارس ہو جائیں گے۔

داروغہ نے اسی وقت موٹر منگوائی اور رما کو ساتھ لے کر ڈپٹی صاحب سے ملنے چل دیے۔ اتنی اہم کارگزاری دکھانے میں تاخیر کیوں کرتے۔ ڈپٹی صاحب سے تخلیہ میں خوب ڈینگ اُڑائی۔ اس آدمی کی صورت دیکھتے ہی بھانپ گیا کہ مفرور ہے۔ فوراً گرفتار کیا۔ تجربہ کاروں کی نگاہ کہیں چوک سکتی ہے۔ حضور مجرم کی آنکھیں پہچانتا ہوں۔ الہٰ آباد میونسپلٹی کے روپے غبن کر کے بھاگا ہے۔ اس معاملہ میں شہادت دینے پر آمادہ ہے۔ آدمی پڑھا لکھا۔ صورت کا شریف اور ذہین ہے۔

ڈپٹی نے مشتبہ انداز سے کہا۔ ہاں آدمی ہوشیار معلوم ہوتا ہے۔

داروغہ۔ مگر معافی نامہ لیے بغیر اسے اعتبار نہ آئے گا۔ کہیں اُسے یہ شبہ ہوا کہ ہم لوگ اس کے ساتھ کوئی چال چل رہے ہیں تو صاف نکل جائے گا۔

ڈپٹی۔ یہ تو ہوگا ہی۔ گورنمنٹ سے اس بارے میں بات چیت کرنا ہوگا۔ آپ فون ملا کر الہٰ آباد سے پوچھیے کہ اس آدمی پر کیا مقدمہ ہے۔

داروغہ نے ٹیلی فون ڈائرکٹری دیکھی۔ نمبر ملایا اور بات چیت شروع ہوئی۔

ڈپٹی۔ کیا بولا۔

داروغہ۔ کہتا ہے یہاں اس نام کے کسی آدمی پر مقدمہ نہیں ہے۔

ڈپٹی۔ یہ کیا بات ہے بھائی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ اس نے نام تو نہیں بدل دیا۔

داروغہ۔ کہتا ہے میونسپلٹی میں کسی نے روپے غبن نہیں کیے۔ اس طرح کا کوئی معاملہ نہیں ہے۔

ڈپٹی۔ یہ تو بڑا تعجب کا بات ہے۔ آدمی بولتا ہے روپیہ لے کر بھاگا۔ میونسپلٹی بولتا ہے کوئی روپیہ غبن نہیں کیا۔ یہ آدمی پاگل تو نہیں ہے۔

داروغہ۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا اگر کہہ دیں تمھارے اوپر کوئی الزام نہیں تو پھر اس کی گرد بھی نہیں ملتی۔

ڈپٹی۔ اچھا میونسپلٹی کے دفتر سے پوچھیے۔

داروغہ نے پھر نمبر ملایا۔ سوال و جواب ہونے لگے۔

داروغہ۔ آپ کے یہاں رما ناتھ کوئی کلرک تھا؟

جواب۔ جی ہاں تھا۔

داروغہ۔ وہ کچھ روپے غبن کرکے بھاگا ہے۔

جواب۔ نہیں۔ وہ گھر سے نکل گیا ہے۔ لیکن غبن نہیں کیا۔ کیا وہ آپ کے یہاں ہے۔

داروغہ۔ جی ہاں۔ ہم نے اسے گرفتار کیا ہے۔ وہ خود کہتا ہے۔ روپے اس نے غبن کیے۔ بات کیا ہے؟

جواب۔ آپ تو لال بجھکڑ ہیں۔ ذرا دماغ لڑائیے!

داروغہ۔ یہاں تو عقل کام نہیں کرتی۔

جواب۔ یہیں کیا۔ کہیں بھی کام نہیں کرتی۔ صرف شہادتیں گھڑنا جانتی ہے۔ سنیئے۔ رما ناتھ نے میزان لگانے میں غلطی کی تھی۔ ڈر کر بھاگا۔ بعد کو معلوم ہوا کہ تحویل میں مطلق کمی نہ تھی۔ آئی سمجھ میں بات۔

ڈپٹی۔ اب کیا کرنے ہوگا کھان صاحب! چڑیا ہاتھ سے گیا۔

داروغہ۔ نکل کیسے گیا حضور۔ رما ناتھ سے یہ بات کہی ہی کیوں جائے۔ اسے کسی آدمی سے ملنے ہی کیوں دیا جائے جو اُسے یہ خبر دے سکے۔ گھر والے ضرور اس سے ملنے

آئیں گے۔ کسی سے ملنے نہ دیا جائے۔ تحریر میں کوئی بات نہ لائی جائے۔ صرف زبانی اطمینان دلایا جائے۔

اُدھر تو یہ مشورے ہو رہے تھے۔ اِدھر دبھی دین ایک گھنٹہ میں لوٹ کر تھانے آیا۔ کانسٹبل نے کہا داروغہ جی تو صاحب کے پاس گئے۔

دبھی دین نے گھبرا کر کہا۔ تو بھیا کو حراست میں ڈال دیا؟

کانسٹبل۔ نہیں انھیں بھی ساتھ لے گئے۔

دبھی دین نے سر پیٹ کر کہا۔ پولیس والوں کی بات کا کوئی بھروسہ نہیں۔ کہہ گیا کہ ایک گھنٹہ میں روپے لے کر آتا ہوں۔ مگر اتنا بھی صبر نہ ہوا۔ سرکار سے پانچ سو ہی ملیں گے۔ تو چھ سو دینے کو تیار ہوں۔ اب اوپر ہی اوپر انھیں پراگ راج بھیج دیں گے۔ میں دیکھ بھی نہ سکوں گا۔ بڑھیا رو رو کر مرجائے گی۔ یہ کہتا ہوا دبھی دین وہیں زمین پر بیٹھ گیا۔

کانسٹبل نے پوچھا۔ تو یہاں کب تک بیٹھے رہو گے؟

دبھی دین بے خوفی سے بولا۔ اب تو داروغہ جی سے دو دو باتیں ہی کرکے جاؤں گا چاہے جہل ہی جانا پڑے۔ مگر پھٹکاروں گا جرور۔ بُری طرح پھٹکاروں گا۔ ان کے بھی تو بال بچے ہیں۔ کیا بھگوان سے بالکل نہیں ڈرتے۔ تم نے بھیا کو جاتے بار دیکھا تھا۔ بہت رنجیدہ تھے۔

کانسٹبل۔ رنجیدہ تو نہیں تھے۔ خاصی طرح ہنس رہے تھے۔ خاصی طرح دونوں صاحب موٹر میں بیٹھ کر گئے ہیں۔

دبھی دین کو یقین نہ آیا۔ بولا۔ ہنس کیا رہے ہوں گے بے چارے۔ منہ سے چاہے ہنسیں۔ لیکن دل سے تو روتے ہی ہوں گے۔

دبھی دین کو یہاں بیٹھے ایک گھنٹہ بھی نہ ہوا ہوگا کہ یکایک جگو آ کھڑی ہوئی۔ دبھی دین کو دروازہ پر بیٹھے ہوئے دیکھ کر بولی۔ تم یہاں بیٹھے کیا کرتے ہو۔ بھیا کہاں ہیں؟

دبھی دین نے شکستہ دل ہوکر کہا۔ لے گئے صاحب کے پاس نہ جانے بھینٹ ہوتی ہے کہ اوپر ہی اوپر پراگ راج بھیج دیے جاتے ہیں۔

جگو۔ داروغہ جی تو بڑے وہ ہیں۔ کہاں تو کہا۔ اتنا لیں گے۔ کہاں لے

کر چل دیے۔

دیبی۔ اسی لیے تو بیٹھا ہوں۔

جگو۔ ہاں پھٹکارنا ضرور۔ جو اپنی بات کا نہیں وہ اپنے باپ کا کیا ہوگا۔ میں کھری کہوں گی۔ میرا کیا کرلیں گے۔

دیبی۔ دُکان پر کون ہے۔

جگو۔ بند کر آئی ہوں۔ ابھی بے چارے نے کچھ کھایا بھی نہیں۔ سویرے سے ویسے ہی ہے۔ چولھے میں جائے وہ تماشہ۔ اسی کے لیے ٹکٹ لینے تو جاتے تھے نہ گھر سے نکلتے تو کاہے کو یہ بلا سر پڑتی۔

دیبی۔ جو ادھر سے پراگ بھیج دیا تو۔

جگو۔ تو چٹھی تو آوے گی۔ چل کر دیکھ آئیں گے۔

دیبی۔ (آنکھوں میں آنسو بھرکر) سزا ہوجائے گی۔

جگو۔ روپے جمع کردیں گے۔ تو کاہے کو سجا ہوگی۔ سرکار اپنے روپے ہی تو لے گی۔

دیبی۔ ارے پگلی ایسا نہیں ہوتا۔ چور مال لوٹا دے تو وہ چھوڑ تھوڑے ہی دیا جائے گا۔

جگو نے صورت حال کا احساس کرکے کہا۔ دروگا جی ....

داروغہ جی کو موٹر سامنے آپہنچی۔ انسپکٹر صاحب بھی تھے۔ رما اِن دونوں کو دیکھتے ہی موٹر سے اُتر کر آیا اور خوش ہوکر بولا۔ تم یہاں دیر سے بیٹھے ہو کیا دادا۔ آو کمرے میں چلو۔ تم کب آئیں اماں!

داروغہ نے مذاقاً پوچھا۔ کہو چودھری لائے روپے؟

دیبی۔ جب کہہ گیا کہ میں ابھی تھوڑی دیر میں آتا ہوں تو آپ کو میری راہ دیکھنی چاہیے تھی۔ چلیے اپنے روپے لیجیے!

داروغہ۔ کھود کر نکالے ہوں گے۔

دیبی۔ آپ کے اقبال سے ہزار پانچ سو ابھی اوپر ہی نکل سکتے ہیں۔ چلو بھیا! بڑھیا کب سے کھڑی ہے۔ میں روپے چکا کر آتا ہوں۔

داروغہ۔ تو بھائی اپنے روپے لے جاکر کسی ہانڈی میں رکھ دو۔ افسروں نے انھیں چھوڑنے سے انکار کیا۔ میرے بس کی بات نہیں۔

انسپکٹر صاحب تو پہلے ہی دفتر میں چلے گئے تھے۔ یہ تینوں آدمی باتیں کرتے اس کے بغل والے کمرے میں گئے۔

دینی۔ دروگا جی! مردوں کی بات ایک ہوتی ہے۔ میں تو یہی جانتا ہوں میں روپے آپ کے حکم سے لایا ہوں۔ آپ کو اپنا قول پورا کرنا پڑے گا۔ کہہ کر مکر جانا نیچوں کا کام ہے۔

اتنے گستاخانہ الفاظ سُن کر داروغہ جی کو بھنا جانا چاہیے تھا لیکن انھوں نے ذرا بھی بُرا نہ مانا۔ ہنستے ہوئے بولے۔بھائی اب چاہے کمینہ کہو۔ چاہے دغاباز کہو۔ مگر اب انھیں چھوڑ نہیں سکتے۔ ایسے شکار روز نہیں ملا کرتے۔ قول کے پیچھے اپنی ترقی نہیں چھوڑ سکتا۔

داروغہ کے ہنسنے پر دینی دین اور بھی تیز ہوا۔ تو آپ نے کہا کس منہ سے تھا۔

داروغہ۔ کہا تو اسی منہ سے تھا۔ لیکن منہ ہمیشہ یکساں تو نہیں رہتا۔ اسی منہ سے گالی دیتا ہوں۔ اسی منہ سے اس کی تعریف کرتا ہوں۔

دینی۔ (تنک کر) یہ مونچھیں مڑوا ڈالیے۔

داروغہ۔ مجھے بڑی خوشی سے منظور ہے۔ نیت تو میری پہلے ہی تھی۔ لیکن شرم کے مارے نہ مڑواتا تھا۔ اب تم نے دل مضبوط کردیا۔

دینی۔ ہنسیے مت دروگا جی۔ آپ ہنستے ہیں اور میرا خون جلا جاتا ہے۔ چاہے جیل ہی کیوں نہ ہوجائے۔ لیکن میں کپتان صاحب سے ضرور کہہ دوں گا۔ ہوں تو کے کا آدمی۔ لیکن آپ کے اقبال سے بڑے بڑے افسروں تک پہنچ ہے۔

داروغہ۔ ارے یار تو کیا سچ مچ کپتان صاحب سے میری شکایت کردوگے؟

دینی دین نے سمجھا کہ دھمکی کارگر ہوئی۔ اکڑ کر بولا۔ آپ جب کسی کی نہیں سنتے۔ بات کہہ کر مکر جاتے ہیں۔ دوسرے بھی اپنی سی کریں گے ہی۔ میم صاحب تو روز ہی دُکان پر آتی ہیں۔

داروغہ۔ کون؟ دینی اگر تم نے صاحب یا میم صاحب سے میری شکایت کی۔ تو قسم کھاکر کہتا ہوں۔ گھر کھدوا کر پھینک دوں گا۔

دینی۔ جس دن میرا گھر کھدے گا۔ اس دن یہ پگڑی اور چپڑول بھی نہ رہے گی حجور۔

داروغہ۔ اچھا تو مارو ہاتھ پر ہاتھ۔ ہماری تمھاری دو دو چوٹیں ہوجائیں۔

دیبی۔ پچھتاؤ گے سرکار کہے دیتا ہوں پچھتاؤ گے۔

رما اب ضبط نہ کرسکا۔ اب تک وہ دیبی دین کی بدمزاجی کا تماشہ دیکھنے کے لیے بھیگی بلّی بنا کھڑا تھا۔ قہقہہ مار کر بولا۔ دادا داروغہ جی تمھیں چڑھا رہے ہیں۔ ہم لوگوں میں ایسی صلاح ہوگئی ہے کہ میں بغیر کچھ لیے دیے ہی رہا ہوجاؤں گا۔ اس کے علاوہ مجھے کوئی جگہ بھی مل جائے گی۔ صاحب نے پکا وعدہ کیا ہے۔ مجھے اب یہیں رہنا ہوگا۔

دیبی دین اس کا کچھ مطلب نہ سمجھ سکا۔ بولا۔ کیسی بات۔ بھیا کیا کہتے ہو۔ کیا پولیس والوں کے چکمے میں آگئے۔ اس میں کوئی نہ کوئی چال ضرور چھپی ہوگی۔

رما نے اطمینان کے ساتھ کہا اور کوئی بات نہیں۔ مجھے ایک مقدمہ میں شہادت دینی پڑے گی۔

دیبی دین نے بدگمانی سے سر ہلاکر کہا۔ جھوٹا مقدمہ ہوگا۔

رما۔ نہیں دادا۔ بالکل سچّا معاملہ ہے۔ میں نے پہلے ہی پوچھ لیا ہے۔

دیبی دین کو اطمینان نہ ہوا۔ بولا۔ میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ بھیا۔ ذرا سوچ سمجھ کر بات کرنا۔ اگر میرے روپوں سے ڈرتے ہو تو یہی سمجھ لو کہ اگر دیبی دین نے روپوں کی پرواہ کی ہوتی۔ تو آج لکھ پتی ہوتا۔ انھیں ہاتھوں سے سو سو روپے کمائے ہیں اور سب اُڑادیے ہیں۔ کس مقدمہ میں شہادت دینی ہے کچھ معلوم ہوا؟

داروغہ جی نے رما کو جواب دینے کا موقعہ نہ دے کر کہا۔ وہی ڈکیتی والا معاملہ ہے۔ جس میں کئی غریب آدمیوں کی جان گئی تھی۔ ان ڈاکوؤں نے صوبہ بھر میں ہنگامہ مچا رکھا تھا۔ ان کے خوف کے مارے کوئی آدمی گواہی دینے پر راضی نہیں ہوتا۔

دیبی دین نے بے رُخی کے ساتھ کہا۔ اچھا تو یہ مخبر بن گئے۔ یہ بات ہے۔ اس میں تو جو پولیس سکھائے گی وہی تمھیں کہنا پڑے گا۔ میں پھوٹی سمجھ کا آدمی ہوں۔ ان باتوں کا مطلب کیا جانوں۔ لیکن مجھ سے کوئی مخبر بننے کو کہتا تو نہ بنتا۔ چاہے کوئی لاکھ روپے دیتا۔ باہر کے آدمی کو کیا معلوم کہ کون کسوروار اور کون بے کسور ہے۔ دو چار ملجوموں کے ساتھ دو چار بے کسور تو جرور ہی ہوں گے۔

داروغہ۔ ہرگز نہیں۔ جتنے آدمی گرفتار کیے گئے ہیں سب پکّے ڈاکو ہیں۔

دیبی۔ یہ تو آپ کہتے ہیں نا۔ ہمیں کیا معلوم۔

داروغہ۔ ہم لوگ بے گناہوں کو پھنسائیں گے ہی کیوں یہ تو سوچو!
دیبی۔ یہ سب بھگتے بیٹھا ہوں دروگا جی! اس سے تو یہی اچھا ہے کہ آپ ان کا چالان
کردیں۔ سال دو سال کی سجا ہی تو ہوگی۔
رما نے بزدلانہ انداز سے کہا۔ میں نے خوب سوچ لیا ہے دادا۔ پوری مِسل دیکھ لی
ہے۔ اس میں کوئی بے گناہ نہیں ہے۔
دیبی دین نے دل شکستہ ہوکر کہا۔ ہوگا بھائی۔ جان تو پیاری ہوتی ہے۔ یہ کہہ کر وہ
لوٹ پڑا۔ اپنے جذبات کو وہ اس سے زیادہ واضح طور پر ظاہر نہ کرسکتا تھا۔
یکایک اُسے ایک بات یاد آگئی۔ مُڑ کر بولا۔ تمھیں کچھ روپے دیتا جاؤں بھیا!
رما نے خفت کے ساتھ کہا۔ کیا ضرورت ہے۔
داروغہ۔ آج سے انھیں یہیں رہنا پڑے گا۔
دیبی دین طنز کے انداز سے بولا۔ ہاں حجور۔ اتنا جانتا ہوں۔ ان کی دعوت ہوگی بنگلہ
رہنے کو ملے گا۔ نوکر ملیں گے۔ موٹر ملے گی۔ یہ سب جانتا ہوں کوئی باہر کا آدمی ان سے
ملنے نہ پائے گا۔ نہ یہ کسی سے ملنے پائیں گے یہ سب دیکھ چکا ہوں۔
یہ کہتا ہوا دیبی دین تیزی سے قدم اُٹھاتا ہوا چل دیا۔ گویا یہاں اس کا دم گھٹ رہا
ہوں۔ داروغہ نے اسے پکارا۔ مگر اس نے پھر کر نہ دیکھا۔ اس کے چہرے سے مایوسی چھائی
ہوئی تھی۔
جگو نے پوچھا۔ بھیا نہیں آرہے ہیں۔
دیبی دین نے سڑک کی طرف تاکتے ہوئے کہا۔ بھیا اب نہیں آویں گے۔ جب
اپنے ہی اپنے نہ ہوئے تو بھیا تو بیگانے ہی ہیں۔
دونوں اس طرح اُداس گھر کی طرف چلے۔ گویا کسی عزیز کی لاش جلا کر لوٹ رہے
ہوں۔

(۳۵)

رونے میں کتنا سکون، کتنی تقویت، کتنا روحانی سرور ہے۔ جو تنہائی میں بیٹھ کر کسی
کی یاد میں، کسی کے فراق میں یا کسی درد سے بیتاب ہوکر سِسک سِسک کر نہیں رویا۔ وہ
زندگی کی ایک ایسی نعمت سے محروم ہے۔ جس پر صدہا مسرتیں نثار ہیں۔ اس میٹھے درد کا

لطف انھیں سے پوچھو۔ جنھیں یہ مبارک موقع ملتے ہی ہنسی کے بعد دل پژمردہ ہوجاتا ہے۔ گویا ہم تھک گئے ہوں۔ مضمحل ہوگئے ہوں۔ رونے کے بعد ایک نئی فرحت، ایک تازہ شگفتگی، ایک روح افزا تسکین کا احساس ہوتا ہے۔ جالپا کے پاس اخبار کے دفتر سے خط پہنچا۔ تو اسے پڑھ کر وہ رو پڑی۔ ایک ہاتھ میں خط لیے اور دوسرے ہاتھ سے چوکھٹ پکڑے وہ خوب روئی۔ کیا سوچ کر روئی۔ یہ کون کہہ سکتا ہے شاید اس غیر متوقع کامیابی نے مسرت کی اس گہرائی تک پہنچادیا۔ جہاں پانی ہے۔ اس بلندی تک جہاں برف ہے۔ آج چھ مہینے کے بعد اسے پژمردہ جانفزا ملا۔ اتنے دنوں وہ وفا شعار امید اور بے رحم مایوسی کا کھلونا بنی رہی۔ آہ کتنی بار اس کے دل میں شورش ہوئی کہ زندگی کا خاتمہ کردے۔ اس تاریکی میں اسے اُمید کی روشنی صاف نظر آرہی تھی۔ اس نے سوچا وہ کتنے بے درد ہیں۔ چھ مہینے سے وہاں بیٹھے ہیں ایک خط بھی نہ لکھا۔ آخر یہی تو سوچ لیا ہوگا کہ بہت رو رو کر مرجائے گی۔ انھوں نے میری پرواہ ہی کب کی۔ دس بیس روپے تو آدمی یار دوستوں پر خرچ کردیتا ہے۔ یہ محبت نہیں ہے۔ محبت دل کی چیز ہے۔ روپے کی نہیں۔

جب تک رما کا کچھ پتہ نہ تھا۔ جالپا سارا الزام اپنے سر رکھتی تھی۔ لیکن آج اس کا سراغ پاتے ہی یکایک اس کا دل اس کی طرف سے سخت ہوگیا۔ طرح طرح کے شکوے پیدا ہونے لگے۔ وہاں کیا سمجھ کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ اسی لیے وہ آزاد ہیں۔ خودمختار ہیں۔ کسی کا دیا نہیں کھاتے۔ اس طرح اگر میں بغیر کہے سُنے کہیں چلی جاؤں تو قیامت آجائے۔ شاید تلوار لے کر میری گردن پر سوار ہوجائے یا زندگی بھر منہ نہ دیکھے۔

اتنے میں رمیش بابو نے دروازہ پر پکارا۔ گوپی۔ گوپی۔ ذرا ادھر آنا۔ منشی جی نے اپنے کمرہ میں پڑے پڑے کراہ کر کہا۔ کون ہے بھائی۔ کمرہ میں آجاؤ۔ ارے آپ ہیں رمیش بابو! بابو جی میں تو مر کر جیا۔ بس یہی سمجھ لیجیے کہ نئی زندگی پائی۔ کوئی امید نہ تھی۔ کوئی آگے ہے نہ پیچھے۔ دو لونڈے آوارہ ہیں۔ مروں یا جیوں ان سے مطلب نہیں۔ ان کی ماں میری صورت سے ڈرتی ہے۔ بچاری بہو نے میری جان بچائی۔ وہ نہ ہوتی تو اب تک چل بسا ہوتا۔

رمیش بابو نے مصنوعی ہمدردی دکھاتے ہوئے کہا۔ آپ اتنے بیمار ہوگئے اور مجھے خبر تک نہ دی۔ میرے یہاں رہتے آپ کو اتنی تکلیف ہوئی۔ بہو نے ایک پرزہ نہ لکھ دیا۔

رخصت لینی پڑی ہوگی۔
منشی جی۔ چھٹی کے لیے درخواست تو بھیج دی تھی۔ مگر صاحب میں نے ڈاکٹری سرٹیکیٹ نہیں بھیجا۔ سولہ روپے کس کے گھر سے لاتا۔ آپ تو جانتے ہی ہیں۔ بغیر فیس لیے ڈاکٹر لوگ بات نہیں کرتے۔ یہ تو ڈاکٹروں کا حال ہے۔ دیکھ رہے ہیں۔ آدمی مر رہا ہے۔ مگر بغیر فیس لیے قلم نہ اُٹھائیں گے۔
رمیش بابو نے فکرمندانہ لہجہ میں کہا۔ یہ تو آپ نے بُری خبر سنائی۔ اگر رخصت نامنظور ہوئی تو کیا کیجیے گا۔
منشی جی نے ماتھا ٹھونک کر کہا۔ ہوگا کیا۔ گھر بیٹھ رہوں گا۔ صاحب پوچھیں گے تو صاف کہہ دوں گا۔ سرجن نے چھٹی نہیں دی۔ آخرکار سرکار نے انھیں کس لیے تعینات کیا ہے۔ محض کرسی کی زینت بڑھانے کے لیے۔ مجھے برخاست ہوجانا منظور ہے مگر سرٹیفکیٹ نہ دوں گا۔ دیکھیے لونڈے غائب ہیں۔ آپ کے لیے پان کیسے منگوائیں۔
رمیش نے مسکرا کر کہا۔ میرے لیے آپ تردد نہ کریں۔ میں آج پان کھانے کا نہیں پیٹ بھر مٹھائی کھانے آیا ہوں (جالپا کو پکار کر) بہو جی! تمھارے لیے خوشخبری لایا ہوں۔ مٹھائی منگواؤ۔
جالپا نے پان کی طشتری ان کے سامنے رکھ دی اور بولی۔ پہلے وہ خبر تو سنایئے شاید آپ جس خبر کو نئی سمجھ رہے ہیں وہ پُرانی ہوگئی ہو۔
رمیش۔ کہیں ہو نہ۔ رما ناتھ کا پتہ چل گیا۔ کلکتہ میں ہیں۔
جالپا۔ مجھے پہلے ہی معلوم ہوچکا۔
منشی جی جھپٹ کر اُٹھ بیٹھے۔ اُن کا بخار گویا بھاگ کر اشتیاق کی آڑ میں چھپا۔ رمیش کا ہاتھ پکڑ کر بولے۔ معلوم ہوگیا۔ کلکتہ ہی میں ہیں۔ کوئی خط آیا تھا؟
رمیش۔ خط نہیں تھا۔ ایک پولیس انکوائری تھی۔ میں نے کہہ دیا ان پر کسی طرح کا الزام نہیں ہے۔ تمھیں کیسے معلوم ہوا بہو جی۔
جالپا نے کل داستان کہہ سنائی۔ اخبار کا خط بھی دکھایا۔ خط کے ساتھ روپوں کی ایک رسید تھی۔ جس پر رما کے دستخط تھے۔
رمیش۔ دستخط تو رما ناتھ کا ہے۔ بالکل صاف۔ کسی طرح کا شبہ نہیں ہوسکتا۔ میں تمھارا

قائل ہوگیا بہو جی۔ واہ کیا حکمت نکالی ہے۔ ہم سب کے کان کاٹ گئے۔ کسی کو نہ سوجھی۔ اب جو سوچتا ہوں تو دیکھتا ہوں۔ کتنی آسان بات تھی۔ اب تو وہاں کسی کو جانا چاہیے۔ جو حضرت کو پکڑ کر گھسیٹ لائے۔

یہی بات چیت ہو رہی تھی کہ رتن آ پہنچی۔ جالپا اسے دیکھتے ہی وہاں سے نکل آئی اور اس کے گلے سے لپٹ کر بولی۔ بہن کلکتہ سے خط آگیا۔ وہیں ہیں۔

رتن۔ میرے سر کی قسم۔

جالپا۔ سچ کہتی ہوں۔ خط دیکھونا۔

رتن۔ تو تم آج ہی چلی جاؤ۔

جالپا۔ ہاں یہی تو میں بھی سوچتی ہوں۔ تم چلوگی۔

رتن۔ چلنے کو تو میں تیار ہوں۔ لیکن اکیلا گھر کس پر چھوڑوں۔ مجھے اس منی بھوشن پر کچھ شبہ ہونے لگا ہے۔ اس کی نیت اچھی نہیں معلوم ہوتی۔ بینک میں بیس ہزار روپے سے کم نہ تھے۔ سب نہ جانے کہاں اُڑا دیے۔ کہتا ہے۔ کریا کرم میں خرچ ہوگئے۔ حساب مانگتی ہوں تو آنکھیں دکھاتا ہے۔ دفتر کی کنجی اپنے پاس رکھے ہوئے ہے۔ مانگتی ہوں تو ٹال جاتا ہے۔ مجھے خوف ہے کہ میرے ساتھ کوئی گہری چال چل رہا ہے۔ڈرتی ہوں۔ میں ادھر جاؤں۔ ادھر یہ سب کچھ لے دے کر چلتا بنے۔ بنگلے کے گاہک آرہے ہیں میں بھی سوچتی ہوں۔ دیہات میں جاکر اطمینان سے پڑی رہوں۔ میں نہ ہوں گی۔ تو شاید روپے بھی مجھے دیکھنے کو نہ ملیں گے۔ گوپی کو ساتھ لے کر آج ہی چلی جاؤ۔ روپے کا انتظام میں کردوں گی۔

جالپا۔ گوپی ناتھ تو شاید نہ جاسکیں۔ دادا کی دوا دارو کے لیے بھی تو کوئی چاہیے۔

رتن۔ وہ مجھ پر چھوڑ دو۔ میں روز سویرے آجاؤں گی اور شام کو بھی ایک بار دیکھ جایا کروں گی۔

جالپا۔ اور دن بھر ان کے ساتھ کون بیٹھا رہے گا۔

رتن۔ میں تھوڑی دیر بیٹھی بھی رہا کروں گی۔ مگر تم آج ہی جاؤ۔ بے چارے پر وہاں نہ جانے کیا گزر رہی ہوگی۔ تو یہی طے رہی نہ۔

رتن منشی جی کے کمرے میں گئی۔ تو رمیش بابو کھڑے ہوگئے اور بولے۔ آیئے!

دیبی جی۔ رما بابو کا پتہ تو چل گیا۔
رتن۔ اس میں آدھی کارگزاری میری ہے۔
رمیش۔ آپ کی صلاح سے تو ہوا ہی ہوگا۔ اب انھیں یہاں لانے کی فکر کرنی ہے۔
رتن۔ اس کی سب سے اچھی صورت یہی ہے کہ جالپا جاکر انھیں پکڑ لاویں۔ گوپی کو ساتھ لیتی جائیں۔ آپ کو اس میں کوئی اعتراض تو نہیں ہے دادا جی۔

منشی جی کو اعتراض تو تھا۔ ان کا بس چلتا۔ تو اس موقع پر دس پانچ آدمیوں کو اور جمع کر لیتے۔ مگر معاملہ ایسا آپڑا تھا کہ کچھ بول نہ سکے۔

گوپی کلکتہ کی سیر کا ایسا اچھا موقعہ پاکر کیوں نہ خوش ہوتا۔ بشمبھر دل میں اینٹھ کر رہ گیا۔ خدا نے اسے کم سن نہ بنایا ہوتا۔ تو آج اس کی حق تلفی کیوں نہ ہوتی۔ گوپی ایسے کہاں بڑے ہوشیار ہیں۔ جہاں جاتے ہیں وہیں کچھ نہ کچھ کھو آتے ہیں۔ ہاں مجھ سے بڑے ہیں۔ قدرت کے نظام نے اسے مجبور کردیا۔

رات کے نو بجے جالپا چلنے کو تیار ہوئی۔ ساس سُسر کے قدموں پر سر جھکاکر دعائیں لیں۔ بشمبھر ناتھ رو رہا تھا۔ اسے گلے لگا کر پیار کیا اور موٹر پر بیٹھی۔ رتن اسٹیشن تک پہنچانے کے لیے آئی تھی۔ موٹر چلی تو جالپا نے کہا۔ کلکتہ تو بہت بڑا شہر ہوگا۔ وہاں پتہ کیسے چلے گا۔

رتن۔ پہلے اخبار کے دفتر میں جانا وہاں سے پتہ چل جائے گا۔
جالپا۔ ٹھہروں گی کہاں؟
رتن۔ دھرم شالا میں یا ہوٹل میں ٹھہرنا۔ روپے کی ضرورت پڑے تو مجھے تار دینا بابو آجائیں۔ تو میری ناؤ پار لگ جائے۔ یہ منی بھوشن مجھے تباہ کردے گا۔
جالپا۔ ہوٹل میں بدمعاش تو نہ آتے ہوں گے۔
رتن۔ کوئی ذرا بھی شرارت کرے ٹھوکر مارنا۔ کچھ پوچھنا مت۔ ٹھوکر جما کر تب بات کرنا (کمر سے ایک چھری نکال کر) اسے اپنے پاس رکھو۔ کمر میں چھپائے رکھنا۔ جب کبھی باہر نکلتی ہوں تو اسے اپنے ساتھ رکھتی ہوں۔ اس سے دل بڑا مضبوط رہتا ہے جو مرد کسی عورت کو چھیڑتا ہے تو سمجھ لو وہ پرلے سرے کا نامرد، کمینہ اور اوباش ہے۔ تمھاری چھری کی چمک اور تمھارے تیور ہی دیکھ کر اس کی روح فنا ہوجائے

گی۔ سیدھا دُم دباکر بھاگے گا۔ لیکن اگر ایسا موقعہ آہی پڑے۔ جب تمھیں چھری سے کام لینے پر مجبور ہوجانا پڑے تو ذرا مت جھجکنا۔ اس کی بالکل فکر نہ کرنا کہ کیا ہوگا۔ کیا نہ ہوگا۔ جو کچھ ہونا ہوگا ہوجائے گا۔

اسٹیشن آگیا۔ قلیوں نے اسباب اُتارا۔ گوپی ٹکٹ لایا۔ جالپا پتھر کی مُورت کی طرح پلیٹ فارم پر کھڑی رہی۔ گویا حواس مفلوج ہوگئے ہوں۔ کسی بڑی آزمائش کے پہلے ہماری وہی حالت ہوجاتی ہے جو آسمان کی طوفان آنے کے قبل ہوتی ہے۔ رتن نے گوپی سے کہا۔ ہوشیار رہنا۔

گوپی ادھر کئی مہینوں سے ورزش کرتا تھا۔ چلتا تو موڈھے اور سینہ کو دیکھا کرتا۔ دیکھنے والوں کو تو وہ جیوں کا تیوں نظر آتا تھا۔ مگر اپنی نگاہ میں وہ کچھ اور ہوگیا تھا۔ شاید اسے تعجب ہوتا تھا کہ اُسے آتے دیکھ کر کیوں لوگ راستہ سے ہٹ نہیں جاتے۔ کیوں اس کے قدو قامت سے مرعوب نہیں ہوجاتے۔ اکڑ کر بولا۔ کسی نے ذرا بھی چوں چپڑ کی تو ہڈی توڑ دوں گا۔

— رتن مسکرائی۔ یہ تو مجھے معلوم ہے۔ سو مت جانا۔

گوپی۔ پلک تو جھپکے گی نہیں۔ مجال ہے نیند آجائے۔

گاڑی آگئی۔ گوپی نے ایک ڈبے میں گھس کر قبضہ جمالیا۔ جالپا کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ بولی۔ بہن دُعا دو کہ انھیں لے کر خیریت سے لوٹ آؤں۔

اس وقت اس کا کمزور دل کوئی سہارا ڈھونڈ رہا تھا اور دُعا کے سوا وہ سہارا اور کہاں ملتا۔

انجن نے سیٹی دی۔ دونوں سہیلیاں گلے ملیں۔ جالپا گاڑی میں جا بیٹھی۔

رتن نے کہا۔ جاتے ہی خط بھیجنا۔

جالپا نے سر ہلا دیا۔

اگر میری ضرورت معلوم ہو تو فوراً خط لکھنا۔ میں سب کچھ چھوڑ کر چلی آؤں گی۔

جالپا نے سر ہلا دیا۔

"راستے میں رونا مت!"

جالپا ہنس پڑی۔ گاڑی چل دی۔

دیبی دین نے چائے کی دکان اسی دن بند کردی اور دن بھر اس عدالت کی خاک چھانتا پھرتا تھا۔ جس میں ڈکیتی کا مقدمہ پیش تھا۔ رما ناتھ کی شہادت ہو رہی تھی۔ تین دن رما کی شہادت برابر ہوتی رہی اور تینوں دن دیبی دین نے کچھ کھایا نہ سویا۔ آج بھی اس نے گھر آتے ہی کرتا اُتار دیا اور ایک پنکھا لے کر جھلنے لگا۔ پھاگن لگ گیا تھا اور کچھ کچھ گرمی شروع ہوگئی تھی۔ لیکن اتنی گرمی نہ تھی کہ پسینہ چلے اور پنکھے کی ضرورت ہو۔ اکثر لوگ تو ابھی تک جاڑے کے کپڑے پہنتے تھے۔ لیکن دیبی دین پسینے میں تر تھا۔ اس کا چہرہ جس پر معصوم بڑھاپا ہنستا رہتا تھا۔ کھسیایا ہوا تھا۔ گویا بیگار سے لوٹا ہوا ہو۔

جگو نے لوٹے میں پانی لاکر رکھ دیا اور بولی۔ چلم بھر دوں۔

دیبی دین کی یہ تین دن کی خاطر ہو رہی تھی۔ اس کے پہلے بڑھیا کبھی چلم رکھنے کو نہ پوچھتی تھی۔ دیبی دین اس کا مطلب سمجھتا تھا۔ بڑھیا کو ترحم آمیز نگاہوں سے دیکھ کر بولا۔ نہیں رہنے دو۔ چلم نہ پیوں گا۔

"تو ہاتھ منہ دھو لو۔ گرد پڑی ہوئی ہے۔"

دھو لوں گا۔ جلدی کیا ہے۔

بڑھیا آج کا واقعہ سننے کے لیے بے قرار تھی۔ ڈر رہی تھی کہ دیبی دین جھنجلا نہ پڑے اور اس کی تھکن مٹا دینا چاہتی تھی۔ جس میں دیبی دین خوش ہوکر آپ ہی آپ سارا قصہ کہہ چلے۔

"تو کچھ جل پان تو کرلو۔ دوپہر کو بھی تو کچھ نہیں کھایا۔ مٹھائی لاؤں۔ پنکھا مجھے دے دو!"

دیبی دین نے پنکھا دے دیا۔ بڑھیا جھلنے لگی۔ دو تین منٹ تک آنکھیں بند کر کے بیٹھے رہنے کے بعد اس نے کہا۔ آج بھیا کی گواہی ختم ہوگئی۔

بڑھیا کا ہاتھ رُک گیا۔ تو کل سے وہ گھر آجائیں گے۔

دیبی۔ ابھی نہیں چھٹی ملی جاتی۔ یہی بیان دیوانی میں دینا پڑے گا اور اب وہ یہاں آنے ہی کیوں لگے۔ کوئی اچھی جگہ مل جائے گی۔ گھوڑے پر چڑھے چڑھے گھومیں گے مگر ہے بڑا پکا مطلبی۔ پندرہ آدمیوں کو بے گناہ پھنسا دیا۔ پانچ چھ کو تو پھانسی ہو جائے

گی۔ دوسروں کو دس دس بارہ بارہ سال کی سجا دھری رکھی ہے۔ اس کے بیان سے مقدمہ ثبوت ہوگیا۔ کوئی کتنی ہی جرح کرے۔ کیا مجال کہ جرا بھی ہچکچائے۔ اب ایک بھی نہ بچے گا۔ کس نے کیا۔ کس نے نہیں کیا۔ اس کا حال بھگوان جانیں پر سب مارے جائیں گے۔ گھر سے بھی سب سرکاری روپیہ کھاکر بھاگا تھا۔ ہمیں بڑا دھوکا ہوا۔

جگو نے شکوہ آمیز لہجہ میں کہا۔ اپنی نیکی بدی اپنے ساتھ ہے۔ مطلب کے لیے تو دنیا ہے۔ کون کس کے لیے مرتا ہے۔

دیبی۔ اپنے مطلب کے لیے جو دوسروں کا گلا کاٹے۔ اس کی جہر دے دینا بھی پاپ نہیں ہے۔

یکایک دو آدمی آکر کھڑے ہوگئے۔ ایک گورا خوبصورت لڑکا تھا۔ جس کی عمر پندرہ سولہ سال سے زاید نہ تھی۔ دوسرا ادھیڑ تھا اور صورت سے چپراسی معلوم ہوتا تھا۔

دیبی دین نے پوچھا۔ کسے کھوجتے ہو؟

چپراسی نے کہا۔ تمھارا ہی نام دیبی دین ہے نا۔ میں اخبار کے دفتر سے آیا ہوں یہ بابو انھیں رما ناتھ کے بھائی ہیں جنھیں شطرنج کا انعام ملا تھا۔ یہ انھیں کی تلاش میں دفتر گئے تھے۔ ایڈیٹر صاحب نے تمھارے پاس بھیج دیا۔ تو میں جاؤں؟

یہ کہتا ہوا وہ چلا گیا۔ دیبی دین نے گوپی کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ صورت رما ناتھ سے ملتی تھی۔ بولا۔ آؤ بیٹا بیٹھو کب آئے گھر سے؟

گوپی نے ایک کھٹک کی دکان پر بیٹھنا شان کے خلاف سمجھا۔ کھڑا کھڑا بولا۔ آج ہی تو آیا ہوں۔ بھابھی جی ساتھ ہیں۔ دھرم شالا میں ٹھہرا ہوا ہوں۔

دیبی دین نے کھڑے ہوکر کہا۔ تو جاکر بہو کو یہیں لاؤنا۔ اوپر تو رما بابو کا کمرہ ہے ہی۔ آرام سے رہو۔ دھرم سالے میں کیوں پڑے رہوگے۔ نہیں۔ چلو میں بھی چلتا ہوں یہاں سب طرح کا آرام ہے۔

اس نے جگو کو یہ خبر سنائی اور اوپر جھاڑو لگانے کو کہہ کر گوپی کے ساتھ دھرم شالے چل دیا۔ بڑھیا نے فوراً اوپر جاکر جھاڑو لگائی۔ لپک کر حلوائی کی دکان سے مٹھائی اور دہی لائی۔ صراحی میں پانی بھر کر رکھ دیا۔ پھر اپنا منہ دھویا۔ ایک رنگین ساڑھی نکالی۔ گہنے

پہنے اور بن ٹھن کر بہو کا انتظار کرنے لگی۔

ذرا دیر میں فٹن بھی آ پہنچی۔ بڑھیا نے جاکر جالپا کو اُتارا۔ جالپا پہلے تو ساگ بھاجی کو دکان دیکھ کر کچھ جھجکی۔ مگر بڑھیا کی مادرانہ خاطر مدارت دیکھ کر اس کی جھجک دُور ہوگئی۔ اس کے ساتھ اوپر گئی۔ تو ہر ایک چیز اس طرح اپنی جگہ پر پائی۔ گویا اپنا ہی گھر ہو۔

جگو نے لوٹے میں پانی رکھ کر کہا۔ اس گھر میں بھیا رہتے تھے بیٹی۔ آج تو پندرہ دن سے گھر سُونا پڑا ہوا ہے۔ منہ ہاتھ دھوکر منہ جوٹھا کر لو۔ بھیا کا حال تو ابھی تمھیں نہ معلوم ہوگا۔

جالپا نے سر ہلا کر کہا۔ کچھ ٹھیک نہیں معلوم ہوا۔ اخبار کے دفتر میں اتنا معلوم ہوا کہ پولیس نے گرفتار کر لیا۔

دیبی دین بھی اُوپر آگیا تھا۔ بولا۔ گرفتار تو کیا تھا۔ مگر اب تو وہ ایک معاملہ میں سرکاری گواہ ہوگئے ہیں۔ پراگ راج میں ان پر اب کوئی مقدمہ نہ چلے گا اور سُنا ہے نوکری چاکری بھی مل جائے گی۔

جالپا نے بے خوفی کے ساتھ کہا۔ وہاں تو ان پر کوئی مقدمہ نہیں ہے۔

دیبی دین نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ سنا ہے کچھ روپے پیسے کا معاملہ تھا۔

جالپا۔ وہ تو کوئی بات نہ تھی۔ جوں ہی ہم لوگوں کو معلوم ہوا کہ ان سے کچھ سرکاری رقم خرچ ہوئی ہے۔ اسی وقت روپے داخل کردیے۔ یہ فضول گھبرا کر چلے آئے اور پھر ایسی چپ سادھی کہ اپنی خبر تک نہ دی۔

دیبی دین کا چہرہ روشن ہوگیا۔ گویا کسی درد سے آرام مل گیا ہو۔ بولا۔ تو یہ ہم لوگوں کو کیا معلوم۔ باربار سمجھایا کہ گھر چٹھی پتر بھیج دو۔ لوگ گھبراتے ہوں گے۔ مگر مارے شرم کے لکھتے ہی نہ تھے۔ اسی دھوکے میں پڑے ہوئے تھے کہ وہاں ان پر مکدمہ چل رہا ہوگا۔ جانتے تو سرکاری گواہ کیوں بنتے۔

سرکاری گواہ قوم میں کتنی بُری نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ لوگ اسے کتنا ذلیل اور حقیر سمجھتے ہیں۔ یہ اس سے چھپا نہ تھا۔ سرکاری گواہ کیوں بنائے جاتے ہیں۔ کس طرح انھیں ترغیبیں دی جاتی ہیں۔ کس طرح وہ پولیس کے کٹھ پتلے بن کر اپنے ہی دوستوں کا گلا

گھونٹتے ہیں۔ یہ اسے معلوم تھا۔ اگر کوئی آدمی اپنی ناہمواریوں پر شرمندہ ہوکر حقیقت کا انکشاف کرے۔ دغا اور فتنہ انگیزی کا پردہ ہٹا دے تو وہ فرشتہ ہے۔ اس کی حق پسندی کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ مگر شرط یہی ہے کہ وہ اپنے رفیقوں کے ساتھ اپنے کیے کا پھل بھوگنے کو تیار ہو۔ ہنستا کھیلتا پھانسی پر چڑھ جائے۔ لیکن اپنی جان بچانے کے لیے یا خودغرضی کے زیر اثر سزا سے خائف ہوکر جو اپنے رفیقوں سے دغا کرے آستین کا سانپ بن جائے۔ وہ نامرد ہے۔ بے غیرت ہے۔ بے حیا ہے۔ ایسے آدمی کو دُنیا کبھی معاف نہیں کرتی۔ کبھی نہیں۔ یہاں تو معاملہ اور بھی پیچیدہ تھا۔ رما نے سزا کے خوف سے اپنے گروہ گناہوں کا پردہ نہیں کھولا تھا۔ اس میں کم سے کم سچائی تو ہوتی قابل نفرین ہونے پر بھی بات تو سچی ہوتی۔ یہاں تو ان گناہوں کا پردہ کھولا گیا تھا۔ جن کی ہوا تک اُسے نہ لگی تھی۔ جالپا کو اس کا یقین نہ آیا ضرور کوئی نہ کوئی بات اور ہوئی ہوگی۔ جس نے رما کو سرکاری گواہ بننے پر مجبور کردیا ہوگا۔ شرماتی ہوئی بولی۔ کیا یہاں بھی کوئی بات ہوگئی تھی؟

دیبی دین نے اطمینان انگیز لہجہ میں کہا۔ کوئی بات نہیں۔ پراگ راج سے وہ میرے ساتھ ہی یہاں آئے۔ جب سے یہاں سے کہیں گئے نہیں باہر نکلتے ہی نہ تھے۔ بس ایک دن نکلے اور اسی دن پولیس نے پکڑ لیا۔ ایک سپاہی کو اپنی طرف آتے دیکھ کر ڈرے کہ مجھی کو پکڑنے آرہا ہے۔ بھاگ کھڑے ہوئے۔ سپاہی کو کھٹکا ہوا اس نے شبہے میں گرفتار کرلیا۔ میں بھی ان کے پیچھے تھانے پر پہنچا۔ دروگا پہلے تو رشوت مانگتے تھے۔ مگر جب میں روپے لے کر پہنچا۔ تو وہاں اور ہی گل کھلا ہوا تھا۔ افسروں نے نہ جانے ان سے کیا بات چیت کی۔ بس سرکاری گواہ بن گئے۔ مجھ سے بھیّا نے یہی کہا کہ اس معاملے میں بالکل جھوٹ نہ بولنا پڑے گا۔ میں کیا کرتا چپ ہو رہا۔

جگو۔ نہ جانے سبھوں نے کون سی بوٹی سنگھا دی۔ بھیّا تو ایسے نہ تھے۔ دن بھر اماں اماں کرتے رہتے تھے۔ دکان پر سبھی طرح کے لوگ آتے ہیں۔ مرد بھی عورت بھی۔ کیا مجال کہ کسی کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھا ہو۔

دیبی۔ کوئی برائی نہ تھی۔ میں نے تو ایسا لڑکا ہی نہیں دیکھا۔

جالپا نے کچھ سوچ کر کہا۔ کیا ان کا بیان ہوگیا؟

دیبی۔ ہاں تین دن برابر ہوتا رہا۔

جالپا نے پوچھا۔ ان سے میری ملاقات تو ہوجائے گی؟

دیبی دین نے مسکرا کر کہا۔ ہاں اور کیا جس میں سارا بھنڈا پھوڑ کر رکھ۔ دو پولیس ایسی گدھی نہیں ہے۔ آج کل کوئی بھی ان سے ملنے نہیں پاتا۔ کڑا پہرہ رہتا ہے۔

اس مسئلہ پر اس وقت زیادہ گفتگو نہ ہوسکی۔ اس گتھی کو سلجھانا آسان نہ تھا۔ جالپا نے گوپی کو بلایا۔ وہ چھجے پر کھڑا سڑک کا تماشا دیکھ رہا تھا۔ گویا سسرال آیا ہو۔ جالپا نے کہا۔ منہ ہاتھ دھوکر کچھ کھالو تو۔

گوپی شرما کر پھر باہر چلا گیا۔

دیبی دین سمجھ گیا کہ ہم لوگوں کے سامنے یہ لڑکا کچھ کھاتے شرماتا ہے۔ بولا۔ تو اب ہم دونوں جاتے ہیں۔ تمھیں جس چیز کی جرورت ہو ہم سے کہہ دینا۔ بھیا کو تو ہم اپنا ہی سمجھے تھے اور ہمارے کون بیٹھا ہوا ہے۔

جگو نے غرور سے کہا۔ وہ تو میرے ہاتھ کا بنایا کھا لیتے تھے۔

جالپا مسکرا کر بولی۔ اب تمھیں کھانا نہ پکانا پڑے گا ماں جی۔ میں پکا دیا کروں گی۔

جگو نے ٹوکا۔ ہماری برادری میں دوسرے کے ہاتھ کا کھانا منع ہے۔ بہو۔ اب چار دن کے لیے برادری میں کیا نکو بنیں۔

جالپا۔ ہماری برادری میں بھی تو دوسروں کے ہاتھ کا کھانا منع ہے۔

جگو۔ تمھیں یہاں کون دیکھنے آتا ہے۔ پھر پڑھے لکھے آدمی ان باتوں کا بچار بھی تو نہیں کرتے۔ ہماری برادری تو گنواروں کی ہے۔

جالپا۔ یہ تو اچھا نہیں لگتا کہ تم پکاؤ اور میں کھاؤں۔ جسے بہو بنایا اس کے ہاتھ کا کھانا پڑے گا۔

اس اپنے پن سے بھرے ہوئے جُملے نے دیبی دین کے دل پر چوٹ کی۔ بولا۔ بہو نے بات تو بڑے پتہ کی کہی۔ اس کا جواب سوچ کر دینا ہوگا۔ ابھی چلو۔ ان لوگوں کو آرام کرنے دو۔

دونوں چلے گئے تو گوپی نے آکر کہا۔ بھیا اسی کھٹک کے یہاں رہتے تھے کیا۔ کھٹک ہی معلوم ہوتا ہے۔

جالپا نے پھٹکار کر کہا۔ کھٹک ہوں یا چمار ہوں لیکن ہم سے اور تم سے سوگنے اچھے

ہیں۔ ایک پردیسی آدمی کو چھ مہینہ تک گھر میں رکھا۔ کھلایا پلایا۔ ہم میں ہے اتنی ہمت۔ یہاں تو کوئی مہمان آجاتا ہے تو وہ بھی بھاری ہوجاتا ہے۔ اگر یہ لوگ نیچے ہیں تو ہم ان سے کہیں نیچے ہیں۔

گوپی منہ ہاتھ دھو چکا تھا۔ مٹھائی کھاتا ہوا بولا۔ کسی کو ٹھہرا لینے سے کوئی اُونچا نہیں ہوجاتا۔ چمار کتنا ہی دان پُن کرے پر رہے گا چمار ہی۔

جالپا۔ میں اس چمار کو اس پنڈت سے اچھا سمجھوں گی۔ جو دوسروں کو دغا دے۔

جل پان کرکے گوپی تو شہر گھومنے چلا گیا۔ جالپا نے کچھ نہ کھایا۔ اس کے سامنے ایک مشکل مسئلہ درپیش تھا۔ رما کو اس دلدل سے کیسے نکالے۔ اس رسوائی اور جگ ہنسائی کے خیال سے ہی اس کا ضمیر مجروح ہو اُٹھتا تھا۔

ان بے گناہوں کا خون کس کی گردن پر ہوگا۔ ملزموں میں نہ جانے کون گنہگار ہے۔ کون بے گناہ ہے۔ سبھی سزا پاجائیں گے۔ شاید دو چار کو پھانسی ہوجائے۔ یہ خون ناحق کس کی گردن پر ہوگا۔

اس نے پھر سوچا۔ لوگ کہتے ہیں یہ ڈھکوسلا ہے۔ کون جانتا ہے۔ کسی پر ہتیا پڑتی ہے یا نہیں۔ یہ بھی مان لیا کہ کسی پر ہتیا نہ پڑے گی۔ لیکن اپنی غرض کے لیے دوسروں کو خطرہ میں ڈالنا کتنا شرمناک ہے۔ رما نے اسے قبول ہی کیوں کیا۔ اگر مقدمہ چلنے کا خوف بھی تھا تو سال دو سال کی قید کے سوا اور کیا ہوتا۔ محض اس سزا سے بچنے کے لیے یہ دغا۔ اب معلوم بھی ہوجائے کہ میونسپلٹی کچھ نہیں کرسکتی تو کیا ہوسکتا ہے۔ ان کی شہادت تو ہو ہی گئی۔

یکایک ایک نقطہ کسی باریک کیل کی طرح اس کے دل میں چُبھ گیا۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ یہ اپنا بیان تبدیل کردیں۔ انھیں معلوم ہوجائے کہ ان پر کوئی مقدمہ نہ چلے گا۔ تو شاید وہ خود ہی اپنا بیان بدل دیں۔ مگر یہ معاملہ ان کے کانوں تک کیسے پہنچے۔

وہ اضطراب کے عالم میں نیچے آئی اور دیبی دین سے بولی۔ کیوں دادا ان کے پاس کوئی خط بھی نہیں پہنچ سکتا۔ پہرہ والوں کو دس پانچ روپے دینے سے تو شاید خط پہنچ جائے۔

دیبی دین نے نفی میں گردن ہلا کر کہا۔ مشکل ہے۔ پہرہ پر بڑے جنچے ہوئے آدمی رکھے گئے ہیں۔ میں دو بار گیا تھا۔ سبھوں نے پھاٹک پر کھڑا بھی نہ ہونے دیا۔

"اِس بنگلے کے آس پاس مکان دکان تو ہوں گے۔"

"ہاں ہیں کیوں نہیں۔ ایک طرف تو دوسرا بنگلہ ہے۔ دوسری طرف آموں کا باغ ہے سامنے سڑک ہے۔"

"شام کو وہ گھومنے گھامنے تو نکلتے ہی ہوں گے۔"

"ہاں نکلتے تو ہیں۔ لیکن پولیس کے دو ایک اپسر ساتھ رہتے ہیں۔"

"اگر کوئی اس باغ میں چھپ کر بیٹھے۔ تو کیا ہو۔ جب انھیں اکیلے دیکھے، خط پھینک دے۔ وہ ضرور اُٹھائیں گے۔

دیبی دین نے سوچ کر کہا۔ ہاں ہوسکتا ہے۔ لیکن اکیلے ملیں تب تو

ذرا اور اندھیرا ہوا تو جالپا نے دیبی دین کو ساتھ لیا اور رما ناتھ کا بنگلہ دیکھنے چلی۔ ایک خط لکھ کر جیب میں رکھ لیا تھا۔ بار بار دیبی دین سے پوچھتی۔ اب کتنی دُور ہے۔ سوچتی کہیں رما تنہا ٹہلتے ہوئے مل جائیں تو کیا پوچھنا ہے۔ خط کو رومال میں باندھ کر ان کے سامنے پھینک دُوں۔

دفعتاً اسے ایک اندیشہ پیدا ہوا۔ کہیں وہ خط پاکر بھی اپنا بیان نہ بدلیں تو کیا ہوگا۔ کون جانے اب میری یاد بھی انھیں ہے یا نہیں۔ کہیں مجھے دیکھ کر وہ منہ پھیر لیں تو کیا ہو۔ اس خیال سے وہ سہم اُٹھی۔

اس نے دیبی دین سے پوچھا۔ کیوں دادا وہ کبھی ہم لوگوں کا ذکر کرتے تھے۔

دیبی دین نے سر ہلا کر کہا کبھی نہیں۔ ہاں اُداس بہت رہتے تھے۔

اس جواب نے جالپا کو اور بھی تردّد میں ڈال دیا۔ شہر کی گھنی بستی سے یہ لوگ دور نکل آئے تھے۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ دن کی تیزروی کے بعد اس وقت ہوا بھی آرام کر رہی تھی۔ سڑک کے کنارے درخت اور میدان چاند کی گرد آلود روشنی میں بے جان سے معلوم ہوتے تھے۔ جالپا کو یہ گمان ہونے لگا کہ اس کی کوشش کا کچھ حاصل نہیں ہے۔ اس کی بادیہ پیمائی بالکل بے سُود ہے۔ اس بستی میں اس کی حالت بے کس لڑکے کی سی ہے۔ جو مٹھی بھر اناج کے لیے در بدر پھرتا ہو۔ وہ جانتا ہے۔ اگلے دروازہ پر بھی اسے کچھ نہ ملے گا۔ شاید گالیاں ہی ملیں۔ پھر بھی دستِ سوال پھیلا دیتا ہے۔ یہ اُمید کا سہارا نہیں مایوسی کا سہارا ہے۔

یکایک سڑک کے داہنی طرف بجلی کی روشنی نظر آئی۔

دیبی دین نے ایک بنگلے کی طرف انگلی اُٹھا کر کہا۔ وہی ان کا بنگلہ ہے۔

جالپا نے مایوسانہ نظروں سے ادھر دیکھا۔ بالکل سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کوئی آدمی نہ تھا۔ پھاٹک پر تالا پڑا ہوا تھا۔ بولی۔ یہاں تو کوئی نہیں ہے۔

دیبی دین نے پھاٹک کے اندر جھانک کر کہا۔ شاید یہ بنگلہ چھوڑ دیا۔ دیکھو میں پتہ لگاتا ہوں۔

بنگلے کے دائیں طرف آموں کے باغ میں روشنی نظر آئی۔ شاید کھٹک باغ کی رکھوالی کر رہا تھا۔ دیبی دین نے باغ میں آکر پکارا۔ کون ہے۔ یہاں کس نے یہ باغ لیا ہے۔

ایک آدمی آموں کے جھرمٹ سے نکل آیا۔ دیبی دین نے اسے پہچان کر کہا۔ ارے تم ہو جنگلی۔ تم نے یہ باغ لیا ہے۔ جنگلی ٹھنگنا سا گٹھیلا آدمی تھا۔ دیبی کی آواز پہچان کر بولا۔ ہاں دادا لے تو لیا۔ مگر کچھ ہے نہیں۔ گھاٹا ہی رہے گا۔ تم یہاں کیسے آگئے۔

دیبی۔ کچھ نہیں یوں ہی چلا آیا۔ اس بنگلہ والے آدمی کہاں گئے۔

جنگلی نے اِدھر اُدھر چوکنی آنکھوں سے دیکھ کر ان بتیوں میں کہا۔ اس میں وہی مخبر ٹکا ہوا تھا۔ آج سب چلے گئے۔ سنتے ہیں پندرہ بیس دن میں آویں گے۔ پڑھے لکھے آدمی بھی ایسے دگاباج ہوتے ہیں۔ دادا۔ سراسر جھوٹی گواہی دی۔ نہ جانے اس کے بال بچے ہیں یا نہیں۔ بھگوان سے بھی نہ ڈرا۔

جالپا وہیں کھڑی تھی۔ دیبی دین نے جنگلی کو اور زہر اُگلنے کا موقعہ نہ دیا۔ بولا۔ تو پندرہ بیس دن میں آویں گے۔ خوب معلوم ہوا ہے۔

”ہاں۔ وہی پہرے والے کہہ رہے تھے۔“

”کچھ معلوم ہوا۔ کہاں گئے ہیں۔“

”وہی موقع دیکھنے گئے ہیں۔ جہاں واردات ہوئی تھی۔“

دیبی دین چلم پینے لگا اور جالپا سڑک پر آکر ٹہلنے لگی۔ رما کی یہ توہین سُن کر اس کا دل پاش پاش ہوا جاتا تھا۔ اُسے رما پر غصہ نہ آیا۔ رنج بھی نہ ہوا۔ بلکہ اسے ہاتھوں کا سہارا دے کر اس دلدل سے نکالنے کے لیے اس کا دل بے قرار ہوگیا۔ رما چاہے اسے دھتکار ہی

کیوں نہ دے۔ اُسے ٹھکرا ہی کیوں نہ دے۔ مگر وہ اسے معصیت کے اس غار میں نہ گرنے دے گی۔

جب دونوں یہاں سے چلے تو جالپا نے پُوچھا۔ اس آدمی سے کہہ دیا ہے کہ جب وہ آئیں تو ہمیں خبر دے دے۔

"ہاں کہہ دیا ہے۔"

(۳۷)

ایک مہینہ گزر گیا۔ گوپی ناتھ پہلے تو کئی دن کلکتہ کی سیر کرتا رہا۔ مگر چار پانچ دن میں ہی یہاں سے اس کا جی ایسا اُچاٹ ہوا کہ گھر کی رٹ لگانی شروع کی۔ آخر جالپا نے اُسے لوٹا دینا ہی اچھا سمجھا۔ یہاں تو وہ چُھپ چُھپ کر رویا کرتا تھا۔

جالپا کئی بار رما کے بنگلہ تک ہو آئی۔ وہ جانتی تھی کہ ابھی رما نہیں آئے ہیں۔ پھر بھی وہاں کا ایک چکر لگا آنے میں اُسے ایک عجیب تسلی ہوتی تھی۔

جالپا کچھ پڑھتے پڑھتے یا لیٹے لیٹے تھک جاتی تو ایک لمحہ کے لیے کھڑکی کے سامنے آکھڑی ہوتی۔ ایک دن شام کو وہ کھڑکی کے سامنے آئی۔ تو سڑک پر موٹروں کی قطار نظر آئی۔ تعجب ہوا اتنی موٹریں کہاں جاتی ہیں۔ غور سے دیکھنے لگی۔ کُل چھ موٹریں تھیں۔ ان میں پولیس کے افسر بیٹھے ہوئے تھے۔ آخری موٹر پر اس کی نگاہ پڑی۔ تو سارے جسم میں ایک برقی رو سی دوڑ گئی۔ وہ ایک محویت کے عالم میں کھڑکی سے زینے تک دوڑی ہوئی گئی۔ گویا موٹروں کو روک لینا چاہتی ہو۔ لیکن اتنی ہی دیر میں اسے معلوم ہوگیا کہ میرے نیچے پہنچتے پہنچتے موٹریں نکل جائیں گی۔ وہ پھر کھڑکی کے سامنے آگئی۔ رما اب بالکل سامنے آگیا تھا۔ اس کی آنکھیں کھڑکی کر طرف لگی ہوئی تھیں۔ جالپا نے اشارہ سے کچھ کہنا چاہا۔ لیکن حیا مانع ہوئی۔ ایسا معلوم ہوا کہ رما کی موٹر کچھ دھیمی ہوگئی ہے۔

دیبی دین کی آواز بھی سنائی دی۔ مگر موٹر رُکی نہیں۔

جالپا نے زینہ پر آکر کہا۔ دادا!

دیبی دین نے سامنے آکر کہا۔ بھیا آگئے۔ وہ کیا موٹر جا رہی ہے۔

یہ کہتا ہوا وہ اُوپر گیا۔ جالپا نے شوق تجسس کو شرم سے دباتے ہوئے کہا۔ تم سے کچھ کہا۔

دیبی۔ اور کیا کہتے۔ کھالی رام رام کی۔ میں نے خیریت پوچھی۔ دونوں ہاتھوں سے دلاسا دیتے چلے گئے۔ تم نے دیکھا کہ نہیں۔

جالپا نے سر جھکا کر کہا۔ دیکھا کیوں نہیں۔ کھڑکی پر کھڑی تھی۔

"انھوں نے بھی تمھیں دیکھا ہوگا۔'

"کھڑکی کی طرف تو تاکتے تھے۔"

"بہت چکرائے ہوں گے کہ یہ کون ہے۔"

"کچھ معلوم ہوا۔ مقدمہ کب پیش ہوگا۔"

"کل ہی تو"

"تب تو جو کچھ کرنا ہے۔ آج ہی کرلینا چاہیے۔ میرا خط کسی طرح انھیں مل جاتا تو کام بن جاتا۔

دیبی دین نے اس طرح دیکھا۔ گویا کہہ رہا ہے۔ تم اس کام کو جتنا آسان سمجھتی ہو اتنا آسان نہیں ہے۔

جالپا نے اس کے دل کی کیفیت سمجھ کر کہا۔ کیا تمھیں شبہ ہے کہ وہ اپنا بیان تبدیل کرنے پر راضی نہ ہوں گے۔

دیبی دین کہ اب سے تسلیم کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ بولا۔ ہاں بہو جی! مجھے اس کا بہت بڑا اندیشہ ہے اور سچ پوچھو۔ تو ہے بھی جوکھم۔ اگر وہ بیان بدل بھی دیں تو پولیس کے پنجے سے چھوٹ نہیں سکتے۔ وہ کوئی دوسرا الزام لگا کر انھیں پھر پکڑے گی اور کوئی نیا مقدمہ چلا دے گی۔

جالپا نے ایسی نظروں سے دیکھا۔ گویا اسے اس کا بالکل اندیشہ نہیں ہے۔ پھر بولی۔ دادا۔ میں انھیں پولیس کے پنجے سے بچانے کا ٹھیکہ نہیں لیتی۔ میں صرف یہی چاہتی ہوں کہ ممکن ہو تو انھیں رسوائی سے بچا لوں۔ اگر وہ سچ مچ ڈکیتوں میں شریک ہوتے تب بھی میں یہی چاہتی کہ آخر تک اپنے ساتھیوں کے ساتھ رہیں۔ میں یہ کبھی پسند نہ کرتی کہ وہ دوسروں کو دغا دے کر مخبر بن جائیں۔ لیکن یہ معاملہ تو بالکل جھوٹ ہے۔ میں کسی طرح نہیں برداشت کرسکتی کہ وہ اپنی غرض کے لیے جھوٹی شہادت دیں۔ اگر انھوں نے اپنا بیان نہ بدلا۔ تو میں عدالت میں جاکر ساری قلعی کھول دوں گی۔ نتیجہ کچھ بھی ہو۔ وہ ہمیشہ کے

لیے مجھ سے قطع تعلق کرلیں۔ میری صورت نہ دیکھیں۔ یہ مجھے منظور ہے۔ مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ اتنے بے گناہوں کا خون ان کی گردن پر ہو۔

دیبی دین نے اُسے عقیدت کی نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ تم سب کچھ کر لوگی بہو جی اب مجھے بسواس ہوگیا۔ جب تم نے کلیجہ اتنا مضبوط کر لیا ہے تو تم سب کچھ کر سکتی ہو۔

"تو یہاں سے نو بجے چلیں۔"

"میں تیار ہوں۔"

(۳۸)

وہ رما ناتھ جو پولیس کے خوف سے باہر نہ نکلتا تھا۔ جو دیبی دین کے گھر میں چوروں کی طرح پڑا زندگی کے دن پورے کر رہا تھا۔ آج دو مہینوں سے رئیسانہ عیش و عشرت میں ڈوبا ہوا ہے۔ آسائش کے سبھی سامان موجود ہیں۔ خدمت کے لیے چوکیداروں کی ایک فوج۔ کھانا پکانے کے لیے کاشمیری باورچی۔ بڑے بڑے افسر اس کی دلجوئی کرتے رہتے ہیں۔ اس کے منہ سے بات نکلی نہیں کہ پوری ہوئی۔ اتنے ہی دنوں میں اس کے مزاج میں اتنی نفاست آگئی ہے۔ گویا وہ خاندانی رئیس ہو۔ اسے کبھی اس کا خیال بھی نہیں آتا کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ کتنے بے گناہوں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگ رہا ہوں۔ اسے اپنی حالت پر غور کرنے کا موقعہ ہی نہیں دیا جاتا۔ رات کو وہ افسروں کے ساتھ سنیما یا تھیئٹر دیکھنے جاتا ہے۔ شام کو موٹروں کی سیر ہوتی ہے۔ دلچسپی کے نت نئے سامان مہیا ہوتے رہتے ہیں۔ جس دن مجسٹریٹ نے ملزموں کو سشن کے سپرد کیا۔ سب سے زیادہ خوشی رما کو ہوئی۔ گویا اس کی خوش نصیبی کا ستارا طلوع ہو رہا ہے۔

پولیس کو معلوم تھا کہ سیشن جج کی عدالت میں یہ گھر کی کھیتی نہ ہوگی۔ اتفاق سے جج صاحب ہندوستانی تھے اور حق پروری کے لیے بدنام۔ پولیس ہو یا ملزم ان کی نگاہ میں دونوں برابر تھے۔ وہ کسی کے ساتھ رورعایت نہ کرتے تھے۔ اس لیے پولیس نے ایک بار رما کو ان مقامات سے روشناس کرا دینا ضروری سمجھا۔ جہاں وارداتیں ہوئی تھیں ایک زمیندار کے سجے سجائے بنگلہ میں یہ جماعت فروکش ہوئی۔ دن بھر لوگ شکار کھیلتے۔ رات کو گراموفون سنتے۔ تاش کھیلتے یا بجرے پرندے کی سیر کرتے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی شہزادہ شکار کھیلنے آیا ہے۔ ان دلچسپیوں میں رما کو کوئی آرزو تھی تو یہ کہ جالپا بھی یہاں

ہوتی۔ اب تک وہ محتاج تھا۔ مفلس تھا۔ اس کی خواہشیں گویا نیم جان ہو رہی تھیں۔ نسیم کے ان ٹھنڈے جھونکوں نے انھیں بیدار کردیا۔ وہ اس خیال سے خوش تھا کہ یہ مقدمہ ختم ہوتے ہی اسے کوئی عہدہ مل جائے گا۔ تب وہ جاکر جالپا کو منا لائے گا اور زندگی کے لطف اُٹھائے گا۔ وہاں وہ ایک نئی زندگی ہوگی۔ اس کے اصول کچھ اور ہوں گے۔ معیار کچھ اور ہوں گے۔ اس میں سخت پابندیاں ہوں گی۔ اور بے دردانہ بندشیں۔ اب اس کی زندگی کا کچھ مقصد ہوگا۔ کچھ نصب العین ہوگا۔ محض کھانا۔ سونا اور روپے کے لیے ہائے ہائے کرنا ہی مآلِ زندگی نہ ہوگا۔ اسی مقصد کے ساتھ اس بے اصولانہ زندگی کا خاتمہ ہوجائے گا۔ نفس کی گمراہیوں نے اسے یہ دن دکھایا تھا اور اب تک نئے بے لوث زندگی کا خواب دکھا رہی تھی۔ شرابیوں کی طرح ایسے اشخاص بھی روز ہی پاک ارادے کرتے ہیں۔ لیکن ان ارادوں کا انجام کیا ہوتا ہے۔ نئی نئی ترغیبیں سامنے آتی رہتی ہیں اور آغازِ اصلاح کی معیاد ٹلتی چلی جاتی ہے۔ نئی سحر کا طلوع کبھی نہیں ہوتا۔

ایک مہینہ دیہات کی سیر کرنے کے بعد رما اپنے نازبرداروں کے ساتھ اپنے بنگلہ پر جا رہا تھا۔ راستہ دیبی دین کے گھر کے سامنے سے تھا۔ کچھ دُور ہی سے اپنا کمرہ دکھائی دیا۔ اس کی نگاہیں خواہ مخواہ اوپر اُٹھ گئیں۔ کھڑکی کے سامنے کوئی کھڑا تھا۔ اس نے سوچا اس وقت دیبی دین وہاں کیا کر رہا ہے۔ ذرا غور سے دیکھا۔ یہ تو کوئی عورت معلوم دیتی ہے۔ مگر عورت کہاں سے آئی۔ دیبی دین نے وہ کمرہ کرایہ پر تو نہیں اُٹھا دیا۔ ایسا تو شاید وہ کیا کرے گا۔ موٹر جب اور قریب آئی تو اس عورت کا چہرہ صاف نظر آنے لگا۔ رما چونک پڑا۔ یہ تو جالپا ہے۔ بے شک جالپا ہے۔ مگر نہیں۔ جالپا یہاں کیسے آوے گی۔ میرا پتہ ٹھکانہ اسے کہاں معلوم۔ کہیں بڈھے نے اسے خط تو نہیں لکھ دیا، ہے تو جالپا ہی۔ نائب داروغہ موٹر چلا رہا تھا۔ رما نے بڑی منّت کے ساتھ کہا۔ سردار صاحب ایک لمحہ کے لیے رُک جایئے۔ میں ذرا دیبی دین سے ایک بات کرلوں۔ نائب نے موٹر دھیمی کرلی۔ لیکن پھر سوچ کر اُسے آگے بڑھا دیا۔

رما نے تیز ہوکر کہا۔ آپ تو مجھے قیدی سمجھ رہے ہیں۔

نائب نے خفیف ہوکر کہا۔ آپ تو جانتے ہیں۔ ڈپٹی صاحب کتنا جامے سے باہر ہوجاتے ہیں۔

بنگلہ پر پہنچ کر رما سوچنے لگا کہ جالپا سے کیسے ملوں۔ وہ جالپا ہی تھی۔ اس میں اسے کچھ ذرا بھی شبہ نہ تھا۔ آنکھوں کو کیسے دھوکا دیتا۔ دل میں ایک طوفان اُٹھا ہوا تھا کیا کرے۔ کیسے جائے۔ اسے کپڑے اُتارنے کی یاد بھی نہ رہی تھی۔ پندرہ منٹ تک وہ کمرے کے دروازے پر کھڑا رہا۔ کوئی حکمت نہ سُوجھی۔ لاچار پلنگ پر لیٹ رہا۔

ذرا دیر میں وہ پھر اُٹھا اور سامنے صحن میں نکل آیا۔ پھاٹک پر چوکیدار کھڑا تھا۔ سڑک پر اسی وقت بجلی روشن ہوگئی۔ رما کو چوکیدار پر ایسا غصہ آیا کہ گولی مار دے۔ سوچنے لگا۔ اگر مجھے کوئی اچھی جگہ مل گئی۔ تو ایک ایک سے سمجھوں گا۔ تمھیں تو ڈسمس کرا کے چھوڑوں گا۔ کیسا شیطان کی طرح سر پر سوار ہے۔ منہ تو دیکھو ذرا۔ معلوم ہوتا ہے بکری کی دُم ہے۔ واہ رے آپ کی پگڑی۔ کوئی ٹوکری ڈھونے والا قلی ہے۔ ابھی کُتا بھونک پڑے۔ تو آپ دُم دبا کر بھاگیں گے۔ مگر یہاں ایسے ڈٹے کھڑے ہیں۔ گویا کسی قلعہ کے دروازے کی حفاظت کر رہے ہیں۔

ایک چوکیدار نے آکر کہا۔ اسپٹر صاحب نے بلایا ہے۔ باجے کے کچھ نئے توے منگوائے ہیں۔ رما نے جھلا کر کہا۔ مجھے فرصت نہیں ہے۔ پھر سوچنے لگا۔ جالپا اس وقت یہاں کیسے آئی۔ اکیلی آئی ہے یا اور کوئی ساتھ ہے۔ ظالم نے بڈھے سے ایک منٹ بھی بات نہ کرنے دیا۔ جالپا پوچھے گی تو ضرور کہ کیوں بھاگے تھے۔ صاف صاف کہہ دوں گا۔ اس وقت اور کر ہی کیا سکتا تھا۔ مگر ان تھوڑے دنوں کی تکلیف نے زندگی کا مسئلہ تو حل کردیا۔ اب لطف سے زندگی کٹے گی۔ کوشش کرکے اسی طرف اپنا تبادلہ کرالوں گا۔ یہ سوچتے سوچتے رما کو خیال آیا کہ جالپا بھی میرے ساتھ یہاں رہے تو کیا ہرج ہے۔ مجھے باہر والوں سے ملنے کی ممانعت ہے۔ جالپا کے لیے روکاوٹ ہوسکتی ہے لیکن اس وقت اس مسئلہ کو چھیڑنا مناسب نہیں۔ کل اس کا تصفیہ کروں گا۔ وہی دین بھی عجیب آدمی ہے۔ پہلے تو کئی بار آیا۔ مگر آج اس نے بھی چپ سادھ لی۔ کم سے کم اتنا تو ہوسکتا تھا کہ آکر پہرے والے کانسٹبل کی معرفت مجھے جالپا کے آنے کی خبر دیتا۔ پھر میں دیکھتا کون جالپا کو نہیں آنے دیتا۔

رسویا تھالی لایا۔ گوشت ایک قسم کا تھا۔ رما تھالی دیکھتے ہی جھلا اُٹھا۔ ان دنوں لذیذ کھانا دیکھ کر ہی اُسے بھوک لگتی تھی۔ جب تک چار پانچ قسم کا گوشت نہ ہو۔ چٹنی اچار نہ

ہو۔ اسے کھانے کی رغبت نہ ہوتی تھی۔ بگڑ کر بولا۔ کیا کھاؤں تمھارا سر۔ تھالی اُٹھا لے جاؤ۔

رسوئیے نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ حضور اتنی جلد اور چیزیں کیسے بناتا۔ ابھی کل دو گھنٹے تو آئے ہوئے ہیں۔

"دو گھنٹے تمھارے لیے تھوڑے ہوتے ہیں۔"

"اب حضور سے کیا کہوں۔"

"مت بکو"

"حضور......"

"مت بکو۔ ڈیم"

رسوئیے نے پھر کچھ نہ کہا۔ بوتل لایا۔ برف توڑ کر گلاس میں ڈالی اور پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔

رما کو اس وقت ایسا غصہ آرہا تھا کہ رسوئیے کو نوچ کھائے۔ اس کا مزاج ان دنوں بہت تیز ہو گیا تھا۔

شراب کا دور شروع ہوا۔ تو رما کا غصہ اور بھی تیز ہوا۔ لال لال آنکھیں نکال کر بولا۔ چاہوں تو ابھی تمھارا کان پکڑ کر نکال دوں۔ ابھی اسی دم۔ تم نے سمجھا کیا ہے؟

اس کا غصہ بڑھتا ہوا دیکھ کر رسویا چپکے سے سرک گیا۔ رما نے گلاس لیا اور دو چار لقمہ کھاکر باہر صحن میں ٹہلنے لگا ذُھن سوار تھی۔ کیسے یہاں سے نکل جاؤں۔

یکایک اُسے ایسا معلوم ہوا کہ تار کے باہر درختوں کی آڑ میں کوئی ہے۔ ہاں کوئی کھڑا اس کی طرف تاک رہا ہے۔ شاید اشارے سے اپنی طرف بُلا رہا ہے۔ رما ناتھ کا دل دھڑکنے لگا۔ کہیں مفسدوں نے اس کی جان لینے کی تو نہیں ٹھانی ہے۔ یہ خدشہ اسے ہمیشہ لگا رہتا تھا۔ اسی خوف سے وہ رات کو بنگلہ کے باہر بہت کم نکلتا تھا۔ فقط جان کے اندیشہ نے اُسے اندر چلے جانے کی تحریک کی۔ اسی وقت ایک موٹر سڑک سے نکلی۔ اس کی روشنی میں رما نے دیکھا۔ وہ اندھیرا سایہ کسی عورت کا ہے۔ اس کی ساڑھی صاف نظر آرہی تھی۔ پھر اسے معلوم ہوا کہ وہ عورت اس کی طرف آرہی ہے۔ پھر خیال آیا کوئی مرد اس صورت میں میرے ساتھ دغا تو نہیں کر رہا ہے۔ وہ جیوں جیوں پیچھے ہٹتا تھا وہ سایہ اس کی

طرف بڑھتا چلا۔ یہاں تک کہ تار کے پاس آکر اس نے کوئی چیز رما کی طرف پھینکی۔ رما چیخ مار کر پیچھے ہٹ گیا۔ مگر دیکھا تو صرف ایک لفافہ تھا۔ اس لیے کچھ تسکین ہوئی۔ وہ سایہ بھی تاریکی میں غائب ہوگیا تھا۔ رما نے لپک کر وہ لفافہ اُٹھا لیا۔ خوف بھی تھا اور تعجب بھی۔ خوف کم تھا تعجب زیادہ۔ لفافہ کو جیب میں چھپائے وہ کمرے میں آیا۔ دونوں طرف کے دروازے بند کرلیے اور لفافہ کو ہاتھ میں لے کر دیکھنے لگا۔ سرنامہ دیکھتے ہی اس کے دل میں پھریریاں سی اُڑنے لگیں۔ تحریر جالپا کی تھی۔ فوراً لفافہ کھولا۔ ایک ہی سانس میں سارا خط پڑھ گیا۔ اور ایک لمبی سانس لی۔ اسی سانس کے ساتھ توہمات کا وہ بوجھ جس نے چھ ماہ سے اس کی روح کو دبا رکھا تھا۔ وہ سارا دردِ دل جو اس کے خونِ حیات کو چوسے ڈالتا تھا۔ وہ ساری کمزوری۔ شرم اور خفت جیسے چھومنتر ہوگئی۔ اُسے اتنی تقویت اتنا غرور اور اپنے اوپر اتنا اعتماد کبھی نہ ہوا تھا۔ پہلی سنک یہ سوار ہوئی۔ ابھی چل کر داروغہ سے کہہ دوں۔ مجھے اس مقدمہ سے کوئی تعلق نہیں۔ لیکن پھر خیال آیا بیان تو اب ہو ہی چکا۔ جتنی رسوائی ہوئی تھی۔ ہو ہی چکی۔ اب گناہ کی لذت سے کیوں ہاتھ دھوؤں۔ مگر ان ظالموں نے مجھے کیسا دھوکا دیا ہے۔ کیسا چکمہ دیا ہے اور ابھی تک مغالطہ میں ڈالے ہوئے ہیں۔ سب کے سب میری دوستی کا دم بھرتے ہیں۔ مگر ابھی تک اصلی راز مجھ سے چھپائے ہوئے ہیں۔ اب بھی ان پر مجھے اعتبار نہیں ہے۔ اگر اسی بات پر اپنا بیان بدل دوں۔ تو ناطقہ بند ہوجائے۔ یہی تو ہوگا۔ مجھے کوئی جگہ نہ ملے گی۔ بلا سے ان لوگوں کے منصوبے تو خاک میں مل جائیں گے۔ اس دغابازی کی سزا تو مل جائے گی۔ اور کچھ بھی نہ سہی۔ تو اتنی بڑی بدنامی سے تو بچ جاؤں گا۔ یہ سب شرارت ضرور کریں گے۔ لیکن جھوٹا الزام لگانے کے سوا کر ہی کیا سکتے ہیں۔ جب میرا یہاں رہنا ثابت ہی نہیں تو مجھ پر الزام ہی کیا لگ سکتا ہے۔ سبھوں کے منہ میں کالکھ لگ جائے گی۔ ایک ایک کو اپنی جان کی خیر منانی پڑے گی۔ انھیں چکمہ دوں گا۔ کہہ دوں گا۔ اگر آج مجھے کوئی اچھی جگہ مل جائے گی تو میں شہادت دوں گا۔ ورنہ صاف کہہ دوں گا۔ اس معاملہ سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ نہیں تو پیچھے سے کسی چھوٹے موٹے تھانہ میں نائب داروغہ بنا کر بھیج دیں اور وہاں سڑا کروں۔ لوں گا انسپکٹری اور کل دس بجے تک میرے پاس تقرری کا پروانہ آجائے۔ وہ چلا کہ اسی وقت داروغہ سے کہا؟ لیکن پھر رُک گیا۔ ایک بار جالپا سے ملنے کے لیے اس کی جان تڑپ رہی

تھی۔ جالپا سے اتنی محبت اتنی شیفتگی اتنی عقیدت اسے کبھی نہ ہوئی تھی۔ گویا وہ کوئی غیبی طاقت ہے جسے دیوتاؤں نے اس کی حفاظت کے لیے بھیجا ہو۔

دس بج گئے تھے۔ رما ناتھ نے بجلی گُل کردی اور برآمدے میں آکر زور سے کواڑ بند کردے جس میں پہرے والے سپاہی کو معلوم ہو۔ اندر سے کواڑ بند کر کے سو رہے ہیں۔ وہ اندھیرے برآمدے میں ایک منٹ تک کھڑا رہا۔ تب آہستہ سے اترا اور کانٹے دار کے پاس آکر سوچنے لگا۔ اس پار کیسے جائے۔ شاید جالپا ابھی باغیچہ میں ہو۔ دیبی دین ضرور اس کے ساتھ ہوگا۔ صرف یہ تار اس کا راستہ روکے ہوئے تھا۔ اسے پھاند جانا غیر ممکن تھا۔ اس نے تاروں کے بیچ میں ہوکر نکل جانے کا ارادہ کیا۔ اپنے سب کپڑے سمیٹ لیے اور کانٹوں کو بچاتے ہوئے سر اور کندھے کو تار کے بیچ میں ڈالا۔ مگر نہ جانے کیوں کر کپڑے پھنس گئے۔ ہاتھ سے کپڑوں کو چھڑانا چاہا۔ تو آستین کانٹوں میں پھنس گئی۔ دھوتی بھی الجھی ہوئی تھی۔ بے چارہ بڑی مصیبت میں پڑا۔ نہ اس پار جاسکتا نہ اِس پار۔ ذرا سی بھی غلطی ہوئی اور کانٹے اس کے جسم میں چبھ جائیں گے۔

مگر اس وقت اسے کپڑوں کی پرواہ نہ تھی۔ اس نے گردن اور آگے بڑھائی۔ اور کپڑوں میں لمبا چیرا لگاتا ہوا اس پار نکل گیا۔ سارے کپڑے تار تار ہوگئے۔ پیٹھ میں بھی کھرونچے لگے۔ مگر اس وقت کوئی بندوق کا نشانہ باندھ کر بھی اس کے سامنے کھڑا ہوجاتا تو وہ پیچھے نہ ہٹتا۔ پھٹے ہوئے کپڑوں کو اس نے وہیں پھینک دیا۔ گلے کی چادر پھٹ جانے پر بھی کام دے سکتی تھی۔ اسے اوڑھ لیا۔ دھوتی سمیٹ لی اور باغیچہ میں گھومنے لگا۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ شاید رکھوالا کھٹک کھانے گیا ہوا تھا۔ اس نے دو تین بار آہستہ آہستہ جالپا کا نام لے کر پکارا۔ کسی کی آہٹ نہ ملی۔ سمجھ گیا جالپا چلی گئی۔ وہ اِنہی پیروں دیبی دین کے گھر کی طرف چلا۔ اسے مطلق خوف نہ تھا۔ بلا سے کسی کو معلوم ہوجائے کہ میں بنگلے سے نکل آیا ہوں۔ پولیس میرا کر ہی کیا سکتی ہے۔ میں قیدی نہیں ہوں۔ کسی کی غلامی نہیں لکھائی ہے۔

آدھی رات ہوگئی تھی۔ دیبی دین آدھ گھنٹہ پہلے لوٹا تھا اور کھانا کھانے جارہا تھا کہ ایک ننگ دھڑنگ آدمی کو دیکھ کر چونک پڑا۔ رما نے چادر سر پر باندھ لی تھی۔ اور دیبی دین کو ڈرانا چاہتا تھا۔

دیبی دین نے ہکبکا کر پوچھا۔ کون ہے؟

پھر رما ناتھ کو پہچان گیا اور جھپٹ کر اس کا ہاتھ پکڑتا ہوا بولا۔ تم نے تو بھیا کھوب بھیس بنایا ہے۔ کپڑے کیا ہوئے۔

"تار سے نکل رہا تھا۔ سب اس کے کانٹوں میں اُلجھ کر پھٹ گئے۔"

"رام رام بدن میں تو کانٹے نہیں چُبھے۔"

"کچھ نہیں۔ دو ایک کھرونچے لگے ہیں۔ میں بہت بچ کر نکلا۔"

"بہو کا خط تو مل گیا تھا۔"

"ہاں اسی وقت مل گیا تھا۔ کیا وہ بھی تمھارے ساتھ تھیں۔"

"وہ میرے ساتھ نہیں تھیں۔ میں ان کے ساتھ تھا۔ جب سے تمھیں موٹر پر آتے دیکھا۔ تبھی سے جانے جانے لگائے ہوئے تھیں۔"

"تم نے گھر میں کوئی خط لکھا تھا؟"

"میں نے کوئی خط وط نہیں لکھا بھیا۔ جب وہ آئیں تو مجھے خود اچنبھا ہوا کہ بغیر جانے بوجھے کیسے آگئیں۔ پیچھے سے انھوں نے بتایا۔ وہ شطرنج والا نقشہ انھیں نے پراگ راج سے بھیجا تھا۔ اور انعام بھی وہیں سے آیا تھا۔

رما حیرت میں آگیا۔ جالپا کی دانشمندی نے استعجاب میں ڈال دیا۔ اس کے ساتھ ہی اپنی شکست کے خیال نے اُسے کچھ ملول بھی کردیا۔ یہاں بھی اس کی ہار ہوئی۔

بڑھیا اُوپر گئی ہوئی تھی۔ دیبی دین نے زینے کے پاس جاکر کہا۔ ارے کیا کرتی ہے۔ بہو سے کہہ دے ایک آدمی ان سے ملنے آیا ہے۔

یہ کہہ کر دیبی دین نے رما کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا۔ چلو اب سرکار میں تمھاری پیشی ہوگی۔ بہت بھاگے تھے۔ بغیر وارنٹ کے پکڑے گئے۔

رما کا ولولہ اور اشتیاق اڑا جاتا تھا۔ اس کی شرم اس کے سر پر سوار ہوتی جاتی تھی۔ جالپا کے سوالوں کا اس کے پاس کیا جواب تھا۔ جس خوف سے وہ بھاگا تھا۔ اس نے بالآخر اس کا پیچھا کرکے اسے مغلوب کرہی دیا۔ وہ جالپا کے سامنے آنکھیں بھی تو نہ سیدھی کرسکتا تھا۔ اس نے ہاتھ چھڑا لیا اور زینہ کے پاس ٹھٹھک گیا۔ دیبی دین نے پوچھا کیوں رُک گئے۔

رما نے سر کھجلاتے ہوئے جواب دیا۔ چلو میں آتا ہوں۔ بڑھیا نے اوپر

پوچھو۔ کون آدمی ہے۔ کہاں سے آیا ہے۔

دیبی دین نے دل لگی کی۔ کہتا ہے۔ اب جو کچھ کہوں گا۔ بہو سے کہوں گا۔

"کوئی چٹھی لایا ہے؟"

"نہیں"

سناٹا ہوگیا۔ دیبی دین نے ایک لمحہ کے بعد پوچھا۔ کہہ دوں لوٹ جائے۔

جالپا زینہ پر آکر بولی۔ کون آدمی ہے۔ پوچھتی تو ہوں۔

"کہتا ہے بڑی دُور سے آیا ہوں۔"

"ہے کہاں؟"

"یہ کھڑا ہے۔"

"اچھا بلا لو۔"

رما چادر اوڑھے کچھ جھجکتا کچھ جھینپتا۔ کچھ ڈرتا زینہ پر چڑھا۔ جالپا اسے دیکھتے ہی فوراً دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ دیبی دین وہاں نہ ہوتا تو وہ دو قدم آگے بڑھی ہوتی۔

جالپا کی آنکھوں میں کبھی اتنا سرور نہ تھا۔ جسم میں کبھی اتنی چستی نہ تھی۔ رخساروں پر کبھی اتنی چمک نہ تھی۔ سینہ میں کبھی اتنا ارتعاش نہ تھا۔ آج اس کی تمنا پوری ہوئی۔

(۳۹)

ساری رات باتوں میں گزر گئی۔ دونوں ہی کو اپنی اپنی چھ مہینے کی داستان کہنی تھی۔ رما نے اپنا وقار جمانے کے لیے اپنی خستہ حالی کو مبالغہ کے ساتھ بیان کیا۔ جالپا نے اپنی داستان میں اپنی تکلیفوں کا ذکر تک نہ کیا۔ وہ ڈرتی تھی۔ انھیں رنج ہوگا۔ لیکن رما کو اسے رُلانے میں مزا آرہا تھا۔ وہ کیوں بھاگا۔ کس لیے بھاگا۔ یہ سارا قصہ اس نے دردناک آواز میں سنایا۔ اور جالپا نے سسک سسک کر سنا۔ وہ اپنی لفاظی سے اس پر رُعب جمانا چاہتا تھا۔ اب تک ہر ایک معاملے میں اس کی ہار ہوتی تھی۔ جو بات اسے محال معلوم ہوئی تھی اسے جالپا نے چٹکیوں میں پورا کر دکھایا تھا۔ شطرنج والے واقعہ کو وہ خوب نمک مرچ لگا کر بیان کرسکتا تھا۔ لیکن وہاں بھی جالپا ہی غالب رہی۔ پھر اس کے لیے اس کے سوا اور کیا تدبیر رہ گئی تھی کہ اپنی تکلیفوں کو رائی کا پربت بنا کر دکھائے۔

جالپا نے سسک کر کہا۔ تم نے یہ ساری کڑیاں جھیلیں اور مجھ کو ایک خط نہ لکھا۔ کیوں لکھتے ہم سے ناتا ہی کیا تھا۔ منہ دیکھے کی محبت تھی۔ آنکھ اوٹ پہاڑ اوٹ۔

رما نے حسرت ناک لہجہ میں کہا۔ یہ بات نہیں جالپا۔ دل پر جو کچھ گزرتی تھی۔ دل ہی جانتا ہے۔ لیکن لکھنے کا منہ بھی تو ہو۔ جب روپوش ہوکر گھر سے بھاگا تو اپنا قصۂ غم کیا لکھنے بیٹھتا۔ میں نے تو سوچ لیا تھا۔ جب تک خوب روپے نہ کما لوں گا۔ ایک لفظ بھی نہ لکھوں گا۔

جالپا نے چشم پُر آب میں طنز بھر کر کہا۔ ٹھیک ہی تھا۔ روپے آدمی سے زیادہ پیارے ہوتے ہی ہیں۔ ہم تو روپے کے یار ہیں۔ تم چاہے چوری کرو۔ ڈاکہ مارو۔ جھوٹی گواہیاں دو۔ یا بھیک مانگو۔ کسی طرح روپے لاؤ۔ تم نے میری عادت کو کتنا ٹھیک سمجھا ہے کہ واہ!

رما نے جھینپتے ہوئے کہا۔ نہیں نہیں۔ جالپا یہ بات نہ تھی۔ میں یہی سوچتا تھا کہ ان پھٹے حالوں جاؤں گا کیسے۔ سچ کہتا ہوں مجھے سب سے زیادہ خوف تمھیں سے لگتا تھا۔ سوچتا تھا۔ تم مجھے کتنا دغاباز۔ مکار اور کچے دل کا سمجھ رہی ہوگی۔ شاید میرے دل میں یہ خیال تھا کہ روپے کی تھیلی دیکھ کر تمھارا دل کچھ تو نرم ہوگا۔

جالپا نے اسی ستم ظریفانہ لہجہ میں کہا۔ تو تمھارا وہ خیال غلط تھا۔ میں شاید اس تھیلی کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھتی بھی نہیں۔ آج مجھے معلوم ہوگیا۔ تم مجھے کتنا خودغرض سمجھتے ہو۔ اس میں تمھاری کوئی خطا نہیں۔ ساری خطا میری ہے۔ اگر میں بھلی ہوتی۔ تو آج یہ دن ہی کیوں آتا۔ جو آدمی تیس چالیس روپے مہینہ کا نوکر ہو۔ اس کی بیوی اگر دو چار روپے روز خرچ کرے۔ ہزار دو ہزار کے زیور پہنے تو وہ اپنی اور اپنے شوہر کی تباہی کا سامان کر رہی ہے۔ اگر تم نے مجھے اتنا بندۂ زر سمجھا تو کوئی بے انصافی نہیں کی۔ مگر ایک بار جس آگ میں جل چکی اس میں پھر نہ کودوں گی۔ ان چند مہینوں میں میں نے ان گناہوں کا کفارہ ادا کیا ہے اور جو کچھ باقی ہے وہ آخری دم تک کرتی رہوں گی۔ یہ میں نہیں کہتی کہ عیش و آرام سے میرا جی بھر گیا یا میرے گہنے کپڑے سے میں اُوب گئی۔ یا سیر تماشہ سے مجھے نفرت ہوگئی۔ یہ ساری تمنائیں جیوں کی تیوں ہیں۔ اگر تم اپنے قوتِ بازو سے اپنی جانفشانی سے انھیں پورا کرسکو تو کیا کہنا۔ لیکن نیت کھوٹی کرکے یا ضمیر کا خون

کرکے ایک لاکھ بھی لاؤ تو میں اسے ٹھکرا دوں گی۔ جس وقت مجھے معلوم ہوا کہ تم پولیس کے گواہ بن گئے ہو۔ مجھے اتنا رنج ہوا کہ دیبی دادا کو ساتھ لے کر تمھارے بنگلے تک گئی۔ اسی دن تم باہر چلے گئے تھے۔ میں اتنے آدمیوں کا خون اپنی گردن پر نہیں لینا چاہتی۔ تمھیں بیان واپس لینا پڑے گا۔

رما فکرمند ہوکر بولا۔ جب سے تمھارا خط ملا۔ میں اسی معاملہ پر غور کر رہا ہوں۔ لیکن بچاؤ کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ ایک بات کہہ کر مکر جانے کی ہمت مجھ میں نہیں ہے۔

"بیان تو بدلنا ہی پڑے گا"

"آخر کیسے؟"

"مشکل کیا ہے۔ جب تمھیں معلوم ہوگیا کہ میونسپلٹی تمھارے اُوپر کوئی مقدمہ نہیں چلاسکتی تو پھر کس بات کا ڈر؟"

"ڈر نہ ہو۔ جھیپ بھی تو کوئی چیز ہے۔ جس منہ سے ایک بات کہی۔ اسی منہ سے مکر جاؤں۔ یہ تو مجھ سے نہ ہوگا۔ پھر مجھے کوئی اچھی جگہ مل جائے گی۔ آرام سے زندگی بسر ہوگی۔ مجھ میں گلی گلی ٹھوکر کھانے کا بوتا نہیں ہے۔"

جالپا نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ سوچ رہی تھی۔ انسان کتنا خودغرض ہوتا ہے۔

رما نے پھر پہلو بدلا۔ اور کچھ میری شہادت پر ہی تو سارا فیصلہ نہیں ہوا جاتا۔ میں بدل بھی جاؤں تو پولیس نہایت آسانی سے کوئی دوسرا گواہ کھڑا کردے ی۔ ملزموں کی جان تو کسی طرح نہیں بچ سکتی۔ ہاں! میں مفت میں مارا جاؤں گا۔

جالپا نے ترش ہوکر کہا۔ کیسی بے شرمی کی باتیں کرتے ہو جی۔ کیا تم اتنے گئے گزرے ہو کہ تمھیں اپنی روٹیوں کے لیے دوسروں کا گلا کاٹنا پڑے۔ میں اسے نہیں برداشت کرسکتی۔ مجھے مزدوری کرنا۔ بھوکوں مرجانا منظور ہے۔ لیکن کسی کا بُرا چیت کر میں جنت کا راج بھی نہیں لے سکتی۔

رما چڑھ کر بولا۔ تو کیا تم یہ چاہتی ہو کہ میں یہاں قلی گیری کروں۔

جالپا۔ نہیں میں یہ نہیں چاہتی۔ لیکن اگر قلی گیری بھی کرنی پڑے تو وہ خون چپڑی ہوئی روٹیاں کھانے سے کہیں بڑھ کر ہے۔

رما نے تحمل کے ساتھ کہا۔ جالپا تم مجھے جتنا کمینہ سمجھتی ہو۔ اتنا کمینہ میں نہیں ہوں بُری بات ہر ایک کو بُری لگتی ہے۔ مجھے بھی اس بات کا رنج ہے کہ میرے ہاتھوں اتنے آدمیوں کا خون ہورہا ہے۔ لیکن حالات نے مجھے مجبور کردیا ہے۔ تم مجھے کیوں اس اونچائی پر چڑھانا چاہتی ہو۔ جہاں پر پہنچنے کی طاقت مجھ میں نہیں ہے۔

جالپا نے پُرملامت تبسم کے ساتھ کہا۔ جس آدمی میں خون کرنے کی طاقت ہو۔ اس میں خون نہ کرنے کی طاقت کا نہ ہونا تعجب کی بات ہے۔ جس میں دوڑنے کی طاقت ہو۔ اس میں کھڑے ہونے کی طاقت نہ ہو اسے کون باور کرے گا۔ جب ہم کوئی کام کرنے کا ارادہ کرلیتے ہیں تو طاقت آپ ہی آپ آجاتی ہے۔ تم یہ طے کرلو کہ تمھیں بیان بدلنا ہے۔ بس اور ساری باتیں آپ ہی آپ آجائیں گی۔

رما سر جھکائے سنتا رہا۔

جالپا نے پھر اسی روٗ میں کہا۔ اگر تمھیں یہ پاپ کی کھیتی کرنی ہے تو مجھے آج ہی یہاں سے رخصت کردو۔ میں آج منہ میں کالکھ لگا کر چلی جاؤں گی۔ پھر تمھیں دق کرنے نہ آؤں گی۔ تم زندگی کے مزے اُٹھانا۔ میں محنت مزدوری کرکے اپنا پیٹ بھر لوں گی۔

رما کے دل پر کچھ چوٹ لگی۔ سر کھجلا کر بولا۔ چاہتا تو میں بھی ہوں کہ کسی طرح میری گلوخلاصی ہوجائے۔

جالپا نے جواب دیا تو پھر کرتے کیوں نہیں۔ اگر تمھیں کہتے شرم آتی ہے تو میں کہوں۔ یہی اچھا ہوگا۔ میں تمھارے ساتھ چلی چلوں گی اور تمھارے سپرنٹنڈنٹ صاحب سے سارا ماجرا کہہ سناؤں گی۔

رما کا پس و پیش غائب ہوگیا۔ اپنی اتنی ذلت وہ کرانا نہ چاہتا تھا۔ بولا تمھارے چلنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جالپا میں ان لوگوں کو سمجھا لوں گا۔

جالپا نے مزید اطمینان کے لیے پوچھا۔ تو وعدہ کرتے ہو۔ اپنا بیان بدل دوگے؟

رما نے سرگرمی سے کہا۔ کہتا تو ہوں۔

"میرے کہنے سے یا اپنے دل سے۔"

"تمھارے کہنے سے نہیں اپنے دل سے۔ مجھے خود ایسی باتوں سے نفرت ہے۔

کچھ جھجک تھی وہ تم نے نکال دی۔"

پھر اور باتیں ہونے لگیں۔ کیسے پتہ چلا کہ رما نے روپے خرچ کرڈالے۔ روپے ادا کیسے ہوگئے؟ رتن پر کیا گزری؟ گوپی کیوں اتنی جلدی بھاگ گیا۔ دونوں کچھ کچھ پڑھ رہے ہیں یا اسی طرح آوارہ پھر رہے ہیں۔ اماں تو بہت نہیں روتی ہیں۔ دادا کے کیا رنگ ڈھنگ ہیں۔ یہ ساری باتیں ہوئیں۔ پھر زندگی کے منصوبے باندھے جانے لگے۔

جالپا نے کہا۔ چلو وہاں رتن سے تھوڑی زمین لے لیں اور کھیتی باڑی کریں!

رما نے کہا۔ اس سے کہیں اچھا ہے کہ یہاں چائے کی دکان کھول لیں۔ اس پر دونوں میں مباحثہ ہوا۔ آخر رما کو ہار ماننا پڑی۔ یہاں رہ کر وہ گھر کی دیکھ بھال نہ کرسکتا تھا۔ بھائیوں کی نگرانی نہ کرسکتا تھا اور ماں باپ کی کچھ خدمت نہ کرسکتا تھا۔ آخر گھر والوں کے ساتھ بھی تو اس کا کچھ فرض ہے۔ رما لاجواب ہوگیا۔

(۴۰)

رما منہ اندھیرے بنگلہ پر پہنچا۔ کسی کو شبہ نہ ہوا۔

ناشتہ کرکے رما ناتھ نے خط صاف کیا اور داروغہ کے پاس پہنچا۔ تیوریاں چڑھی ہوئی تھیں۔ داروغہ نے پوچھا۔ خیریت تو ہے۔ نوکروں نے کوئی شرارت تو نہیں کی۔

رما نے کھڑے کھڑے جواب دیا۔ نوکروں نے شرارت نہیں کی۔ ہاں آپ نے اور آپ کے افسروں اور ماتحتوں نے مجھے چرکا دیا ہے۔

داروغہ نے کچھ پریشان ہوکر پوچھا۔ آخر بات کیا ہے۔ کچھ کہیئے تو؟

رما۔ بات یہی ہے کہ میں اس معاملے میں اب مطلق شہادت نہیں دوں گا۔ آپ لوگوں نے مجھے دغا دی اور وارنٹ کی دھمکی دے کر مجھے شہادت پر مجبور کیا۔ اب مجھے معلوم ہوگیا کہ میرے اُوپر کسی قسم کا الزام نہیں ہے۔ میں پولیس کی طرف سے شہادت نہیں دینا چاہتا میں آج جج صاحب سے صاف کہہ دوں گا۔

داروغہ نے اُسے مرعوب کرنے کی کوشش کرکے کہا۔ آپ نے خود غبن تسلیم کیا تھا۔

رما۔ وہ میزان کی غلطی تھی۔ غبن نہ تھا۔

یہ آپ کو کیسے معلوم ہوا؟

اس سے آپ کو کوئی بحث نہیں۔ میں شہادت نہ دوں گا۔ جن تاریخوں کا یہ وقوعہ

ہے۔ ان تاریخوں میں میں الہٰ آباد میں تھا۔ میونسپل آفس میں مری حاضری درج رجسٹر ہے۔

داروغہ نے اس معاملہ کو ہنسی میں اُڑا کر کہا۔ اچھا صاحب پولیس نے آپ کو دھوکہ دیا۔ لیکن اس کا خاطر خواہ انعام تو دینے کو حاضر ہے۔ کوئی اچھی جگہ مل جائے گی موٹر پر بیٹھے سیر کروگے۔ خفیہ پولیس کی کوئی جگہ مل گئی تو چین ہی چین ہے۔ سوچو سرکار کی نظروں میں کتنا رسوخ بڑھ گیا۔ یوں مارے مارے پھرتے۔ یوں کہو کہ تمھاری ترقی کا دروازہ کھل گیا۔ اچھی کارگزاری دکھائی۔ تو ایک دن رائے بہادر ہوجائے گے۔ تمھیں ہمارا احسان ماننا چاہیے اور آپ اُلٹے خفا ہوتے ہیں۔

رما پر اس کا کچھ اثر نہ ہوا۔ بولا۔ میں ایسی ترقی سے درگزرا۔ وہ آپ ہی کو مبارک رہے۔

اتنے میں ڈپٹی اور انسپکٹر دونوں آپہنچے۔ رما کو دیکھ کر انسپکٹر صاحب نے فرمایا۔ ہمارے بابو صاحب تو آج پہلے ہی سے تیار بیٹھے ہیں۔ بس آج کی کارگزاری پر وارا نیارا ہے۔

رما۔ جی ہاں! آج وارا نیارا کردوں گا۔ اتنے دنوں تک آپ لوگوں کے اشاروں پر چلا۔ اب اپنی آنکھوں سے دیکھ کر چلوں گا۔

انسپکٹر نے داروغہ کا منہ دیکھا۔ داروغہ نے ڈپٹی کا منہ دیکھا۔ یہ لونڈا کیا کہتا ہے انسپکٹر صاحب نے استعجاب سے کہا۔ کیا معاملہ ہے۔ حلف سے کہتا ہوں۔ آپ کچھ ناراض معلوم ہوتے ہیں۔

رما۔ میں نے اپنا بیان تبدیل کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ بے گناہوں کا خون نہیں کرنا چاہتا۔

انسپکٹر نے اسے نگاہِ ترحم سے دیکھ کر کہا۔ آپ بے گناہوں کا خون نہیں کر رہے ہیں۔ صاحب اپنی تقدیر کی عمارت کھڑی کر رہے ہیں۔ حلف سے کہتا ہوں۔ ایسے موقع بہت کم آدمیوں کو ملتے ہیں۔ آج کیا بات ہوئی کہ آپ اتنے خفا ہوگئے۔ آپ کو کچھ معلوم ہے داروغہ جی! اگر کسی نے آپ کے مزاج کے خلاف کوئی حرکت کی ہو تو اس کی گوشمالی کیجیے۔

داروغہ۔ میں ابھی جاکر تحقیقات کرتا ہوں۔

رما۔ آپ تکلیف نہ کریں۔ مجھے کسی سے شکایت نہیں ہے۔ میں اپنے فائدے کے لیے اپنے

ضمیر کا خون نہیں کرنا چاہتا۔

ایک منٹ سناٹا رہا۔ کسی کو کوئی بات نہ سوجھی۔ داروغہ کوئی دوسرا چکمہ سوچ رہے تھے۔ انسپکٹر صاحب کوئی دوسری ترغیب۔

دفعتاً ڈپٹی صاحب نے کہا۔ رما بابو یہ اچھا بات نہ ہوگا۔

رما نے دلیری کے ساتھ کہا۔ آپ کے لیے نہ ہوگا۔ میرے تو سب سے اچھی یہی بات ہے۔

ڈپٹی۔ نہیں آپ کے لیے اس سے بُرا دوسرا بات نہیں ہے۔ ہم آپ کو چھوڑے گا نہیں۔ تم کو ایسا لیسن دے گا کہ تم عمر بھر نہ بھولے گا۔ آپ کو وہی گواہی دینا ہوگا۔ جو پہلے دے چکا ہے۔ اگر کچھ بھی گول مال کیا تو ہم تمھارے ساتھ دوسرا برتاؤ کرے گا۔ ایک رپورٹ میں تم یوں (کلائیوں کو نیچے اوپر رکھ کر) چلا جائے گا۔

رما سہم اُٹھا۔ اس تخویف نے اسے لرزہ براندام کردیا۔ کہیں یہ سب کوئی جھوٹا مقدمہ چلا کر اسے پھنسا دیں۔ تو کون اس کی فریاد سُنے گا۔ اسے گمان بھی نہ تھا کہ ڈپٹی صاحب جو اخلاق اور مروّت کے پُتلے بنے ہوئے تھے یک بارگی اتنے طیش میں آجائیں گے۔ پھر بھی خودداری کے ساتھ بولا۔ آپ مجھ سے جبراً شہادت دلوائیں گے۔

ڈپٹی نے پیر پٹک کر کہا۔ ہاں جبراً دلائے گا۔

رما۔ واہ! اچھی دل لگی ہے۔

ڈپٹی۔ تم نے ابھی پولیس کی چال نہیں دیکھی ہے۔ ہم ابھی دو گواہ دے کر تم پر بغاوت کا کیس چلاسکتا ہے۔ بس چلا جائے گا۔ سات سال کے لیے چکی پیستے پیستے ہاتھ میں چھالے پڑجائیں گے۔ یہ چکنا چکنا منہ نہیں رہے گا۔

رما جیل سے ڈرتا تھا۔ جیل کی زندگی کے خیال سے ہی اس کے رونگٹے کھڑے ہوتے تھے۔ جیل ہی کے خوف سے اس نے یہ شہادت دینی منظور کی تھی۔ وہ خوف اس وقت بھی اس کے دل میں رعشہ پیدا کرنے لگا۔ ڈپٹی نفسیات کا ماہر تھا۔ آسن کا پتہ پاگیا۔ اسی لہجہ میں بولا۔ حلوا پوڑی نہیں پائے گا۔ ڈھول ملا ہوا آٹا کا روٹی۔ گوبھی کے سڑے ہوئے پتوں کا ساگ کھانے کو پائے گا۔ چار مہینہ بھی کال کوٹھڑی ہوگیا تو تم بچ نہیں سکتا۔ وہیں مرجائے گا۔ بات بات پر وارڈر گالی دے گا۔ جوتوں سے پیٹے گا۔ تم سمجھتا کیا ہے؟

رما کے چہرے کا رنگ فق ہونے لگا۔ اپنی کمزوری پر اسے اتنا ملال ہوا کہ رو پڑا۔ کانپتی ہوئی آواز سے بولا۔ آپ لوگوں کی ہی خواہش ہے تو یہی سہی۔ بھیج دیجیے جیل۔ مر ہی تو جاؤں گا۔ گلا تو چھوٹ جائے گا۔ جب آپ یہاں تک مجھے تباہ کرنے پر آمادہ ہیں تو میں بھی مرنے کو تیار ہوں۔ جو کچھ ہونا ہوگا۔ ہوجائے گا۔

اس کا دل ضعفت کی اس حالت کو پہنچ گیا تھا۔ جب ذرا سی ہمدردی۔ ذرا سی شفقت، سینکڑوں دھمکیوں سے زیادہ کارگر ہوجاتی ہے۔ انسپکٹر صاحب نے اس کی نبض پہچان لی۔ اس کی حمایت کرتے ہوئے بولے۔ حلف سے کہتا ہوں۔ آپ لوگ آدمی کو پہچانتے تو ہیں نہیں۔ لگتے ہیں رعب جمانے۔ اس قسم کی شہادت دینا ہر ایک ذی فہم آدمی کو ناگوار گزرے گا۔ یہ انسانی فطرت کا تقاضہ ہے۔ بابو کی جگہ میں ہوتا تو میں بھی ایسا ہی کرتا۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم سے منحرف ہوجائیں گے۔ آپ لوگ اپنا کام کیجیے۔ بابو صاحب کی طرف سے مطمئن رہیے۔ میں ان کا ذمہ لیتا ہوں۔

اس نے رما کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا۔ آپ ڈپٹی صاحب کی گیدڑ بھبکیوں میں آگئے۔ آیئے میرے ساتھ چلیے۔ ایسے ایسے ریکارڈ سناؤں کی طبیعت پھڑک اُٹھے۔

رما نے رُوٹھے ہوئے لڑکے کی طرح ہاتھ چھڑا کر کہا۔ مجھے دق نہ کیجیے۔ انسپکٹر صاحب! اب تو مجھے جیل خانے میں مرنا ہے۔

انسپکٹر نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ایسی باتیں منہ سے نہ نکالو۔ بھائی جان۔ جیل خانے میں مریں آپ کے دشمن۔

ڈپٹی نے تسمہ بھی باقی نہ چھوڑنا چاہا۔ اس طرح بولا۔ گویا رما سے کبھی جان پہچان نہیں ہے۔ صاحب ہم تمھارے ساتھ سب طرح کا سلوک کرنے کو تیار ہیں۔ لیکن جب تم ہمارا جڑھ کھودو گے تو ہم بھی اپنا کارروائی کرے گا۔ ضرور سے کرے گا۔ کبھی چھوڑ نہیں سکتا۔

اسی وقت سرکاری ایڈوکیٹ اور بیرسٹر موٹر سے اُترے۔

(۴۱)

رتن اپنے خطوں میں جالپا کو تشفی دیتی رہتی تھی۔ مگر اپنے بارے میں کچھ نہ لکھتی تھیں۔ جو خود ہی مبتلائے غم ہو۔ اسے اپنی مصیبت کی کہانی کیا سنائے جس نے روپوں کی

کبھی کوئی حقیقت نہ سمجھی۔ وہ اس ایک ہی مہینہ میں روٹیوں کی محتاج ہو رہی تھی۔ پہلے بھی اس کی زندگی پر عافیت نہ تھی۔ لیکن اسے کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ مریل گھوڑے پر سوار ہوکر بھی سفر پورا کیا جاسکتا ہے۔ اگر سڑک اچھی ہو۔ نوکر چاکر اور کھانے پینے کا سامان ساتھ ہو۔ گھوڑا بھی تیز ہو تو پوچھنا ہی کیا ہے۔ رتن کی حالت بھی اسی سوار کی سی تھی۔ اسی سوار کی طرح وہ آہستہ آہستہ زندگی کے مرحلے طے کرتی جاتی تھی۔ کبھی کبھی وہ گھوڑے پر جھنجلاتی ہوگی۔ دوسرے سواروں کو آگے بڑھتے دیکھ کر اُسے خواہش ہوتی ہوگی کہ اس کا گھوڑا بھی اتنا ہی تیز خرام ہوتا۔ لیکن وہ رنجیدہ نہ تھی۔ اپنے نصیبوں کو نہ روتی تھی۔ وہ اس گائے کی طرح تھی جو ایک پیلی سی پگھیا کے بندھن میں پڑ کر اپنی ناند کے بھوسے کھلی میں مگن رہتی ہے۔ سامنے ہرے بھرے میدان ہیں۔ اس میں اشتہا انگیز گھاسیں لہرا رہی ہیں مگر رسی توڑا کر کبھی ادھر نہیں جاتی۔ اس کے اس رسی اور لوہے کی زنجیر میں کوئی فرق نہیں ہے۔

عالم شباب میں محبت کی اتنی پیاس نہیں ہوتی۔ جتنی خودنمائی کی یہ پیاس بعد کو آتی ہے۔ رتن کو خودنمائی کے سبھی سامان ملے ہوئے تھے۔ اس کا شباب میں مست دل اپنی زیبائش اور آرائش میں خوش تھا۔ ہنسی مذاق۔ سیر و تفریح۔ کھانا پینا یہی اس کی زندگی تھی۔ اس سے گہرے پانی میں اُسے جانے کی نہ خواہش تھی نہ غرض۔ فارغ البالی بہت کچھ رنج و محن کا ازالہ کرتی رہتی ہے۔ اس کے پاس اپنی مصیبتوں کو بُھلانے کے لیے کتنے ہی سامان ہیں۔ سینما ہے۔ سیر و سیاحت ہے۔ کتابوں کا مطالعہ ہے۔ سُرود و ستار ہے۔ پالتو جانور ہیں۔ لیکن افلاس کو بھلانے کا انسان کے پاس کوئی ذریعہ نہیں۔ بجز اس کے کہ وہ روئے اپنی تقدیر کو کوسے اور دنیا سے مایوس ہوکر خودکشی کرلے۔ رتن کی تقدیر نے پلٹا کھایا تھا۔

اور یہ ہوا اپنے ہی ہاتھوں۔ پنڈت جی ان آدمیوں میں تھے جنھیں موت کی فکر نہیں ہوتی۔ انھیں کسی طرح یہ خیال ہوگیا تھا کہ دائم المریض آدمی اگر احتیاط اور پرہیز سے رہے تو اس کی عمر دراز ہوسکتی ہے وہ پرہیز اور احتیاط کے دائرے سے باہر کبھی نہیں جاتے تھے۔ پھر موت کو ان سے کیا دشمنی تھی۔ جو خواہ مخواہ ان کے پیچھے پڑتی۔ اپنی وصیت لکھنے کا خیال انھیں اس وقت آیا۔ جب قریب المرگ ہوئے۔ لیکن رتن وصیت کا نام سنتے ہی اتنی پریشان اور غمگین ہوئی کہ پنڈت جی نے اسے اس وقت ملتوی کرنا ہی مناسب سمجھا تب سے

انھیں اتنا ہوش نہ آیا کہ وصیت لکھواتے۔
پنڈت جی کی وفات کے بعد رتن دنیا سے اس قدر بیزار ہوگئی کہ اسے کسی بات کی بھی سدھ بدھ نہ رہی تھی۔ یہ وہ موقع تھا جب اسے خاص طور پر ہوشیار رہنا چاہیے تھا۔ گویا دشمنوں نے اسے گھیر رکھا ہو۔ مگر اس نے سب کچھ منی بھوشن پر چھوڑ دیا اور اس منی بھوشن نے رفتہ رفتہ اس کا سارا اثاثہ ہضم کرلیا۔ ایسا سوانگ بھرا کہ سادہ لوح رتن کو اس کی فتنہ انگیزیوں کی بھنک تک نہ ملی۔ پھندا جب خوب کس گیا تو اس نے ایک دن آکر رتن سے کہا۔ آج بنگلہ خالی کرنا ہوگا۔ میں نے اسے بیچ دیا ہے۔
رتن نے تیز ہوکر کہا۔ میں نے تو تم سے کہا تھا۔ ابھی بنگلہ نہ بیچوں گی۔
منی بھوشن نے ظاہرداری کا پردہ اُتار پھینکا اور بولا۔ آپ میں یہ بہت بڑا عیب ہے کہ آپ ایک بات کہہ کر اُسے بھول جاتی ہیں۔ اسی کمرے میں میں نے آپ سے یہ ذکر کیا تھا اور آپ نے یہ حامی بھری تھی۔ جب میں نے بنگلہ بیچ دیا تو آپ یہ رنگ لائیں بنگلہ آج خالی کرنا ہوگا اور آپ کو میرے ساتھ چلنا ہوگا۔
"میں ابھی یہیں رہنا چاہتی ہوں۔"
"میں آپ کو یہاں نہ رہنے دوں گا۔"
"میں تمھاری لونڈی نہیں ہوں۔"
"آپ کی خبرگیری کا بار مجھ پر ہے۔ اپنے خاندان کے حفظ و وقار کے لیے میں آپ کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔"
رتن نے ہونٹ چبا کر کہا۔ میں اپنی عصمت کی حفاظت خود کرسکتی ہوں۔ تمھاری مدد کی ضرورت نہیں۔ میری اجازت کے بغیر تم کوئی چیز فروخت نہیں کرسکتے۔
منی بھوشن نے گولی سی ماری۔ آپ کا اس گھر پر اور چچا صاحب کی جائداد پر کوئی حق نہیں ہے۔ یہ میری ملکیت ہے۔ آپ مجھ پر صرف گزارے کا دعوا کرسکتی ہیں۔
رتن نے حیرت میں آکر کہا۔ تم کچھ بھنگ تو نہیں کھا گئے ہو؟
منی بھوشن نے بے دردانہ انداز سے کہا۔ میں اتنی بھنگ نہیں کھاتا کہ بے سر پیر کی باتیں کرنے لگیں۔ آپ تو پڑھی لکھی ہیں۔ ایک بڑے وکیل کی بیوی تھیں۔ قانون کی بہت سی باتیں جانتی ہوں گی۔ مشترکہ خاندان کی بیوہ کا شوہر کی جائداد پر کوئی حق نہیں

ہوتا۔ چچا صاحب اور میرے والد میں کبھی علاحدگی نہیں ہوئی۔ چچا صاحب یہاں تھے ہم لوگ اندور میں تھے مگر اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ہم میں علاحدگی تھی۔ اگر چچا صاحب اپنی جائداد آپ کو دینا چاہتے تو کوئی وصیت ضرور لکھ جاتے اور اگرچہ قانوناً اس وصیت کی کوئی وقعت نہ ہوتی۔ مگر ہم اس کا احترام کرتے۔ مرحوم کا کوئی وصیت نہ کرنا ثابت کر رہا ہے کہ وہ آپ کے ساتھ کوئی خاص سلوک نہ کرنا چاہتے تھے۔ آج آپ کو بنگلہ خالی کرنا ہوگا۔ دوسرے سامان بھی نیلام کردیے جائیں گے۔ آپ کی مرضی ہو میرے ساتھ چلیں یا یہیں رہیں۔ یہاں رہنے کے لیے آپ کو دس پندرہ روپے کا مکان کافی ہوگا۔ گزارہ کے لیے پچاس روپے مہینہ کا انتظام میں نے کردیا ہے۔ کل مطالبات ادا کرنے کے بعد اس سے زیادہ گنجائش ہی نہیں ہے۔

رتن نے کوئی جواب نہ دیا۔ کچھ دیر وہ مفلوج سی بیٹھی رہی۔ پھر موٹر منگوائی۔ اور سارا دن وکیلوں کے پاس دوڑتی پھری۔ کتنے ہی وکیلوں سے پنڈت جی کا یارانہ تھا۔ ہر ایک نے اس کی حالت سن کر رنج کیا اور وکیل صاحب کے وصیت نہ لکھ جانے پر تعجب کرتے رہے۔ اب اس کے لیے صرف ایک ہی راستہ تھا۔ وہ یہ ثابت کردے کہ وکیل صاحب اور ان کے بھائی میں علاحدگی ہوگئی تھی اور یہ ثابت کرنا کچھ مشکل نہ تھا۔ تو رتن کا اس جائداد پر قبضہ ہوجائے گا۔ ورنہ اس کے لیے کوئی چارہ نہ تھا۔

رتن شام کو گھر لوٹ آئی۔ اس نے فیصلہ کیا۔ جو کچھ میرا نہیں ہے اسے لینے کے لیے میں جھوٹ کا سہارا نہ لوں گی۔

اتنے دنوں میں وہ اپنے کو اس گھر کی مالکن سمجھتی رہی۔ یہ کتنی بڑی غلطی تھی۔ شوہر کی زندگی میں جو لوگ اس کا منہ تاکتے تھے وہ آج اس کے مخدوم بنے ہوئے ہیں یہ ذلت رتن جیسی خوددار عورت کے ناقابلِ برداشت تھی۔ مانا کمائی پنڈت جی کی تھی۔ لیکن یہ گاؤں تو اسی نے خریدا تھا۔ کئی مکان تو اس نے اپنے ہی ہاتھوں بنوائے۔ اس نے ایک لمحے کے لیے بھی یہ خیال نہ کیا تھا کہ ایک دن یہ جائداد اس کی زندگی کی کفیل ہوگی۔ اسے اس جائداد کے خریدنے میں اس کی ترقی اور تنظیم میں وہی مسرت ہوتی تھی جو ماں اپنی اولاد کے پھلتے پھولتے دیکھ کر حاصل کرتی ہے۔ اس میں غرض کا شائبہ بھی نہ تھا محض اپنے پن کا غرور تھا۔ وہی محبت تھی۔ لیکن شوہر کی آنکھیں بند ہوتے ہی اس کے

پالے اور گود کے کھلائے ہوئے بچے بھی اس کی گود سے چھین لیے گئے۔ اس کا ان پر اب کوئی اختیار نہیں۔ اگر وہ جانتی کہ ایک دن یہ مسئلہ ضرور پیش ہوگا۔ تو وہ چاہے روپے کو لٹا دیتی۔ خیرات کرتی۔ مگر ملکیت کی میخ اپنے سینے میں نہ گاڑتی۔ کیا گرمیوں میں وہ منصوری یا نینی تال نہ جاسکتی تھی۔ ایک کیا دو دو چار نوکر اور نہ رکھے جاسکتے تھے۔ اگر وہ زیور ہی بنواتی۔ تو ایک ایک مکان کی قیمت کا ایک ایک زیور بنوا سکتی تھی۔ مگر اس نے نفس کو کبھی پاؤں نہ پھیلانے دیا۔ کیا اس نفس کشی کا یہی صِلہ تھا۔ جو چیز کل تک اس کی تھی۔ آج اس کی طرف وہ آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتی۔ کل تک وہ دوسروں کی پرورش کرتی تھی۔ آج وہ خود دوسروں کی محتاج ہے۔

دفعتاً اس کے خیال میں ایک تغیر ہوا۔ وہ کیوں اپنے کو بیکس سمجھے۔ کیوں غیروں کے سامنے ہاتھ پھیلائے۔ دُنیا میں لاکھوں ہی عورتیں دیدہ ریزی کر کے اپنی گزر بسر کرتی ہیں۔ کیا وہ کپڑا نہیں سی سکتی۔ کسی چیز کی چھوٹی موٹی دکان نہیں رکھ سکتی۔ لڑکوں کو بھی پڑھا سکتی ہے۔ یہی تو ہوگا۔ لوگ ہنسیں گے۔ مگر اسے ہنسی کی کیا پرواہ۔ یہ اس کی ہنسی نہیں ہے۔ اپنی قوم کے رسم و رواج کی ہنسی ہے۔

شام کو دروازے پر کئی ٹھیلے والے آگئے۔ منی بھوشن نے آکر کہا۔ میں نے ایک مکان طے کرلیا ہے۔ آپ جو چیز کہیں لدوا کر بھیج دوں۔

رتن نے بے اعتنائی کے ساتھ کہا۔ مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ نہ تم میرے لیے کوئی مکان ہی لو۔ جس چیز پر میرا کوئی اختیار نہیں وہ میں ہاتھ سے بھی نہیں چھوسکتی۔ میں اپنے گھر سے لے کر کچھ نہیں آئی تھی۔ اسی طرح لوٹ جاؤں گی۔

منی بھوشن نے شرمندہ ہوکر کہا۔ آپ کا سب کچھ ہے۔ یہ آپ کیسے کہتی ہیں کہ آپ کا کچھ اختیار نہیں۔ آپ وہ مکان دیکھ لیں۔ میں تو سمجھتا ہوں۔ آپ کو کوئی تکلیف نہ ہوگی۔

رتن نے طنزیہ انداز سے کہا۔ اتنا بڑا مکان لے کر میں کیا کروں گی۔ میرے لیے ایک کوٹھڑی کافی ہے۔ جو دو روپیہ میں مل جائے گی۔ سونے کے لیے زمین ہی ہے۔ احسان کا بوجھ سر پر جتنا ہی کم ہو اُتنا ہی اچھا۔

منی بھوشن نے عاجزی سے کہا۔ آخر آپ چاہتی کیا ہیں۔ کچھ تو کہیے۔

رتن نے جواب دیا۔ میں کچھ نہیں چاہتی۔ میں اس گھر کا ایک تنکا بھی اپنے ساتھ نہ لے جاؤں گی۔ جس چیز پر میرا کوئی اختیار نہیں۔ وہ میرے لیے ویسی ہی ہے جیسے کسی غیر کی چیز۔ تم ان چیزوں کے مالک ہوتے جاؤ۔ میں ذرا بھی بُرا نہیں مانتی، رحم کی چیز نہ زبردستی لی جاسکتی ہے نہ زبردستی دی جاسکتی ہے۔ دُنیا میں ہزاروں بیوہ عورتیں پڑی ہوئی ہیں۔ میں بھی انھیں میں سے ایک ہوں۔ میں بھی انھیں کی طرح مزدوری کروں گی۔ اور نہ کرسکوں گی تو کسی گڈھے میں ڈوب مروں گی۔ جو اپنا پیٹ بھی نہ پال سکے۔ اسے زندہ رہ کر دوسروں کے اوپر بار بننے کا کوئی حق نہیں ہے۔

یہ کہتی ہوئی رتن گھر سے نکلی اور دروازے کی طرف چلی۔ منی بھوشن نے اس کا راستہ روک کر کہا۔ اگر آپ کی مرضی نہ ہو۔ تو میں ابھی بنگلہ نہ بیچوں؟

رتن نے جلتی ہوئی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ آنسوؤں کے امنڈتے ہوئے سیلاب کو روک کر بولی۔ میں نے کہہ دیا اس گھر کی کسی چیز پر میرا دعوا نہیں ہے۔ میں کرائے کی لونڈی تھی۔ لونڈی کا گھر سے کیا تعلق۔ نہ جانے کس پاپی نے یہ قانون بنایا تھا۔ اگر ایشور کہیں ہے اور اس کے یہاں انصاف ہوتا ہے تو ایک دن اسی کے سامنے اس پاپی سے پوچھوں گی۔ کیا تیرے گھر میں ماں بہن نہ تھی۔ تجھے اس کی توہین کرتے شرم نہ آئی۔ اگر میری زبان میں اتنی طاقت ہوتی کہ اس کی آواز سارے ملک میں پہنچ سکتی۔ تو میں اپنی بہنوں سے کہتی۔ بہنو! کسی مشترکہ خاندان میں شادی مت کرنا اور اگر کرنا تو جب تک اپنا گھر الگ نہ بنا لینا آرام کی نیند مت سونا۔ خاندان تمھارے لیے پھولوں کی سیج نہیں۔ کانٹوں کا بستر ہے۔ تمھیں پار لے جانے والی کشتی نہیں۔ تمھیں نگل جانے والا جانور ہے۔

شام ہوگئی تھی۔ گرد سے بھری ہوئی پھاگن کی ہوا چلنے والوں کی آنکھوں میں دھواں جھونک رہی تھی۔ رتن چادر سنبھالتی ہوئی سڑک پر چلی جا رہی تھی۔ راستہ میں کئی پہچان کی عورتوں نے اسے ٹوکا۔ کئی نے اپنی موٹر روک لی اور اسے بیٹھنے کو کہا۔ مگر رتن کو ان کی ہمدردی اس وقت تیر سی لگ رہی تھی۔ وہ تیزی سے قدم اُٹھاتی ہوئی جالپا کے گھر جا رہی تھی۔ آج اس کی اصلی زندگی کا آغاز ہوا تھا۔

ٹھیک دس بجے جالپا اور دیبی دین کچہری پہنچ گئے۔ تماشائیوں کی کافی بھیڑ تھی۔ اوپر کی گیلری تو بھری ہوئی تھی۔ ہزاروں آدمی سامنے کے میدان میں کھڑے تھے۔ جالپا اوپر گیلری میں جا بیٹھی۔ دیبی دین برآمدے میں کھڑا ہو گیا۔

اجلاس پر جج کے ایک طرف اہلمد تھا۔ دوسری طرف پولیس کے کئی عملے کھڑے تھے۔ سامنے کٹہرے کے باہر دونوں طرف کے وکیل کھڑے مقدمہ پیش ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ ملزموں کی تعداد پندرہ سے کم نہ تھی۔ سب کٹہرے کے بغل میں زمین پر بیٹھے ہوئے تھے۔ سبھی کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تھیں اور پیروں میں بیڑیاں۔ کوئی لیٹا تھا۔ کوئی بیٹھا تھا۔ دو پنجے لڑا رہے تھے۔ دو میں کسی مسئلہ پر بحث ہو رہی تھی۔ سبھی بشاش تھے۔ انتشار، مایوسی یا غم کا کسی کے چہرے پر نشان نہ تھا۔

گیارہ بجتے بجتے مقدمہ کی پیشی ہوئی۔ پہلے پولیس کی شہادتیں ہوئیں۔ آخر میں کوئی تین بجے رما ناتھ کچہری میں لایا گیا۔ تماشائیوں میں سنسنی پھیل گئی۔ کوئی تنبولی کی دکان سے پان کھاتا ہوا بھاگا۔ کسی نے اخبار کو مروڑ کر جیب میں رکھا اور اجلاس کی طرف دوڑا۔ جالپا بھی سنبھل کر بارجے میں کھڑی ہو گئی۔ وہ چاہتی تھی ایک بار رما کی آنکھیں اُٹھ جاتیں اور وہ اسے دیکھ لیتی۔ لیکن رما سر جھکائے کھڑا تھا۔ گویا آنکھیں اُٹھاتے ڈر رہا تھا۔ اس کے چہرے کا رنگ اُڑ رہا تھا۔ کچھ سہما ہوا، گھبرایا ہوا اس طرح کھڑا تھا گویا اسے کسی نے باندھ رکھا ہے اور بھاگنے کی راہ نہیں ہے۔ جالپا کا کلیجہ دھک دھک کر رہا تھا۔ جیسے اس کی تقدیر کا فیصلہ ہو رہا ہے۔

رما کا بیان شروع ہوا۔ پہلا ہی جملہ سن کر جالپا کانپ اُٹھی۔ دوسرے جملے نے اس کی تیوریوں پر بل ڈال دیے۔ تیسرے جملے نے اس کے چہرے کا رنگ فق کر دیا اور چوتھا جملہ سنتا تھا کہ وہ ایک لمبی سانس کھینچ کر پیچھے رکھی ہوئی کرسی پر گر پڑی۔ مگر پھر دل نہ مانا۔ جنگلے پر جھک کر ادھر کان ہی لگا دیے۔ وہی پولیس کی سکھائی ہوئی شہادت تھی۔ جس کا خلاصہ وہ دیبی دین کے منہ سے سن چکی تھی۔ عدالت میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ جالپا نے کئی بار کھانسا کہ شاید رما کی آنکھیں اب بھی اوپر اُٹھ جائیں لیکن رما کا سر اور بھی جھک گیا۔ معلوم نہیں۔ اس نے جالپا کے کھانسے کی آواز پہچان لی۔ یا ندامت کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ اس

کی آواز کچھ اور دھیمی ہوگئی۔

ایک خاتون نے جو جالپا کے پاس ہی بیٹھی ہوئی تھی۔ ناک سکوڑ کر کہا۔ جی چاہتا ہے کہ اس شیطان کو گولی مار دے۔ ایسے ایسے خودغرض لوگ بھی اس بدنصیب دیش میں پڑے ہیں جو تھوڑے فائدے کے لیے لوگ بے گناہوں کا گلا دباتے بھی نہیں ہچکتے۔

جالپا نے کوئی جواب نہ دیا۔

ایک دوسری خاتون نے جو آنکھوں پر عینک لگائے ہوئے تھیں تلملا کر کہا۔ اس بدنصیب ملک کا ایشور ہی مالک ہے۔ گورنری تو لالہ کو کہیں مل نہیں جاتی۔ زیادہ سے زیادہ کلرکی مل جائے گی۔ اس کے لیے اپنا ایمان بیچے ڈالتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کوئی نہایت کمینہ آدمی ہے۔

تیسری عورت نے عینک والی دیوی سے مسکرا کر پوچھا۔ آدمی تو فیشن ایبل اور پڑھا لکھا معلوم ہوتا ہے۔ بھلا تم اسے پاجاؤ تو کیا کرو۔

عینک والی عورت نے جوش سے کہا۔ ناک کاٹ لوں۔ بس نکٹا بنا کر چھوڑ دوں۔

"جانتی ہو میں کیا کروں"

"نہیں۔ شاید گولی مار دوگی۔"

"نہیں گولی نہ ماروں۔ سر بازار کھڑا کر کے پانچ سو جوتے لگواؤں چاند گنجی ہوجائے۔"

"تمھیں ذرا بھی رحم نہ آئے گا؟"

"یہ کچھ کم رحم ہے۔ اس کی پوری سزا تو یہ ہے کہ کسی اونچی پہاڑی سے دھکیل دیا جائے۔"

ایک ضعیفہ نے ان دیویوں کی ملامت کرتے ہوئے کہا۔ کیوں مفت میں مُنہ خراب کرتی ہو۔ یہ غریب نفرت کے قابل نہیں۔ رحم کے قابل ہے۔ دیکھتی نہیں ہو اس کا چہرہ کیسا زرد ہوگیا ہے۔ جیسے کوئی اس کا گلا دبائے ہوئے ہے۔ اپنی ماں یا بہن کو دیکھ لے تو ضرور رو پڑے۔ آدمی کا دل بُرا نہیں ہے۔ پولیس نے مار پیٹ کر سیدھا کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے ایک ایک لفظ اس کے دل کو چیر چیر کر نکل رہا ہے۔

عینک والی خاتون نے طعنہ مارا۔ جب اپنے پاؤں میں کانٹا چبھتا ہے جبھی آہ نکلتی ہے۔

جالپا اب وہاں نہ ٹھہر سکی۔ ایک ایک لفظ چنگاری کی طرح اس کے دل پر لگتا تھا۔ دل میں ایسا اُبال آتا تھا کہ اسی وقت اُٹھ کر کہہ دے کہ یہ شخص بالکل جھوٹ بول رہا ہے اور اسی وقت اس کا ثبوت دے دے۔ اس غصہ جائز کو پوری طاقت سے دبائے ہوئے تھی۔ اس کا ضمیر اس کے تحمل پر اسے نفرین کر رہا تھا۔ کیوں وہ اسی وقت ساری کیفیت بیان نہیں کردیتی۔ پولیس اس کی دشمن ہوجائے گی ہوجائے۔ عدالت کو تو کچھ خیال ہوگا۔ ممکن ہے۔ غریبوں کی جان بچ جائے۔ کم سے کم عوام کو تو معلوم ہوجائے گا کہ یہ جھوٹی شہادت ہے۔ اس کے منہ سے ایک بار آواز نکلتے نکلتے رہ گئی۔

آخر وہ وہاں سے اُٹھ کر باہر چلی آئی۔

دیبی دین اسے اُترتے دیکھ کر برآمدے میں چلا آیا اور ہمدردانہ لہجہ میں بولا۔ کیا گھر چلتی ہو بہو جی!

جالپا نے آنسوؤں کی یورش کو روک کر کہا۔ ہاں اب یہاں نہیں بیٹھا جاتا۔

احاطہ سے باہر نکل کر دیبی دین نے جالپا کو تشفی دینے کے ارادے سے کہا۔ پولیس نے جسے ایک بار بوٹی سنگھا دی۔ اس پر کسی دوسری بات کا اثر نہیں ہوسکتا۔

جالپا نے کچھ جواب نہ دیا۔ کچھ دُور تک دونوں خاموش چلتے رہے۔ یکایک جالپا نے کہا۔ کیوں دادا! اب اور تو کہیں اپیل نہ ہوگی۔ قیدیوں کا یہیں فیصلہ ہوجائے گا۔

دیبی دین اس سوال کا مطلب سمجھ گیا۔ بولا۔ نہیں ہائی کورٹ میں اپیل ہوسکتی ہے۔

پھر تھوڑی دور تک دونوں چپ چاپ چلتے رہے۔ جالپا ایک درخت کے نیچے کھڑی ہوگئی اور بولی۔ دادا میرا جی چاہتا ہے۔ آج جج صاحب سے مل کر سارا واقعہ کہہ دوں۔ شروع سے جو کچھ ہوا سب کہہ سناؤں۔ میں ثبوت دوں گی تب تو مانیں گے۔

دیبی دین نے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ جج صاحب سے؟

جالپا نے کہا۔ ہاں!

دیبی دین پس و پیش کے ساتھ بولا۔ میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ بہو جی! حاکم کا واسطہ نہ جانے چت پڑے یا پٹ۔

جالپا بولی۔ وہ کیا پولیس والوں سے کہہ نہیں سکتا کہ تمھارا گواہ فرضی ہے۔

"کہہ تو سکتا ہے۔"

"تو آج میں اس سے ملوں۔ مِل تو لیتا ہے۔"

چلو دریافت کریں گے۔ لیکن جوکھم کی بات ہے۔"

"کیا جوکھم ہے بتاؤ۔"

"بھیّا پر کہیں جھوٹی گواہی کا الجام لگا سجا کردے تو۔"

تو کچھ نہیں جو جیسا کرے ویسا بھوگے۔

دیبی دین نے جالپا کی اس بے دردی پر متحیر ہوکر کہا ایک دوسرا کھٹکا بھی ہے۔ سب سے بڑا ڈراسی کا ہے۔

جالپا نے پوچھا وہ کیا؟

دیبی دین۔ پولیس والے بے مروّت ہوتے ہیں۔ کسی کی عزت اُتار لینا تو ان کے لیے دل لگی ہے۔ جج صاحب پولیس کمشنر کو بلا کر یہ سب حال جرور کہیں گے۔ کمشنر سوچے گا یہی عورت سارا کھیل بگاڑ رہی ہے۔ اسی کو گرفتار کرلو۔ جج انگریج ہوتا تو نڈر ہوکر پولیس کو تنبیہ کرتا۔ ہمارے بھائی تو ایسے مکدموں پر منہ کھولتے ڈرتے ہیں کہ کہیں سرکار ان سے بُرا نہ مان جائے۔ جج صاحب پولیس کمشنر سے جرور کہیں گے۔ پھر یہ تو نہ ہوگا کہ مکدمہ اُٹھا لیا جائے۔ یہی ہوگا کہ کبھی نہ کھلنے پائے۔ کبھی کبھی جب گواہ بدلنے لگتا ہے تو پولیس والے اس کے ساتھ بڑی زحمت کرتے ہیں۔

جالپا کو اپنی گرفتاری کا خوف نہ تھا۔ لیکن یہ خوف ضرور تھا کہ رما پر کہیں آفت نہ آجائے۔ اس خوف نے اس کی ہمت پست کردی اس وقت ایسا تکان معلوم ہوتا گویا سینکڑوں میل کی منزل مار کر آئی ہو۔

کچھ دُور اور چلنے کے بعد اس نے دیبی دین سے پوچھا۔ اب تو ان سے ملاقات نہ ہوسکے گی۔

دیبی دین نے سر ہلا کر کہا۔ کسی طرح نہیں۔ پہرہ اور کڑا کردیا جائے گا۔ چاہے وہ بنگلہ ہی چھوڑ دیا جائے اور اب ان سے ملاقات ہوہی گئی تو کیا اب کسی طرح اپنا بیان بدل نہیں سکتے۔ دروگ حلفی میں پھنس جائیں گے۔

کچھ دور چل کر جالپا نے کہا۔ میں سوچتی ہوں۔ گھر چلی جاؤں۔ یہاں رہ کر اب کیا کروں گی۔

دیبی دین نے پُردرد نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ نہیں نہیں بہو ابھی میں نہ جانے دوں گا۔ تم چلی جاؤگی۔ تو یہاں پل بھر بھی ہمارا جی نہ لگے گا۔ بڑھیا تو رو رو کر جان دے دے گی۔ ابھی یہاں رہو۔ دیکھو کیا فیصلہ ہوتا ہے۔ بھیا کو میں اتنے کچے دل کا آدمی نہیں سمجھتا تھا۔ نہ جانے لوگ کیسے سرکاری نوکری پر جان دیتے ہیں۔ مجھے تو کوئی سو روپے بھی طلب دے تو نوکری نہ کروں۔ اپنے روزگار کی بات ہی دوسری ہے۔ اس میں آدمی کبھی تھکتا ہی نہیں۔ نوکری میں تو جہاں پانچ چھ گھنٹے ہوئے کہ بدن ٹوٹنے لگا۔ جمہایاں آنے لگیں۔

راستہ میں اور کوئی بات چیت نہ ہوئی۔ جالپا کا دل اپنی شکست ماننے کے لیے کسی طرح راضی نہ ہوتا تھا۔ وہ ناکام ہوکر ایک ناظر کی بے تعلقی سے اس تماشے کو دیکھنے پر قناعت نہ کرسکتی تھی۔ وہ اس تماشے میں شریک ہوکر اپنا پارٹ ادا کرنے کے لیے بے قرار ہو رہی تھی۔ کیا ایک بار پھر رما سے ملاقات ہوگی۔ اس کے دل میں ان آتشیں الفاظ کا ایک شعلہ سا دہک رہا تھا۔ جو وہ اس سے کہنا چاہتی تھی۔ اسے رما پر ذرا بھی رحم نہ آتا تھا۔ اس سے شمہ بھر بھی ہمدردی نہ ہوتی تھی۔ وہ اس سے کہنا چاہتی تھی۔ تمھاری دولت اور تمھارا عہدہ تمھیں مبارک ہو۔ جالپا کی نظروں میں اس کی کوئی وقعت نہیں جس نے ان حقیر چیزوں کے لیے اپنا ضمیر بیچ دیا۔ اسے میں انسان نہیں سمجھتی۔ تم انسان نہیں ہو۔ تم حیوان بھی نہیں ہو۔ نامرد ہو، روسیاہ ہو۔

جالپا کا چہرہ فرطِ غضب سے چمک اُٹھا۔ غرور سے اس کی گردن تن گئی وہ شاید سمجھتے ہوں گے۔ جالپا جس وقت مجھے چھپے دار پگڑی باندھے گھوڑے پر سوار دیکھے گی۔ پھولی نہ سمائے گی۔ جالپا اتنی کور باطن نہیں ہے۔ تم گھوڑے پر نہیں آسمان پر اُڑو۔ میری نظروں میں قاتل ہو۔ میں نے چلتے چلتے سمجھایا تھا۔ اس کا کچھ بھی اثر نہ ہوا۔ کوئی مضائقہ نہیں۔ جالپا تمھاری محتاج نہیں ہے۔

(۴۳)

ایک مہینہ گزر گیا۔ جالپا کئی دن تک بہت بے قرار رہی۔ کئی بار جنون سا ہوا کہ سارا واقعہ کسی اخبار میں چھپوا دے۔ لیکن دل کی گہرائیوں میں چھپی ہوئی کوئی طاقت اس کی زبان بند کردیتی تھی۔ رما کی طرف سے وہ بے تعلق ہوگئی تھی۔ اس کے اوپر اب اسے

غصہ نہ آتا تھا۔ رحم بھی نہ آتا تھا۔ صرف ایک بے نیازی تھی۔ اس کے مرجانے کی خبر پاکر شاید اس کی آنکھوں میں آنسو نہ آتے۔ ہاں اسے تقدیر کا ایک کھیل سمجھ کر تھوڑی دیر کے لیے رنجیدہ ہوجاتی۔ شادی کا وہ رشتہ جو دو ڈھائی سال پہلے اس کے گلے میں پڑا تھا۔ وہ ٹوٹ چکا تھا۔ صرف اس کا نشان باقی تھا۔ اس درمیان میں اس نے رما کو کئی بار اپنے مکان کے سامنے سے جاتے دیکھا۔ اس کی آنکھیں کسی کو تلاش کرتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ ان آنکھوں میں کچھ شرم تھی۔ کچھ عذرِ تقصیر تھا۔ لیکن جالپا نے کبھی اس کی طرف آنکھ نہ اُٹھائی۔ وہ شاید اس وقت آکر اس کے پیروں پر گر پڑتا۔ تب بھی وہ اس سے مخاطب نہ ہوتی۔ رما کی اس نفرت انگیز خودغرضی نے جالپا کے دل کو مجروح کردیا تھا۔ پھر بھی اس رشتہ اُلفت کا نشان ابھی قائم تھا۔ رما کی وہ محبت آمیز بے خودی جسے دیکھ کر ایک دن وہ خوشی سے متوالی ہوجاتی تھی۔ کبھی کبھی اس کے باطن میں چھائی ہوئی تاریکی میں ایک غمناک ٹمٹماتی ہوئی شمع مزار کی طرح چمک اُٹھتی۔ لیکن پھر اسی تاریکی اور غم کا پردہ پڑجاتا۔

وہی جالپا جو پہلے بات بات پر ضد کیا کرتی تھی۔ اب خدمت، ایثار اور حلم کی مورت بنی ہوئی تھی۔ جگو منع کرتی رہتی پر وہ اندھیرے سارے گھر میں جھاڑو لگا آتی۔ چوکا برتن کر ڈالتی۔ آٹا گوند کر رکھ دیتی۔ بڑھیا کو صرف روٹی بنانا باقی رہ جائے بڑھیا اسے ٹھیل ٹھال کر رسوئی میں لے جاتی۔ اور کچھ نہ کچھ کھلا دیتی۔ دونوں میں ماں بیٹی کی سی محبت ہوگئی تھی۔

مقدمہ کی کارروائیاں ختم ہوچکی تھیں۔ دونوں طرف کے وکیلوں کی بحث ختم ہوچکی تھی۔ صرف فیصلہ سنانا باقی تھا۔ آج اسی فیصلے کی تاریخ تھی۔ آج علی الصبح گھر کے کام دھندے سے فرصت پاکر جالپا روزانہ اخبار والے کی آواز پر کان لگائے بیٹھی تھی۔ گویا آج اس کی تقدیر کا فیصلہ ہونے والا ہے۔ اتنے میں دیبی دین نے اخبار لاکر اس کے سامنے رکھ دیا۔ جالپا اخبار پر ٹوٹ پڑی اور آج کا فیصلہ پڑھنے لگی۔ فیصلہ کیا تھا۔ ایک خیالی افسانہ تھا۔ جس کا ہیرو رما تھا۔ جج نے بار بار اس کی تو تعریف کی تھی سارا مقدمہ اسی کے بیانات پر مبنی تھا۔

دیبی دین نے پوچھا۔ فیصلہ چھپا ہے۔

جالپا نے اخبار پڑھتے ہوئے کہا۔ ہاں ہے تو۔

"کس کی سزا ہوئی۔"

کوئی نہیں چھوٹا۔ ایک کو پھانسی کی سزا ہوئی۔ پانچ کو دس دس سال کی اور آٹھ کو پانچ پانچ سال کی۔ پھانسی اسی دنیش کو ہوگی۔

یہ کہہ کر اس نے اخبار پھینک دیا اور ایک لمبی سانس لے کر بولی۔ ان بے چاروں کے بال بچوں کا نہ جانے کیا حال ہوگا۔

دیبی دین نے سرگرمی سے کہا۔ تم نے جس دن مجھ سے ذکر کیا تھا۔ اسی دن سے میں ان سبھوں کا پتہ لگا رہا ہوں۔ اوروں کا تو ابھی تک بیاہ ہی نہیں ہوا ہے۔ صرف دنیش کے دو چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ بڑھیا ماں ہے اور بیوی ہے۔ یہاں کسی اسکول میں ماسٹر تھا۔

جالپا نے پوچھا۔ اس کے گھر کا کچھ پتہ لگا سکتے ہو؟

دیبی نے کہا۔ ہاں کیا مشکل ہے۔

جالپا۔ تو میں بھی تمھارے ساتھ چلوں گی۔ ابھی تو وقت ہے۔ چلو دیکھ آئیں۔

دیبی۔ پہلے میں دیکھ تو آؤں اس طرح اُٹھ کر میرے ساتھ کہاں کہاں دوڑتی پھروگی؟ جالپا نے مجبورانہ انداز سے سر جھکا لیا اور کچھ نہ بولی۔

دیبی دین چلا گیا۔ جالپا پھر اخبار دیکھنے لگی۔ مگر اس کا دھیان دنیش کی طرف لگا ہوا تھا۔ غریب پھانسی پاجائے گا۔ جس وقت اس نے پھانسی کا حکم سنا ہوگا اُس کی کیا حالت ہوئی ہوگی۔ اس کی بوڑھی ماں اور بیوی یہ خبر سُن کر چھاتی پیٹنے لگی ہوں گی۔ بے چارہ اسکول ماسٹر ہی تو تھا۔ مشکل سے روٹیاں چلتی ہوں گی۔ اس کی مصیبتوں کے تخیل سے اسے رما کے ساتھ ایسی نفرت پیدا ہوئی کہ ضبط نہ کرسکی۔ دل میں اُبال سا اُٹھ رہا تھا۔ کہ رما اس وقت آجائے تو اس کی ملامت کرے کہ وہ بھی یاد کرے۔ تم انسان نہیں ہو۔ تم انسان کی صورت میں خونخوار درندے ہو۔ تم اتنے خبیث النفس ہو کہ آج کمینہ سے کمینہ آدمی بھی تمھارے اوپر تھوک رہا ہے۔ تمھیں کسی نے پہلے ہی کیوں نہ قتل کردیا۔ ان آدمیوں کی جان تو جاتی ہی۔ مگر تمھارے منہ میں کالکھ تو نہ لگتی۔

شام ہوگئی۔ لیکن دیبی دین نہ آیا۔ رفتہ رفتہ آٹھ بج گئے۔ دفعتاً ایک موٹر دروازے

پر آکر رُکی۔ رما نے اُتر کر جگو سے پوچھا۔ کیوں دادی سب خیر و عافیت تو ہے۔ دادا کہاں گئے ہیں؟

جگو نے ایک بار اس کی طرف دیکھا اور منہ پھیر کر بولی۔ کہیں گئے ہوں گے۔ میں نہیں جانتی۔

رما نے سونے کی چار چوڑیاں جیب سے نکال کر جگو کے پیروں پر رکھ دیں اور بولا۔ یہ تمھارے لیے لایا ہوں دادی پہنو۔ ڈھیلی تو نہیں ہیں۔ جگو نے چوڑیاں اُٹھا کر زمین پر پٹک دیں۔ اور آنکھیں نکال کر بولی۔ بھگوان کی دیا سے بہت چوڑیاں پہن چکی ہوں۔ اور اب بھی سیر دو سیر سونا پڑا ہوگا۔ لیکن جو کھایا پہنا اپنی محنت کی کمائی سے۔ کسی کا گلا نہیں دبایا۔ پاپ کی گٹھڑی سر پر نہیں لادی۔ اس کوکھ میں آگ لگے جس نے تم جیسے کپوت کو جنم دیا۔ یہ پاپ کی کمائی لے کر تم بہو کو دینے آئے ہو۔ سمجھتے ہوگے تمھارے روپوں کی تھیلی دیکھ کر وہ لٹو ہوجائے گی۔ اتنے دنوں اس کے ساتھ رہ کر بھی تمھاری لوبھی آنکھ اسے نہ پہچان سکی۔ اگر اپنی خیریت چاہتے ہو تو انھیں پیروں جہاں سے آئے ہو وہیں لوٹ جاؤ۔ اس کے سامنے جاکر کیوں اپنا پانی اترواؤ گے۔ تم آج پولیس کے ہاتھوں زخمی ہوکر آئے ہوتے تو بہو تمھاری پوجا کرتی۔ تمھارے پاؤں دھو دھو کر پیتی۔ وہ ان عورتوں میں ہے جو چاہے مصیبتیں سہیں۔ مگر کسی کی برائی نہیں دیکھ سکتیں۔ اگر تم میرے لڑکے ہوتے تو تمھیں زہر دے دیتی۔ کیوں کھڑے مجھے جلا رہے ہو۔ چلے کیوں نہیں جاتے۔ میں نے تم سے کچھ لے تو نہیں لیا ہے۔

رما سر جھکائے خاموش سنتا رہا۔ تب دل گرفتہ ہوکر بولا۔ دادی میں نے بُرائی کی ہے اور اس کے لیے مرتے دم تک شرمندہ رہوں گا۔ لیکن تم مجھے جتنا کمینہ سمجھ رہی ہو اتنا کمینہ نہیں ہوں۔ اگر تمھیں معلوم ہوتا کہ پولیس نے میرے ساتھ کیسی کیسی زیادتیاں کیں تو تم مجھ سے اتنی ناراض نہ ہوتیں۔

جالپا کے کانوں میں ان آوازوں کی بھنک پڑی۔ اس نے زینہ سے جھانک کر دیکھا رما ناتھ کھڑا ہے۔ سر پر بنارسی ریشمی صافہ تھا۔ ریشم کا بڑھیا کوٹ۔ آنکھوں پر سنہری عینک۔ اس ایک ہی مہینہ میں اس کا جسم چوگنا ہوگیا تھا۔ رنگت بھی نکھر آئی تھی۔ ایسی رونق اس کے چہرے پر کبھی نظر نہ آئی تھی۔ رما کی گفتگو کے آخر الفاظ اس کے کانوں میں پڑگئے۔

باز کی طرح ٹوٹ کر دھم دھم کرتی نیچے آئی اور بولی۔ اگر سختیوں سے اتنا دب سکتے ہو۔ تو تم بے غیرت ہو۔ تمھیں اپنے آپ کو مرد کہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ کیا سختیاں کی تھیں۔ ذرا سنوں۔ لوگوں نے ہنستے ہنستے سر کٹائے ہیں، اپنے بیٹوں کو مرتے دیکھا ہے۔ کولہو میں پیلے جانا منظور کیا ہے۔ مگر حق سے جو بھر بھی منحرف نہیں ہوئے۔تم کیوں دھمکی میں آگئے۔ کیوں نہیں سینہ کھول کر کھڑے ہوگئے کہ اسے گولی کا نشانہ بنا لو۔ مگر میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔ کیوں نہیں سر جھکا دیا، روح اس لیے جسم کے اندر رکھی گئی ہے کہ جسم اس کی حفاظت کرے۔ اس لیے نہیں کہ اس کو تباہ کردے۔ آخر اس کا کیا انعام ملا۔ ذرا معلوم تو ہو۔

رما نے دبی ہوئی آواز سے کہا۔ ابھی تو وعدے ہی وعدے ہیں۔

جالپا نے ناگن کی طرح پھنکار کر کہا۔ یہ سن کر مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ ایشور سے یہی دعا کررہی تھی۔ لیکن تم جیسے موم کے پتلوں کو پولیس کبھی ناراض نہیں کرے گی۔ جاؤ شوق سے زندگی کے مزے لوٹو۔ میں نے تم سے پہلے ہی کہہ دیا تھا اور آج پھر کہتی ہوں کہ میرا تم سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔ میں نے سمجھ لیا کہ تم مر گئے۔ تم بھی سمجھ لو کہ میں مرگئی۔ بس جاؤ۔ میں عورت ہوں اگر کوئی سختیاں کرکے مجھ سے ایسی شرمناک حرکت کرانے کی کوششیں کرے تو چاہے اُسے نہ مارسکوں۔ مگر اپنی گردن پر چھری چلا لوں گی۔ کیا تم میں عورتوں کے برابر بھی ہمت نہیں ہے؟

رما نے عاجزی سے گڑگڑا کر کہا۔ تم میرا کوئی عذر نہ سنوگی۔

جالپا نے بے اعتنائی سے کہا نہیں۔

"تو میں منہ میں کالکھ لگا کر کہیں نکل جاؤں؟"

"تمھاری خوشی"

"تم معاف نہ کروگی۔"

"کبھی نہیں۔ کسی طرح نہیں۔"

رما ایک لمحہ تک سر جھکائے کھڑا رہا۔ تب آہستہ آہستہ برآمدے کے نیچے جاکر جگو سے بولا۔ دادا آویں تو کہہ دینا۔ مجھ سے ذرا دیر کے لیے مل لیں۔ جہاں کہیں آجاؤں۔

جگو نے پگھل کر کہا۔ کل یہیں چلے آنا۔

رما نے موٹر پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ یہاں اب نہ آؤں گا دادی!

موٹر چلی گئی تو جالپا نے حاسدانہ انداز سے کہا۔ موٹر دکھانے کو آئے تھے جیسے خرید ہی تو لائے ہیں۔

جگو نے سرزنش کی۔ تمھیں اتنا بے لگام نہ ہونا چاہیے تھا۔ بہو دل پر چوٹ لگتی ہے۔ تو آدمی کو کچھ نہیں سُوجھتا۔

جالپا نے بے دردی سے کہا۔ ایسے حیادار نہیں ہیں دادی! اسی عیش کے لیے تو ایمان بیچا ہے۔ پوچھا نہیں دادا سے مل کر کیا کروگے۔ وہ ہوتے تو ایسی پھٹکار سناتے کہ چھٹی کا دودھ یاد آجاتا۔

جگو ماما سے بھرے ہوئے لہجے میں بولی۔ تمھاری جگہ میں ہوتی۔ تو میرے منہ سے ایسی باتیں نہ نکلتیں۔ تمھارا کلیجہ بڑا سخت ہے۔ دوسرا مرد ہوتا تو کیا اس طرح چپکا چپکا سنتا۔ میں تو تھر تھر کانپ رہی تھی کہ کہیں تمھارے اوپر ہاتھ نہ چلا دیں۔ مگر ہیں بڑے غم خوار۔

جالپا نے اسی بے رحمی سے کہا۔ اسے غم خوار نہیں کہتے دادی۔ یہ بے حیائی ہے۔

دیبی دین نے آکر کہا۔ کیا یہاں بھیا آئے تھے۔ مجھے موٹر پر راستہ میں دکھائی دیے تھے۔

جگو نے کہا۔ ہاں آئے تھے کہہ گئے ہیں۔ دادا ذرا مجھ سے مل لیں۔

دیبی دین نے بے دلی سے کہا۔ ہاں مل لوں گا۔ کچھ اور بات چیت ہوئی؟

جگو پچھتائی ہوئی بولی۔ بات چیت کیا ہوئی۔ پہلے میں نے پوجا کی۔ میں چپ ہوئی تو بہو نے اچھی طرح مالا پھول چڑھایا۔

جالپا نے بے باکی سے کہا۔ آدمی جیسا کرے گا ویسا بھرے گا۔

جگو۔ اپنا ہی سمجھ کر ملنے آئے تھے۔

جالپا۔ کوئی بلانے تو گیا نہ تھا۔

یہ کہہ کر اس نے دیبی دین سے پوچھا کہ دنیش کا پتہ لگا۔ دادا!

دیبی دین نے کہا۔ ہاں سب پوچھ آیا۔ ہوڑے میں گھر ہے۔ پتہ ٹھکانہ سب معلوم ہے۔

جالپا۔ تو اس وقت چلو گے یا کل کسی وقت۔
دینو۔ تمھاری جیسی خوشی۔ جی چاہے اسی وقت چلو میں تیار ہوں۔
جالپا۔ تھک گئے ہو گے۔
دینو۔ ایسے کاموں میں تھکن نہیں ہوتی۔

آٹھ بج گئے تھے۔ سڑک پر موٹروں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ سڑک کی دونوں پٹریوں پر ہزاروں عورت مرد بنے ٹھنے ہنستے بولتے جاتے تھے۔ جالپا نے سوچا۔ دُنیا کیسی اپنے راگ رنگ میں مست ہے۔ جسے اس کے لیے مرنا ہو مرے۔ وہ اپنی عادت نہ چھوڑے گی۔ ہر ایک اپنا چھوٹا سا مٹی کا ہی گھروندا بنائے بیٹھا ہے۔ ملک تباہ ہوجائے۔ اسے غم نہیں۔ اس کا گھروندا بچا رہے۔ جالپا کا بھولا بھالا دل اس وقت بازار کو بند دیکھ کر خوش ہوتا۔ لوگ غم سے سر جھکائے یا غصہ سے تیوریاں بدلے نظر آتے۔ وہ نہ جانتی تھی کہ خلقت کے اس سمندر میں ایسی چھوٹی چھوٹی کنکریوں کے گرنے سے ایک ہلکورا بھی نہیں اُٹھتا۔ آواز تک نہیں ہوتی۔

(۴۴)

رما موٹر پر بیٹھ کر چلا۔ تو اُسے کچھ سُوجھتا نہ تھا۔ جاتے ہوئے راستے اس کے لیے انجان ہوگئے تھے۔ اُسے جالپا پر غصہ نہ آتا تھا۔ ذرا بھی نہیں۔ جگو پر بھی اُسے غصّہ نہ آتا تھا۔ غصّہ آتا تھا اپنی کمزوری پر اور اپنی بے شرمی اور بے غیرتی پر۔ پولیس والوں کے زیر اثر اس کے ضمیر پر پردہ پڑگیا تھا۔ وہ کتنی بڑی بے انصافی کرنے جا رہا تھا۔ اس کا اُسے صرف اس دن خیال آیا تھا جب جالپا نے اسے تنبیہ کی تھی۔ وہ پھر پولیس والوں کے چکمے میں آگیا۔ افسروں نے بڑی بڑی امیدیں بندھا کر اُسے بہلا رکھا۔ اس کے بعد اسے جالپا سے ملنے کا موقع ہی نہ ملا۔ پولیس کا رنگ اس پر جمتا گیا۔ آج وہ ایک جڑاؤ ہار جیب میں رکھے جالپا کو اپنی کامیابی کی خوشخبری دینے گیا تھا۔ وہ جانتا تھا جالپا پہلے کچھ ناک بھوؤں سکوڑے گی۔ مگر یہ بھی جانتا تھا کہ یہ ہار دیکھ کر وہ ضرور خوش ہوجائے گی۔ کل ہی صوبہ متحدہ کے ہوم سکریٹری کے نام پولیس کمشنر کا سفارشی خط اسے مل جائے گا۔ دو چار دن اور لطفِ صحبت اُٹھانے کے بعد وہ گھر کی راہ لے گا۔ دینی دین اور جگو کو بھی اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ ان کا احسان وہ کیوں کر بھول سکتا تھا۔ یہی منصوبہ دل میں باندھ کر وہ جالپا

کے پاس گیا تھا۔ جیسے کوئی بے چاری پھول اور شرینی لے کر دیوتا کی پوجا کرنے جائے۔ لیکن دیوتا نے اس کے تھال کو ٹھکرا دیا۔ اس کے پھول کو پیروں سے کچل ڈالا۔ اُسے کچھ کہنے کا موقع ہی نہ ملا۔ آج پولیس کے محفوظ دائرۂ اثر سے باہر نکل کر آزادی کی فضا میں اس کا ضمیر بیدار ہوگیا تھا۔ اب اپنی خباثت سے اصلی روپ نظر آئی۔ اس کے دل میں ایک ہیجان پیدا ہوا کہ اسی وقت جج کے پاس جائے اور سارا واقعہ کہہ سنائے۔ کیا جج اپنا فیصلہ تبدیل نہیں کرسکتا۔ ابھی تو سب ہی ملزم حوالات میں ہیں۔ پولیس والوں کے دانت پیسنے کا اُسے مطلق خوف نہ تھا۔ جالپا کی وہ غصے میں بھری ہوئی صورت اس کی آنکھوں میں پھر گئی۔ اُف! کتنے طیش میں تھی۔ اگر وہ جانتا کہ جالپا اتنی برہم ہوجائے گی تو چاہے دُنیا ادھر کی اُدھر ہوجاتی اپنا بیان ضرور بدل دیتا۔ اگر کہیں جج نے کچھ سماعت نہ کی اور ملزموں کو بری نہ کیا تو جالپا اس کا منہ نہ دیکھے گی۔ پھر وہ زندہ ہی کیوں رہے۔ کس کے لیے۔

اس نے موٹر روکی۔ اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ کہاں آگیا۔ یکایک چوکیدار نظر آگیا۔ رما نے اس سے جج کے بنگلہ کا پتہ پوچھا چوکیدار ہنس کر بولا۔ حضور تو بہت دور نکل آئے۔ یہاں سے تو چھ سات میل سے کم نہ ہوگا۔ وہ اِدھر چورنگی کی طرف رہتے ہیں۔

رما چورنگی کی طرف چلا۔ نو بج گئے تھے۔ معلوم نہیں جج سے ملاقات بھی ہوگی یا نہیں۔ کچھ بھی ہو۔ آج ان سے بغیر اپنی سرگزشت کہے وہ نہیں لوٹے گا۔ اگر انھوں نے کچھ سماعت کی تو اچھا ہی ہے۔ نہیں تو وہ کل ہائی کورٹ کے ججوں سے کہے گا۔ کوئی تو سُنے گا۔ وہ سارا واقعہ اخباروں میں چھپوا دے گا۔ تب تو سب کی آنکھیں کھلیں گی۔

موٹر تیس میل کی رفتار سے جا رہی تھی۔ دس ہی منٹ میں چورنگی آپہنچی۔ یہاں ابھی تک وہی چھل پہل تھی۔ مگر رما اس زناٹے سے موٹر لیے جاتا تھا۔ یکایک ایک پولیس مین نے لال بتی دکھلائی۔ رما نے موٹر روک لی اور سر باہر نکال کر دیکھا۔ تو وہی داروغہ جی۔

داروغہ نے پوچھا۔ کیا ابھی تک بنگلے پر نہیں گئے۔ کہیئے بیگم صاحبہ سے ملاقات ہوئی۔ میں نے تو سمجھا تھا وہ بھی آپ کے ساتھ ہوں گی۔ خوش تو خوب ہوئی ہوں گی۔

رما نے بات بنا کر کہا۔ جی ہاں بہت خوش ہوئیں۔

"میں نے تو کہا ہی تھا۔ عورتوں کی ناراضگی کی یہی دوا ہے۔ آپ کانپے جاتے تھے۔"

"میری حماقت تھی"

"چلیے اب میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔ ایک بازی تاش اُڑے اور ذرا سرور رہے۔ انسپکٹر صاحب بھی آتے ہوں گے۔ اب آپ مسزرما ناتھ کو بنگلے پر ہی کیوں نہیں بلا لیتے۔"

رما نے کہا۔ ابھی تو مجھے ایک ضرورت سے دوسری طرف جانا ہے۔ آپ موٹر لے جائیں۔ میں پاؤں پاؤں چلا آؤں گا۔

داروغہ نے موٹر کے اندر آکر کہا۔ نہیں صاحب مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔ آپ جہاں چاہیں چلیے۔ میں ذرا بھی مخل نہ ہوں گا۔

رما نے کچھ ترش ہوکر کہا۔ میں سمجھ رہا ہوں۔ لیکن میں ابھی بنگلے پر نہیں جا رہا ہوں۔

داروغہ نے مسکرا کر کہا۔ میں سمجھ رہا ہوں۔ لیکن میں ذرا بھی مخل نہ ہوں گا۔

رما نے جھلا کر کہا۔ آپ جو کچھ سمجھ رہے ہیں۔ وہ بالکل غلط ہے۔ میں اتنا بے غیرت نہیں ہوں۔

داروغہ نے کچھ نادم ہوکر کہا۔ اچھا صاحب خطا ہوئی معاف کیجیے۔ لیکن ابھی آپ اپنے کو خطرے سے باہر نہ سمجھیں۔ آپ کو کسی ایسی جگہ نہ جانے دوں گا۔ جہاں مجھے پورا اطمینان نہ ہوگا۔ میں آپ ہی کے فائدے کے خیال سے یہ عرض کر رہا ہوں۔

رما نے ہونٹ چبا کر کہا۔ بہتر ہوآپ میرے فائدے کا اتنا خیال نہ کریں۔ آپ لوگوں نے مجھے ملیامیٹ کردیا اور اب بھی گلا نہیں چھوڑتے۔ مجھے اب اپنے حال پر مرنے دیجیے۔ میں اس غلامی سے تنگ آگیا ہوں۔

یہ کہتا ہوا وہ موٹر سے اُتر پڑا اور تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ داروغہ نے کئی بار پکارا۔ لیکن اس نے پیچھے پھر کر دیکھا تک نہیں۔ کچھ دور جاکر وہ ایک موڑ پر گھوم گیا۔ اسی سڑک پر جج کا بنگلہ تھا۔ سڑک پر کوئی آدمی نہ تھا۔ رما کبھی اس بازو پر۔ کبھی اس بازو پر جاجاکر بنگلوں کے سائن بورڈ پڑھتا چلا جاتا تھا۔ یکایک جج کا نام دیکھ کر وہ رُک گیا۔ اندر

جانے کی ہمت نہ پڑی۔ خیال آیا۔ جج نے پوچھا تم نے جھوٹی گواہی کیوں دی۔ تو کیا جواب دوں گا۔ یہ کہنا کہ پولیس نے مجھ سے زبردستی گواہی دلوائی۔ ترغیبیں دیں۔ تشدد کیا شرمناک معلوم ہوتا تھا۔ اگر وہ پوچھے کہ تم نے محض دو تین سال کی سزا سے بچنے کے لیے اتنے بے گناہوں کا خون سر پر لے لیا تو اس کا میرے پاس کیا جواب ہے۔ خواہ مخواہ ذلیل ہونا پڑے گا۔ بے وقوف بنایا جاؤں گا۔ وہ انھیں پاؤں لوٹ پڑا۔ اس ذلت کا مقابلہ کرنے کی اس میں ہمت نہ تھی۔

(۴۵)

رما آدھی رات گئے سویا۔ تو نو بجے دن تک نیند نہ کھلی۔ وہ خواب دیکھ رہا تھا۔ دنیش کو پھانسی ہورہی ہے۔ اسی وقت داروغہ نے آکر کہا آج تو آپ خوب سوئے بابو صاحب! کل کب سوئے۔

رما نے لاپرواہی سے جواب دیا۔ ذرا دیر بعد لوٹ آیا۔ اس مقدمہ کی اپیل تو ہائی کورٹ میں ہوگی۔

داروغہ۔ اپیل کیا ہوگی۔ ضابطہ کی پابندی ہوگی۔ آپ نے مقدمہ کو اِتنا مضبوط کر دیا ہے کہ اب وہ کسی کے ہلائے ہل نہیں سکتا۔

دفعتاً ڈپٹی اور انسپکٹر پولیس دونوں آپہنچے۔ ڈپٹی صاحب نے کہا۔ ابھی تو آپ سویا ہوا ہے۔ کمشنر صاحب آپ سے بہت خوش ہے۔

یہ دیکھیے۔ انھوں نے آپ کو یہ سفارشی چٹھی دی ہے۔ بس یہی سمجھ لیجیے کہ آپ کی تقدیر کھل گئی۔

یہ کہتے ہوئے اس نے ایک لفافہ رما کی طرف بڑھایا۔ رما نے لفافہ کھول کر دیکھا۔ یکایک اسے پھاڑ کر پُرزہ پُرزہ کر ڈالا۔ تینوں آدمی حیرت سے اس کا مُنہ دیکھنے لگے۔

داروغہ نے تیز ہوکر کہا۔ یہ آپ نے کیا حماقت کی۔

انسپکٹر۔ حلف سے کہتا ہوں۔ کمشنر صاحب کو معلوم ہوگا۔ تو بہت ناراض ہوں گے۔

ڈپٹی۔ اس کا کچھ مطلب ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ آخر آپ اتنے ناراض کیوں ہیں؟

رما۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مجھے اس خط کی ضرورت نہیں اور نہ میں نوکری چاہتا ہوں۔ میں آج ہی یہاں سے چلا جاؤں گا۔

ڈپٹی۔ جب تک ہائی کورٹ کا فیصلہ نہ ہوجائے۔ آپ کہیں نہیں جاسکتے۔

رما۔ کیوں؟

ڈپٹی۔ کمشنر صاحب کا یہ حکم ہے۔

رما۔ میں کسی کا غلام نہیں ہوں۔

انسپکٹر۔ بابو صاحب! آپ ناحق بنا بنایا کھیل بگاڑ رہے ہیں۔ جو کچھ ہونا تھا۔ وہ ہوگیا۔ دس پانچ دن میں ہائی کورٹ سے فیصلہ کی تصدیق ہوجائے گی۔ آپ کی بہتری اسی میں ہے کہ جو صِلہ مِل رہا ہے اسے شکریہ کے ساتھ قبول کیجیے اور آرام سے زندگی کے دن بسر کیجیے۔ خدا نے چاہا تو ایک دن آپ بھی کسی اُونچے منصب پر ہوں گے۔ یہ واضح رہے کہ افسروں کی ذرا سی نگاہ بدل جائے تو آپ کا کہیں پتہ نہ لگے۔ حلف سے کہتا ہوں۔ پولیس کے ایک ذرا سے اشارہ پر دس سال کی سزا ہوجائے گی۔ آپ ہیں کس زعم میں۔ ہم آپ کے ساتھ دغا نہیں کرنا چاہتے۔ ہاں اگر ہمیں بھی پولیس کی چالیں چلنی پڑیں گی۔ جیل کو آسان نہ سمجھیے گا۔ خدا دوزخ میں لے جائے۔ پر جیل کی سزا نہ دے۔ حلف سے کہتا ہوں کہ جیل دوزخ سے بھی بدتر ہے۔

داروغہ۔ یہ بے چارے اپنی بیوی سے مجبور ہیں۔ وہ شاید ان کی جان کی گاہک ہو رہی ہے۔

انسپکٹر۔ کیا ہوا۔ کل تو آپ وہ ہار لے گئے تھے۔ پھر بھی ان کا منہ سیدھا نہ ہوا۔

رما نے کوٹ کی جیب سے ہار نکال کر میز پر رکھ دیا اور بولے وہ ہار یہ رکھا ہے۔

ڈپٹی۔ کوئی مغرور عورت ہے۔

انسپکٹر۔ کچھ ان کی بھی مزاج پُرسی کرنی پڑے گی۔

داروغہ۔ یہ تو بابو صاحب کے سلیقے اور برتاؤ پر منحصر ہے۔

ڈپٹی۔ اس کھٹک سے بھی مچلکہ لینا چاہیے۔

رما ناتھ کے سامنے ایک نیا مسئلہ کھڑا ہوگیا۔ ممکن تھا وہ اپنے کو فرض پر قربان کردیتا۔ دو چار سال کی سزا کے لیے بھی تیار ہوجاتا۔ شاید اس نے ان سختیوں کے لیے اپنے آپ کو آمادہ کر لیا تھا۔ لیکن اپنے ساتھ جالپا کو بھی مصیبت میں ڈالنے کا ارادہ کسی طرح نہ کرسکتا تھا۔ اس نے دیکھا کہ وہ پولیس کے پنجے میں کچھ اس طرح پھنس گیا ہے کہ اس

کے بے داغ نکلنے کی کوئی صورت نہیں ہے۔ وہ پولیس سے ہرگز پیش نہیں پاسکتا۔ اس خیال نے اس کی تیزی اور تندی غائب کردی۔

بیکسانہ انداز سے بولا۔ آخر آپ لوگ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟

انسپکٹر نے داروغہ کی طرف دیکھ کر آنکھ ماری۔ گویا کہہ رہے ہیں۔ آگیا پنجے میں اور بولے۔ بس ہم اتنا ہی چاہتے ہیں کہ آپ ہمارے مہمان بنے رہیں اور مقدمہ ہائیکورٹ سے طے ہوجانے کے بعد خوش خوش رخصت ہوجائیں۔ کیونکہ اس کے بعد ہم آپ کی حفاظت کے ذمہ دار نہ ہوں گے۔ ابھی جو خط آپ نے پھاڑ کر پھینک دیا ہے اس کی نقل دوبارہ مل سکتی ہے۔ اگر آپ دُوراندیش ہیں تو اس سے اپنی زندگی کی اصلاح میں کام لیں گے۔ نہیں تو اِدھر اُدھر کے دھکے کھائیں گے۔ اور آپ کے اُوپر گناہ بے لذت کی مثل صادق آئے گی۔ اس کے سوا ہم آپ سے کچھ نہیں کہتے۔

تینوں افسر رخصت ہوگئے۔ اور رما ایک سگار جلا کر ان معاملات پر غور کرنے لگا۔

(۴۶)

ایک مہینہ اور نکل گیا۔ ہائی کورٹ میں مقدمہ کی تاریخ مقرر ہوگئی ہے۔ رما پر پھر پولیس کا رعب غالب آگیا ہے اور وہ پھر سابق دستور افسروں کے اشاروں پر ناچتا ہے۔ وہ اب پہلے سے کہیں زیادہ شراب پینے لگا ہے اور اس کی مزید دلچسپی کے لیے پولیس نے زہرہ نام کی ایک نازنین کو بھی مقرر کردیا ہے۔ زہرہ حسین ہے۔ خوش گلو ہے اور مزاج شناس ہے۔ اس نے اپنی ہمدردانہ باتوں سے رما ناتھ کو گرویدہ کر لیا ہے۔ اس کی سادگی اور خلوص نے زہرہ کو بھی اس سے مانوس کردیا ہے۔ اب تک اُسے جن لوگوں سے سابقہ پڑا تھا۔ وہ سبھی اسے ایک آلۂ تفریح سمجھتے تھے۔ رما وہ پہلا آدمی تھا جو اس کوچہ سے ناواقف ہونے کے باعث اسے اپنا شریکِ غم بنانا چاہتا تھا۔

ایک دن اس نے دورانِ گفتگو میں زہرہ سے کہا۔ تم مجھ پر اتنی مہربان ہو کہ میں ڈرتا ہوں کہ تمھاری محبت میں گرفتار نہ ہوجاؤں۔ مگر تم سے وفا کی امید ہوسکتی ہے؟

زہرہ نے دل میں خوش ہوکر اپنی مخمور آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

ہم وفا کیا جانیں۔ ہمارا تو پیشہ ہی حسن فروشی ہے۔

رما۔ کیا اس میں کوئی شک بھی ہے؟

زہرہ۔ مطلق نہیں۔ آپ لوگ ہمارے پاس محبت سے لبریز دل لے کر آتے ہیں۔ مگر ہم اتنے بے وفا ہیں کہ اس کی ذرا بھی قدر نہیں کرتے۔ ہے یہی بات نہ؟

رما۔ بے شک!

زہرہ۔ معاف کیجیے گا۔ آپ مردوں کی طرفداری کر رہے ہیں۔ حق یہ ہے کہ آپ لوگ ہمارے پاس محض تفریح کے لیے آتے ہیں۔ محض غم غلط کرنے کے لیے محض نفسانی خواہشوں کو پورا کرنے کے لیے جہاں آپ کو وفا تلاش ہی نہیں۔ وہاں وفا ملے کیوں کر! لیکن اتنا ہی جانتی ہوں کہ ہم میں جتنی بے چاریاں مردوں کی بے مہری اور بے وفائی سے مایوس ہوکر خونِ جگر پیتی ہیں۔ ان کا پتہ اگر دنیا کو چلے تو آنکھیں کھل جائیں۔ یہ ہماری حماقت ہے کہ تماش بینوں سے وفا کی امید رکھتے ہیں مگر پیاسا آدمی اندھے کنوئیں کی طرف دوڑے تو میرے خیال میں اس کا کوئی قصور نہیں۔

آج جب زہرہ یہاں سے چلی۔ تو اس نے داروغہ صاحب سے یوں رپورٹ کی۔ آج تو حضرت خوب مزے میں آئے۔ خدا نے چاہا۔ تو چار دن کے بعد بیوی کا نام بھی نہ لیں گے۔

داروغہ نے خوش ہوکر کہا۔ یہ تو میں نے پہلے ہی سمجھ رکھا تھا۔ لطف تو جب ہے کہ اس کی بیوی مایوس ہوکر چلی جائے۔ ایسے گاؤدیوں کو سبز باغ دکھانا تمھارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔

زہرہ کی آمد و رفت بڑھنے لگی۔ بالآخر رما خود اپنے ہی جال میں پھنس گیا۔ اس نے زہرہ سے الفت کا سوانگ بھر کر افسروں کی نگاہوں میں اپنا وقار جمانا چاہا تھا۔ لیکن زہرہ اب اُسے وفا اور محبت کی دیوی سی معلوم ہوتی تھی۔ وہ جالپا کی سی حسین نہ سہی۔ اظہارِ محبت میں اس سے کہیں زیادہ ہوشیار، ناز و ادا میں اس سے کہیں زیادہ پختہ کار اور سحر آفرینی میں کہیں زیادہ مشاق تھی۔ سرد لوح رما کے دل میں نئے نئے منصوبے پیدا ہونے لگے۔

ایک دن اُس نے زہرہ سے کہا۔ زہرہ جدائی کی گھڑی آرہی ہے۔ دو چار دن میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔ پھر تو تمھیں میری یاد بھی نہ آوے گی۔

زہرہ نے محبت آمیز لہجے میں کہا۔ اب تمھیں نہ جانے دوں گی۔ یہیں کوئی اچھی سی

نوکری کرلینا۔ پھر ہم دونوں آرام سے رہیں گے۔

رما مخمور ہوکر بولا۔ یہ دل سے کہتی ہو زہرہ؟ دیکھو تمھیں میرے سر کی قسم! دغا مت دینا۔

زہرہ۔ اگر یہ خوف ہے تو نکاح پڑھالو۔ نکاح کے نام سے نفرت ہو تو شادی کرلو۔ اب اس کے سوا اپنی محبت کا کیا ثبوت دوں۔

خلوص میں ڈوبے ہوئے ان الفاظ نے رما کو متوالا کردیا۔ اس نے سوچا۔ یہ نازنین جس پر بڑے بڑے رئیس فدا ہیں۔ میرے لیے اتنی بڑی قربانی کرنے کو تیار ہے۔ اس کی خوش نصیبی کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوسکتا ہے۔ جس کان میں دوسروں کو بالو کے ذرّے ملتے ہیں اس میں اسے سونے کی ڈلے مل گئے۔ کیا یہ حسنِ تقدیر نہیں ہے۔ رما کے دل میں کئی روز تک کشمکش ہوتی رہی۔ جالپا کے ساتھ آنے والی زندگی کا خیال کرکے وہ مایوس ہوجاتا تھا۔ وہ زندگی کتنی خشک اور صبر آزما ہوگی۔ جالپا قدم قدم پر فرض اور حق کا جھنڈا لے کر کھڑی ہوجائے گی۔ اور اسے زاہدوں کی سی زندگی بسر کرنی پڑے گی۔ فقیرانہ زندگی میں رما کے لیے کوئی کشش نہ تھی۔ عام آدمیوں کی طرح وہ بھی عیش و آرام چاہتا تھا۔ زندگی کے مزوں سے اس کی طبیعت سیر نہ ہوئی تھی۔ تپسونی جالپا کی طرف سے ہٹ کر اس کا عیش پرور دل زہرہ کی طرف دوڑا۔ اسے نازفروشوں کی مثالیں یاد آنے لگیں۔ جن کی عصمت کی قسم کھائی جاسکتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی رنگین مزاج اور وفا شعار بیویوں کی مثالیں بھی آپہنچیں۔ اس نے دل میں فیصلہ کیا۔ یہ سب ڈھکوسلا ہے۔ انسان کی طبیعتیں جدا جدا ہیں۔ پردہ کے باہر آجانے سے کوئی گنہگار نہیں ہوجاتا۔ اور نہ پردے کے اندر بیٹھ کر کوئی عصمت مآب ہوجاتا ہے۔ یہ سب زندگی کے اتفاقات ہیں۔

زہرہ روز آتی اور بندھن میں ایک گانٹھ دے کر چلی جاتی۔ ان حالات میں کئی مستقل مزاج نوجوانوں کے بھی آسن ڈول جاتے۔ رما تو عیش کا بندہ تھا۔ اب تک وہ محض اس لیے بے راہ نہ ہوا تھا کہ جوں ہی اس نے پر نکالے صیاد نے اسے پنجرے میں قید کرلیا۔ کچھ دن پنجرے سے باہر آجانے پر بھی اسے پرواز کی ہمت نہ ہوئی۔ اب اس کے سامنے ایک نیا اور وسیع منظر تھا۔ وہ چھوٹا سا تیلیوں والا پنجرہ نہیں بلکہ پھولوں سے لہراتا ہوا باغ جہاں کی قید میں بھی آزادی کا مزا تھا۔

رما جیوں جیوں زہرہ کے دامِ الفت میں پھنستا جاتا تھا۔ پولیس کے افسر اس کی طرف سے بے فکر ہوتے جاتے تھے۔ اس کے اوپر جو قیدیں لگائی گئیں تھیں۔ وہ رفتہ رفتہ ترک ہوتی جاتی تھیں۔ ایک دن رما ڈپٹی صاحب کے ساتھ سیر کرنے نکلا۔ تو موٹر دیبی دین کی دکان کے سامنے سے گزری۔ رما نے اپنا سر اندر کھینچ لیا کہ کسی کی اس پر نظر نہ پڑجائے۔ وہ یہ جاننا چاہتا تھا کہ جالپا ہے یا چلی گئی۔ لیکن دیبی دین کی دکان پر نہ جاسکا۔ دل میں اب بھی وہ یہی سمجھتا تھا کہ میں نے جو راستہ پکڑا ہے وہ بہت مخدوش ہے۔ لیکن یہ جان کرکے بھی وہ اسے چھوڑنا نہ چاہتا تھا۔ دیبی دین کو دیکھ کر اس کا سر آپ ہی آپ شرم سے جھک جاتا۔ وہ کسی دلیل سے اپنے اطوار کی حمایت نہ کرسکتا تھا۔ اس کی خیریت اسی میں تھی کہ وہ ان لوگوں سے اب ملنا جلنا چھوڑ دے۔ شہر میں تین آدمیوں کے سوا چوتھے آدمی سے اس کی ملاقات یا راہ و رسم نہ تھی۔ جس کی حرف گیری کی اسے پرواہ ہوتی۔

موٹر اِدھر اُدھر گھومتی ہوئی ہوڑہ کے پُل کی طرف جا رہی تھی کہ یکایک رما نے ایک عورت کو سر پر گنگا جل کا کلسا رکھے گھاٹوں کے اوپر چڑھتے دیکھا کہ اس کے کپڑے بہت میلے ہو رہے تھے اور اتنی لاغر کہ کلسے کے بوجھ سے اس کی کمر دہری ہو رہی تھی۔ اس کی چال کچھ کچھ جالپا سے ملتی ہوئی معلوم ہوئی۔ رما نے سوچا جالپا یہاں کیا کرنے آئے گی۔ کوئی دوسری عورت ہوگی۔ اس کی صورت دیکھ کر مزید اطمینان کرنا چاہتا تھا۔ مگر ایک ہی لمحے میں کار اور آگے بڑھ گئی۔ اور رما کو اس کا چہرہ دکھائی دیا۔ اس کا کلیجہ دھک سے ہوگیا۔ یہ جالپا ہی تھی۔ اس نے کھڑکی کی بغل میں سر جھکا دیا۔ بیشک جالپا تھی۔ مگر کتنی لاغر اندام گویا کوئی بیکس ضعیفہ ہو۔ چہرہ پر نہ رونق تھی نہ وہ سادگی اور نہ وہ غرور۔ رما بے درد نہ تھا۔ اس کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ جالپا اس حالت میں اور اس کے جیتے جی۔ غالبًا دیبی دین نے اسے گھر سے نکال دیا ہے۔ اور وہ مزدوری کرکے بسر کر رہی ہے۔ مگر نہیں دیبی دین اتنا بے مروّت نہیں ہے۔ جالپا نے خود اس کے سایۂ حمایت میں رہنا منظور نہ کیا ہوگا۔ عالی ظرف تو ہے ہی۔ مگر کسے معلوم ہو کیا بات ہے۔

موٹر دُور نکل آئی تھی۔ رما کی ساری شوقین مزاجی۔ ساری شوریدہ سری غائب ہوگئی۔ اس میلے کپڑے والی ستم رسیدہ جالپا کی صورت آنکھوں کے سامنے کھڑی تھی۔ کس

سے پوچھے۔ کہاں جائے۔ جالپا کا نام بھی زبان پر آجائے تو سب کے سب بدگمان ہو جائیں اور اسے قید تنہائی میں ڈال دیں۔ ہائے جالپا کے چہرے پر کتنی حسرت تھی۔ آنکھوں میں کتنی بے کسی۔

کچھ دیر بعد زہرہ آئی۔ مسکراتی اور لچکتی۔ رما اس سے کچھ بھی مخاطب نہ ہوا۔

زہرہ نے پوچھا۔ آج کسی کی یاد آرہی ہے کیا؟

یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی گول مکھن سی نرم باہیں اس کی گردن میں ڈال کر اسے اپنی طرف کھینچا۔ رما نے ذرا بھی مزاحمت نہ کی۔ اس طرح اس کے سینہ پر اپنا سر رکھ دیا گویا اب یہی اس کا سہارا ہے۔

زہرہ نے دردمندانہ لہجہ میں پوچھا۔ سچ بتاؤ۔ آج اتنے اُداس کیوں ہو۔ کیا مجھ سے کسی بات پر ناراض ہو۔

رما نے رقت آمیز انداز سے کہا۔ نہیں زہرہ تم نے مجھ بدنصیب پر جتنا رحم کیا ہے۔ اس کے لیے میں ہمیشہ تمہارا احسان مند رہوں گا۔ تم نے اس وقت مجھے سنبھالا۔ جب میری زندگی کی ٹوٹی ہوئی کشتی غوطے کھا رہی تھی۔ وہ دن میری زندگی کے سب سے مبارک دن ہیں اور میں اپنے سینے میں انھیں ہمیشہ محفوظ رکھوں گا۔ مگر بدنصیبوں کے لیے دُنیا میں آسائش کہاں۔ میں نے آج جالپا کو جس صورت میں دیکھا ہے۔ وہ میرے دل کو بھالوں کی طرح چھید رہا ہے۔ آج وہ پھٹے اور میلے کپڑے پہنے سر پر پانی کا کلسا لیے چلی جارہی تھی۔ اسے اس حالت میں دیکھ کر میرے جگر کے ٹکڑے ہوگئے مجھے اپنی زندگی میں کبھی صدمہ نہ ہوا تھا۔ کچھ نہیں کہہ سکتا اس پر کیا گزر رہی ہے۔

زہرہ نے پوچھا۔ وہ تو اس مالدار کھٹک کے گھر پر تھیں۔

رما۔ ہاں تھی تو مگر نہیں کہہ سکتا۔ کیوں وہاں سے چلی گئی۔ میرے ساتھ ڈپٹی صاحب تھے۔ ان کے سامنے میں اس لیے کچھ پوچھ نہ سکا۔ میں جانتا ہوں وہ مجھے دیکھ کر منہ پھیر لیتی۔ اور شاید مجھے حقیر سمجھتی۔ مگر کم سے کم مجھے اتنا معلوم تو ہوجاتا کہ وہ اس وقت کس حالت میں ہے۔ زہرہ! تم اپنے دل میں چاہے جو سمجھ رہی ہو۔ لیکن میں اس خیال میں مست ہوں کہ تمھیں مجھ سے محبت ہے اور محبت کرنے والے سے ہم کم سے کم ہمدردی کی اُمید رکھتے ہیں۔ یہاں ایک بھی ایسا آدمی نہیں

جس سے میں اپنے دل کا درد کہہ سکوں۔ تم ہی مجھے گمراہ کرنے کے لیے ہی بھیجی گئی تھیں۔ مگر تمھیں مجھ پر رحم آگیا۔ شاید تم نے ایک گرے ہوئے آدمی کو ٹھوکر مارنا مناسب نہ سمجھا۔ اگر خدا نخواستہ آج ہم میں اور تم میں کسی وجہ سے بدمزگی ہوجائے۔ تو کیا کل تم مجھے مصیبت میں دیکھ کر ذرا بھی ہمدردی نہ کروگی۔ کیا مجھے بھوکوں مرتے دیکھ کر میرے ساتھ اس سے بہتر سلوک نہ کرتی۔ جو آدمی کتوں کے ساتھ کرتا ہے کیا اس وقت تم میرے ساتھ ذرا بھی ہمدردی نہ کروگی زہرہ۔ تم اگر چاہو تو جالپا کا پورا پورا پتہ لگا سکتی ہو۔ وہ کہاں ہے۔ کیا کرتی ہے۔ میری طرف سے اس کے دل میں کیا خیال ہیں۔ گھر کیوں نہیں جاتی۔ یہاں کب تک رہنا چاہتی ہے۔ اگر تم کسی طرح جالپا کو گھر جانے پر راضی کرسکو۔ تو میں عمر بھر تمھاری غلامی کروں گا۔ اس خستہ حالی میں میں اُسے نہیں دیکھ سکتا۔ مجھے ایسا صدمہ ہو رہا ہے کہ شاید میں آج رات کو یہاں سے بھاگ جاؤں۔ مجھ پر کیا گزرے گی اس کا مجھے مطلق غم نہیں ہے۔ میں دلیر نہیں ہوں۔ خطرہ کے سامنے ہمیشہ میرا حوصلہ پست ہوجاتا ہے۔ لیکن میری بے غیرتی بھی یہ چوٹ نہیں سہہ سکتی۔

زہرہ طوائف تھی۔ بھلے بُرے سبھی طرح کے آدمیوں سے اُسے سابقہ پڑچکا تھا۔ آدمیوں کا مزاج پہچانتی تھی۔ اس پردیسی نوجوان میں اسے وہ چیز ملی۔ جس کا دوسروں میں کہیں پتہ نہ تھا۔ اس کی زندگی میں زہرہ کو یہ پہلا آدمی ملا تھا۔ جس نے اس کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیا۔ ایسے وفا اور محبت کے پُتلے کو وہ مایوس نہ کرسکتی تھی۔ رما کی باتیں سن کر اسے ذرا بھی حسد نہ ہوا۔ بلکہ اس کے دل میں ایک خودغرضانہ امانت کا جذبہ پیدا ہوا۔ اس موقع پر رما کو خوش کرکے ہمیشہ کے لیے اپنا غلام بنا سکتی تھی۔ جالپا سے اُسے کوئی خوف نہ تھا۔ جالپا کتنی ہی حسین کیوں نہ ہو۔ زہرہ اپنی عشوہ طرازی اپنی دل لبھانے والی اداؤں سے اس کا رنگ پھیکا کرسکتی تھی۔ اس نے بارہا گلعذار کھترانیوں کو رُلا کر چھوڑ دیا تھا۔ پھر جالپا کسی شمار میں تھی۔

زہرہ نے اس کی دلجوئی کرکے کہا۔ تو اس کے لیے تم اتنے رنجیدہ کیوں ہو۔ زہرہ تمھارے لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہے۔ میں کل ہی جالپا کو تلاش کروں گی۔ وہ یہاں رہنا چاہیں گی تو ان کے آرام کا سامان مہیا کردوں گی۔ جانا چاہیں گی تو ریل پر بٹھا دوں گی۔

رما نے بڑی عاجزی سے کہا۔ ایک بار میں اس سے مل لیتا۔ تو میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا۔

زہرہ نے فکرمند ہوکر کہا۔ یہ تو مشکل ہے۔ تمھیں یہاں سے کون جانے دے گا۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے میں جالپا کو پارک میں کھڑی کر آؤں۔ تم ڈپٹی صاحب کے ساتھ وہاں جاؤ اور کسی بہانے سے اس سے مل لو۔

رما کچھ کہنا چاہتا تھا کہ داروغہ جی نے پکارا۔ مجھے بھی خلوت میں آنے کی اجازت ہے۔

دونوں سنبھل بیٹھے اور دروازہ کھول دیا۔ داروغہ جی مسکراتے ہوئے آئے۔ اور زہرہ کی بغل میں بیٹھ کر بولے۔ یہاں آج سناٹا کیسا؟ کیا آرج خزانہ خالی ہے؟ زہرہ! آج اپنے دستِ حنائی سے ایک جام بھر دو۔ رما ناتھ بھائی جان ناراض نہ ہونا۔

رما نے ترش ہوکر کہا۔ اس وقت رہنے دیجیے۔ داروغہ جی آپ تو پیے ہوئے نظر آتے ہیں۔

داروغہ نے زہرہ کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ بس ایک جام زہرہ۔ اور پھر ایک رات اور آج میری مہمانی قبول کرو۔

رما نے گرم ہوکر کہا۔ آپ اس وقت یہاں سے چلے جائیں۔ میں یہ گوارا نہیں کرسکتا۔

دونوں آدمیوں میں حجت ہونے لگی۔ داروغہ کا اصرار تھا کہ زہرہ اس کے ساتھ جائے۔ رما کہتا تھا۔ اس وقت وہ ہرگز نہیں جاسکتی۔ اگر وہ گئی تو میں اس کا اور آپ کا دونوں کا خون پی جاؤں گا۔ آخر داروغہ صاحب نے زہرہ کا ہاتھ پکڑکر اپنی طرف کھینچا۔ رما اب ضبط نہ کرسکا۔ اس نے داروغہ کو دھکا دے کر باہر نکال دیا اور دروازہ بند کر کے کنڈی لگا دی۔ داروغہ مضبوط آدمی تھا۔ لیکن اس وقت نشہ نے اُسے کمزور کردیا تھا۔ باہر برآمدہ میں کھڑے ہوکر گالیاں بکنے اور دروازہ پر ٹھوکریں مارنے لگا۔

رما نے زہرہ سے کہا۔ کہو تو جاکر بچہّ کو برآمدے کے نیچے دھکیل دوں!

زہرہ۔ بکنے دو۔ آپ ہی چلا جائے گا۔ شاید چلا گیا۔ تم نے بہت اچھا کیا کہ سُور کو نکال باہر کیا۔ مجھے لے جاکر دق کرتا۔

زہرہ۔ اور جو وہ کل سے مجھے نہ آنے دے۔

رما۔ اگر اس نے ذرا بھی شرارت کی۔ تو گولی ماردوں گا۔ وہ دیکھو۔ طاق پر پستول رکھا ہوا ہے۔ تم اب میری ہو زہرہ! میں نے اپنا سب کچھ تمھارے قدموں پر نثار کر دیا۔ کسی دوسرے آدمی کو ہمارے بیچ میں آنے کا حق نہیں ہے۔ جب تک میں نہ مر جاؤں۔

(۴۸)

رما سارا دن بے تاب رہا۔ کبھی مایوسی کی اندھیری گھاٹیاں سامنے آجاتیں۔ کبھی اُمید کی لہراتی ہوئی ہریالی۔ زہرہ جالپا کی تلاش میں گئی بھی ہوگی۔ یہاں سے تو بڑے لمبے چوڑے وعدے کرکے گئی تھی۔ مگر اُسے کیا غرض ہے۔ آکر کہہ دے گی ملاقات ہی نہیں ہوئی۔ کہیں جاکر ڈپٹی صاحب سے سارا راز فاش کردے تو بے چاری جالپا پر بیٹھے بٹھائے آفت آجائے۔ مگر زہرہ اتنی سفلہ مزاج نہیں ہے۔ اگر زہرہ جیسی عورت اتنی بے وفا ہوسکتی ہے تو یہ دُنیا رہنے کے قابل نہیں۔ رما کو وہ دن یاد آئے جب اس کے دفتر سے آتے ہی جالپا اس کی جیب ٹٹولتی تھی اور روپے نکال لیتی تھی۔ وہ جالپا آج اتنی پاک نفس ہوگئی۔ تب وہ پیار کرنے کی چیز تھی۔ اب وہ پرستش کی چیز ہے۔

رما کو اپنی اس غلطی پر افسوس ہورہا تھا، جو اس نے جالپا کی بات نہ مان کرکے کی تھی۔ اگر اس نے اس کی مرضی کے مطابق جج کے اجلاس میں اپنا بیان بدل دیا ہوتا، دھمکیوں میں نہ آتا، تو اس کی یہ حالت کیوں ہوتی۔ جالپا کے ساتھ وہ ساری مصیبتیں جھیل لے جاتا۔ اس محبت اور عقیدت کا خُود پہن کر وہ مخالفوں کا کامیابی سے مقابلہ کرتا۔ اگر اسے پھانسی بھی ہوجاتی، تو وہ ہنستے کھیلتے اس پر چڑھ جاتا۔

مگر پہلے اس سے چاہے جو غلطی ہوئی ہو۔ اس وقت تو وہ غلطی سے نہیں جالپا کی خاطر سے یہ تکلیف جھیل رہا تھا۔ آخر پولیس والوں کے دل میں اپنا اعتبار پیدا کرنے کے لیے وہ اور کیا کرتا۔ یہ شیطان جالپا کو ستاتے۔ اس کو رسوا کرتے۔ اس پر جھوٹے مقدمہ چلاتے۔ وہ حالت تو اور بھی نا قابلِ برداشت ہوتی۔ وہ خود پست ہمّت ہے اور ذلّت برداشت جالپا شاید جان ہی دے دیتی۔

اسے آج معلوم ہوا کہ وہ جالپا کو ترک نہیں کرسکتا اور زہرہ کو ترک کرنا بھی اس

کے لیے محال معلوم ہوتا تھا۔ کیا وہ دونوں کو خوش رکھ سکتا ہے۔ کیا ان حالات میں جالپا اس کے ساتھ رہنا قبول کرے گی۔ ہرگز نہیں۔ وہ شاید کبھی اسے معاف نہ کرے گی۔ جالپا کو اگر یہ بھی معلوم ہوجائے کہ رما اس کی خاطر اذیتیں بھوگ رہا ہے تو بھی وہ اسے الزام سے سبکدوش نہ کرے گی۔

وہ دن بھر اسی ادھیڑبُن میں پڑا رہا۔ نہانے اور کھانے کا وقت ٹل گیا۔ اُسے کسی بات کی پرواہ نہ تھی۔ اخبار سے دل بہلانا چاہا۔ ناول لے کر بیٹھا۔ مگر کسی کام میں دل نہ لگا۔ آج داروغہ جی بھی نہیں آئے۔ یا تو رات کے واقعہ سے ناراض ہوگئے، یا نادم۔ رما نے کسی سے اس کے متعلق پوچھا بھی نہیں۔

رات کے دس بج گئے۔ مگر زہرہ کا کہیں پتہ نہ تھا۔ پھاٹک بند ہوگیا۔ رما کو اب اس کے آنے کی امید نہ رہی۔ پھر بھی دروازے کی طرف اس کے کان لگے ہوئے تھے۔ کیا جالپا اُسے ملی ہی نہیں۔ یا وہ وہاں گئی ہی نہیں۔ اس نے ارادہ کیا کہ اگر کل زہرہ نہ آئی تو کسی کو اس کے گھر بھیجے گا۔

علی الصبح وہ داروغہ کے پاس جاکر بولا۔ پرسوں رات تو آپ آپنے ہوش و حواس میں نہ تھے۔

داروغہ نے حسد کو چھپاتے ہوئے کہا۔ میں محض آپ کو چھیڑ رہا تھا۔

رما۔ زہرہ رات آئی ہی نہیں۔ ذرا کسی کو بھیج کر پتہ تو لگوایئے۔ ماجرا کیا ہے؟

داروغہ نے بے اعتنائی سے کہا۔ اُسے غرض ہوگی۔ خود آئے گی۔ کسی کو بھیجنے کی ضرورت نہیں ہے۔

ایک ہفتہ تک زہرہ سے اس کی ملاقات نہ ہوئی۔ اب اس کے آنے کی کوئی امید نہ تھی۔ رما نے سوچا۔ آخر بے وفا نکلی۔ یا ممکن ہے پولیس والوں نے اسے آنے کی ممانعت کردی ہو۔ کم سے کم مجھے ایک خط تو لکھ سکتی تھی۔ مگر اس کا ضمیر کہتا تھا کہ زہرہ بے وفائی نہیں کرسکتی۔

آٹھواں دن تھا۔ آج ایک بہت اچھا فلم ہونے والا تھا۔ داروغہ نے آکر رما سے کہا۔ تو وہ چلنے کو تیار ہوگیا۔ کپڑے پہن رہا تھا کہ زہرہ آپہنچی۔ رما نے آنکھ اُٹھا کر دیکھا۔ پھر آئینہ میں اپنے بال سنوارنے لگا۔ مگر اسے دیکھ کر تعجب ہوا کہ زہرہ محض ایک سفید ساڑھی

پہنے ہوئے ہے۔ ایک بھی زیور اس کے جسم پر نہ تھا۔ ہونٹ سُوکھے ہوئے تھے اور چہرے
پر معشوقانہ شوخی کی جگہ متانت جھلک رہی تھی۔
وہ ایک منٹ تک کھڑی رہی۔ تب رما کے پاس جاکر بولی۔ کیا مجھ سے ناراض ہوگئے
حضور! اس لیے کہ میں اتنے دنوں آئی کیوں نہیں۔
رما نے رُوکھے پن سے جواب دیا۔ اگر تم اب بھی نہ آتیں۔ تو میرا کیا اختیار تھا۔
زہرہ نے مسکرا کر کہا۔ یہ اچھی دل لگی ہے۔ آپ ہی نے تو ایک کام سونپا اور جب
وہ کام کر کے لوٹی۔ تو آپ بگڑ بیٹھے۔ وہ کام تم نے آسان سمجھا تھا کہ چٹکیوں میں پُورا
ہو جاتا۔ تم نے مجھے اس عورت کے پاس بھیجا تھا۔ جو اوپر سے موم ہے اور اندر سے پتھر
جو اتنی نازک ہوکر بھی اتنی مضبوط ہے۔
رما نے بے توجہی سے پُوچھا، ہے کہاں۔ کیا کرتی ہے؟
زہرہ۔ اسی دنیش کے گھر ہے جسے پھانسی کی سزا ہوگئی ہے۔ اس کے دو بچّے ہیں۔ بیوی ہے
اور ماں ہے۔ دن بھر انھیں بچّوں کو لیے رہتی ہے۔ بُڑھیا کے لیے ندی سے پانی
لاتی ہے۔ گھر کا سارا کام کاج کرتی ہے۔ اور جب فرصت پاتی ہے تو ان کے لیے
چندہ مانگنے نکل جاتی ہے۔ وہ خاندان بڑی تکلیف میں تھا۔ کوئی مددگار نہ تھا۔ دوست
سبھی مُنہ پھیر بیٹھے تھے۔ کئی فاقے تک ہوچکے تھے۔ جالپا نے جاکر انھیں جلا لیا۔
رما کی ساری بے دلی کافور ہوگئی۔ جوتے پہننا بھول گیا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ تم کھڑی
کیوں ہو۔ بیٹھ جاؤ۔ شروع سے کہو۔ ایک بات بھی مت چھوڑنا۔ تم پہلے اس کے پاس کیسے
پہنچیں۔ کیسے پتہ چلا؟
زہرہ۔ کچھ نہیں۔ پہلے اس دیبی دین کے گھر گئی۔ اس نے دنیش کے گھر کا پتہ بتا دیا۔ بس
وہاں جا پہنچی۔
رما۔ تم نے اسے جاکر پکارا۔ تمھیں دیکھ کر کچھ جھجکی تو ضرور ہوگی۔
زہرہ مسکرا کر بولی۔ میں اس شکل میں نہ تھی۔ دیبی دین کے گھر سے نکل کر میں
اپنے گھر گئی اور برہم سماج عورت کا سوانگ بھرا۔ نہ جانے مجھ میں ایسی کون سی بات ہے
جس سے دوسرے فوراً بھانپ جاتے ہیں کہ میں کون ہوں اور کیا ہوں۔ اور براہمنوں
لیڈیوں کو دیکھتی ہوں۔ کوئی ان کی طرف آنکھیں نہیں اُٹھاتا۔ میرا لباس وہی ہے۔ میں

بھڑکیلے کپڑے اور زیور بالکل نہیں پہنتی۔ پھر بھی سب لوگ میری طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑکر دیکھتے ہیں۔ میری اصلیت نہیں چھپتی۔ مجھے یہی خوف تھا کہ کہیں جالپا بھانپ نہ جائے۔ نیا سوانگ بھر کر میں وہاں پہنچی۔ تو وہ کیا کوئی بھی نہ پہچان سکتا تھا۔ میں نے دنیش کے گھر جاکر اس کی ماں سے بات چیت شروع کی۔ اپنا گھر منگیر بتلایا۔ بچوں کے لیے مٹھائی لیتی گئی تھی۔ دونوں عورتیں رونے لگیں۔ اسی اثنا میں جالپا بھی گنگا جل لیے آ پہنچی۔ میں نے دنیش کی ماں سے بنگلہ میں پوچھا۔ یہ کون ہے۔ اس نے کہا۔ یہ بھی تمھاری ہی طرح ہم لوگوں کے غم میں شریک ہونے کے لیے آگئی ہے۔ یہاں اس کا شوہر کسی دفتر میں نوکر ہے۔ روز سویرے آجاتی ہے اور بچوں کو گھمانے لے جاتی ہے۔ میرے لیے روز ندی سے گنگا جل لاتی ہے۔ ہمارے کوئی آگے پیچھے نہ تھا۔ بچے دانے دانے کو ترستے تھے۔ جب سے یہ آگئی ہیں ہمیں کوئی تکلیف نہیں ہے۔ ہم نے نہ جانے کون سی تپیا کی تھی۔ جس کا یہ بردان ہمیں ملا ہے۔ شام ہوگئی تھی۔ جالپا دیوی نے دونوں بچوں کو ساتھ لیا اور پارک کی طرف چلیں۔ میں جو مٹھائی لے گئی تھی اس میں سے بڑھیا نے ایک ایک مٹھائی دونوں بچوں کو دی۔ دونوں خوش ہوکر ناچنے لگے۔ بچوں کی اس خوشی پر مجھے رونا آگیا۔ جب پارک میں دونوں بچے کھیلنے لگے تو جالپا سے میری باتیں ہونے لگیں۔

رما نے کرسی اور قریب کھینچ لی اور آگے کو جھک گیا۔ بولا۔ کس طرح بات چیت شروع کی؟

زہرہ۔ کہہ رہی ہوں۔ میں نے پوچھا۔ جالپا دیوی گھر کی دونوں عورتوں سے تمھاری تعریف سُن کر میں تمھارے اُوپر عاشق ہوگئی ہوں۔

رما۔ بالکل یہی الفاظ تھے؟

زہرہ۔ بالکل یہی۔ میری طرف تعجب سے دیکھ کر بولیں۔ تم بنگالی نہیں معلوم ہوتیں اتنی صاف ہندی کوئی بنگالن نہیں بولتی۔ میں نے کہا۔ میں منگیر کی رہنے والی ہوں اور یہاں مسلمان عورتوں سے میری بہت آمد و رفت ہے۔ آپ سے ملنے کو جی چاہتا ہے۔ آپ کہاں رہتی ہیں؟ کبھی کبھی دو گھڑی کے لیے چلی آؤں گی۔ تمھاری محبت میں شاید میں بھی آدمی بن جاؤں۔

جالپا نے شرما کر کہا۔ تم تو مجھے بنانے لگیں بہن۔ کہاں تم کالج کے پڑھنے والی۔

کہاں میں جاہل۔ گنوار عورت تم سے مل کر میں البتہ آدمی بن جاؤں گی۔ جب جی چاہے یہیں چلی آنا۔ یہیں میرا گھر سمجھو۔

میں نے کہا۔ تمھارے شوہر بہت شریف معلوم ہوتے ہیں کہ تمھیں آزادی دے رکھی ہے۔ کس دفتر میں ہیں؟

جالپا نے اپنے ناخنوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ پولیس میں اُمیدوار ہیں۔

میں نے تعجب سے پُوچھا۔ پولیس میں رہتے ہوئے بھی انھوں نے تمھیں یہاں آنے کی آزادی دے دی؟

جالپا اس سوال کے لیے تیار نہ تھی۔ کچھ چونک کر بولی۔ وہ مجھ سے کچھ نہیں کہتے۔ میں نے ان سے یہاں آنے کا کبھی ذکر ہی نہیں کیا۔ وہ گھر بہت کم آتے ہیں۔ وہیں پولیس والوں کے ساتھ رہتے ہیں۔

میں نے پُوچھا۔ تم اپنے شوہر کے ذریعے سے میری ملاقات اس مُخبر سے کرا سکتی ہو۔ جس نے ان بے گناہوں کے خلاف شہادت دی۔

رما ناتھ کی آنکھیں فرطِ اشتیاق سے پھیل گئیں اور چھاتی دھک دھک کرنے لگی۔

زہرہ نے پھر اپنا قصہ کہنا شروع کیا۔ یہ سن کر جالپا دیوی نے مجھے تیز نگاہوں سے دیکھ کر پُوچھا۔ اس سے مل کر کیا کروگی۔

میں نے کہا۔ مَیں اس بھلے آدمی سے صرف اتنا پوچھنا چاہتی ہوں کہ تم نے اتنے بے گناہوں کو پھنسا کر کیا پایا۔ صرف یہ دیکھنا چاہتی ہوں کہ وہ کیا جواب دیتا ہے۔

جالپا کا چہرہ یکایک سرخ ہوگیا۔ بولیں۔ وہ کہہ سکتا ہے۔ میرا فائدہ اسی میں تھا ساری دنیا اپنے فائدے کے لیے مرتی ہے۔ میں نے بھی اپنا فائدہ اس میں سوچا۔ جب پولیس کے سدہا آدمیوں سے یہ سوال کوئی نہیں کرتا تو اسی غریب سے یہ سوال کیوں کیا جائے۔

میں نے پوچھا۔ اچھا ذرا دیر کے لیے فرض کرلو۔ تمھارا شوہر ہی مُخبر ہوتا تو تم کیا کرتیں؟

جالپا نے میری طرف سہمی نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ تم مجھ سے یہ سوال کیوں کرتی ہو۔ خود اپنے دل میں اس کا جواب کیوں نہیں ڈھونڈتیں۔

میں نے کہا۔ میں تو ان سے کبھی نہ بولتی۔ نہ کبھی ان کی صورت دیکھتی۔

جالپا نے دو رنگے پن سے جواب دیا۔ شاید میں بھی ایسا ہی سمجھتی یا ممکن ہے نہ سمجھتی۔ کچھ کہہ نہیں سکتی۔ آخر پولیس والوں کے گھروں میں بھی تو عورتیں ہیں۔ وہ کیوں اپنے شوہروں سے کچھ نہیں کہتیں۔ جس طرح ان کے دل اپنے مردوں کے لیے ہوگئے ہیں۔ ممکن ہے میرا دل بھی ویسا ہی ہو جاتا۔

اتنے میں اندھیرا ہوگیا۔ جالپا دیوی نے کہا۔ اب مجھے دیر ہورہی ہے۔ بہن! بچے ساتھ ہیں۔ ممکن ہو تو کل پھر ملیے گا۔ آپ کی بات نہایت دلچسپ ہوتی ہیں۔

میں چلنے لگی۔ تو انھوں نے چلتے چلتے مجھ سے کہا۔ ضرور آیئے گا۔ میں یہیں ملوں گی۔ آپ کا انتظار کرتی رہوں گی۔ ہاں میں نے آپ کا نام تو پوچھا ہی نہیں۔

میں نے اپنا نام بتلا دیا۔

رما نے کہا۔ یہ تم نے بڑا غضب کیا۔

زہرہ بولی۔ نام بتلانے میں کیا ہرج تھا۔ پہلے تو وہ چونکیں۔ مگر شاید سمجھ گئیں۔ بنگالی مسلمان ہوگی۔ جب وہ چلنے لگیں۔ تو میں نے کہا۔ آپ سے باتیں کر کے ابھی سیری نہیں ہوئی۔ اگر کوئی ہرج نہ سمجھو۔ تو میں بھی تمھارے گھر تک چلوں۔ راستہ میں باتیں ہوں گیں۔ جالپا راضی ہوگئیں۔ ہم دونوں چلے۔ اس ذرا سے کنگھرے میں نہ جانے وہ کیوں کر رہتی ہیں۔ تل رکھنے کی بھی جگہ نہیں ہے۔ کہیں مٹکے ہیں۔ کہیں کھاٹ۔ کہیں صندوق۔ نمی سے دیواریں تر ہو رہی تھیں اور تعفن کے مارے ناک پھٹی جاتی تھی۔ کھانا تیار ہوگیا تھا۔ دنیش کی بیوی برتن دھو رہی تھی۔ جالپا دیوی نے اسے اٹھا کر کہا۔ بچوں کو کھلا کر سلا دو۔ میں برتن دھوئے دیتی ہوں۔ ان کی اس بے نفسی کا میرے دل پر اتنا گہرا اثر ہوا کہ میں بھی وہیں بیٹھ گئی۔ اور مانجھے ہوئے برتنوں کو دھونے لگی۔

جالپا نے میرے ہاتھوں برتن چھین لینا چاہے۔ لیکن جب میں اپنی جگہ سے نہ ہلی تو انھوں نے پانی کا مٹکا الگ ہٹا کر کہا۔ میں پانی نہ دوں گی۔ تم یہاں سے اُٹھ جاؤ۔ مجھے بڑی شرم آتی ہے۔ تمھیں میری قسم ہٹ جاؤ۔ تم نے اپنی زندگی میں ایسا کام کاہے کو کیا ہوگا۔

میں نے کہا۔ تم نے بھی تو نہیں کیا ہوگا۔

جالپا نے کہا۔ میری اور بات ہے۔ میں نے پوچھا۔ کیوں جو بات تمھارے لیے ہے وہی بات میرے لیے ہے۔ کوئی مہری کیوں نہیں رکھ لیتی۔ جالپا نے کہا۔ مہریاں آٹھ آٹھ

روپے مانگتی ہیں۔ میں بولی۔ میں آٹھ روپے مہینہ دیا کروں گی۔

جالپا نے ایسی نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ جس میں سچی محبت کے ساتھ سچی خوشی اور دعائے خیر بھری ہوئی تھی۔ کتنی پاکیزہ نگاہ ہے اس کی۔ اس بے غرض خدمت کے سامنے مجھے اپنی زندگی کتنی حقیر کتنی قابلِ نفرت معلوم ہو رہی تھی۔ ان برتنوں کے دھونے میں مجھے جو لطف آیا۔ اُسے بیان نہیں کرسکتی۔ برتن دھونے کے بعد جالپا دیوی بڑھیا کے پاؤں دبانے بیٹھ گئیں۔ میں کھڑی یہ پاک نظارہ دیکھ رہی تھی۔

نو بجے ہم دونوں وہاں سے چلے۔ راستے میں جالپا نے کہا۔ زہرہ تم سمجھتی ہو گی۔ میں ان لوگوں کی یہ خدمت کر رہی ہوں۔ یہ بات نہیں ہے۔ میں دراصل اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کر رہی ہوں۔ مجھ سے زیادہ بدنصیب عورت دُنیا میں نہ ہو گی۔

میں نے انجان بن کر کہا۔ اس کا مطلب میں نہیں سمجھی۔

جالپا نے پُرحسرت لہجے میں کہا۔ کبھی موقعہ آئے گا تو بتا دوں گی۔

میں نے کہا۔ تم مجھے چکر میں ڈالے دیتی ہو بہن۔ جب تک اس کا مطلب نہ سمجھا دو گی۔ میں تمھارا گلہ نہ چھوڑوں گی۔

جالپا نے لمبی سانس کھینچ کر کہا۔ زہرہ! کسی بات کو خود چھپائے رہنا اس سے زیادہ آسان ہے کہ دوسروں پر وہ بوجھ رکھوں۔

کچھ دور تک ہم دونوں خاموش چلتے رہے۔ یکایک جالپا نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ زہرہ اگر اس وقت تمھیں معلوم ہوجائے کہ میں کون ہوں تو شاید تم نفرت سے منہ پھیر لو گی اور میرے سائے سے دُور بھاگو گی۔

ان الفاظ میں خدا جانے کیا جادو تھا کہ میرے سارے روئیں کھڑے ہوگئے۔ یہ ایک رنج اور شرم سے بھرے ہوئے دل کی نورانی صدا تھی۔ جس نے میرے سیاہ کارناموں کو واضح کردیا۔ میرے جی میں ایسا آیا کہ اپنا سارا سوانگ کھول دوں۔ میں نے بڑے بڑے گرگ باراں دیدہ اور چھپے ہوئے شہدوں اور پولیس افسروں کو چرٹٹو بنایا ہے مگر جالپا دیوی کے سامنے میرے منہ سے آواز تک نہ نکلتی تھی۔ معلوم نہیں کس طرح میں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ بولی یہ تمھارا خیال غلط ہے دیوی جی۔ شاید تب میں تمھارے پیروں پر گر پڑوں گی۔ اپنی یا اپنوں کی برائیوں پر شرمندہ ہونا پاک نفسوں ہی کا کام ہے۔

جالپا نے کہا۔ تو کلیجہ مضبوط کرکے سن لو کہ میں اس مُخبر کی بدنصیب بیوی ہوں۔ جس نے ان بے گناہوں پر یہ آفت ڈھائی ہے۔ ہم لوگ الہ آباد کے رہنے والے ہیں۔ ایک ایسا واقعہ ہوا کہ انھیں وہاں سے بھاگنا پڑا۔

رما نے کہا۔ اس کا تو قصہ کبھی تم سے بتاؤں گا۔

زہرہ بولی۔ یہ سب مجھے دوسرے دن معلوم ہوگیا۔ اب میں تمھاری رگ رگ سے واقف ہوں۔ جالپا نے اپنی کوئی بات شاید ہی مجھ سے چھپائی ہو۔ کہنے لگی۔ زہرہ میں بڑی مصیبت میں گرفتار ہوں۔ ایک طرف تو ایک آدمی کی جان اور کئی خاندانوں کی تباہی ہے۔ دوسری طرف اپنی ذلت اور رسوائی ہے۔ میں چاہوں تو آج ان سبھوں کی جان بچا سکتی ہوں۔ میں عدالت کو ایسا ثبوت دے سکتی ہوں کہ مخبر کی شہادت کی کوئی وقعت ہی نہ رہ جائے۔ بس اسی ذبدھے میں پڑی اپنے نصیبوں کو رو رہی ہیں۔ نہ تو یہی ہوسکتا ہے کہ ان لوگوں کو مرنے دوں اور نہ یہی ہوسکتا ہے کہ رما کو آگ میں جھونک دوں۔ میں خود مرجاؤں گی پر انھیں ایذا نہیں پہنچا سکتی۔ ابھی دیکھ رہی ہوں۔ ہائیکورٹ سے کیا فیصلہ ہوتا ہے۔ نہیں کہہ سکتی۔ اس وقت میں کیا کر بیٹھوں۔ شاید اسی دن زہر کھا کر سو رہوں۔

وہیں دین کا گھر آگیا۔ ہم دونوں رخصت ہوئے۔ جالپا نے مجھ سے بہت اصرار کیا کہ کل اسی وقت پھر آنا۔ انھیں صرف شام کو باتیں کرنے کی فرصت ملتی ہے۔ وہ اتنے روپے جمع کردینا چاہتی ہیں کہ کم سے کم دنیش کے گھر والوں کو کوئی تکلیف نہ ہو۔ ایک ہزار سے زیادہ جمع کرچکی ہیں۔ میں نے بھی پچیس روپے ان کی نذر کیے۔ میں نے دو ایک بار کنایتاً کہا کہ آپ اس زحمت میں نہ پڑیں۔ لیکن جب جب میں نے اس کا اشارہ کیا۔ اُنھوں نے ایسا منہ بنایا۔ گویا اب وہ یہ بات سُننا بھی نہیں چاہتیں۔

ذرا دم لے کر زہرہ نے پھر کہا۔ میں نے ایک بات سوچی ہے۔ کہو تو بتاؤں؟

رما نے اس طرح سے کہا۔ گویا اس کا دھیان کہیں اور ہے۔ کیا بات ہے۔

زہرہ۔ انسپکٹر صاحب سے کہہ دوں۔ وہ جالپا کو الہ آباد پہنچا دیں۔ بس۔ عورتیں اسٹیشن تک انہی باتوں میں لگا لے جائیں۔ جوں ہی گاڑی چلے انھیں اس میں بٹھا دیں۔ اس کے سوا اور کوئی تدبیر مجھے نظر نہیں آتی۔

رما نے زہرہ کی آنکھوں سے آنکھیں ملا کر کہا۔ کیا یہ مناسب ہوگا۔

زہرہ شرمندہ ہوکر بولی اور کیا کیا جائے۔

رما نے چٹ پٹ جوتے پہن لیے اور زہرہ سے پوچھا۔ اس وقت وہ دیبی دین کے ہی گھر پر ہوں گی؟

زہرہ نے اس کا راستہ روک کر کہا۔ تو کیا اسی وقت جاؤ گے؟

رما۔ ہاں زہرہ! اسی وقت جاؤں گا۔ بس ان سے دو باتیں کرنے وہیں جاؤں گا جہاں مجھے اب سے بہت پہلے جانا چاہیے تھا۔

زہرہ۔ مگر کچھ سوچ تو لو۔ نتیجہ کیا ہوگا۔

رما۔ خوب سوچ چکا۔ زیادہ سے زیادہ دروغ بیانی کے جرم میں تین چار سال قید۔ بس اب رخصت! بھول مت جانا زہرہ! شاید پھر کبھی ملاقات ہو۔

رما برآمدے سے اُتر کر صحن میں آیا اور ایک لمحہ میں پھاٹک کے باہر تھا۔ زہرہ بے حس و حرکت کھڑی اسے حسرت بھری آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ رما پر اس کا دل کبھی اتنا فریفتہ نہ ہوا تھا۔ جیسے کوئی ناگن اپنے محبوب کو میدانِ کارزار کی طرف جاتے دیکھ کر غرور سے پھولی نہ سماتی ہو۔

چوکیدار نے لپک کر داروغہ سے یہ خبر کہی۔ بے چارے کھانا کھا کر لیٹے ہی تھے۔ گھبرا کر نکلے اور رما کے پیچھے دوڑے۔ بابو صاحب ذرا سنیے تو۔ ایک منٹ رُک جایئے۔ اس سے کیا فائدہ کچھ معلوم تو ہو۔ آپ کہاں جا رہے ہیں۔ آخر بے چارے ٹھوکر کھا کر گر پڑے۔ رما نے لوٹ کر انھیں اُٹھایا اور پوچھا۔ کہیں چوٹ تو نہیں آئی۔

داروغہ۔ نہیں ذرا ٹھوکر کھا گیا تھا۔ آخر آپ اس وقت کہاں جا رہے ہیں۔ سوچیے تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔

رما نے داروغہ کو چکمہ دیتے ہوئے کہا۔ جالپا کو شاید مخالفوں نے پٹی پڑھائی ہے کہ تو ہائی کورٹ میں ایک درخواست دے دے ذرا اسے جاکر سمجھاؤں گا۔

داروغہ نے پوچھا۔ یہ آپ کو کیسے معلوم ہوا۔

"زہرہ کہیں سُن آئی ہے۔"

"تمھاری بیوی ہوکر تمھارے ساتھ اتنی دغا۔ ایسی عورت کا سر کاٹ لینا چاہیے۔"

اسی لیے تو جا رہا ہوں یا تو اسی وقت اسے اسٹیشن پر بھیج کر آؤں گا یا اس سے بُری

طرح پیش آؤں گا کہ وہ بھی یاد کرے گی۔

"میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔"

"جی نہیں۔ بالکل معاملہ بگڑ جائے گا۔"

داروغہ لاجواب ہوگیا۔ ایک منٹ تک کھڑا کچھ سوچتا رہا۔ پھر لوٹ پڑا۔ اُدھر رما نے ایک تانگہ لیا۔ اور دیبی دین کے گھر جا پہنچا۔

تھوڑی دیر قبل جالپا دنیش کے گھر سے پہنچی تھی کہ اتنے میں رما نے نیچے سے آواز دی۔ دیبی دین نے کہا۔ بھیا ہیں شاید۔

جالپا۔ کہہ دو۔ یہاں کیا کرنے آئے ہیں۔ وہیں جائیں۔

دیبی۔ نہیں۔ نہیں۔ ذرا پوچھ تو لوں۔ کیا کہتے ہیں۔ اتنی رات گئے انھیں چھٹی کیسے ملی۔

جالپا۔ مجھے سمجھانے آئے ہوں گے اور کیا۔ لیکن منہ دھو رکھیں۔

دیبی دین نے دروازہ کھول دیا۔ رما نے اندر آکر کہا۔ دادا، تم مجھے یہاں دیکھ کر اس وقت تعجب کر رہے ہوگے۔ ایک گھنٹے کی چُھٹی لے کر آیا ہوں۔ تم لوگوں سے اپنے بہت سے گناہوں کو معاف کرانا تھا۔ جالپا اُوپر ہیں۔

دیبی دین۔ ہاں ہیں تو۔ ابھی آئی ہیں۔ بیٹھو کچھ کھانے کو لاؤں۔

رما۔ نہیں میں کھانا کھا چکا ہوں۔ بس جالپا سے دو دو باتیں کرنا چاہتا ہوں۔

دیبی۔ جب وہ تم سے ملیں بھی۔

رما۔ کیا میری صورت سے اتنی نفرت ہے۔ ذرا پوچھ تو لو۔

دیبی۔ اس میں پوچھنا کیا ہے۔ دونوں بیٹھی تو ہیں۔ جاؤ۔ تمھارا گھر جیسے تب ویسے اب ہے۔

رما۔ نہیں دادا۔ ان سے پوچھ لو۔ میں یوں نہ جاؤں گا۔

دیبی دین نے اوپر جاکر کہا۔ تم سے کچھ کہنا چاہتے ہیں بہو۔

جالپا نے منہ لٹکا کر کہا تو کہتے کیوں نہیں۔ کیا میں نے ان کی زبان بند کردی ہے؟

جالپا نے یہ الفاظ اتنے زور سے کہے کہ نیچے رما بھی سُن لیے۔ کتنے دل آزار الفاظ تھے۔ رما کا سارا شوق ملاقات غائب ہوگیا۔ نیچے ہی کھڑے کھڑے بولا۔ وہ اگر مجھ سے نہیں بولنا چاہتی تو کوئی زبردستی نہیں ہے۔ میں اس وقت جج صاحب کے پاس جا رہا ہوں۔ ان سے سارا قصہ کہوں گا۔ میری عقل پر پردہ پڑا ہوا تھا۔ جان کی محبت اور تکلیفوں کے

خوف نے میری عقل میں فتور ڈال دیا تھا۔ جیسے کوئی نحوست سر پر سوار تھی۔ تم لوگوں کی دعاؤں نے وہ نحوست دُور کردی۔ شاید دو چار سال کے لیے سرکار کی مہمانی قبول کرنی پڑے۔ جیتا رہا تو پھر ملاقات ہوگی۔ نہیں تو میری بُرائیوں کو معاف کرنا اور بھول جانا۔ تم بھی دادا اور اماں تم بھی میرے قصوروں کو معاف کرنا۔ تم لوگوں نے میرے ساتھ جو احسانات کیے ہیں۔ اگر جیتا لوٹا تو شاید تم لوگوں کی کوئی خدمت کرسکوں۔ میری تو زندگی خراب ہوگئی۔ نہ دین کا ہوا نہ دُنیا کا۔ جالپا دیوی سے یہ بھی کہہ دینا کہ میں نے ہی ان کے زیور چرائے تھے۔ صراف کو دینے کے لیے روپوں کی ضرورت تھی۔ اس لیے مجھ کو یہ فعل کرنا پڑا۔ بس یہی کہنے آیا تھا۔

رما برآمدے کے نیچے اُتر پڑا اور تیزی سے قدم اُٹھاتا ہوا چل دیا۔ جالپا بھی نیچے اُتری۔ لیکن رما کا پتہ نہ تھا۔ برآمدے کے نیچے اُتر کر دیبی دین سے پُوچھا۔ کدھر گئے ہیں دادا!

دیبی دین نے کہا۔ میں نے کچھ نہیں دیکھا ہے بہو! میری آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ وہ اب نہ ملیں گے دوڑے گئے ہیں۔

جالپا کئی منٹ تک سڑک پر بے خودی کی سی حالت میں کھڑی رہی۔ انھیں کیسے روک لے۔ اس وقت وہ کتنے مایوس ہیں۔ وہ پچھتا رہی تھی کہ انھیں ذرا دیر کے لیے اُوپر کیوں نہ بلا لیا۔ آئندہ کا حال کون جانتا ہے۔ نہ جانے کب ملاقات ہو یا نہ ہو۔ شادی ہونے کے اس دو ڈھائی سال کے اندر کبھی اس کا دل محبت سے اتنا بے تاب نہ ہوا تھا۔ نمود اور آسائش کے جنون میں اس نے خانۂ محبت کی دیواروں کو ہی دیکھا تھا۔ وہ اسی میں خوش تھی۔ رفیق حیات بن کر اس نے خانۂ محبت کے اندر قدم رکھا تھا۔ کتنا دل فریب نظارہ تھا۔ کتنی دل آویز نکہت جہاں کی ہوا میں، روشنی میں اور فضا میں تقدس کی جھلک تھی۔ محبت اپنی معراج پر پہنچ کر پرستش بن جاتی ہے۔

اتنے میں زہرہ آگئی۔ جالپا کو سڑک پر دیکھ کر بولی۔ یہاں کیسے کھڑی ہو جالپا۔ آج تو میں نہ آسکی۔ چلو آج مجھے تم سے بہت کچھ باتیں کرنی ہیں۔

(۴۹)

داروغہ کو بھلا کہاں چین۔ رما کے جانے کے بعد ایک گھنٹہ تک اس کا انتظار کرتے

رہے۔ پھر گھوڑے پر سوار ہوئے اور دینی دین کے گھر جا پہنچے۔ وہاں معلوم ہوا کہ رما کو یہاں سے گئے آدھ گھنٹے سے اُوپر ہوگیا۔ انھیں اعتبار نہ آیا۔ پہلے نیچے کی کوٹھری دیکھی۔ پھر اُوپر چڑھ گئے۔ سمجھا رما وہاں چُھپا بیٹھا ہوگا۔ وہاں تین عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ زہرہ کو شرارت سُوجھی۔ تو اس نے لمبا سا گھونگھٹ نکال لیا اور اپنے ہاتھ ساڑھی میں چُھپا لیے۔ داروغہ کو شک ہوا۔ شاید رما بھیس بدلے ہوئے بیٹھا ہوا ہے۔ دینی دین سے پوچھا۔ یہ تیسری عورت کون ہے؟

دینی دین نے کہا۔ میں نہیں جانتا۔ کبھی کبھی بہو سے ملنے آجاتی ہیں۔

داروغہ۔ مجھ سے اُڑتے ہو بچہ۔ ساڑھی پہنا کر ملزم کو چھپانا چاہتے ہو۔ جالپا دیوی سے کہہ دو نیچے چلی جائیں۔ اس گھونگھٹ والی عورت کو یہیں رہنے دو!

جالپا چلی گئی۔ تو داروغہ جی نے زہرہ کے پاس جاکر کہا۔ کیوں حضرت مجھ سے یہ چالیں۔ وہاں سے کیا کہہ کر آئے تھے اور یہاں مزے میں ہی آگئے۔ اب یہ بھیس اُتاریئے اور میرے ساتھ چلیے دیر ہو رہی ہے۔

یہ کہہ کر انھوں نے زہرہ کا گھونگھٹ اُٹھا دیا۔ زہرہ نے قہقہہ مارا۔ داروغہ جی گویا پھسل کر حیرت کے گڈھے میں گر پڑے۔ ارے زہرہ تم یہاں کہاں؟

زہرہ نے کہا۔ اپنی ڈیوٹی بجا رہی ہوں۔

"اور رما ناتھ کہاں گئے۔ تمھیں تو معلوم ہی ہوگا۔"

"وہ تو میرے یہاں آنے کے پہلے ہی چلے گئے تھے۔"

"اچھا ذرا میرے ساتھ آؤ۔ اس کا پتہ لگانا ہے۔"

"کیا ابھی تک بنگلے پر نہیں پہنچے؟"

"نہ جانے کہاں رہ گئے۔"

زہرہ داروغہ جی کے ساتھ چلی تو انھوں نے راستے میں پوچھا۔ جالپا کب تک یہاں سے جائے گی؟

زہرہ۔ میں نے خوب پٹی پڑھائی ہے۔ اب اس کے یہاں سے جانے کی ضرورت نہیں۔ رما ناتھ نے بُری طرح ڈانٹا ہے۔

"تمھیں یقین ہے۔ اب یہ کوئی شرارت نہ کرے گی۔"

"ہاں میرا تو یہی خیال ہے۔"

"تو پھر یہ حضرت کہاں چلے گئے؟"

"کہہ نہیں سکتی پیئے ہوئے تھے۔"

"تو کہیں گر گرا پڑا ہوگا۔ اس نے بہت دق کیا ہے۔ میں ذرا ڈپٹی صاحب کے پاس جاتا ہوں۔ آؤ تمھیں تمھارے گھر تک پہنچا دوں۔"

"بڑی عنایت ہوگی۔"

ذرا دیر میں زہرہ کا مکان آگیا۔ وہ اُتر کر زینے کی طرف چلی۔ مگر اتنی دیر میں داروغہ جی بھی مزے میں آگئے۔ بولے اب تو جانے کو جی نہیں چاہتا۔ زہرہ چلو۔ کچھ غپ شپ ہو۔ میں بھی آتا ہوں۔

زہرہ نے زینے کے اوپر قدم رکھ کر کہا۔ جا کر پہلے ڈپٹی صاحب کو اطلاع دیجیے۔ یہ غپ شپ کا موقعہ نہیں ہے۔

داروغہ نے موٹر سے اُتر کر کہا۔ اب نہ جاؤں گا۔ زہرہ! صبح دیکھی جائے گی۔

زہرہ نے اُوپر چڑھ کر دروازہ بند کرلیا اور اوپر جاکر کھڑکی سے سر نکال کر بولی۔ آداب عرض!

(۵۰)

داروغہ جی مجبور ہوکر گھر جاکر لیٹ رہے۔ نیند کھلی۔ تو آٹھ بج رہے تھے۔ اُٹھ کر بیٹھے ہی تھے کہ ٹیلیفون پر پکار ہوئی۔ ڈپٹی صاحب پوچھ رہے تھے۔ رما ناتھ رات کو بنگلے پر تھا یا نہیں!

داروغہ کے ہوش اُڑ گئے۔ بولے نہیں۔ مجھ سے بہانہ کرکے اپنی بیوی کے پاس چلاگیا تھا۔

ڈپٹی صاحب نے غصّے کے ساتھ کہا۔ تم نے اسے کیوں جانے دیا۔ تم سے اس کا جواب طلب ہوگا۔ اس نے جج سے سب حال کہہ دیا ہے۔ مقدمہ کی جانچ پھر سے ہوگی۔ آپ سے بڑا بھاری بلینڈر ہوا ہے۔ سارا محنت پانی میں گر گیا۔

داروغہ۔ تو کیا وہ رات کو جج صاحب کے پاس چلا گیا۔

ڈپٹی۔ ہاں وہیں گیا تھا۔ جج صاحب پھر سے مقدمہ کی پیشی کرے گا۔ یہ سب آپ کا بنگلنگ ہے۔ زہرہ بھی دغا دیا۔ اب رما ناتھ کا سب سامان کمشنر صاحب کے پاس بھیج دو۔

وہ کسی دوسری جگہ ٹھہرایا جائے گا۔

داروغہ جی اسی وقت رما ناتھ کا سب سامان لے کر پولیس کمشنر کے بنگلے کی طرف چلے۔ رما پر ایسا غصہ آرہا تھا کہ پائیں تو کچا نگل جائیں۔ کم بخت کی کتنی خوشامدیں کیں۔ کتنی نازبرداری کی۔ مگر دغا ہی دے گیا۔ اس میں زہرہ کی بھی شازش ہے۔ آج ہی بیگم صاحب کی بھی خبر لیتا ہوں۔ بچہ دیہی دین سے بھی سمجھوں گا۔

ایک ہفتہ تک پولیس کے حکام میں جو ہل چل رہی۔ اس کا ذکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ رات کی رات اور دن کے دن اسی فکر میں چکر کھاتے رہتے۔ مقدمہ سے کہیں زیادہ اپنی فکر تھی۔ سب سے زیادہ تشویش داروغہ صاحب کو تھی۔ انھیں اپنے بچنے کی امید نظر نہیں آتی۔ ڈپٹی اور انسپکٹر دونوں نے ساری بلا اُس کے سر ڈال دی تھی اور خود بالکل الگ ہوگئے تھے۔

سارے شہر میں یہ خبر پھیل گئی۔ اس مقدمہ کی دوبارہ پیشی ہوگی۔ انگریزی انصاف کی تاریخ میں یہ عدیم المثال واقعہ تھا۔ وکیلوں میں اس پر قانونی مباحثے ہوتے جج صاحب کو اس کا مجاز ہے بھی یا نہیں۔ لیکن جج اپنے ارادے پر مستقل تھا۔ پولیس والوں نے بڑے بڑے زور لگائے۔ پولیس کمشنر نے یہاں تک کہا کہ اس سے سارا محکمہ بدنام ہوجائے گا لیکن جج نے کسی کی نہ سُنی۔ جھوٹی شہادتوں پر پندرہ آدمیوں کی زندگی برباد کرنے کی ذمہ داری لیتے اسے روحانی تکلیف ہوتی تھی۔ اس نے ہائی کورٹ اور گورنمنٹ دونوں ہی کو اس کی اطلاع دے دی تھی۔ ادھر پولیس والے رما کی تلاش میں رات دن سرگرداں رہتے تھے۔ لیکن رما نہ جانے کہاں روپوش ہوگیا تھا۔

ہفتوں حکام میں خط و کتابت ہوتی رہی۔ منوں کاغذ سیاہ ہوگئے۔ اخباروں میں بھی اس معاملہ پر قیاس آرائیاں ہوتی رہتی تھیں۔ ایک اخبار کے ایڈیٹر نے جالپا سے ملاقات کی اور اس کا بیان شائع کرا دیا۔ دوسرے اخبار نے زہرہ کا بیان چھاپ دیا۔ اِن دونوں بیانات نے پولیس کی بخیہ ادھیڑی۔ زہرہ نے صاف کہا کہ مجھے صرف اس لیے پچاس روپے روز دیئے جاتے تھے کہ رما ناتھ کو بہلاتی رہوں اور اسے کچھ سوچنے یا کرنے کا موقعہ نہ ملے۔ پولیس والوں نے یہ بیان پڑھا تو دانت پیس لیے۔

آخر دو مہینے کے بعد فیصلہ ہوا۔ اس مقدمہ کی سماعت کے لیے ایک سولین تعینات

کیا گیا۔ پھر پیشیاں ہونے لگیں۔ پولیس نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا کہ ملزموں میں کوئی مخبر بن جائے مگر کامیابی نہ ہوئی۔ داروغہ صاحب چاہتے تو نئی شہادتیں بنا سکتے تھے۔ لیکن افسروں کی خودغرضی سے وہ اتنے کبیدہ خاطر ہوئے کہ دُور سے تماشہ دیکھنے کے سوا اور کچھ نہ کیا۔ جب ساری نیک نامی افسروں کو ملتی ہے اور ساری بدنامی ماتحتوں کو تو کوئی کیوں شہادتیں بنائے۔

آخر پولیس کو مجبور ہوکر مقدمہ اُٹھا لینا پڑا۔ طویلے کی بلا بندر کے سر گئی داروغہ تنزل ہوگئے۔ اور نائب داروغہ کا ترائی میں تبادلہ کر دیا گیا۔

جس دن ملزموں کو بری کیا گیا۔ آدھا شہر ان کا خیرمقدم کرنے کو جمع تھا پولیس نے انھیں دس بجے رات کو چھوڑا۔ لیکن خلقت جمع ہوگئی۔ لوگ جالپا کو بھی کھینچ لے گئے۔ اس پر پھولوں کی بارش ہورہی تھی اور اس کی تعریف کے نعروں سے آسمان گونج رہا تھا۔

مگر رما ناتھ کی مصیبتوں کا ابھی خاتمہ نہ ہوا تھا۔ اس پر دروغ بیانی کا مقدمہ چلانے کا فیصلہ ہوگیا۔

(۵۱)

اسی بنگلے میں ٹھیک دس بجے مقدمہ پیش ہوا۔ ساون کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ کلکتہ دلدل ہو رہا تھا۔ لیکن تماشائیوں کا ہجوم میدان میں کھڑا تھا۔ عورتوں میں دنیش کی بیوی اور ماں بھی آئی تھیں۔ پیشی سے دس منٹ پہلے جالپا اور زہرہ بھی بند گاڑیوں میں آپہنچیں۔

پولیس کی شہادتیں شروع ہوئیں۔ پر اُن میں قابلِ ذکر کوئی بات نہ تھی۔ محض ضابطہ کی پابندی تھی۔ اس کے بعد رما ناتھ کا بیان ہوا۔ پر اس میں کوئی نئی بات نہ تھی۔ اس نے اپنی زندگی کے پورے ایک سال کی سرگزشت کہہ سنائی۔ وکیل کے پوچھنے پر اس نے کہا۔ جالپا کی بے نفسی، حق پسندی اور استقلال نے میری آنکھیں کھولیں۔ اور اس سے بھی زیادہ زہرہ کی دلجوئی اور خلوص نے۔ میں اسے اپنی خوش نصیبی سمجھتا ہوں کہ مجھے اس طرف سے روشنی ملی۔ جدھر اوروں کو تاریکی ہی ملتی ہے۔

اس کے بعد صفائی کی طرف دیبی و جالپا اور زہرہ کے بیان ہوئے۔ زہرہ کا بیان بہت ہی پُر اثر تھا۔ اس نے کہا۔ میں نے دیکھا کہ جس آدمی کو نشانۂ ستم بنانے کی خدمت

مجھے سونپی گئی ہے وہ خود درد سے تڑپ رہا ہے۔ اسے مرہم کی ضرورت ہے زخموں کی نہیں۔ جالپا دیوی سے اُسے جتنی عقیدت تھی اسے دیکھ کر مجھے اپنی خودغرضی اور بے غیرتی پر شرم آئی۔ میری زندگی کتنی حقیر کتنی گری ہوئی اور کتنی شرمناک ہے۔ یہ مجھ پر اس وقت کھلا۔ جب میں جالپا سے ملی۔ اس کے بے غرض خدمت اس کے مردانہ عزم اور اس کی پاک غریب دوستی نے میری زندگی کی رفتار پلٹ دی۔ میں نے فیصلہ کیا اس آغوش میں میں بھی پناہ لوں گی۔

مگر اس سے بھی معرکے کا بیان جالپا کا تھا۔ وہ بیان سن کر حاضرین کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس کے آخری الفاظ یہ تھے۔ میرے شوہر بے گناہ ہیں ایشور کی نگاہوں میں ہی نہیں۔ قانون کی نگاہ میں بھی۔ ان کی تقدیر میں میری نمائش پسندی کا تاوان دینا لکھا تھا۔ وہ انھوں نے دیا۔ اصلی خطاوار میں ہوں۔ جس کے باعث انھیں یہ عذاب جھیلنے پڑے، میں مانتی ہوں کہ میں نے انھیں اپنا بیان بدلنے کے لیے مجبور کیا۔ اگر مجھے یقین ہوتا کہ وہ سچ مچ ڈاکوؤں میں شریک ہوئے اور ان کی شہادت واقعات پر مبنی ہے تو میں انھیں تبدیل بیان کے لیے ہرگز آمادہ نہ کرتی۔ جن تاریخوں میں میرے شوہر کا ڈاکوؤں میں شریک ہونا بتلایا جاتا ہے ان تاریخوں میں وہ الہ آباد میں تھے۔ عدالت چاہے تو وہاں کی میونسپل بورڈ کے دفتر سے اس کی تصدیق کرسکتی ہے۔

عدالت نے سرکاری وکیل سے پوچھا۔ کیا الہ آباد سے اس معاملے میں کوئی رپورٹ مانگی گئی تھی؟

سرکاری وکیل نے کہا۔ جی ہاں! مگر ہمیں اس معاملے سے کوئی بحث نہیں ہے۔

صفائی کے وکیل نے کہا۔ اس سے یہ ثابت ہو ہی جاتا ہے کہ ملزم ڈاکے میں شریک نہ تھا۔ اب صرف یہ امر رہ جاتا ہے کہ وہ مخبر کیوں بنا؟

سرکاری وکیل نے کہا۔ خودغرض کے سوا اور کیا سبب ہوسکتا ہے؟

صفائی کے وکیل نے جواب دیا۔ میرا دعویٰ ہے کہ اسے دھوکا دیا گیا اور جب اُسے معلوم ہوگیا کہ اسے پولیس سے خائف ہونے کا کوئی سبب نہیں ہے تو اُسے دھمکیوں سے مجبور کیا گیا۔

اس کے بعد سرکاری وکیل نے بحث شروع کی۔ جناب والا! آج آپ کے ہاں ایک

ایسا مقدمہ پیش ہوا ہے۔ جیسا خوش قسمتی سے بہت کم ہوا کرتا ہے۔ آپ کو جنک پور کی ڈکیتی کا حال معلوم ہے۔ جنک پور کے قریب و جوار میں متواتر کئی ڈاکے پڑے اور پولیس کے عملے مہینوں اپنی جان ہتھیلی پر لیے ڈکیتوں کی تلاش میں سرگرم رہے اور آخر ان کی کوشش بار آور ہوئی۔ اور ڈاکوؤں کا سراغ ملا۔ یہ لوگ گھر کے اندر بیٹھے ہوئے پائے گئے۔ پولیس نے یکبارگی سب کو گرفتار کرلیا۔ لیکن آپ جانتے ہیں ایسے معاملوں میں پولیس کے لیے عدالتی ثبوت پہنچانا کتنا مشکل ہے۔ عوام جان کے خوف سے شہادت دینے کو تیار نہیں ہوتے۔ یہاں تک کہ جن گھروں میں ڈاکے پڑے تھے۔ وہ شہادت دینے کا موقعہ آیا تو صاف نکل گئے۔ پولیس اسی اُلجھن میں پڑی ہوئی تھی کہ ایک نوجوان آتا ہے اور ان ڈاکوؤں کا سرغنہ ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ وہ ان وارداتوں کا اتنا مبسوط اور مفصل ذکر کرتا ہے کہ پولیس کو اس پر یقین آجاتا ہے۔ وہ اس موقعہ پر اس آدمی کو پاکر غیبی امداد سمجھتی ہے۔ یہ آدمی الہ آباد سے کسی معاملہ میں ماخوذ ہوکر بھاگ آیا تھا اور یہاں بھوکوں مرتا تھا۔ اس میں اور کوئی صفت ہو یا نہ ہو۔ موقع شناسی کی صفت ضرور ہے۔ اس موقعہ سے اس نے اپنے مستقبل کی تعمیر کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ مخبر بن کر اسے سزا کا تو کوئی خوف تھا ہی نہیں۔ اس کے برعکس فائدے بے شمار تھے۔ پولیس اس کی خوب آؤ بھگت کرتی ہے اور اسے اپنا مخبر بنا لیتی ہے۔ بہت ممکن تھا کہ ان وارداتوں کی کوئی شہادت نہ پاکر پولیس ڈکیتی کے ملزموں کو چھوڑ دینے پر مجبور ہوجاتی۔ لیکن یہ غیبی امداد پاکر اس نے مقدمہ چلانے کا ارادہ کیا۔

لیکن ایسا ہوتا ہے کہ اس اثناء میں.اُسے تقدیر سازی کے دوسرے موقع ہاتھ آگئے۔ ممکن ہے مغویانہ جماعتوں نے اسے ترغیبیں دی ہوں اور ان ترغیبوں نے اسے مطلب براری کا نیا راستہ دکھا دیا۔ جہاں دولت کے ساتھ نیک نامی بھی تھی۔ واہ وا بھی تھی۔ اور قوم پروری کی شہرت بھی۔ یہ شخص اپنی غرض کے لیے سب کچھ کرسکتا ہے۔ یہی اس کی زندگی کا مقصد اولیٰ ہے۔ ہم خوش ہیں کہ بالآخر اس کی حق پسندی اس پر غالب آئی۔ چاہے اس کے اسباب کچھ بھی ہوں۔ بے گناہوں کو سزا دلوانا پولیس کے لیے اتنا ہی قابلِ اعتراض ہے۔ جتنا گناہگار کو چھوڑ دینا۔ وہ اپنی کارگزاری دکھانے کے لیے ہی ایسے مقدمہ نہیں چلاتی۔ اس جوان کی ابلہ فریبیوں سے پولیس کی جو بدنامی ہوئی۔ اور سرکار کے جو

روپے خرچ ہوئے۔ اس کی اسے معقول سزا ملنی چاہیے۔ ایسے دروغ بانوں کو آزاد رہ کر سوسائٹی کے ٹھگنے کا موقعہ دینا صریح بے انصافی ہوگی۔ اس کے لیے سب سے موزوں مقام وہ ہے۔ جہاں اسے کچھ دن تہذیب نفس کا موقعہ ملے۔ شاید اس خلوت میں اس کا ضمیر بیدار ہو۔ آپ کو محض یہ فیصلہ کرنا ہے کہ اس نے پولیس کو دغا دی یا نہیں۔ اس تنقیح کے صحیح تسلیم کرنے میں اب شک کی گنجائش نہیں مگر پولیس نے اُسے دھمکیاں دی تھیں تو وہ پہلے ہی عدالت میں اپنا بیان واپس لے سکتا تھا۔ اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ دھمکیوں کا الزام بالکل غلط ہے۔ اس نے جو کچھ کیا اپنی رضا و رغبت سے کیا۔ ایسے آدمی کو اگر سزا نہ دی گئی تو اس کی شعبدہ بازیوں کا سلسلہ قائم رہے گا۔

اس کے بعد صفائی کے وکیل نے جواب دیا۔ یہ مقدمہ انگریزی تاریخ ہی میں نہیں شاید دنیا کی تاریخ انصاف میں اپنی نوعیت کا بے مثال مقدمہ ہے۔ رما ناتھ ایک معمولی طبقہ کا آدمی ہے۔ اس نے تعلیم بھی بہت ہی معمولی درجہ کی پائی ہے۔ وہ اونچے خیالات کا آدمی نہیں ہے۔ الہٰ آباد کی میونسپلٹی میں وہ کئی سال ملازم رہ چکا ہے وہاں اس کا کام چنگی کے روپے وصول کرنا تھا۔ عام دستور کے مطابق وہ تاجروں سے رشوت بھی لیتا ہے اور اپنی آمدنی کی پرواہ نہ کرکے اناپ شاپ خرچ کرتا ہے۔ آخر ایک دن میزان میں غلطی ہوجانے کے باعث اُسے شک ہوتا ہے کہ کچھ سرکاری رقم اسے کے تصرف میں آگئی ہے۔ وہ اتنا بدحواس ہوجاتا ہے کہ کسی سے اس کا ذکر نہیں کرتا۔ خفیہ طور پر گھر سے بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ وہاں دفتر میں اس پر شبہ ہوتا ہے اور اس کے کاغذات کی جانچ ہوتی ہے۔ تب معلوم ہوتا ہے کہ اس نے کوئی بے جا تصرف نہیں کیا۔ صرف میزان کی غلطی تھی۔

اس کے بعد اس نے رما کے پولیس کے پنجے میں پھنسنے، فرضی مخبر بننے اور شہادت دینے کا ذکر کرکے سلسلۂ بحث جاری کیا۔

اب رما ناتھ کی زندگی میں ایک نیا تغیر جو کہ ایک شوقین مزاج اور ملازمت کے دلدادہ نوجوان کو فرض اور حق کے راستے پر لگا دیتا ہے۔ اس کی زوجہ جالپا اس کی تلاش میں الہ آباد سے یہاں آتی ہے اور جب اسے معلوم ہوتا ہے کہ رما ایک مقدمہ میں پولیس کا مخبر ہوگیا ہے۔ تو وہ اس سے خفیہ طور پر ملنے آتی ہے۔ رما پولیس کا مہمان ہے اپنے بنگلے میں آرام سے پڑا ہوا ہے۔ پھاٹک پر سنتری پہرہ دے رہا ہے۔ جالپا کو شوہر سے ملنے

سے ناکامی ہوتی ہے۔ تب وہ ایک خط لکھ کر اس کے سامنے پھینک دیتی ہے اور دیبی دین کے ساتھ چلی جاتی ہے۔ رما یہ خط پڑھتا ہے۔ اور اس کی آنکھوں کے سامنے سے پردہ ہٹ جاتا ہے۔ وہ چھپ کر جالپا کے پاس آتا ہے۔ جالپا اس سے ساری داستان کہہ سناتی ہے۔ اور اسے اپنا بیان واپس لینے پر مجبور کرتی ہے۔ رما پہلے تو ڈرتا ہے۔ مگر راضی ہوجاتا ہے اور بنگلہ پر جاکر پولیس افسروں پر اپنا ارادہ ظاہر کرتا ہے۔ حکام کو یہ معلوم ہوگیا ہے کہ رما پر غبن کا کوئی الزام نہیں ہے۔ تو وہ جالپا کو گرفتار کرنے کی دھمکی دے کر اُسے اپنے ارادے سے باز رکھتے ہیں۔ رما ناتھ کی ہمّت پست ہوجاتی ہے۔ وہ جانتا ہے پولیس کے اختیارات وسیع ہیں مجبور ہوکر وہ جج کے اجلاس میں اپنے پہلے بیان کی تائید کرتا ہے۔ آخر ملزموں کو سزا ہوجاتی ہے۔ رما ناتھ کی اور خاطرداریاں ہونے لگتی ہیں۔

اس کے بعد جو واقعات ہوئے ان کا مختصر ذکر کرنے کے بعد وکیل صاحب نے فرمایا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اس نے جھوٹی شہادت نہیں دی۔ لیکن ان حالات اور ان ترغیبوں پر نگاہ ڈالیے تو اس جرم کی اہمیت بہت کم ہوجاتی ہے۔ اس جھوٹی شہادت کا نتیجہ اگر یہ ہوتا کہ کسی بے قصور کو سزا مل جاتی تو دوسری بات تھی۔ یہاں تو پندرہ نوجوانوں کی قیمتی جان بچ گئی۔ ملزم نے خود اپنی جھوٹی شہادت کا اقبال کیا ہے۔ کیا اس دلیرانہ حق پسندی کا یہی انعام اسے ملنا چاہیے۔ جالپا دیوی کی اصول پروری کیا اسی برتاؤ کی مستحق ہے۔ جالپا ہی اس ڈرامے کی ملکہ ہے۔ اس کی حق پسندی۔ اس کی فرض پروری، اس کی عصمت اور وفا، اس کی بے نفسی غرض کن کن اوصاف کی تعریف کی جائے اسے معلوم تھا کہ پولیس کی حمایت سے اس کا دنیاوی مستقبل کتنا روشن ہو جائے گا۔

ایک حسینہ کے دل میں جو آرزوئیں ہوسکتی ہیں جالپا کا دل ان سے خالی نہیں ہوسکتا۔ لیکن وہ حمایتِ حق کے جوش میں ان ساری تمناؤں کو خیرباد کہتی ہے۔ ایک معمولی عورت میں جس نے اُونچے درجے کی تعلیم نہیں پائی۔ کیا اتنا ایثار اور اتنی روشن طبعی کسی غیبی امداد کا ثبوت نہیں ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں ایسے مقدمات روز نہیں پیش ہوتے۔ شاید آپ لوگوں کو اپنی زندگی میں پھر ایسے مقدمہ کی سماعت کا موقعہ نہ ملے۔ یہاں آپ ایک مقدمہ کا فیصلہ کرنے بیٹھے ہوئے ہیں۔ مگر اس اجلاس کے باہر ایک بہت بڑی عدالت ہے۔ جہاں آپ کے فیصلہ کی جانچ ہوگی۔ آپ کا وہی فیصلہ واجب سمجھا جائے گا جسے یہ باہر کی

عدالت بھی واجب تسلیم کرلے۔ وہ عدالت کی موشگافیوں میں نہیں پڑتی۔ جن میں اُلجھ کر ہم اکثر گمراہ ہوجایا کرتے ہیں۔ اکثر پانی کا دودھ اور دودھ کا پانی کر بیٹھتے ہیں اگر آپ جھوٹ سے تائب ہوکر حق کی پیروی کرنے کے لیے کسی کو مجرم ٹھہراتے ہیں۔ تو آپ دنیا کے سامنے عدل کا کوئی اونچا معیار نہیں رکھتے۔

سرکاری وکیل نے اس دلیل کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ فرض اور ایثار اپنی اپنی جگہ پر بہت ہی قابلِ قدر ہیں۔ لیکن جس آدمی نے عمداً جھوٹی شہادت دی۔ اس نے قانون کی نگاہ میں اور اخلاق کی نگاہ میں جرم کیا ہے۔ اور سزا کا مستوجب ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس نے الہ آباد میں بے جا تصرف نہیں کیا اسے صرف وہم تھا۔ لیکن ایسی حالت میں ایک سچے آدمی کا یہ فرض تھا کہ وہ گرفتار ہوجانے پر اپنی صفائی پیش کرتا۔ نہ یہ کہ اپنے کمینے اغراض کے لیے جھوٹ کا جال پھیلاتا۔ اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ اس کا یہ فعل نا واجب ہے تو آپ اسے ضرور سزا دیں۔

فریقین کے وکیلوں کی بحث ختم ہوجانے کے بعد جج نے سینئروں سے مشورہ کیا اور یہ تجویز سنائی۔ مقدمہ صرف یہ ہے کہ ایک نوجوان نے اپنے کو ایک الزام سے بری کرنے کے لیے پولیس کی پناہ لی۔ اور جب اسے معلوم ہوگیا کہ جس بناء پر وہ پولیس کی حمایت میں جاتا ہے اس کی کوئی ہستی نہیں تو وہ اپنا بیان واپس لے لیتا ہے رما ناتھ اگر حق پرور ہوتا ہے تو وہ پولیس کی حمایت میں جاتا ہی کیوں۔ لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ پولیس نے ایسی جھوٹی شہادت دینے کی ترغیب دی۔ میں یہ نہیں مان سکتا کہ شہادت کی تحریک رما ناتھ کی جانب سے ہوئی یا اسے ترغیب دی گئی۔ اور سزا کے خوف سے اس نے منظور کرلیا۔ اسے اس بات کا یقین بھی دلایا گیا ہوگا کہ جن لوگوں کے خلاف شہادت دینے کے لیے اسے آمادہ کیا جارہا ہے۔ وہ فی الواقع خطاوار تھے۔ کیوں کہ رما ناتھ میں اگر سزا کا خوف ہے تو احساسِ حق بھی ہے۔ وہ ایسے پیشے ور گواہوں میں نہیں ہے جو اپنے مفاد کے لیے جھوٹی شہادتیں دیا کرتے ہیں۔ اگر یہ واقعہ نہ ہوتا تو رما اپنی بیوی کے اصرار سے اپنا بیان تبدیل کرنے پر بھی کبھی راضی نہ ہوتا۔ اس لیے میں اُسے بری کرتا ہوں۔

(۵۳)

چیت کی سہاؤنی فرحت بخش شام۔ گنگا کا کنارہ۔ ٹیسوؤں سے لہلہاتا ہوا ڈھاک کا

میدان۔ ایک برگد کا چھتنار درخت۔ اس کے نیچے بندھی ہوئی گائے بھینسیں۔ کدو اور لوکی کی بیلوں سے لہراتی ہوئی جھونپڑیاں۔ نہ کہیں گرد و غبار نہ شور و غل۔ آرام و سکون کے لیے اس سے بہتر کوئی اور جگہ ہوسکتی ہے۔ نیچے سنہری گنگا۔ سُرخ۔ سیاہ اور نیلے رنگوں سے چمکتی ہوئی میٹھے سُروں میں گاتی۔ کہیں لپکتی۔ کہیں جھجکتی۔ کہیں شوخ اور کہیں متین اس طرح بہتی ہوئی چلی جاتی ہے گویا بے فکریوں کا خوش نما بچپن ہنستا کھیلتا چلا جاتا ہو۔

دینی دین اور رما ناتھ نے یہیں سکونت اختیار کی ہے۔

تین سال گزر گئے ہیں۔ اسی اثنا میں دینی دین نے زمین خریدی۔ باغ لگایا۔ کھیتی جمائی۔ مویشی جمع کیے اور مسلسل جد و جہد میں آرام و سکون کا لطف اُٹھا رہا ہے۔ اس کے چہرے پر اب وہ زردی اور جھریاں نہیں ہیں۔ بلکہ ایک نئی رونق نظر آ رہی ہے۔

شام ہوگئی۔ مویشی چراگاہ سے لوٹے۔ جگو نے انھیں کھونٹے سے باندھا اور تھوڑا تھوڑا بھوسہ لاکر ان کے سامنے ڈال دیا۔ دینی دین اور گوپی بھی بیل گاڑی پر پولے لادے ہوئے آپہنچے۔ دیا ناتھ نے برگد کے نیچے زمین صاف کر رکھی ہے۔ وہیں پولے اُتارے گئے۔ یہی اس چھوٹی سی بستی کا ہی کھلیان ہے۔ دیا ناتھ نوکری سے برخاست ہوگئے ہیں۔ اور اب دینی دین کے اسسٹنٹ ہیں۔ ان کو اخباروں سے اب بھی وہی عشق ہے۔ روز کئی اخبار آتے ہیں اور شام کو کام سے فرصت پانے کے بعد منشی جی اخباروں کو پڑھ کر سناتے اور سمجھاتے ہیں۔ آس پاس کے گاؤں کے دس پانچ آدمی روز جمع ہوجاتے ہیں۔ روز ایک چھوٹی موٹی سبھا ہوتی ہے۔

رما کو تو اس زندگی سے اتنی دل بستگی ہوگئی ہے کہ اب اسے شاید تھانیداری ہی نہیں چنگی کی انسپکٹری بھی مل جائے تو وہ ملازمت کا نام نہ لے۔ روز صبح اُٹھ کر گنگا اشنان کرتا ہے۔ اور دن نکلتے نکلتے اپنے شفاخانے میں آبیٹھتا ہے۔ اس نے طب کی دو چار کتابیں پڑھ لی ہیں۔ اور چھوٹی موٹی بیماریوں کا علاج کر لیتا ہے۔ بس پانچ مریض روز آجاتے ہیں۔ اور اس کی شہرت روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ یہاں سے فرصت پاکر اپنے باغ میں چلا جاتا ہے۔ وہاں کچھ ساگ بھاجی لگی ہوئی ہے۔ کچھ پھل پھولوں کے درخت ہیں۔ ابھی تو باغ سے محض ترکاری ملتی ہے۔ لیکن امید ہے کہ تین چار سال میں پھلوں کی کافی مقدار پیدا ہونے لگے گی۔

دینی دین نے بیلوں کو گاڑی سے کھول کر کھونٹے سے باندھ دیا اور دیا ناتھ سے بولا۔ ابھی بھیا نہیں آئے؟

دیا ناتھ نے جواب دیا۔ ابھی نہیں۔ مجھے تو اب بہو کے اچھے ہونے کی امید نہیں ہے۔ زمانے کا پھیر ہے۔ کتنے آرام سے رہتی تھیں اور آج یہ حال ہے۔ وکیل صاحب نے اچھی جائداد چھوڑی تھی۔ مگر بھائی بھتیجوں نے سب ہڑپ کرلی۔

دینی بھیا کہتے تھے۔ عدالت کرتی تو سب مل جاتا۔ مگر کہتی ہے۔ میں عدالت میں جھوٹ نہ بولوں گی۔

یکایک جاگیشوری ایک بچے کو گود میں لیے جھونپڑے سے نکلی اور بچے کو دیا ناتھ کی گود میں دیتی ہوئی بولی۔ مہتو ذرا چل کر رتن کو دیکھو۔ جانے کیسی ہوئی جاتی ہے۔ زہرہ اور بہو دونوں رو رہی ہیں۔

دینی دین نے منشی جی سے کہا۔ چلو لالہ دیکھیں۔

جاگیشوری بولی۔ یہ جاکر کیا کریں گے۔ بیمار کو دیکھ کر تو آپ ہی ان کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں۔

دینی دین نے رتن کو کوٹھڑی میں جا کر دیکھا۔ رتن بانس کی ایک کھاٹ پر پڑی تھی۔ جسم سوکھ کر کانٹا ہوگیا تھا۔ وہ سورج مکھی کا سا کھلا ہوا چہرہ مُرجھا کر زرد ہو گیا تھا۔ وہ دل نواز مستی اور حسرت میں ڈوبا ہوا نغمہ فضا میں غائب ہوگیا تھا۔ صرف اس کی یاد باقی تھی۔ زہرہ اس کے اُوپر جھکی ہوئی اسے دردناک اور مجبور نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ آج سال بھر سے اس نے رتن کی تیمارداری میں اپنے تئیں قربان کردیا تھا۔ رتن نے اس کے ساتھ جو محبت آمیز برتاؤ کیا اس بے اعتباری اور حقارت کے ماحول میں جس خلوص اور دلیری کے ساتھ بہناپا جوڑا تھا۔ اس کا احسان وہ اور کس طرح مانتی۔ جو ہمدردی اسے جالپا سے بھی نہ ملی۔ وہ رتن نے عطا کی۔ اس دوستی میں اس کے دلِ محروم نے شوہر کا سُکھ پایا اور اولاد کا بھی۔

دینی دین نے رتن کے چہرے کی طرف فکرمند نگاہوں سے دیکھ کر پُوچھا۔ کتنی دیر سے نہیں بولیں۔

جالپا نے آنکھیں پُونچھ کر کہا۔ ابھی ابھی تو بول رہی تھیں۔ یکایک آنکھیں اُوپر

چڑھ گئیں اور بے ہوش ہو گئیں۔

زہرہ نے پوچھا۔ کیا بابو جی ابھی وید کو لے کر نہیں لوٹے۔

دیبی دین نے آہستہ سے کہا۔ ان کی دوا اب وید کے پاس نہیں ہے۔

یہ کہہ کر اس نے تھوڑی راکھ لی۔ رتن کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ کچھ منہ ہی منہ میں بُدبدایا اور چٹکی راکھ اس کے ماتھے پر لگا دی۔ تب پُکارا۔ بیٹی رتن آنکھیں کھولو۔

رتن نے آنکھیں کھول دیں۔ اور اِدھر اُدھر وحشت آمیز انداز سے دیکھ کر بولی۔ میرا موٹر آیا تھا نا؟ کہاں گیا۔ وہ آدمی؟ اس سے کہہ دو تھوڑی دیر کے بعد لائے۔ زہرہ! آج میں تمھیں اپنے باغیچہ کی سیر کراؤں گی۔ ہم دونوں جُھولے پر بیٹھیں گے۔

زہرہ پھر رونے لگی۔ جالپا بھی سیلاب اشک کو نہ روک سکی۔ رتن ایک لمحہ تک چھت کی طرف تاکتی رہی۔ پھر یکایک گویا اس کا حافظہ بیدار ہوگیا ہو۔ شرمندہ ہوکر ایک غمناک تبسّم کے ساتھ بولی۔ میں ایک خواب دیکھ رہی تھی۔

سُرخ آسمان پر تاریکی کا پردہ پڑ گیا تھا۔ اسی وقت موت نے رتن کی زندگی پر پردہ ڈال دیا۔

رما ناتھ وید جی کو لے کر پہر رات کو لوٹے تو یہاں موت کا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ رتن کی موت کا غم وہ غم نہ تھا۔ جس میں انسان ہائے ہائے کرتا ہے بلکہ وہ غم جس میں آہیں خاموش ہوجاتی ہیں۔ جس میں آنکھیں خشک ہوجاتی ہیں۔ جو روح پر ہیبت کی طرح مسلّط ہوجاتا ہے۔

رتن کے بعد زہرہ اکیلی رہ گئی۔ دونوں ساتھ سوتی تھیں۔ ساتھ بیٹھتی تھیں۔ ساتھ کام کرتی تھیں۔ اب زہرہ کا جی کسی کام میں نہ لگتا۔ کبھی دریا کے کنارے جاکر رتن کو یاد کرتی اور روتی۔ کبھی اس آم کے پودے کے پاس جاکر گھنٹوں کھڑی رہتی جسے ان دونوں نے لگایا تھا۔ گویا سہاگ لُٹ گیا۔ جالپا کو بچّے کی پرورش و پرداخت اور گھر کے کام کاج سے اتنی فرصت نہ ملتی کہ اس کے ساتھ بہت دیر تک بیٹھتی اور یہ بھی ایک طرح سے اچھا تھا۔ کیونکہ جب دونوں ساتھ ہوتیں تو رتن کا ذکر آجاتا اور دونوں رونے لگتیں۔

بھادوں کا مہینہ تھا۔ عناصر معرکہ کارزار گرم تھا۔ بحری فوجیں ہوائی جہازوں پر چڑھ کر آبی تیروں کی بارش کررہی تھیں۔ زمین اس پرورش سے عاجز آکر گوشۂ عافیت تلاش

کرتی پھرتی تھی۔ گنگا گاؤں اور قصبوں کو نگل رہی تھی۔ گاؤں کے گاؤں بہتے چلے جاتے تھے۔ زہرہ ندی کے کنارے بیٹھی سیلاب کی خانہ براندازیوں کا تماشا دیکھ رہی تھی۔ وہ لاغر اندام گنگا اتنی جسیم اور مہیب ہوسکتی ہے۔ اس کا وہ قیاس بھی نہ کرسکتی تھی۔ اسی گنگا میں وہ ایک ہلکی سی ڈونگی میں بیٹھ کر جل بہاؤ کیا کرتی ہے۔ آج اس میں پہاڑ کا بھی پتہ نہ لگے گا۔ لہریں جنون کے عالم میں گرجتیں۔ منہ سے پھین نکالتی، بلیوں اچھل رہی تھیں۔ کبھی لپک کر آگے جاتیں۔ پھر پیچھے لوٹ پڑتیں اور چکر کھاکر آگے دوڑتیں۔ کہیں جھونپڑا ڈگمگاتا تیزی سے بہا جارہا تھا۔ گویا کوئی شرابی دوڑا جاتا ہو۔ کہیں کوئی درخت ڈال پتوں سمیت ڈوبتا اتراتا کسی دور حجر کے کوہ قامت جاندار کی طرح تیرتا چلا جاتا تھا۔ گائے بھینسیں۔ کھاٹ کھٹولے طلسمی تصویروں کی طرح آناً فاناً آنکھوں کے سامنے سے نکل جاتے تھے اور ایک بار غائب ہوکر ایک فرلانگ کے بعد پھر نکل پڑتے تھے۔

دفعتاً ایک کشتی نظر آئی۔ اس پر کئی مرد عورت بیٹھے ہوئے تھے۔ بیٹھے کیا چمٹے ہوئے تھے۔ کشتی زیرو زبر ہورہی تھی۔ پس یہی معلوم ہوتا تھا کہ اب اُلٹی۔ اب اُلٹی۔ مگر واہ ری ہمت مردانہ سب کے سب اب بھی گنگا ماتا کی جے کے نعرے لگاتے جاتے تھے۔ عورتیں اب بھی گنگا کے گیت گا رہی تھیں۔ مرگ و حیات کی کش مکش کا کتنا ہیبت ناک نظارہ تھا۔ دونوں طرف کے آدمی سینوں پر ہاتھ رکھے شدتِ سکون کی حالت میں کھڑے تھے۔ جب کشتی کروٹ لیتی تو لوگوں کے دل اُچھل اُچھل کر لبوں تک آجاتے۔ رسیاں پھینکنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ مگر وہ ساحل سے تھوڑی دُور ہی گر پڑتی تھیں۔ یکایک ایک بار کشتی اُلٹ گئی۔ وہ سب ہستیاں بحرِ فنا میں غرق ہوگئیں۔ ایک لمحے تک کئی مرد و عورت ڈوبتے نظر آئے۔ پھر نظروں سے اوجھل ہوگئے۔ صرف ایک سفید سی چیز ساحل کی طرف چلی آرہی تھی۔ ایک ہی ریلے میں وہ ساحل سے کوئی تیس گز قریب آگئی۔ اب معلوم ہوا کوئی عورت ہے۔ زہرہ۔ جالپا اور رما ناتھ تینوں ہی آپہنچے تھے۔ عورت کی گود میں ایک بچہّ بھی نظر آرہا تھا۔ دونوں چشم زدن میں کہاں سے کہاں جا پہنچیں گے۔ انھیں کیسے گنگا کے منہ سے نکال لیا جائے۔ تینوں ہی بے تاب تھے۔ تینوں بیکسانہ اضطراب سے اس عورت کی طرف دیکھتے تھے اور دل میں پیچ و تاب کھاکر رہ جاتے تھی۔ عورتیں معذور تھیں۔ رما ناتھ تیرنا جانتا تھا۔ لیکن لہروں سے مقابلہ کرنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ کہیں

لہروں کے زور میں پاؤں اُکھڑ جائیں تو خلیج بنگال کے سوا اور کہیں ٹھکانہ نہ لگے۔

زہرہ نے بے صبر ہوکر کہا۔ ابھی دونوں زندہ ہیں جالپا۔ سچ!

اور وہ ایک بے ہوشی کے عالم میں پانی میں چل پڑی۔

رما ناتھ نے شرمندہ ہوکر کہا۔ تم کہاں جاتی ہو زہرہ! تیار تو میں بھی تھا۔ لیکن وہاں تک پہنچ بھی سکوں گا۔ اس میں شک ہے۔ دیکھتی نہیں ہو۔ پانی میں کتنا توڑ ہے۔

زہرہ گھٹنے تک پانی میں جا پہنچی تھی۔ بولی۔ نہیں تم نہ آنا خدا کے لیے۔ میں ابھی نکالے لاتی ہوں۔

وہ کمر تک پانی میں پہنچ گئی۔ رما ناتھ گھبرا نر بولا۔ کیوں ناحق جان دینے جاتی ہو زہرہ! خدا کے لیے لوٹ آؤ۔ ٹھہرو میں آتا ہوں۔

زہرہ نے ہاتھوں سے منع کرتے ہوئے کہا۔ نہیں نہیں تمھیں میری قسم۔ تم نہ آنا۔ میں ابھی لیے آتی ہوں۔ مجھے کچھ کچھ تیرنا آتا ہے۔

جالپا نے کہا۔ لاش ہوگی اور کیا۔

رما بولا۔ شاید ابھی جان ہو۔

جالپا۔ اچھا زہرہ تیر بھی لیتی ہے۔ جبھی ہمّت پڑی۔

رما نے زہرہ کی طرف فکرمند نظروں سے دیکھ کر کہا۔ ہاں کچھ کچھ جانتی تو ہے۔ مگر لوٹ آئے تو کہیں۔ مجھے اپنی پست ہمتی پر شرم آرہی ہے۔

جالپا نے چیں بجبیں ہوکر کہا۔ اس میں شرم کی کون سی بات ہے۔ مُردہ لاش کے لیے اپنی جان خطرے میں ڈالنا کون سی عقل مندی ہے۔

رما نے اپنے نفس کو ملامت کرتے ہوئے کہا۔ یہاں سے کون جاسکتا ہے زندہ ہو یا مُردہ۔ واقعی بال بچوں والا نامرد ہوجاتا ہے۔ میں کاٹھ کے اُلّو کی طرح کھڑا رہا اور زہرہ چلی گئی۔

زہرہ ہاتھ پیر مارتی لاش کے قریب پہنچ چکی تھی۔ اتنے میں ایک رو آئی اور لاش کو پھر ساحل سے دور کھینچ لے گئی۔ زہرہ خود اس کے زور میں آگئی اور کئی ہاتھ بہاؤ کی طرف چلی گئی۔ وہ پھر سنبھلی۔ پر ایک دوسرے ریلے نے پھر اُسے دھکیل دیا۔ وہ کسی طرح نہ سنبھل سکی۔ اس نے چیخ ماری اور پانی میں سما گئی۔

رما بے تاب ہوکر پانی میں کود پڑا اور زور زور سے پکارنے لگا۔ زہرہ زہرہ۔ میں آتا ہوں۔ مگر زہرہ میں اب لہروں سے جنگ کرنے کی طاقت نہ تھی۔ وہ پھر باہر نکلی۔ مگر ایک فرلانگ پر وہ بھی جا رہی تھی۔ اس کے اعضا میں کوئی بھی حرکت نہ تھی۔

یکایک ایک ایسا ریلا آیا کہ وہ بیچ دھار میں جا پہنچی۔ اب صرف اس کے سر کے بال نظر آرہے تھے۔ وہ بھی صرف ایک لمحے تک۔ پھر وہ نشان غائب ہوگیا۔ یہی اُس کی آخری دیدار تھی۔

رما ایک سو گز تک ہاتھ پاؤں مارتا۔ لہروں کا سامنا کرتا ہوا گیا۔ لیکن اتنی سی دور میں اس کا دم پھول گیا۔ اب آگے کہاں جائے۔ زہرہ کا کہیں پتہ نہ تھا۔ وہی آخری جھلک آنکھوں کے سامنے تھی۔

کنارے پر جالپا کھڑی ہائے ہائے کر رہی تھی۔ آخر وہ بھی پانی میں گھُسی۔ رما اب آگے نہ بڑھ سکا۔ ایک طاقت آگے کھینچتی تھی۔ دوسری پیچھے۔ آگے کی طاقت میں مایوسی تھی۔ ناکامی تھی۔ پیچھے کی طاقت میں فرض تھا۔ بندش تھی اور زندگی کی اُمیدیں تھیں۔ بندش نے روک لیا۔ وہ لَوٹ پڑا۔

کئی منٹ تک جالپا اور رما گھٹنوں تک پانی میں کھڑے اسی طرف تاکتے رہے۔ رما کی زبان تاسف نے بند کر رکھی تھی۔ جالپا کے غم نے۔

آخر رما نے کہا۔ پانی میں سے نکل چلو۔ ٹھنڈ لگ جائے گی۔

جالپا پانی سے باہر نکل کر کنارے پر کھڑی ہوگئی۔ پر مُنہ سے کچھ نہ بولی۔ موت کے اس طمانچے نے اس کے حواس کو مفلوج سا کردیا تھا۔ زندگی کی حبابی کیفیت زندگی میں دوسری بار اس کی نظروں کے سامنے آئی۔ رتن کی موت کا پہلے ہی سے اندیشہ تھا۔ معلوم تھا کہ وہ تھوڑے دنوں کی مہمان ہے۔ مگر زہرہ کی موت تو بجلی کی چوٹ تھی۔ ابھی آدھ گھنٹہ پہلے تینوں آدمی روانی دریا کا تماشا دیکھنے خوش خوش چلے تھے۔ کون جانتا تھا کہ موت انھیں اپنی بے دردیوں کا تماشا دکھانے کے لیے کھینچے لیے جا رہی ہے۔

ان چار برسوں میں زہرہ نے اپنی خدمت بے نفسی اور پُرانکسار اخلاق سے سبھی کو گرویدہ کر لیا تھا۔ اپنے ماضی کی یاد کو دل سے مٹانے کے لیے۔ اپنے پچھلے داغوں کو دھو ڈالنے کے لیے اس کے پاس اس کے سوا اور کیا ذریعہ تھا۔ اس کی ساری خواہشیں اور ساری

حسرتیں اسی جوشِ خدمت میں جذب ہوگئی تھیں۔ کلکتہ میں وہ خطہ نفس اور تفریح کی چیز تھی۔ اس وقت شاید کوئی شریف آدمی اسے اپنے گھر میں قدم نہ رکھنے دیتا۔ یہاں وہ ہمدردی اور محبت کی چیز تھی۔ سبھی اس کے ساتھ گھر کے آدمی کا سا برتاؤ کرتے تھے۔ منشی دیا ناتھ اور جاگیشوری کو یہ کہہ کر خاموش کردیا گیا تھا کہ وہ دیہی دین کی بیوہ بہو ہے۔ زہرہ نے کلکتہ میں جالپا سے محض اس کے ساتھ رہنے کی التجا کی تھی۔ مگر اس کا دل ترازؤں سے خالی نہ تھا۔ جالپا کے خلوص اور بہناپے نے اسے تہذیبِ نفس کی جانب مائل کردیا تھا۔ رتن کی پاکیزہ اور بے غرض زندگی اسے روز بروز ایثار کی طرف لیے جاتی تھی۔ یہاں تک کہ اس میں غرض کا شائبہ بھی نہ رہا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد رما بھی پانی سے نکلا اور ماتم میں ڈوبا ہوا آہستہ آہستہ گھر کی طرف چلا۔ اس کے بعد اکثر وہ اور جالپا ندی کے کنارے آبیٹھتے اور جہاں زہرہ ڈوبی تھی۔ وہاں گھنٹوں دیکھا کرتے۔ کئی دنوں تک انھیں امید ہو رہی تھی کہ شاید زہرہ کہیں بچ گئی ہو۔ اور کسی طرف سے ہنستی ہوئی چلی آئے۔ رفتہ رفتہ اُمید کا جھلملاتا ہوا چراغ بھی یاس کی تاریکی میں فنا ہوگیا۔ ہاں ابھی تک زہرہ کی وہ پاکیزہ صورت ان کی آنکھوں کے سامنے پھرا کرتی ہے۔ اس کے لگائے پودے۔ اس کی پالی ہوئی بلّی۔ اس کے ہاتھوں کے سلے ہوئے کپڑے یہ سب اس کی یادگاریں ہیں جو خیال کو اس کے وجود کا یقین دلاتی رہتی ہیں۔

پریم چند کے ادبی کارناموں پر تحقیقی کام کرنے والوں میں مدن گوپال کی اہمیت مسلم ہے پریم چند کے خطوط کے حوالے سے بھی انھیں اولیت حاصل ہے۔ ان کی پہلی کتاب انگریزی میں بہ عنوان "پریم چند" 1944 میں لاہور سے شائع ہوئی۔ اسی کتاب کی وجہ سے غیر ممالک میں بھی پریم چند کے بارے میں دلچسپی پیدا ہوئی۔ "ٹائمز لٹریری سپلیمنٹ لندن" نے لکھا ہے کہ مدن گوپال وہ شخصیت ہے جس نے مغربی دنیا کو پریم چند سے روشناس کرایا۔ اردو، ہندی ادیبوں کو غیر اردو ہندی حلقے سے متعارف کرانے میں مدن گوپال نے تقریباً نصف صدی صرف کی ہے۔

مدن گوپال کی پیدائش اگست 1919 میں (ہانسی) ہریانہ میں ہوئی۔ 1938 میں سینٹ اسٹیفن کالج سے گریجویشن کیا۔ انھوں نے تمام زندگی علم و ادب کی خدمت میں گزاری۔ انگریزی، اردو اور ہندی میں تقریباً 60 کتابوں کے مصنف ہیں۔ پریم چند پر اکسپرٹ کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ ویسے پرنٹ میڈیا اور الکٹرانک میڈیا کے ماہر ہیں۔ مختلف اخبارات، سول ملیٹری گزٹ لاہور، اسٹیٹس مین اور جن ستہ میں بھی کام کیا۔ بعدازاں حکومتِ ہند کے پبلکیشن ڈویژن کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے 1977 میں ریٹائر ہوئے اس کے علاوہ دینک ٹریبون چندی گڈھ کے ایڈیٹر کی حیثیت سے 1982 میں سبکدوش ہوئے۔